قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 23 ❖ شمارہ 10 ❖ ستمبر 2013ء

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی بادشاہ	0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

سیلاب بلاخیز نے ملک کے بیشتر حصے کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ایک بے بسی کا عالم ہے' کوئی پرسانِ حال نہیں۔ بستیوں کی بستیاں زیرِ آب آرہی ہیں کیونکہ پڑوسی ملک نے اپنے آبی ذخائر بھر لینے کے بعد بیراج کے دروزے کھول دیے ہیں اور ہمارے پاس اس اضافی پانی کو ذخیرہ کرنے کے لیے وسائل نہیں، ہم نے بیراج بنانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ نتیجہ خشک سالی اور سیلاب کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ سال بہ سال سیلاب کی تباہ کاری کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے۔ لوگ بغیر امداد فاقوں سے مرنے پر مجبور ہیں۔ سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو کلپ دیکھی کہ کچھ لوگ اسلحہ لہراتے آئے اور اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر امدادی سامان بزور طاقت لے گئے۔ کیا یہ توہین احکام خدا نہیں ہے؟ کیا یہ اسلام کی تکذیب نہیں ہے؟ مسلمانوں کو رسوا کرنے کا سامان نہیں ہے۔ مغربی میڈیا ایسے ہی مناظر دکھا دکھا کر مسلمانوں کو دہشت پسند ثابت کرنے میں لگا ہوا ہے اور ہم اس کے لیے سامان فراہم کررہے ہیں۔ ایسے ویڈیو کلپ اپ لوڈ کرکے آسانیاں دے رہے ہیں کہ وہ چیخ چیخ کر کہیں کہ یہ ہے مسلمانوں کی حقیقت۔ ایسے وقت پر ہمارے دل کی بس ایک صدا ہے جو عابدہ بانو صبا کا یہ شعر ہے۔

اس وقت فضائے عالم پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں
اے ماہِ عرب اے نورِ خدا ظلمت میں اجالا ہوجائے

معراج رسول

ناخدا

سرگزشت

1910 میں علی پور چٹھہ ضلع گوجرانوالہ میں اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس وقت یہ قصبہ پسماندگی کی نمائندگی میں سرفہرست تھا۔ یہاں کی زندگی انتہائی دشوار تھی۔ تعلیم کا بھی زیادہ رواج نہ تھا پھر بھی اس کے گھرانے میں علم کی بوباس باقی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اسے نزدیکی مسجد کے مکتب میں بھیج دیا گیا تاکہ وہ ابجد سے واقف ہوجائے۔ ابتدا میں اسے مولوی صاحب سے بہت خوف آتا تھا۔ ان کی صورت دیکھ کر وہ سوچا کرتا کہ اماں جس ملک الموت کا تذکرہ کرتی ہیں وہ بھی مولوی صاحب کا ہمشکل ہوگا۔ اس قدر خوف ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی حرکتوں میں پیچھے نہ تھا۔ عمر صرف چھ سال تھی پھر بھی اس نے ایک عجیب حرکت کردی۔ اس دن مولوی صاحب آکر اپنی جگہ بیٹھے تھے کہ انہوں نے ایک بڑے لڑکے سے کہا کہ ان کی میز لائی جائے۔ مکتب بند ہوتے ہی کوئی ایک نسبتاً بڑا بچہ ان کی ڈھائی فٹ بلند میز اٹھا کر گلدستۂ اذان کے نیچے رکھ آتا پھر اگلے دن جب مکتب شروع ہوتا تو اس میز کو لاکر مولوی صاحب کے سامنے رکھ دیتا۔ اس دن بھی مولوی صاحب کے آتے ہی ان کے سامنے وہ میز رکھی گئی .جو مولوی صاحب نے بڑے شوق سے لاہور جاکر بنوائی تھی۔ عادت کے مطابق مولوی صاحب نے کندھے پر رکھے رومال کو اتارا اور چہرہ صاف کرنے کے بعد میز کی دراز کھول کر اسے رکھنا چاہا تھا کہ وہ اچھل پڑے۔ دراز سے پھنکارتا ہوا سانپ نکلا تھا۔ مولوی صاحب نے دو تین مددگاروں کی مدد سے اسے مارا۔ اب غور شروع ہوا کہ سانپ دراز میں گیا کس طرح۔ دراز میں ایک بڑا سا رومال تھا۔ رومال کو دیکھتے ہی لڑکوں نے پہچان لیا کہ وہ اس شریر بچے کا ہے۔ مولوی صاحب نے ڈنڈا اٹھایا تو اس نے فرفر بتادیا کہ آتے وقت اس کی نظر سانپ پر پڑی تو اس نے رومال پھینک کر اسے باندھ لیا اور لاکر دراز میں رکھ دیا۔ اس دن مولوی صاحب نے کچھ زیادہ نہیں کہا مگر گھر پہنچنے پر حشر برا ہوا۔ اس کا نتیجہ اگلے دن یہ نکلا کہ جیسے ہی مولوی صاحب نے مسجد کے صحن میں بچوں کو سبق دینا شروع کیا۔ گلدستۂ اذان سے ایک کے بعد ایک آٹھ دس بڑے بڑے مینڈک کود کود کر گرنے لگے۔ بچوں میں بھگدڑ مچی۔ وہ تو مولوی صاحب کے بالکل سامنے تھا اس لیے کسی کو شک بھی نہیں ہوا۔ بعد میں اس نے اپنے حالاتِ زندگی میں لکھا کہ میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ سوکھی گھاس کے ڈھیر کی دوسری طرف مینڈکوں کو رکھا اور گھاس میں آگ لگادی پھر خاموشی سے آکر مولوی صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ جب آگ پھیلی تو مینڈکوں نے چھلانگ لگانا شروع کردیا۔ ایسی ہی شرارتوں کے درمیان وہ عمر کی منزلیں طے کرتا رہا پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آگیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے اس نے 1930 میں اکنامکس میں ایم اے کیا۔ عملی زندگی کا آغاز ماہنامہ شاہکار لاہور سے کیا۔ اس نے مدیر کی حیثیت سے اس پرچے کو خوب سنبھالا پھر اس نے کمشنر ملتان کے دفتر میں ملازمت کرلی۔ یہ دور اس کی زندگی کا تلخ ترین دور تھا۔ بالآخر اس نے نوکری سے استعفا دیا اور آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہوگیا۔ اسی دوران دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی اور وہ ریڈیو سے محکمۂ فوج کے شعبۂ نشر و اشاعت میں چلا گیا۔ فوج کے ساتھ مختلف ممالک میں متعین رہا۔ قاہرہ، تہران اور سری لنکا میں بحیثیت کیپٹن ڈیوٹی دی۔ 1952 میں اسے وائس آف امریکا کے لیے مستعار لے لیا گیا۔ وہیں نیویارک میں اس کا انتقال ہوا۔ اسے ہم جدید اردو نظم کا ناخدا ن۔م راشد کے نام سے پہچانتے ہیں جبکہ اس کا اصل نام نذر محمد تھا۔

●●

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی لاہور سے لکھتے ہیں "معراج رسول صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح انسانیت کے دکھ میں مبتلا ہیں۔ اس مرتبہ دشمنانِ اسلام کی ریشہ دوانیاں اور امتِ مسلمہ کی بے حسی پر وہ نوحہ کناں تھے۔ کاش خدا ہمارے گناہوں اور غلطیوں کو معاف کردے تاکہ انتشار کا شکار امتِ مسلمہ یکجا ہوکر دشمنوں کے خلاف صف آرا ہوسکے۔ تمام تر نامساعد حالات کے باوجود معذوری معذوری نہیں رہتی اگر لگن جستجو اور امید کا دامن تھام لیا جائے۔ بے بصارتی نے بھی معذوری کو شکست دے کر پوری دنیا میں وہ عظیم انسان نمایاں کیے ہیں جن کے کارہائے نمایاں ہم آنکھوں والوں کے لیے بھی مشعلِ راہ بن گئے ہیں۔ بے بصارت لوگوں کے کارناموں کو یکجا کرکے اس ماہ آپ نے دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ دنیا بھر کی بے بصارتی ایک ہی نشست میں پڑھ کر ہماری بصارت اور بصیرت دونوں اس آزمائش میں مبتلا ہوگئی ہیں کہ کس کس کی تعریف کی جائے۔ ہماری نیم دانشوری اگر مصر جا کر نابینا طٰہٰ حسین کو داد و تحسین دینے کا سوچتی ہے تو پاکستان کے شیخ محمد اقبال شکوہ کرنے لگتے ہیں کہ آپ اگر دیدہ ور ہیں تو پہلے مجھے خراجِ تحسین پیش کریں کیونکہ میرے اور ان کے کارناموں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی صف میں پاکستان کے نسیم احمد کی زندگی بھی مشعلِ راہ ہے۔ عراق کے بشار اگر باغی شاعر ہیں تو خلیفہ وقت کا کردار متنازعہ کیونکہ قدرت نے تاریخ کے اوراق میں بشار کو ہمیشہ کے لیے امر کردیا ہے۔ اس تحریر پر جب ہم سر دھننے سے فارغ ہوئے تو ہمارے سامنے پسِ پردہ گلوکاری کے بانی مغنی ہند کرشن چندر ڈے اور فرانس کے لوئی بریل آکھڑے ہوئے جن کا کہنا تھا کہ وہ بھی ان کی طرح نابیناؤں کی تحریر شناسی کے موجد ہیں ہم نے اپنی خبط ہوتی ہوئی عقل کے مطابق دونوں کو داد دی تو امریکی ایرک وین میئر کو دیکھ کر رہی سہی عقل بھک سے اڑگئی جب انہیں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرتے دیکھا۔ اس حوصلہ مند جوان کی ابھی پیٹھ تھپکی ہی تھی کہ جوڈو کے انتھونی کلارک نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا کہ میرا ملک آسٹریلیا بھی میری وجہ سے چیمپئن بنا ہے۔ ان کی داستان سن کر ہمیں سو فیصد اتفاق ہوا ہی تھا کہ ہمارے کانوں میں پاکستان کے ڈاکٹر ممتاز عمر کی سرگوشی سنائی دی کہ زیادہ مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں نے بھی بصارت سے بصیرت تک کا سفر طے کرنے میں بہت سی کٹھنائیوں کا سامنا کیا ہے۔ ان کی عزم و ہمت کے سحر میں جکڑے جانے لگے تو بنگال کے احمد حسن مسافر ہوں یارو، کا راگ الاپتے ہوئے اپنی لندن یاترا سنانے بیٹھ گئے۔ سچ پوچھیے تو ہمیں مشکل راگ بالکل سمجھ نہیں آتے لیکن دوسروں کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی صرف اس لیے تالیاں بجائیں کہ کوئی ہمیں موسیقی سے نا آشنا نہ سمجھ بیٹھے جیسے بلغاریہ کی بابا وینگا کو ان کے اپنے ہی انہیں عظیم پیش گو کی بجائے جاسوس سمجھ بیٹھے۔ ویسے جاسوسہ کا لفظ ہمارے لیے بہت دلکشی رکھتا ہے کیونکہ ہم جاسوسی ڈائجسٹ کے بھی مستقل قاری ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم جاسوسہ کی دلکشی میں کھو جاتے فلسطین سے مجاہدِ اعظم شیخ احمد اسماعیل نے اچانک وارد ہوکر ہمیں بے نقط سنانا شروع کردیں کہ عورتوں میں مگن ہوجانے والے تمہاری طرح کے لوگ صرف ان کی شان میں قصیدے ہی لکھ سکتے ہیں۔ مجھے دیکھو میں بصارت سے عاری ہونے کے باوجود امتِ مسلمہ کے دشمنوں پر لرزہ طاری کردیتا ہوں لیکن میرے اندھے پن سے زیادہ امتِ مسلمہ اندھی ہوچکی ہے جسے فلسطین کے مسلمانوں کی آہ و بکا سنائی نہیں دے رہی۔ ہم نے کہا کہ انہیں تو کشمیر، بوسنیا، چیچنیا اور برما کے مسلمانوں پر بھی ہونے والے مظالم دکھائی نہیں دے رہے تو انہوں معراج رسول صاحب کی طرح بڑے دکھ سے فرمایا کہ پھر بھی ہم جیسے بڑے لوگ، پیدا ہوتے رہیں گے اور امتِ مسلمہ کے حکمران دشمنوں کے مصنوعی دیدہ زیب سراب کے پیچھے بھاگتے رہیں گے۔ ان سے فارغ ہوتے ہی بقایا چھ بیانیوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ویسی ہی اداکاری شروع کردی جیسی فلمی الف لیلیٰ میں اندھوں کا کردار ادا کرنے والے اداکاروں نے کی ہم چونکہ اب تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوکر تھک چکے تھے اور شہرِ خیال میں جا کر دوستوں سے ہیلو ہائے کرنا چاہتے تھے لہٰذا فالتو سانس کو تازہ دم کرنے کے لیے پرائی خوشبو کو استعمال کیا اور بے بصارتی کو نعمت سمجھنے والے کے خیالات جان کر یقین ہوگیا کہ جلد باز اور محدود بین کبھی بڑا آدمی نہیں بن سکتے۔ اس ماہ کی عظیم الشان تحریروں سے نبرد آزما ہونا اور ان پر تبصرہ کرنا ایک بڑے آدمی کا ہی کام ہے اور خود کو اس منصب کے لائق سمجھتے ہوئے جب ہم شہرِ خیال میں داخل ہوئے تو خود کی بجائے محمد عمران جونانی کو مسندِ

صدارت پر دیکھ کر پہلے تو سرگزشت کی انتظامیہ کی بے بصارتی پر افسوس ہوا لیکن جب عمران صاحب کا تبصرہ پڑھا تو ہم انتظامیہ کی بصارت کے ساتھ ساتھ ان کی بصیرت کے بھی قائل ہوگئے کہ کیوں ہمارا تبصرہ رد کردیا گیا۔ عمران صاحب کو شاندار خراجِ تحسین ہماری طرف سے، اور حمیرا کریم صاحبہ کی خدمت میں عرض ہے کہ جب آپ کو کوئی شعر پسند آئے تو اس محفل میں ہمارا شعر تلاش کرلیا کریں آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ تنویر اقبال صاحب شہرِ خیال میں خط ہی چھپ جائے تو بڑی بات ہے آپ افسانوی باتیں نہ کیا کریں۔ روبینہ نفیس صاحبہ آپ کی ہم نام ہماری اہلیہ نے بھی نواز شریف صاحب کو ووٹ دیا ہے اور اب آپ ہی کی طرح مہنگائی اور اپنے بجٹ کے موازنے پر شرمندگی کا شکار بھی ہیں۔ محمد اجمل اور آصف ضیاء آپ کی تحریریں بھی ضرور چھپ جائیں گی۔ عبدالحمید جانی ادا کارشیام ہی نہیں گزشتہ تئیس سال کے شماروں میں وہ کچھ چھپ چکا ہے جس کا تصور بھی کسی ایک میگزین میں ممکن نہیں ہے۔ ہمارے پاس مکمل ریکارڈ موجود ہے۔ سدرہ بانو قلم انڈسٹری کی تباہی میں وہی لوگ شامل ہیں جو اس سرسبز درخت کی شاخوں کو خود ہی کاٹتے رہے ہیں۔ افتخار احمد کمسن ہمارا کوئی حکمران غیروں کے آگے کشکول اٹھائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ چوہدری مدثر حسین اس ماہ آپ کی طرح ہمارا بھی پروگرام جامع اور مکمل تبصرہ لکھنے کا ہے۔ احسان سحر آپ کے تبصرے یاسیت کی رات کے بعد سحر کے اجالوں کی نوید دیتے ہیں بالکل معراج رسول صاحب کی طرح۔ معراج الدین صاحب آپ قائد اعظمؒ کی نادر اشیا کا رونا رو رہے ہیں یہاں تو ہم نے ان کے افکار کو ہی بھلا دیا ہے۔ چودہ اگست کی رات کو سڑکوں پر ہونے والی ہڑبونگ مچاتی ہوئی ہماری نوجوان نسل ہمارے مستقبل کی نشاندہی کرتی نظر آتی ہے۔ (ہوائی فائرنگ سے صرف کراچی میں ایک ہلاک 50 زخمی ہوئے تھے) رانا محمد سجاد آپ بھی ہماری طرح دکھی ہیں کہ خالد حسن چیمہ، ہمایوں دین خان پوری، محمد یونس بلوچ جرمنی، شہباز ندیم جونیجو اور بشریٰ افضل کہاں غائب ہوگئیں۔ انجم فاروقی اگر لکھنے کا شوق ہے تو لوازمات ضرور پورے کیا کریں شاید آپ کی کوئی اچھی تحریر سے ہم محظوظ ہوسکیں۔ رانا محمد شاہد آپ بھی کتابوں سے محبت کرنے والوں میں شامل ہیں۔ اعجاز حسین صاحب تعلیم کے بارے میں آپ کے خیالات قابلِ قدر ہیں۔ شاہد جہانگیر شاہد صاحب آپ کا خدشہ درست ہے کہ ہم ہر طرف سے اپنے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور جو ہمارے دوست ہیں ان کے لیے ہم ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ہماری یہ شناخت ہمارے لیڈران کی وجہ سے ہے جنہیں کبھی ہم خود منتخب کرتے ہیں اور وہ کبھی کبھی خود کو ہی منتخب کرکے ہم پہ مسلط ہوجاتے ہیں۔ پارچہ اپنی مثال آپ تھے سب دوستوں کو مبارکباد خاص کر محمد ایاز راہی کو اس تاریخی دستاویز کا حصہ بننے پر ہم بھی بن جاتے اگر پاکستان کی بلائنڈ کرکٹ ٹیم پر اپنی معلومات کو بروقت روانہ کردیتے۔ کاش اتنے خاص نمبر میں ہماری عالمی چیمپئن ٹیم کو بھی اس کا حصہ بنا دیا جاتا۔ (اس کمی کا غم ہمیں بھی ہے)"

☆ ڈاکٹر آر ایم ای نے ریاض سعودیہ عرب سے لکھا ہے "سرگزشت کے معتبر لکھاریوں نے علمی محفل کو قابلِ ستائش انداز میں آباد کر رکھا ہے۔ آپ نے کمالِ فیاضی سے میری آرا کو اعزازی توجہ کے قابل بنایا اس کے لیے ممنون ہوں۔ قارئین نے اپنی گراں قدر آرا سے نوازا اور ہمت افزائی بھی فرمائی جوان کے علمی ذوق کی دلیل ہے۔ گزشتہ تحریر کی بقیہ جز کی کاٹ یا حذف نے صورت تحریر کے خد و خال کو کچھ مبہم سا بنا دیا۔ (ہم اس بات پر عمل کرتے ہیں کہ بحث طول نہ پکڑے) ایک صاحب نے دلیپ کمار کے بیان کی نسبت سے بڑے جوشیلے اور غضبناک اسلوب میں دلیپ کمار کی وکالت کرتے ہوئے منصف اعلیٰ کی حیثیت میں سخت اور تلخ فیصلے بھی صادر فرما دیئے۔ اگر وہ تحریر صبر و سکون کے ساتھ پڑھ لیتے تو غلط نتائج اخذ نہ کرتے۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ پھر پڑھیں اور بتائیں کہ غلط بیانی کہاں تھی۔ بہرکیف دلیپ کمار صاحب کی فنکارانہ مہارت کا میں معترف اور مداح تھا شاید ان سے بھی زیادہ۔ اللہ یوسف صاحب کو شفائے کلی عطا فرمائے (آمین) بیماری اور صحت حیاتِ ارضی کا مقسوم حصہ ہیں۔ توبہ و اصلاح کی اپنی اہمیت لیکن حقوق اللہ اور حقوق الناس کی اپنی حیثیت۔ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم پر عظیم احسان کیا اس کے حقوق کی حرمت اور تحفظ کو نہ صرف مامون بنایا بلکہ فضیلت کی سند بھی عطا کی۔ بدقسمتی سے ہم اس فضیلت سے لاعلم ہیں۔ دلیپ کمار کا ایک منفرد اور خاص مقام رہا ہے۔ سونا (Gold) میں کھوٹ آجائے تو پھر بھی سونا ہی کہلاتا ہے لیکن کھوٹ مدحت پسندی سے ختم تو نہیں ہوجاتی۔ اہلِ نظر اور اہلِ قدر کھوٹ کے عنصر کو جانچتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یوسف صاحب نے نسیم بانو اور دیگر اعزا کی سفارشات پر سائرہ بانو سے دینی اور ملی غیرت کے جذبے سے شادی کی تھی جو کہ راجندر کمار سے بہت قریب ہوگئی تھیں۔ جہاں تک یوسف صاحب کی نجی اور ذاتی زندگی میں نقب زنی اور مداخلت کا الزام ہے تو کتنے فلمی لوگ ہیں جن کی ذاتی زندگی گھریلو چہار دیواری تک محدود ہوتی ہے لیکن یوسف صاحب کی بات صرف کوٹھوں تک ہی نہیں تھی بلکہ اس قصے کی بازگشت شمع دہلی اور دیگر کئی رسائل کی معرفت گلی کوچوں قصبوں، شہروں اور متعدد ممالک میں اس کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اسما صدیقی کا قصہ منفرد اور عام قسم کا نہیں تھا۔ اسما شادی شدہ اور دو تین بچوں کی ماں تھیں اور خوشگوار و معزز زندگی گزار رہی تھیں وہ دلیپ کمار کی فلمی مداح تھیں۔ دو چند ملاقات میں شادی کے عہد و پیمان ہوئے۔ حلفیہ قسم پر کہ اسما طلاق لے کر واپس آئیں گی اور پھر مروجہ نظام کے مطابق شادی انجام پائے گی۔ چنانچہ یوسف صاحب کی حلفیہ تصدیق کے ایما اور اساس پر وہ جنونی انداز میں حیدرآباد (دکن) تا پہنچیں ان کا میکے کا خاندان جو کافی بڑا اور معزز سمجھا جاتا تھا اور یہی حالت سسرال کی بھی تھی دونوں خاندانوں کے افراد اور خاوند و بچوں کے لیے زندگی کا انوکھا اور عظیم شاک تھا۔ سائرہ بانو، نسیم بانو نے طوفان برپا کردیا حتیٰ کہ یوسف صاحب سے اسما سے تعلقات کی نفی کا حلفیہ بیان بھی دلوا دیا۔ چنانچہ اسما کو عارضی قیام گاہ چھوڑنا پڑی، گویا کہیں کی بھی نہ رہیں۔ اس عبرتناک اور دردناک المیے کے متاثرین میں تعین کرنا بے حد مشکل امر ہے کہ کون زیادہ متاثر ہوا ہے۔ 1۔ اسما صدیقی۔ 2۔ اس کے بچے۔ 3۔ اس کا خاوند اور گھر۔ 4۔ میکے کے افراد۔ 5۔ اس کا سسرال۔ بہرکیف میں اس واقعہ کی نوعیت سے بہت دکھی ہوا اور دلیپ کمار صاحب کی فنکارانہ پسندیدگی کے باوجود اپنے تحفظات کا برملا اظہار کیا۔ دلیپ کمار بلاشبہ ہندو پاکستان کی مسلم کمیونٹی میں خاص مقام رکھتے ہیں لیکن جب وہ ممبئی کے آنریری میٹروپولیٹن میئر بنے تھے تو مسلم اکثریتی اور نادار علاقے میں کوئی اسپتال یا یونیورسٹی وغیرہ بنوا دیتے تو اس کے ان گنت ثمرات ہوتے۔ (فون پر لکھائی گئی سطریں: بینا نابینا نمبر پڑھا، بہت پسند آیا، ہر تحریر اپنی جگہ بہت درست اور اعلیٰ معیار کی ہے۔ حفاظت سے رکھے جانے والا شمارہ ہے)"

☆ اعجاز حسین سحار نور پور تھل سے لکھتے ہیں "اداریہ واقعی فکر انگیز ہے ہم ابھی گرے نہیں ہیں، لڑکھڑا رہے ہیں ہمیں مضبوط سہارے کے

ساتھ ہمت و حوصلے کی ضرورت ہے جیسا کہ آپ نے صرف ایک شعر میں علاج تجویز کردیا ہے لیکن احساسِ ذمہ داری کہاں سے لائیں کہ مسئلہ ہی حل ہوجائے اگر خوابوں کی حقیقی زندگی میں تعبیریں مل سکتی ہیں تو ہماری آنکھیں بھی کبھی معجزہ دیکھ ہی لیں گی بھلا یہاں کیا کچھ ممکن نہیں ہے۔ خطوط کی محفل بھی کافی گرم ہے بلکہ عروج پر ہے۔ پچھلے ماہ ہمارا خط شامل نہ ہوسکا تھا اس لیے ہمیں کسی نے یاد نہیں کیا۔ دیدہ ور، کے شیخ محمد اقبال ہمارے قریبی علاقوں میں رہے تب خوشاب تحصیل تھی جسے 82ء میں ضلع کا درجہ مل گیا۔ ہم اس معاملے میں بدقسمت رہے کہ شیخ صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ہماری بیٹی ثنائلہ حسین سرگودھا یونیورسٹی میں پڑھتی رہی ہیں ان سے معلومات لیں۔ ہمیں ایسے باہمت ہنرمند پر فخر ہے۔ ''مشعلِ راہ'' پڑھا تو ہمیں نیلام گھر کا سارا منظر یاد آگیا۔ ہم تمام اعضاء سلامت پانے کے باوجود ناشکرے پن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ الحمدللہ کی بجائے زبان سے ہائے مرگئے یا اس عذاب سے موت بہتر ہے جیسے فقرے کہتے رہتے ہیں۔ کتنے فخر کی بات ہے کہ کچھ باہمت جوانوں نے کیسے کیسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے دنیا کو حیران کردیا اور ملک کا نام روشن کیا۔ ''فلمی الف لیلیٰ'' میں آفاقی بھائی نے پرانی یادیں تازہ کی ہیں خاص طور پر فلم ''بندگی'' کا خلاصہ مزہ دے گیا۔ سچ بیانیوں میں اولین تحریر ''اندھیرے اجالے'' سندھی ماحول کی آئینہ دار ہے۔ ''محدود بین'' میں عدنان کو بھی غلط فہمی ہوئی وہ حق بجانب تھے صورتِ حال ہی ایسی تھی لیکن ایسے سخت الفاظ سن کر وجاہت کو جیسا صدمہ پہنچا ہوگا اس کی اذیت وہ خود جانتا ہے پھر اسے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جس کا اس نے واویلا کرنے، گڑگڑانے اور معذوری کو بنیاد بنا کر ہمدردی سمیٹنے کی بجائے ہمت سے سامنا کیا جس نے اس کی محرومیوں کا ازالہ کرکے کھویا ہوا باعزت مقام لوٹا دیا۔...

''جلد باز'' میں مجھے آخر تک یقین نہیں آیا کہ مینا کو فون کرنے والا ظہیر نہیں تھا لیکن مونا کو ایسے قائل کیا گیا کہ ماننے کے سوا چارہ نہ تھا بہرحال جیسے بھی واقعات تھے غلط فہمی دور ہوئی کہ دو بچھڑے مل گئے۔ اس کے علاوہ پرائی خوشبو، بڑا آدمی، نعمت بے بصارتی، اور فالتو سانس اپنے وقت اور حالات کے ساتھ دلچسپ ہیں۔ کُل ملا کر یہ ایک بہت اعلیٰ شمارہ ثابت ہوا ہے۔''

☆ عامر شہزاد کی دوسیرو ضلع جھنگ سے آمد ''پہلی بار سرگزشت میں خط لکھ رہا ہوں امید ہے شائع کرکے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ سرگزشت کی معلوماتی تحریریں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ سچ بیانیاں کافی سبق آموز ہوتی ہیں۔ بینا نابینا نمبر پڑھ کر یہ سبق ملا کہ نابینا افراد اتنا کچھ کرسکتے ہیں تو ہم بینا افراد اتنا کچھ کیوں نہیں کرسکتے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آزادی نمبر بھی نکالیں تاکہ سب کو معلوم ہو کہ یہ ملک پاکستان ہمارے آباؤ اجداد نے کتنی مشکل سے حاصل کیا تھا۔ امید ہے آپ میری اس گزارش کو قبول فرمائیں گے۔ (آپ کی فرمائش نوٹ کرلی ہے)''

☆ رانا محمد شاہد، بورے والا سے لکھتے ہیں ''اداریے میں معراج رسول صاحب نے عالم اسلام کے حوالے سے اسرائیل کے مکروہ کردار کو اجاگر کیا۔ لیکن اگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو عالم اسلام کا اپنا کردار اخوت و یکجہتی کے حوالے سے انتہائی شرمناک ہے۔ مسلمانوں کے آج کے المیے اور زوال کی وجہ کو سید جمال الدین افغانی نے برسوں پہلے بتا دیا تھا کہ ''مسلمانوں نے اس بات پر اتفاق کرلیا ہے کہ انہوں نے اتفاق سے نہیں رہنا۔'' جہاں تک اسرائیل کا کردار ہے تو اس حوالے سے مصری صدر جمال عبدالناصر نے بڑے کمال کی بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ''اسرائیل کو صرف دو چیزیں مفتوحہ علاقے واپس کرنے پر مجبور کرسکتی ہیں، امریکا کا دباؤ یا عالم عرب کی مشترکہ قوت'' جہاں تک جمال عبدالناصر کی پہلی بات کا تعلق ہے تو یہ حقیقت برسوں سے ہمارے سامنے ہے کہ اسرائیل وہ بچہ ہے جس کی پرورش امریکا کررہا ہے۔ اب وہ بچہ کیونکر اپنے پالنے والے کے خلاف کام کرے گا اور امریکا کیوں اپنے پالتو پر دباؤ ڈالے گا کہ جب اس کی اپنی نظر عرب ریاستوں کے قدرتی وسائل پر ہے۔ یک تحقیقی سرگزشت میں مصر کے ایک بڑے دانشور طٰحہٰ حسین نے نابینا ہوتے کے باوجود ایسے کارنامے سرانجام دیئے، جو قابلِ ستائش ہیں۔ شہرِ خیال میں محمد عمران جونانی کا تبصرہ اچھا تھا۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ ہم آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ نفیس لوگوں کا مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ پازیٹو سوچا کریں اور تبصرہ تھوڑا تفصیل سے کیا کریں اور کسی کہانی کے ساتھ بھی نظر آئیں نا۔ سدرہ بانو نا گوری، آپ نے جس کتاب کا ذکر کیا، اسے خریدنا پڑے گا۔ ویسے سکون تو صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے خالق یعنی اللہ تعالیٰ سے ناامید نہیں ہوتے۔ اسی لیے مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔ اعجاز حسین سحّار، اب سینما گھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو کیبل، کمپیوٹر کی شکل میں گھر گھر سینما گھر بن چکا ہے۔ سینما گھر میں آپ ایک موی دیکھتے ہو، کیبل کے درجنوں چینلز پر بیک وقت موویز چل رہی ہوتی ہیں۔ شاہد جہانگیر، شادی کی مبارکباد کا شکریہ۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے پاکستان کے ایک سپوت، شیخ محمد اقبال کے قابلِ فخر کارناموں سے آگاہ کیا ایک نابینا شخص نے درجن سے زائد کتابیں لکھیں اور اتنے زیادہ اعزازات دیکھ کر تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہمیں بھی اپنے ایسے ہیروز کی قدر کرنی چاہیے اور زندگی میں ہی کرنی چاہیے جنہوں نے ایک اہم ترین نعمت کی محرومی کے باوجود قابلِ فخر زندگی گزاری۔ مشعلِ راہ میں حافظ نسیم الدین جیسے ذہین شخص کے بارے میں ابن کبیر اپنے خوبصورت انداز میں معلومات دے رہے تھے۔ کراچی کے اس فرد نے آنکھوں کی روشنی نہ ہونے کے باوجود دنیا کو مشعلِ راہ بن کر دکھایا۔ آصف ملک کی تحریر باغی شاعر بھی بھرپور دلچسپی لیے ہوئے تھی۔ ہمارے کالج کے انگلش کے ایک پروفیسر تھے۔ وہ بھی نابینا تھے، انہوں نے نابینا ہونے کے باوجود نہ صرف اپنے شاگردوں کو بام عروج تک پہنچایا، پھر شاعری بھی کی، ان کی شاعری کی کتاب بھی ''چشم بینا'' کے نام سے شائع ہوئی۔ ٹی وی کے متعدد پروگرامز میں بھی شریک ہوئے۔ مختصر یہ کہ ایک چھوٹے سے شہر میں رہ کر ان کے کارنامے ہمارے لیے قابلِ فخر ہیں کہ ہم نے بھی ان سے چند لیکچرز لیے ہوئے ہیں۔ ظفر یوسفی کی حوصلہ مند حقیقی معنوں میں ہمت، جذبے، جوش و ولولے سے بھرپور ناقابلِ یقین داستان تھی کہ ایک نابینا شخص نے دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرلی۔ مہم جوئی کی تاریخ میں یہ کارنامہ یقیناً سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ نابیناؤں کے محسن لوئی بریل کے بارے میں سنا تو تھا مگر ان کے حالاتِ زندگی سے شکیل صدیقی نے آگاہ کردیا۔ عارفہ کریم عثمانی نے بڑے لوگوں کے مختصر مختصر حالاتِ زندگی بیان کرکے معلومات میں اضافہ کیا۔ سرورق کی کہانی ''اندھیرے اجالے'' منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپی سے بھی بھرپور تھی۔ باقی لکھنے والوں کی تحریریں عید کی مصروفیت میں مہمانوں سے ملنے، ملانے کی وجہ سے ابھی پڑھی نہیں ہیں لیکن شمارہ بہت اعلیٰ ہے۔''

☆ غلام عباس جتوئی کی محمد پور دیوان سے خیال آفرینی ''ماہ اگست کا شمارہ ''بینا نابینا نمبر'' ہاتھ میں ہے اس بار پرچہ تین اگست کو مل گیا گویا

معلومات کا خزانہ مل گیا۔ مشعلِ راہ پڑھی تو بڑا مزہ آیا پھر ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر ''دیدہ ور پڑھی'' زبردست تحریر تھی بصارت سے بصیرت بھی اچھی تحریر تھی۔ بس کیا کہوں اس بار اتنا کچھ سیکھنے کو ملا کہ میں بیان بھی نہیں کرسکتا۔ مجھے چودہ سال ہوگئے ہیں سرگزشت پڑھتے پڑھتے اور اس سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور ہر ماہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ شہرِ خیال میں پہلی بار کچھ کاوشیں لے کر حاضر ہوا ہوں امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ میری طرف سے تمام رائٹروں دوستوں کو سلام۔''

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا خلوص نامہ پشاور سے ''طویل انتظار کے بعد آخر ماہنامہ سرگزشت کا ''بینا نابینا نمبر'' منظرِ عام پر آہی گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج تک جتنے بھی خصوصی نمبر نظر سے گزرے ہیں ''بینا نابینا نمبر'' ان سب سے زیادہ خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ سرورق سے لے کر آخری صفحے تک حسن و خوبصورتی کا ایک جہاں آباد ہے۔ میری جانب سے ماہنامہ سرگزشت کی پوری ٹیم کو بے حد مبارکباد۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے دیدہ ور، کے عنوان سے ایک ایسی شخصیت سے متعارف کروایا ہے جو کہ حضرت علامہ اقبالؒ کے درج ذیل شعر کی زندگی تفسیر ہیں۔ ''ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔'' حصولِ علم کی خاطر وہ کیسے کیسے خارزاروں سے گزرے۔ کیسی کیسی مخالفتوں کا سامنا کیا مگر نابینا ہونے کے باوجود ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ آنکھوں کی معذوری کو تحصیلِ علم اور پھر اسے دوسروں تک منتقل کرنے میں کبھی رکاوٹ بننے نہیں دیا۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آج بھی ہمارے درمیان ایک ایسے زندہ لیجنڈ (Living Legend) موجود ہیں جنہوں نے خود روشنی سے محروم ہوتے ہوئے بھی دوسروں تک علم کی روشنی پہنچانے کو اپنا مشن بنائے رکھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں طویل اور صحت مند زندگی عطا فرمائے تاکہ تشنگانِ علم اس فیض کے چشمہ سے تادیر سیراب ہوتے رہیں۔ (آمین) حکومت پاکستان کو بھی چاہیے کہ اپنے اس قابلِ فخر فرزند کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی زندگی میں ہی پاکستان کے سب سے بڑے سول اعزاز سے نوازے۔ ابن کبیر صاحب نے مشعلِ راہ لکھ کر ماضی کی یادوں کو تازہ کردیا جب نسیم نامی ایک نابینا نوجوان نے PTV کے مقبول پروگرام میں بینا افراد کو شکست دے کر سارا اسٹیج لوٹ لیا۔ مشہور ایرانی الاصل عربی شاعر ''بشار بن برد'' کا زندگی نامہ آصف ملک نے پورے تاریخی پس منظر اور حوالوں کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ یہ ایک تحقیقی کام تھا اور ملک صاحب نے تحقیق کا حق ادا کردیا۔ نابینا ہوتے ہوئے اپنے عہد میں ابھرنے والی مختلف اور نئی نئی اختراعات کے سامنے سینہ سپر ہوگئے اور حق و انصاف کی خاطر حکومتِ وقت سے بھی ٹکرا گئے اور اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی اور ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ انجام وہی ہوا جو کہ حق و انصاف کی خاطر لڑنے والے اور حکومت کے ہر باغی کا ہوتا ہے۔ مسافر ہوں یارو، بنگلہ زبان کے مشہور نابینا گلوکار، گلوکار و موسیقار احمد حسن کا سفرنامہ لندن بے حد پسند آیا۔ اپنے سفرنامے میں احمد حسن کہیں بھی بینائی سے محرومی کی وجہ سے کسی احساسِ کمتری کا شکار نظر نہیں آئے۔ ان کی تحریر میں ابن انشا اور ابراہیم جلیس کی طرح زندہ دلی اور طنز و مزاح کے تیر و نشتر نے سفرنامے کو کئی نئے رنگ دیئے ہیں۔ زین مہدی نے ترجمہ کو اصل سے قریب تر تحریر کرکے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ عارفہ کریم عثمانی صاحبہ نے چھوٹے چھوٹے خاکوں کے ذریعے بہت بڑے بڑے لوگوں کی سوانح کو ''سمندر کو کوزے'' کی مثال کے مطابق خوبصورت انداز میں بڑے لوگ کے عنوان سے قلمبند کیا ہے۔ کس کس مضمون کا تذکرہ کیا جائے ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے اور اس تبصرے میں سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ پارچے بھی بے حد خوبصورت اور معلوماتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بینا نابینا نمبر کو جلد کرکے اپنی ذاتی لائبریری کی زینت بنانا چاہیے تو غلط نہ ہوگا۔ شہرِ خیال میں سب سے پہلے میں ایم افضل کھرل صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جنہوں نے میرے جون کے مہینے کے تبصرے پر اتنا شاندار تبصرہ کیا یعنی صندل کے درخت اور کلہاڑی میں سرایت کرجانے والی خوشبو سے تشبیہ دی۔ کھرل صاحب یہ آپ کا حسنِ ظن ہے آپ کی اپنی نظر کی خوبصورتی ہے جو آپ ایسا سمجھتے ہیں ورنہ تو ''من آنم کہ من دانم'' والا معاملہ ہے میرے ساتھ۔ بہرحال بے حد شکریہ۔ محمد عمران جونانی صاحب کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ ان کا طویل تبصرہ بھی خوبصورت تھا۔ اور یہ بات سچ ہے کہ دلیپ کمار صاحب ہم پاکستانیوں کے دلوں میں بستے ہیں۔ باقی رہی سائرہ بانو تو میں ہمیشہ سے دوسروں کے ماضی میں جھانکنے کی عادت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ آج کے دور میں کون یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی برا وقت نہیں آیا۔ ہمیں ہر انسان کے حال پر نظر رکھنی چاہیے۔ آج جب الزائمر اور ضعیفی کے باعث لاحق ہونے والی دیگر بیماریوں کے باعث دلیپ کمار صاحب فراش زندگی گزار رہے ہیں اور وہ گھر جہاں ہر وقت بہنوں اور بھائیوں اور ان کی اولادوں کے قہقہے گونجا کرتے تھے آج سائرہ بانو کے علاوہ دلیپ صاحب کی خدمت کے لیے کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ شخص جو کبھی آنکھ کی ایک جنبش سے سیکڑوں مطالب ادا کردیا کرتا تھا آج ہر طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ تو دکھ اور زمانے کی ناقدری کا احساس ہوتا ہے۔ کیا کوئی اداکار دل پر ہاتھ رکھ کر یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس نے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر دلیپ کمار کی کاپی نہ کی ہو۔ آج جب وہ تنہا اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا ہے تو سائرہ بانو اس کی دیکھ بھال ایک معصوم بچے کی طرح کررہی ہیں۔ جبکہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی حالت میں تو بہت بڑی بڑی خاندانی بیویاں بھی شوہروں کو بے یار و مددگار مرنے کے لیے چھوڑ جاتی ہیں۔ دوستو انسانوں کی زندگی کے اچھے پہلوؤں کا ذکر کرتے رہنا چاہیے چاہے اس کا ماضی کچھ بھی رہا ہو اور یہی ہمیں ہمارا مذہب سکھاتا ہے۔ احسان سحر صاحب بھی ایک خوبصورت تبصرے کے ساتھ آئے ہیں۔ معراج دین خان آپ نے درست فرمایا کہ دل سے نکلی ہوئی دعا یقیناً اس تک پہنچ جاتی ہے جس کے لئے وہ مانگی گئی ہو۔ ویسے اگر آپ قبرستان کے قریب کسی سے بھی پوچھ لیتے کہ اداکار گل حمید کی قبر کہاں ہے تو وہ آپ کو وہاں پہنچا دیتا.... پہلی مرتبہ جب میں گیا تھا تو ایک گدڑیے نے ان کی قبر تک میری رہنمائی کی تھی۔ رانا محمد شاہد، رانا محمد سجاد صاحبان اور سدرہ بانو ناگوری کے تبصرے بھی پسند آئے۔ آخر میں اپنے عزیز دوست محترم شوکت رحمان خٹک صاحب (جن کے دلچسپ خطوط فلمی الف لیلیٰ میں شائع ہوتے رہے ہیں) آج کل بے حد بیمار ہیں۔ شوگر کی بیماری کے باعث وہ اپنی دونوں ٹانگوں سے معذور ہوگئے ہیں۔ ان کے چاہنے والوں کے لیے یقیناً یہ بات باعثِ تشویش ہوگی کہ ان کے دونوں پاؤں کاٹ دیئے گئے ہیں۔ میں ان کی عیادت کے لیے جاتا رہتا ہوں۔ قارئین سرگزشت اور شہرِ خیال کے دوستوں سے گزارش ہے کہ خٹک صاحب کی صحتیابی کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے (آمین)''

☆ پروفیسر محمد بلال ملک تلہ گنگ، ضلع چکوال سے رقمطراز ہیں۔ ''لیکن خط پر درج تاریخ کے مطابق 3 جولائی میں ارسال کیا گیا تھا جو اب

پہنچا" میں اپنی نوعمری میں سرگزشت کا باقاعدہ قاری رہا۔ 1998ء کے بعد سے یہ سلسلہ منقطع تھا۔ گزشتہ دنوں جولائی کا شمارہ پڑھا۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر صاحب کے بارے میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے خوب لکھا۔ سارا شمارہ ہی قابلِ تحسین ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!"

☆بشریٰ افضل بہاولپور سے لکھتی ہیں "ٹائٹل اپنے موضوع کے حساب سے بالکل فٹ تھا اپنی محفل کی طرف دوڑ لگائی محمد عمران کا تبصرہ پڑھا قابلِ ستائش او واقعی اس کرسی کے حقدار تھے ہماری طرف سے مبارک ہو۔ روبینہ نفیس، نصیب دشمناں کون سی پریشانیاں لے کر بیٹھی ہیں؟ اللہ سے اچھی امید رکھیں وہ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ مرد دھوکا دے کر بھی نہیں مانتے۔ اکثر مرد تو شادی بھی غلط بیانی سے کرتے ہیں یعنی دھوکے سے شادی کرتے ہیں اور ان کے گھر والے ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ شاہد اور رانا سجاد کو شادی مبارک ہو۔ ہاں اگر ان کی بیگمات محفل میں آنے کا ٹائم دیں گی تو آئیں گے نا! اریفہ بخاری واپس آجایئے جن لوگوں نے آپ کو یاد رکھا، ان کا شکریہ۔ سچ بیانیاں کی طرف آرہی ہوں۔ جو میں نے لاسٹ کہانی سے شروع کیا "جلد باز" میں نصیحت کا پہلو نمایاں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ظہیر نام بدل کر شاہد کے نام سے بیٹا کو تنگ کرتا ہو اور شادی اس کی دوست سے کرلی۔ "فالتو سانس" خدا نے ان لوگوں میں عام لوگوں سے زیادہ احساسات عطا کیے ہیں۔ "بڑا آدمی" حیرت ہے کہ ایسے بھی مرد ہوتے ہیں جو اعلیٰ ظرفی کا نمونہ بن جاتے ہیں ورنہ ہمارے معاشرے میں مرد کی ذہنی سطح بیوی کے بجائے فرینڈ زیادہ پسند کرنے والوں کو جینے نہیں دیتی۔ اسلم کی اعلیٰ ظرفی کی داد دینی چاہیے۔ "پرائی خوشبو" ایک ہی نشست میں اختتام کی "اندھیرے اجالے" میں رانی نے بہت عقلمندی کا ثبوت دیا۔ شوہر سے چھپایا کہ کبھی کبھار نظر آتا ہے ورنہ اس کا سودا کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کرتا۔ رانی نے بڑی ہمت دکھائی۔ "محمود وبین" اس کہانی نے تو ہمیں رلا دیا۔"

☆فضل رؤف مروت کا خلوص نامہ تحر خیل کی مروت سے "3 ماہ کی غیر حاضری کے بعد شہرِ خیال میں پھر وارد ہو رہا ہوں۔ امید ہے کہ خوش آمدید کہیں گے۔ جناب ایڈیٹر صاحب تعلیم کسی بھی ملک اور قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ مسلمانوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں 7 ویں صدی سے 12 ویں صدی تک مسلمانوں نے تعلیم کی بدولت ہر جگہ راج کیا۔ الہیثم، البیرونی، جابر بن حیان، نصیر الدین طوسی، ابن بسطیار، اور الرشد جیسے جینئس نے اس دور میں اپنا لوہا منوایا۔ لیکن مسلمانوں نے اس کے بعد جب عیش و عشرت کا لبادہ اوڑھا تو علمیت مغرب کی طرف چلی گئی۔ اور ابھی تک مسلمان عظمتِ رفتہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ مغرب نے تعلیم اور ہنر کو یکجا کیا۔ اور اس سے اس زوال پذیر معاشرے میں جیسے روح پڑ گئی۔"

☆رانا محمد سجاد نے مظفر گڑھ سے لکھا ہے "بینا نابینا نمبر ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ شمارے کے اندر داخل ہوتے ہی سراب کے پیچھے بھاگے۔ اس کے بعد شہرِ خیال میں آئے محمد عمران جونانی سرفہرست تھے۔ تبصرہ دلچسپ اور جامع تھا۔ شہرِ خیال کی ایک اور دیرینہ قاری "حمیرا کریم" بھی آئیں۔ بھئی آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ اور یہ اداسی والی باتیں کیوں؟ ڈاکٹر روبینہ نفیس تاقب ووٹ دینے کو غلط کہہ رہی تھیں۔ بس تھوڑا حوصلہ رکھیے انشاء اللہ بہتر ہو جائے گا یہ مسئلہ بھی۔ عبدالحمید آپ بھی چمکدار ستاروں میں سے ہیں سدرہ بانو ناگوری اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ افتخار احمد کھمن کا تبصرہ پسند آیا۔ چوہدری مدثر حسین پھر کب انٹری دے رہے ہیں شمارے میں۔ احسان سحر کا تبصرہ خوبصورتی لیے ہوئے تھا۔ معراج الدین صاحب درست فرمایا وہ جملے پورے پاکستانیوں کے دلوں پر ہوئے ہیں۔ انجم صاحب آپ نے جھلک نہیں دکھائی کافی عرصے سے۔ رانا محمد شاہد صاحب آپ کی بات نے تو دل کو چھو لیا۔ واقعی ہم سب کچھ بدل لیتے ہیں لیکن اپنا رویہ نہیں بدلتے۔ جو سوال آپ نے اٹھایا اس کا جواب تو ادارے نے دے دیا ہے۔ اعجاز حسین سحار جامع تبصرے کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوئے جتنی محبت سے تبصرہ کرتے ہیں اور جس عرق ریزی سے مطالعہ کرتے ہیں وہ ایک مثال ہے۔ شاہد جہانگیر بس خلوصِ دل سے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ ارضِ پاک بھی امن و ترقی کی بہاروں سے آشنا ہو آمین!"

☆فقیر غلام حسین نے بھکر سے لکھا ہے "جولائی کے شمارے میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر مرحوم کا سوانح خاکہ پڑھنے کو ملا۔ مرحوم کی ایک نظم "میرے رونے کو برا مانتی ہو" کے کچھ شعر تجزیہ نگار نے لکھے ہیں اور نظم مجھے بھی بہت مدت تک یاد رہی۔ اب عمر کے آخری اسٹیج پر بہت کچھ بھول چکا ہوں پھر بھی اتنا ضرور عرض ہے کہ زندگی گریۂ پیہم ہی تو رہی۔" کا اگلا شعر "مسکراتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا" کی بجائے "کھل کھلاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جایئے۔" عظیم صاحب نے کراچی سے ادائیگی کے عنوان سے حلالہ کا جو واقعہ تحریر کیا ہے اپنی کزن سے اپنی سابقہ محبت کی تشنگی کو مٹانے کا جو موقع اسے ملا ہے اسے پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ یہ کسی کنجر خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔"

☆سدرہ بانو ناگوری کا خط کراچی سے "بینا نابینا نمبر ہماری امیدوں سے بڑھ کر دلچسپ ثابت ہوا۔ ہماری طرف سے اتنا اچھا شمارہ شائع کرنے پر مبارکباد قبول کیجیے اور ان عظیم لوگوں کو سلام کہ جنہوں نے اپنی کمزوری کو پسِ پشت ڈال کر تاریخ کے صفحات پر روشن مثالوں کی داستانیں رقم کردیں "شہرِ خیال" کی محفل میں "عمران جونانی" کا تبصرہ سرفہرست رہا دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی پسند آئے سعید احمد چاند، ایم اے خالق بھٹی اور طاہر الدین بیگ غیر حاضر رہے، خیریت تو ہے؟ "مشعلِ راہ" ابن کبیر نے شہر کراچی کی ایک عظیم شخصیت سے متعارف کروایا جس کی کامیابیوں کی فہرست اتنی طویل کہ آنکھوں والوں کی عقل بھی دنگ رہ جائے اس سے پہلے ہمیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس گوہرِ نایاب نے ہماری اپنی دھرتی پر جنم لیا ہے۔ عارفہ کریم نے بڑے لوگوں کے مختصر مختصر کارنامے بیان کیے مختصر ہی سہی مگر ان بڑے لوگوں نے ثابت کردیا کہ "ناممکن کچھ بھی نہیں بلکہ ممکن ہی سب کچھ ہے۔ باحوصلہ شخصیت، ڈاکٹر ممتاز عمر نے بصارت سے بصیرت کا سفر دلچسپ انداز میں شیئر کیا گو کہ ان کے راستے کٹھن اور دشوار ضرور تھے مگر منزل ایسی شاندار کہ جس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ سراب اس دفعہ سنسنی خیز واقعات سے بھرپور رہی۔ پرانی فلموں کے تذکرے اور ماضی کی یادگار تصاویر سے سجی "فلمی الف لیلہ" میں آفاقی انکل کی یادداشتوں کو پڑھ کر مزہ آگیا۔ اندھیرے اجالے، پہلی سچ بیانی نئے انداز کی تحریر ثابت ہوئی رانی نے حالات کا جس طرح مقابلہ کیا وہ واقعی قابلِ تحسین ہے "فالتو سانس" آفتاب احمد نے چار دلچسپ نابینا کرداروں کی سرگزشت سنا کر حیران کردیا منظر امام کی تحریر نعمت بے بصارتی،

حافظ ذاکر کے کردار نے متاثر کیا باقی تمام تحریریں لاجواب رہیں۔"

☆محمد عمران خان ڈیلی نامدار، بھکر سے لکھتے ہیں "کافی انتظار کے بعد سرگزشت کا بینا نابینا نمبر ملا۔ بینا نابینا نمبر شائع کرنے پر سرگزشت کی پوری ٹیم کو مبارک باد دیتا ہوں، موجودہ دور کے تمام ڈائجسٹوں میں سرگزشت منفرد اور معلوماتی ڈائجسٹ ہے۔ یہ نمبر پڑھ کر حیرت ہوئی کہ نابینا افراد نے کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیے۔ وہ بینائی کی دولت سے تو محروم تھے لیکن عزم و ہمت کی دولت سے مالا مال تھے۔ بلند حوصلے میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ تحریروں میں سب سے پہلے سچ بیانیوں کو پڑھا کیونکہ سرگزشت کی سچ بیانیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ جس کہانی نے بہت متاثر کیا وہ تھی بڑا آدمی، شرجیل نے محبت میں بہت بڑی قربانی دی۔ محبت کو سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ اور اسلم صاحب نے بھی شرجیل کی قبر کے بارے میں کیا خوبصورت الفاظ کہے کہ "یہ قبر نہیں بلکہ یہ محبت کا تاج محل ہے۔" باقی سچ بیانیاں بھی اچھی تھیں۔ دیدہ ور شیخ اقبال کی زندگی کی کہانی پڑھی تو حیرت ہوئی کہ کیسے ایک شخص نے ہمت کر کے معاشرے میں اپنا ایک مقام بنایا۔ مشعلِ راہ بھی اچھی کہانی تھی تاہم جب ان کہانیوں میں ان کے مخالفین اور حاسدوں کے بارے میں پڑھا تو حیران رہ گیا کہ لوگوں نے ان کو بھی نہ بخشا شاید یہ منافقت تھی اور ان حاسدوں کو ان کی کامیابی پسند نہ آئی دوسرے نمبر پر جس کہانی نے متاثر کیا وہ ظفر یوسف کی حوصلہ مندی تھی ایرک نے ہمت و حوصلہ کی عظیم مثال قائم کی۔ اس نے اپنی ہمت اور حوصلہ سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ایرک نے اپنی ہمت سے بینائی کو شکست دی۔ احسان سحر (میانوالی) اور معراج الدین کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ رانا محمد سجاد (مظفر گڑھ) رانا محمد شاہد (بورے والا) اعجاز حسین سحار (نور پور تھل) اور شاہد جہانگیر شاہد ان چاروں دوستوں کو اچھا تبصرہ لکھنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

☆عرصہ دراز بعد عبدالرؤف عدم کی راولپنڈی سے تشریف آوری "اک عرصہ بعد شہرِ خیال میں داخل ہو رہے ہیں تو بے شمار یادیں بھی ہمارے ساتھ ہی اس شہرِ بے مثال کے در پر دستک دے رہی ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ہم بلا جھجک اور کثرت سے اپنے اس شہر میں آیا کرتے تھے خوب محفلیں جما کرتی تھیں۔ ثمینہ شاہد بہنا اور ہم مل کر شوخیاں بکھیرا کرتے، پھر اسی شہر میں ثمینہ بہنا کی اچانک موت کی خبر سن کر قلم بھی عرصہ تک اداس رہا، اسی شہر میں شہباز ندیم جو نجو کے ساتھ ہماری "تاریخ ساز" جھڑپ ہوئی اس شہر کے ایک کونے میں جرمنی والے یونس بلوچ محبت کے رنگ بکھیرتے، تو دوسری طرف 80 سالہ 'جوان' عبدالوحید خان اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ موجود ہوتے، خالد حسن چیمہ مرحوم اپنے منفرد رنگ کے ساتھ محفل کو چار چاند لگایا کرتے۔ ہمایوں دین پوری کا محنت سے بھرپور سالانہ جائزہ محفل کی جان ہوا کرتا۔ روبینہ نفیس انصاری (جواب ڈاکٹر بن گئی ہیں) عورتوں کے حقوق کی جنگ بھرپور انداز میں لڑا کرتی تھیں اور اس جنگ میں ہم ان کی خوب حمایت کرتے۔ کیا خوب رونق ہوا کرتی تھی۔ خیر رونق تو اب بھی یقیناً ہوگی لیکن ہم طویل عدم موجودگی کے باعث خود رونق افروز نہیں ہو سکے، اب اک عرصہ بعد عدم سے موجودگی کا سفر طے کر رہے ہیں۔ اس عرصہ میں شہرِ خیال میں حاضری نہ دے سکے لیکن سرگزشت سے ہمارا ناتا کبھی نہیں ٹوٹا، یہ ہر ماہ باقاعدگی سے ہمارے گھر کی رونق بنتا ہے۔ بینا نابینا نمبر پڑھا تو دل بے اختیار مچل اٹھا کہ تبصرہ لکھ کر داد دی جائے۔ شیخ محمد اقبال کے حالاتِ زندگی پر مبنی تحریر دیدہ ور، پڑھ کر دل جھوم اٹھا۔ ایک ایسا نابینا جو بیناؤں کے لیے بھی مشعلِ راہ ہو، ایسے نابینا پر تو بے شمار بینائیاں نچھاور کی جاسکتی ہیں۔ مشعلِ راہ میں حافظ نسیم الدین کے کارنامے جان کر دل ان کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ بینائی بھی ایسے نابینا لوگوں کو سلام کرتی ہوگی۔ پہلی دونوں تحریروں کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ شیخ محمد اقبال اور حافظ نسیم الدین دونوں ماشاء اللہ بقیدِ حیات ہیں اور دونوں کو بلاشبہ Living Legends کہا جاسکتا ہے۔ مرجانے والوں کے کارنامے تو ہر کوئی بیان کرتا ہے مگر زندہ لوگوں کی قدر کرتے ہوئے ان کی عظمت اور کامیابیاں دنیا کے سامنے آشکار کرنا بہت اعلیٰ کام ہے جس پر آپ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ عرب شاعر بشار ابن برد کی لازوال تخیلاتی قوت نے بے پناہ متاثر کیا۔ آفاقی انکل نے اپنے مخصوص پُراثر انداز میں "نابینا فلموں" کا ذکر کر کے خوبصورت سماں باندھ دیا۔ نابینا کوہ پیما کی جرأت و ہمت نے حیران کر دیا۔ بابا ونگا اوسط درجے کی تحریر ہے مجاہدِ اعظم ایک زبردست انسان کی داستان ہے۔ شمارے میں شامل ہر نابینا شخص کی داستان اور ان کے کارنامے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ سچ بیانیوں میں اندھیرے اجالے، بہت پراثر تحریر ہے۔ رانی کی ہمت و جرأت کو بھرپور سلام جبکہ جنید جیسے شخص پر جی بھر کے لعنت۔ "پرائی خوشبو" میں ریحانہ کے سونگھنے کی حس نے حیران کر دیا۔ بڑا آدمی بہت لاجواب تحریر ہے۔ بہت پسند آئی۔ شرجیل کا کردار بہت ہی اچھا لگا۔ منظر امام کی نعمت بے بصارتی، پڑھ کر عجیب سا احساس ہوا، یہ کیسا معاشرہ ہے کہ یہاں ایک شخص صرف اس لیے نابینا رہنا چاہتا ہے کہ اس طرح اس کے بچوں کو اچھے کپڑے اور اچھی خوراک مل سکے گی۔ شہرِ خیال میں ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب یعنی روبینہ نفیس انصاری صاحبہ کو موجود پا کر دل خوش ہوا۔ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ اچھا لگا۔ احسان سحر، رانا محمد سجاد اور رانا محمد شاہد بھی بھرپور تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ شاہد جہانگیر شاہد کا تبصرہ، تبصرہ کم اور سیاسی مضمون زیادہ دکھائی دیا۔ اب اجازت درکار ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔"

☆احمد خان توحیدی کراچی سے رقمطراز ہیں "طویل انتظار کے بعد 29 جولائی کو بینا نابینا نمبر ملا۔ رمضان شریف کی برکتیں رخصت اور آمدِ عید سب کو مبارک۔ ادر معراج رسول صاحب، مسلمانوں کی نااتفاقی نے دہشت گردی کو جنم دیا ہے۔ دشمنوں کو کشمیر و فلسطین نظر نہیں آتا۔ بغل بچہ اسرائیل کی ٹیکنالوجی پر پابندی نہیں ہے۔ ازلی دشمن ہر طرف ڈیم بنا کر ہمیں بھوکا پیاسا مارنے کے لیے بے تاب ہے اور ہم کالا باغ ڈیم پر لڑ رہے ہیں۔ بارش و سیلاب تو ساری دنیا میں آتے ہیں مگر وہ پانی کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ جدید ٹیکنالوجی سے دہشت گرد پولیس کے وائرلیس وصول کر کے خود پولیس والے بن کر سب ٹھیک ہے آرام کریں جواب دے کر جیل توڑ لیتے ہیں۔ نابینا طٰحہ حسین ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی حس عطا فرمائی۔ محفل شہرِ خیال میں عمران جونانی کو کرسی صدارت مبارک۔ سدرہ ناگوری، رانا سجاد، مظفر گڑھ، افتخار کھمن، معراج الدین پشاور، احسان سحر میانوالی، اعجاز سحار، رانا شاہد بورے والا، شاہد جہانگیر پشاور آپ کے تبصرے بیوٹی فل تھے مگر بہت طویل بھی تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد دیدہ ور لاجواب کہانی لائے۔ آفاقی صاحب بھی نابینا رول ادا کرنے والے فنکاروں کی کہانیاں لائے۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک۔ سچ بیانیاں میں حسینہ ٹائٹل رانی کے روپ میں۔ اندھیرے اجالے، جنید جیسا بے غیرت اپنی عزت خود پامال کر رہا ہے۔ رحمان شاہ نے رانی کی شادی اسد شاہ سے کر کے بہت اچھا کیا۔ محمود وبین وجاہت کا چشمہ نہ اتارنا،

عدنان وغیرہ کا غلط فہمی کا شکار ہونا۔ عدنان نے اپنی غلطی کا ازالہ کر کے بہت اچھا کیا۔ اب وجاہت کو چشمہ لگانا چاہیے۔ نعمت بے بصارتی، حافظ ذاکر کو بینائی مل سکتی ہے مگر معذوری کو کمائی کا ذریعہ بنالیا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ہے۔ یہ بالکل پسند نہ آئی باقی سب کہانیاں بہت اچھی اور شمارہ لاجواب نمبر ہے۔ میری طرح سب ساتھی جلد بنوا کر اور بینا و نابینا نمبر اگست 2013 لکھ کر محفوظ کرلیں۔"

☆ اختر صبا نے بنوں سے لکھا ہے "سرگزشت کے باسیو" میں نے رمضان کے مبارک مہینے میں جہاں اپنے لیے دعائیں مانگی، وہاں ہم سرگزشت اور اس کے تمام باسیوں کے لیے بھی دعا گو تھے۔ (جزاک اللہ) میرے محبوب کی طرح سرگزشت بھی اک عجیب سا مزاج رکھتا ہے۔ اگست 2011 میں پراسراریت نمبر، اگست 2012 میں عشق ناکام نمبر اور اگست 2013 میں بینا نابینا نمبر" میرے خیال میں۔ اگست 2014 میں شخصیات بدنام نمبر ہونا چاہیے۔ شہر خیال کے تمام باسیوں کو سلام بینا نابینا نمبر پورا کا پورا دو دن میں پڑھا ماسوائے سراب کے لیکن یقین مانیں مجھے زندگی میں پہلی بار کسی کتاب سے اتنی معلومات ملی اور وہ بھی نابینا افراد کے بارے میں حالانکہ میں آٹھ سال سے باقاعدہ لائبریری میں 5 تا 7 گھنٹے گزارتا ہوں (ماشاء اللہ) بینا نابینا نمبر پر تبصرہ کرنا مجھ جیسے کم علم انسان کے بس کی بات نہیں میں فقط اتنا کہتا ہوں کہ خدا جانے علامہ اقبال نے کس کتاب کو دیکھ کر کہا تھا کہ "ایسی کتاب جس کا اک اک لفظ غور سے پڑھنے کے لائق ہو صدیوں کے بعد وجود میں آتی ہے" آج اگر علامہ اقبال زندہ ہوتے تو قسم صبا میں اقبال سے ضرور کہتا کہ آپ کے اور میرے عہد میں بھی اک ایسی کتاب "سرگزشت" ہے جس کا اک اک لفظ غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ میں سرگزشت کے لیے اور کیا کہوں سوائے اس کے کہ "خدا تجھے ہجر یار سے آشنا نہ کرے۔ آمین!"

☆ عمران جونانی نے کراچی سے لکھا ہے "بالآخر خاص نمبر کا انتظار ختم ہوا۔ "بینا نابینا" نمبر ہمارے ہاتھ میں ہے۔ لیکن یہ کیا ایک مرتبہ پھر رمضان المبارک میں خاص نمبر...... چلیں جی اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ معراج بھائی! آج اسرائیل اپنی تمام تر بدمعاشیوں کی وہی توجیہات بیان کررہا ہے جو اس کے سیاسی جد امجد امریکا نے جاپان پر ایٹم بم گرانے سے پہلے اور بعد میں پیش کی تھیں۔ عالم اسلام آج مشکلات کا شکار ہے بیرونی طاقتیں باقاعدہ اتحاد کر کے پیچھے لگی ہیں لیکن ہمارے اپنے لوگ بھی کسی نہ کسی وجہ سے دانستہ نادانستہ ان کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ عرب شہزادوں کی عیاشیاں اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اللہ پاک نے دنیاوی اعتبار سے خوب نوازا ہے لیکن اسی رفتار سے اڑایا جارہا ہے۔ کیا یہ سب باتیں بربادی کی طرف نہیں جاتیں؟ یک جنی سرگزشت میں مصری دانشور طٰہٰ حسین کے بارے میں پڑھ کر اندازہ ہوگیا کہ خاص نمبر واقعی خاص ہوگا قرآن پاک حفظ کرنا جامعہ میں خالص میرٹ کی بنیاد پر داخلہ اور پھر ترقی در ترقی۔ کم ہی لوگ اس مختصر زندگی میں ایسا عروج پاتے ہیں علم بڑھتا ہے تو لغزش کے مواقع بڑھ جاتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر حامد کی زندگی بھی متنازع ٹھہری۔ شکیل صدیقی صاحب کا لوئی بریل کے بارے میں لکھا گیا مضمون بندے کی ناقص رائے میں ترتیبی اعتبار سے اول نمبر پر ہونا چاہیے تھا۔ جتنے بھی نابینا مشاہیر کا تذکرہ پڑھا ان میں سے اکثر نے اسی بریل سسٹم سے استفادہ کیا۔ پیدائشی نابینا ہونا بھی کوئی چھوٹی معذوری نہیں لیکن 7/8 سال دنیا کی رنگینیاں دیکھ کر نابینا ہونے والے شیخ محمد اقبال نے تو زندگی کا رخ ہی موڑ دیا ممکن ہے ان کی آنکھیں نہ جاتیں تو وہ تعلیم کو اس طرح چیلنج کے طور پر نہ لیتے۔ عرصہ دراز کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کے قلم سے کسی ایسے انسان کا تذکرہ پڑھنے کو ملا جو ابھی بقید حیات ہیں۔ اللہ ہر دو صاحبان کی عمر میں برکت عطا فرمائے آمین۔ دلچسپ معلومات سے بھرپور وحید ریاض بھٹی کا مضمون "مغنی بند" خاص نمبر کا تحفہ ثابت ہوا۔ کیا دور تھا وہ جب ایک فلم میں 60 سے لے کر 100 تک گانے ہوا کرتے تھے، سہولتوں اور ٹیکنالوجی کے فقدان کے باوجود کیسے کیسے فنکار پیدا ہوئے جس کی ایک مثال کرشنا چندر ڈے ہیں جو نابینا ہونے کے باوجود کامیابی سے اداکاری کرتے رہے۔ شہر خیال میں نووارد ہوں کرسی صدارت اس قدر جلد ملے گی اس کی توقع بالکل نہیں تھی۔ حوصلہ افزائی بندہ نوازی ہے آپ کی۔ حمیرا کریم! وعلیکم السلام سچ کہتی ہیں آپ بات انعام کے لالچ کی نہیں یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں زندگی کا انمول سرمایہ ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ کا خط کافی مختصر مگر خلوص سے بھرا ہوا تھا۔ سر کے بال کالے ہونے کی آپ نے خوب کہی میری طرف سے بھی سب کو رمضان کی برکتیں عید کی خوشیاں مبارک۔ اجمل خان صاحب امریکا سے اپنی صاف ستھری اردو کے ساتھ تشریف لائے، آپ کے تراشوں کا انتظار رہے گا۔ بھائی عبدالمجید جانی آپ نے جن ساتھیوں کا ذکر کیا وہ واقعی شہر خیال کا بھرم ہیں لیکن ان میں سے کچھ کی غیر حاضری بڑھتی جارہی ہے۔ ایسا نہ کریں دوستو! سدرہ بانو صاحبہ کا بے ساختہ تبصرہ پسند آیا آپ کا انداز اور کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال خوب ہے۔ اگر خدا مشکل راستے دیتا ہے تو ان پر چلنے کے لیے مضبوط جوتے ضرور فراہم کرتا ہے۔ اس جملے نے دل پر اثر کیا۔ مدثر حسین صاحب کے تفصیلی تبصرہ کا انتظار رہے گا۔ احسان سحر! خود تو ملک کی مشکلات اور ان کے حل پر دیر تک سیر حاصل گفتگو کی اور ساتھیوں سے شکایت کہ سب ملکی حالات کا رونا روتے ہیں۔"

☆ قیصر عباس خان کی آمد بھکر سے "شہر خیال کے باسیو آپ سب کو میری طرف سے عید مبارک ہو۔ سرگزشت ایک اچھا ادبی پرچہ ہے شروع کب کیا یاد نہیں عنایت حسین چشتی کی کہانی بہت شوق سے پڑھتا تھا پھر سارا رسالہ پڑھنے لگا۔ اور ایک دن شہر خیال میں ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری بھکر کا تبصرہ پڑھا میں بھی ضلع بھکر سے ہوں۔ ڈاکٹر صاحبہ کا تکون کا بھوت پڑھا کافی متاثر ہوا۔ پھر شہر خیال پڑھنا شروع کیا۔ ایک بار بھکر کے دوسرے آدمی عمران خان نے شرکت کی اچھا لگا اور بینا نابینا نمبر اگست 2013 میں شہر خیال میں ڈاکٹر صاحبہ کے تبصرہ کے اوپر تنویر اقبال تنویر... دریا خان بھکر کا تبصرہ پڑھا۔ شہر خیال میں کبھی نہ لکھتا لیکن پراسراریت نمبر اگست 2011ء عشق ناکام نمبر، اگست 2012ء اور بینا نابینا نمبر اگست 2013ء نے مجبور کیا۔ پہلی دفعہ کسی رسالہ میں خط یا رائے پیش کی ہے۔ پہلے صرف دوست رشتہ داروں کو خط لکھتا تھا۔ بینا نابینا میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی دیدہ وری تحریر کافی قابل دید ہے۔ شیخ صاحب کافی محنت لگن والے شخص ہیں۔ اس کے علاوہ بڑا آدمی سچ بیتی بہت اچھی لگی۔ اسلم، شرجیل اور سارہ تینوں بہت بڑے ظرف کے لوگ تھے۔ اس کے علاوہ پچھلے پرچے میں اونچی والی سچ بیتی کہ مرد کی انا کو جب ٹھیس پہنچے اور موقع ملے مرد پھر بدلہ ضرور لیتا ہے۔ شہر خیال میں سب کے سب بہت اچھا لکھتے ہیں اور رسالہ کافی اچھا ہے۔ خیبر پختونخواہ کے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان جیل پر حملہ ہماری خودمختاری پر حملہ ہے میرا گھر جیل سے 36 کلومیٹر صوبہ پنجاب میں ہے اور میرے رشتے دار وہاں رہتے ہیں کافی دھماکے اور گولیوں نے خوف و ہراس پھیلا دیا جیل سے قیدیوں کا فرار لمحہ فکریہ ہے جو

قیدی قتل کے کیسوں میں عمر قید یا سزائے موت کاٹ رہے تھے اب وہ آزاد ہیں اور خطرہ ان مدعیوں کے لیے ہے جن کے وہ پہلے دشمن تھے اب نکلنے کے بعد زیادہ دشمنی ہوگی۔"

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری بھکر سے لکھتی ہیں "بینا نابینا نمبر ملا عید سے قبل عید کی خوشیاں مل گئیں، شہر خیال میں ایم عمران جونانی نے سچ کہا کہ شادی کے بعد عورت کہیں کی نہیں رہتی۔ اس کی اپنی پسند ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ سدرہ بانو تانا گوری، واقعی اللہ پاک سے مانگنا اور جھکنا چاہیے۔ مگر کسی سے دل کی بات کرلینا کوئی غلط نہیں ہے۔ انسان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ رانا محمد شاہد دل تو بہت کرتا ہے کہ آپ لوگوں سے بہت سی باتیں کروں تاکہ دل کو سکون ملے مگر ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ ان باتوں کو غلط لیتے ہیں۔ کیا سے کیا افسانہ بنا دیتے ہیں۔ بس اسی لیے چپ رہتی ہوں کہ یہاں دکھ بانٹنے والے کم دکھوں پر ہنسنے والے زیادہ ہیں۔ چاند صاحب نظر نہیں آئے، کہانیوں میں پرائی خوشبو پڑھی یہ تو حقیقت ہے کہ عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے چاہے وہ بینا ہو یا نابینا۔ نعمت بے بصارتی پڑھ کر دکھ ہوا کہ لوگ بے روزگاری کو کس کس طرح سے استعمال کررہے ہیں۔ چاہے وہ طریقہ جائز ہو یا ناجائز۔ جن لوگوں کو بیٹھ کر کھانے کی عادت ہو جائے وہ بھلا محنت کیوں کریں گے۔ باقی باتیں بعد میں۔ میری اور ثاقب کی طرف سے سب کو عید مبارک۔"

☆ پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال، سرگودھا سے رقمطراز ہیں "ماہنامہ سرگزشت کے "بینا نابینا نمبر" کی اشاعت پر ڈھیروں مبارکباد! آپ نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جو کسی حکومتی ادارے یا کسی NGO کو سرانجام دینا چاہیے تھا لیکن سرکاری اداروں اور این جی اوز کے لئے قلم کا دھنی ہونا بھی تو ضروری ہے۔ ہاں آپ کی طرح وہ یہ کام مشاہیر زمانہ ادیبوں اور قلمکاروں سے کرواسکتے تھے لیکن یہ اعزاز تو آپ کو حاصل ہونا تھا سو ہوگیا۔ آپ کے قلمکاروں نے کمال کردیا آپ نے جس عرق ریزی سے اور بے پناہ انسانی محبت کے جذبے کے تحت یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے یہ نابیناؤں کی تاریخ میں کسی دستاویز سے کم نہیں ہوگا۔ یقیناً بینائی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن ہمتیں تو اللہ کی دین ہوتی ہیں لیکن ہمت صرف بینائی ہی کو نہ کہا جائے بلکہ ان کی کئی اقسام ہوتی ہیں؟ کتنے انداز اور کتنے طریقے ہوتے ہیں ہم اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلائیں گے جو ایک نعمت چھین لیتا ہے تو اس کی جگہ اتنی ہمت بھی عطا کردیتا ہے کہ اس نعمت سے محروم شخص ہزاروں نعمتیں اپنی قوت بازو سے حاصل کرلیتا ہے۔ یہ قوت بازو یقیناً خدا کی دین ہے لیکن اس کے لئے قوت ارادی مستقل مزاجی اور منزل کی لگن ہونا ناگزیر ہے آپ نے ہر شعبہ سے نابینائی کے چراغ روشن کئے ہیں آپ نے ثابت کیا ہے کہ یہ وہ نابینا ہیں جو بیناؤں سے بھی زیادہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی ایسا شعر ہوگیا تھا وہ نذر قارئین ہے۔

ترے وجود کی نس نس سے آنکھ جھانکے گی
اگر ہے ذوق تماشا نظر کی بات نہ کر

ذوق تماشا ہو تو ہر شے کا تماشا کیا جاسکتا ہے ہر شے سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے قوت لامسہ آنکھیں تراش لیتی ہے قوت ذائقہ کتنی لذتیں فراہم کردیتی ہے کہ بصارت کا دھیان ہی نہیں رہتا۔ آپ نے جس محبت سے میری زندگی کو نذر قارئین کیا ہے اس کے لئے میں آپ کا اور ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ ڈاکٹر موصوف نے کمال ہی کردیا مجھے یوں لگا کہ انہوں نے مجھے کئی آنکھیں عطا کردی ہیں اتنی آنکھیں جو میں پورے معاشرے میں تقسیم کرسکتا ہوں۔ جانے کس کس نابصر کو بصارت دے سکتا ہوں۔

☆ ایاز راہی، مانسہرہ سے لکھتے ہیں "مدیر سرگزشت کے زرخیز ذہن رسا نے تمام ماہ ناموں میں ماہ نامہ سرگزشت کو عجب انفرادیت عطا کی کہ ایک انوکھا نمبر نکالا اور آنکھ والوں کی مزید آنکھیں کھول دیں۔ موجودہ شمارہ سرو چراغاں کی مانند جگمگا تا لگا۔ وہ باہمت لوگ جو دل کی روشنی سے مالا مال تھے اور اب بھی ہیں جہد مسلسل سے گھور اندھیروں کو شرمندہ اور روسیاہ کر گئے اور سب کے لئے مثال بن گئے۔ ایسی جرات مند شخصیات جو آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں یقیناً قابل تقلید ہستیاں ہیں۔ مگر بے حس معاشرہ ہے کہ ہم انہیں نظر انداز کررہا ہے اسی لئے تو کوئی دل جلا چیخ اٹھا تھا۔ اور نہیں تو حکومت کم از کم دکھاوے کے لئے ہی سہی ان ہستیوں کے ڈاک ٹکٹ ہی جاری کردے بہرحال مدیر سرگزشت و ادارہ دعا کے مستحق ہیں کہ ان نادر روزگار سپوتوں کے کارنامے گلدستے کی صورت یکجا کردیئے۔ سرگزشت کا یہ شمارہ یقیناً کتب خانے کا مستقل حصہ رہے گا۔ عرب شاعر بشار ابن برد نے سقراط کی سی جرأت اپنائی اور امر ہوگیا۔ حافظ نسیم کے ٹی وی پروگرام ماضی میں دیکھتا رہا ہوں۔ وہ بلاشبہ نیلام گھر کے فاتح تھے مگر آج تک اسی سرکاری بے حسی کا شکار ہیں اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبال بھی اسی لپیٹ میں ہیں۔ یورپ نے اپنے سپوتوں کی بہرکیف قدر کی جب کہ یہاں۔ "ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ" اس بار فلمی الف لیلہ میں فلم ایلاسے کے گانے فلم "پیار ہی پیار" کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے۔ ایک اور کمی جو محسوس ہوئی وہ یہ کہ صحابی رسول ﷺ عبداللہ بن ام مکتوم جو نابینا تھے ان کا ذکر کہیں بھی نہیں تھا حالانکہ قرآن پاک ۳۰ ویں پارے کی تیسری سورہ عبس (۴۲ آیتیں ایک رکوع) کی شان نزول یہی صحابی عبداللہ ابن ام مکتوم ہیں۔ نیز نابینا نامحرم سے بھی خواتین کو پردے کا حکم انہی صحابی کی وجہ سے ہوا۔ تفصیل کے لئے قرآن پاک کی تفسیر اور احادیث مبارکہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ سرگزشت کے موجودہ ۴۰۰ صفحات تحقیق و راہنمائی کا باعث بنے رہیں گے اور یہ سب مدیر سرگزشت کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ ہے۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

طاہرہ گلزار، پشاور۔ شاہد بخاری، لاہور۔ انیس احمد، ساہیوال۔ ندیم شاہ، خان پور۔ دلشاد خان، ہنگو۔ نادر شاہ، حیدرآباد۔ فصاحت چنگیزی، کاظم علی کاظمی، کوئٹہ۔ نگار بانو، توفیق احمد، باقی شاہ، ارشد علی، کراچی۔ اقبال حسن، خان پور مہر۔ نیاز احسن، علی پور چٹھہ۔ فصیح بخاری، فیصل آباد۔ ناصر حسن، ملتان۔ ناظمہ فاطمہ، دینہ جہلم۔

ایک تھا راجا

ڈاکٹر ساجد امجد

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

یہ ایک شعر نہیں تلخ حقیقت ہے کہ کاروانِ آزادی کے وہ اہم لوگ جن کی کوششوں سے ہم نے منزل پائی انہیں ہی آج ہم بھولے ہوئے ہیں۔ ایسی ہی ایک اہم شخصیت راجا صاحب محمود آباد کی تھی۔ وہ راجا تھے مگر فقیر منشی ان میں حد درجہ تھی۔ انہوں نے پاکستان کے لیے کیا کیا نہیں کیا، اپنی ریاست کا پورا خزانہ مسلم لیگ کی تحریک کو کامیاب کرنے کے لیے خالی کردیا۔ جب خزانہ خالی ہوگیا تو گاؤں کے گاؤں بیچ دیئے تاکہ شایانِ شان جلسے منعقد کیے جاسکیں۔ بہار کے مسلم کش فسادات ہوں یا کلکتہ کا قتلِ عام مسلمان ہر جگہ وہ ایک بہادر سپاہی کی طرح موجود رہتے۔ وہ قائداعظم کے سب سے قریبی ساتھی تھے مگر جب پاکستان بنا اور وہ اپنی وسیع جاگیر کو لات مار کر پاکستان آئے تو یہاں کا عجب منظر تھا۔ حرص وہوس کا دور دورہ دیکھا تو انتہائی مایوس ہوکر عراق کوچ کرگئے۔ گورنر جنرل اسکندر مرزا نے انہیں پاکستان میں جاگیر دینے کی پیشکش کی تو انہوں نے حقارت سے ٹھکرادیا اور کہا کہ میں نے پاکستان کے لیے قربانی دی ہے، پاکستان سے مجھے کچھ لینا نہیں ہے۔ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے جب نوکری کرنے کا ارادہ کیا تو اہم عہدوں پر فائز افراد نوکری حاصل کرنے میں مدد دیتے ہوئے بھی خوفزدہ تھے کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ حکومتی اہلکار ان کی مدد کررہے ہیں۔ کبیرسنی میں بھی وہ مسلمانانِ عالم کی یک جہتی کی سعی میں کوشاں رہے۔ 2014 ان کی صدی کے طور پر منایا جائے گا۔

تحریکِ آزادی کے ایک اہم مجاہد کا زندگی نامہ

موتی لال نہرو ریاست محمود آباد میں مہاراجا محمد علی محمد خان آف محمود آباد کے مہمان تھے اور ان کی شاندار کوٹھی میں مقیم تھے۔ وہ اکثر یہاں آکر مقیم ہوتے تھے اس لیے مہاراجا کے دونوں صاحبزادے بھی ان سے مانوس تھے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اس روز مہاراجا کے بڑے بیٹے راجکمار امیر احمد خان نے ''کھدر'' کا نیا لباس زیب تن کیا تھا۔ اس نے جب سنا کہ انکل نہرو آئے ہوئے ہیں تو اسے شوق ہوا کہ یہ لباس وہ انہیں بھی دکھائے۔ اس لیے کہ نہرو بھی ان دنوں کھدر کا لباس پہنتے تھے۔ دس سالہ امیر احمد نے سوچا ہوگا کہ نہرو اسے اس لباس میں دیکھ کر خوش ہوں گے۔ وہ سلام کرنے ان کے پاس چلا گیا۔ وہ ابھی پہنچا ہی تھا کہ مہاراجا آگئے۔ انہوں نے امیر احمد کو دیکھا پھر اس کے لباس کی طرف نظر ڈالی۔ آنکھوں نے ناپسندیدگی ظاہر ہورہی تھی۔ وہ مہمان کی موجودگی میں کچھ کہہ تو نہ سکے لیکن آنکھوں کا غصہ چھپا نہ سکے جیسے کہہ رہے ہوں، تمہیں تمیز نہیں ہے۔ نہرو کے سامنے کس لباس میں آگئے۔ تم شہزادے ہو ویلش بھگت نہیں۔

امیر احمد باپ کی نظروں کو پہچانتا تھا۔ جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ نہرو نے بھی صورتِ حال کا اندازہ لگالیا تھا۔ انہوں نے بات بنانے کے لیے امیر احمد کو مخاطب کیا۔

''بیٹا اگر تم کو کھدر ہی پہننا ہے تو میری طرح اچھی قسم کا کھدر پہنا کرو۔''

امیر احمد خاموشی سے وہاں سے چلا آیا۔ دوسرے دن موتی لال نہرو کے ہاں سے نہایت اچھی قسم کے کھدر کے کئی تھان بطور تحفہ اس کے پاس آگئے۔

بھارتی ریاستوں کے راجکمار اور شہزادے نازوں میں پلتے تھے، نخروں میں رہتے تھے۔ پھولوں پر سوتے تھے نمود ونمائش کے پتلے بنے رہتے تھے لیکن امیر احمد خان کو اس طبقے کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے شدید نفرت تھی۔ اس کے مطمحِ نظر کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا تھا کہ اس نے اپنے کمرے میں مشہور انقلابی لیڈر بھگت سنگھ کی تصویر لگائی ہوئی تھی۔

اس کی یہ سادگی اور نمود ونمائش سے نفرت اسے اپنی والدہ کی جانب سے تحفے میں ملی تھی۔ اس کی والدہ متوسط ذرائع آمدنی رکھنے والے ایک ایسے علمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جس نے بے شمار علما پیدا کیے تھے۔ یہ خاندان نیشا پور (ایران) سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا۔ مہاراجا محمد علی محمد خان کی والدہ چاہتی تھیں کہ اپنے بیٹے کی شادی کسی

ایسی لڑکی سے کرنا چاہیے جو سیدوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی نظر زاکیہ بیگم پر جا ٹھہری۔ زاکیہ بیگم شادی کے بعد ''مہارانی'' ہو گئی تھیں۔ دولت کی ریل پیل اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ دیکھنے کے باوجود انہوں نے ان اقدار کو خیرباد نہیں کہا جو انہیں اپنے خاندان سے ورثے میں ملی تھیں۔ زاکیہ بیگم کا تعلق دین دار گھرانے سے تھا۔ علما کا خاندان تھا اس لیے مہارانی بن جانے کے بعد بھی اسلامی اصول کے مطابق زندگی گزارنے لگیں جس کا اثر پورے خاندان پر پڑا۔ راج گھرانا ہوتے ہوئے بھی سب کی زندگی سادہ گزرنے لگی۔ تھوڑا بہت تعیش تھا تو وہ مردوں تک محدود رہ گیا۔ پورا گھرانا مکمل طور پر اسلامی اصول کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔ جہاں کبھی ناچ رنگ، طوائفوں کے مجرے زندگی کا حصہ سمجھا جاتا تھا وہی گھرانا اب نماز روزہ اور دیگر ارکانِ دین کو اپنا شیوہ بنا چکا تھا۔ اس گھرانے سے پہلے بھی علما کی سرپرستی ہوتی تھی مگر اب بہت زیادہ ہونے لگی۔ مدرسہ الوعظین کے تمام اخراجات اٹھائے جانے لگے۔ تمام علما کو شہریہ کے نام پر معقول مشاہرہ دیا جانے لگا۔ غربا مساکین کی کھل کر امداد کی جانے لگی اور اتنی بڑی تبدیلی صرف ایک دیندار گھرانے کی لڑکی کے ''مہارانی'' بن جانے پر آئی تھی۔ امیر احمد خان نے ایسی ماں کی آغوش میں پرورش پائی تھی لہٰذا جاگیردارانہ معاشرے کے ٹھاٹ باٹ سے وہ کبھی مانوس نہ ہو سکا۔

اس کی زندگی کا دوسرا پہلو وہ تھا جو اسے برطانوی استعمار کے خلاف نفرت سکھاتا تھا۔ یہ نفرت بھی اس کے ماحول کا حصہ تھی۔ سروجنی نائیڈو، راجکماری امرت کور، ڈاکٹر انصاری، محمد علی جناح وغیرہ اس کے والد کے دوستوں میں تھے۔ ان حضرات وخواتین کے درمیان ہونے والی گفتگو اس کی سماعت کا حصہ بنی۔ یہ گفتگو کسی طرح بھی برطانیہ کے حق میں توصیفی نہیں تھی۔ اس نے اپنے ہندوستانی اساتذہ اور اپنی پرورش پر مامور خواتین سے جنگِ آزادی، برطانوی استبداد، خونریزی اور ہندوستانیوں کی کسمپرسی کے واقعات سنے تھے۔

ایسی صورت میں انگریزوں کے لیے اس کے دل میں کیا گنجائش رہ سکتی تھی۔ روزمرہ واقعات بھی ایسے ہوتے رہتے تھے جن سے اس کے دل میں انگریزوں کی طرف سے نفرت بڑھتی رہتی تھی۔

حکومتِ برطانیہ نے نام نہاد اصلاحات کے لیے سائمن کمیشن ہندوستان بھیجا تھا۔ ہندوستانیوں کی جانب سے اس کمیشن کی شدید مخالفت ہوئی۔ جب یہ کمیشن لکھنؤ پہنچا تو کانگریس نے احتجاج کیا۔ مہاراجا محمد علی محمد خان نے اس احتجاج میں کانگریس سے تعاون کیا۔ پولیس نے اس تعاون کے پاداش میں مہاراجا کی لکھنؤ کی کوٹھی کا گھیراؤ کر لیا اور کوٹھی میں گھس کر تلاشی لی۔ اس کوٹھی سے انہیں ایسی کوئی قابلِ اعتراض چیز نہ ملی لیکن جب پولیس راج کنور امیر احمد کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے ایک ایسی تصویر مل گئی جو اس گھرانے کو برطانوی حکومت کا غدار قرار دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ تصویر تھی بھگت سنگھ کی وہ لوگ بھگت سنگھ کی تصویر اتار کر لے گئے جو اس نے بڑے شوق سے اپنے کمرے میں لگائی تھی۔

اس واقعے کے فوراً بعد ڈپٹی کمشنر نے اس کے والد سے معذرت کی تھی لیکن راج کنور امیر احمد کے دل میں انگریزوں کی طرف سے نفرت کا جذبہ مزید بڑھ گیا۔ وہ انگریزوں کے اس ظالمانہ اقدام کو کبھی نہ بھلا سکا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ تمام رہنما مہاراجا محمد علی محمد خان کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

امیر احمد کے وطن پرستانہ جذبات زوروں پر تھے کہ اس کے کالج میں تاریخ کی کلاس کے دوران اینگلو انڈین پروفیسر نے اپنے لیکچر کے دوران آل پارٹیز کانفرنس کا حوالہ دیتے ہوئے کانفرنس کے رہنماؤں کو ''خنزیر'' کہہ دیا۔ راج کنور امیر احمد یہ لفظ سنتے ہی جوشِ جذبات سے بپھر گیا۔

''میرے والد بھی قوم پرست ہیں۔ تم نے یہ گالی میرے والد کو دی ہے۔'' وہ زور سے چیخا اور اپنی نشست سے اٹھ گیا۔ تاریخ کی ایک موٹی کتاب اس کے ڈیسک پر پڑی تھی۔ اس نے کتاب اٹھائی۔ پروفیسر کا نشانہ لیا اور وہ کتاب کھینچ کر اسے ماری۔ معلوم نہیں کتاب پروفیسر کو لگی یا نہیں۔ وہ تو کلاس سے نکل چکا تھا۔

کالج کا پرنسپل انگریز تھا لیکن اس نے اس حساس معاملے کی تحقیق کرنے کی ٹھانی۔ یوں بھی معاملہ ایک شہزادے کا تھا۔ یہ معاملہ طول کھینچ سکتا تھا اس لیے اس نے معاملے کو دبا دیا پھر کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ مذکورہ پروفیسر کو کالج سے نکال دیا گیا ہے۔

اس ایک واقعے سے ہی منحصر نہیں، طالب علموں کی اکثریت اینگلو انڈین اور انگریز تھی جو ہندوستانیوں کے

بارے میں تحقیر آمیز جذبات رکھتے تھے اور برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو ''حبشی اور کالے'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ان کا یہ تحقیر آمیز عمل دیکھ کر وہ دل ہی دل میں سوچا کرتا تھا کہ خیر ابھی تمہارے دن ہیں لیکن ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ ہم تم سے بدلہ لیں گے۔

اس کا دل اس وقت بھی بہت کڑھتا تھا جب وہ ہندوستانیوں کو اپنے انگریز افسروں سے خوشامدانہ رویّہ اختیار کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اکثر ممتاز خاندانوں کے افراد تک انگریز ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے اتار دیا کرتے تھے۔

اسے ایسے ہندوستانیوں پر سخت غصہ آنے لگا تھا۔ یہ غصہ اس نے اس طرح اتارا کہ قوم پرست رہنماؤں کی تصاویر جمع کرنا شروع کر دیں۔ گویا اس کا ذہن تیاری شروع کر رہا تھا کہ وہ ایک روز انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے گا۔ کسی ایسی تحریک میں شامل ہوگا جو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے کام کر رہی ہوگی۔

امیر احمد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ مشرقی علوم سے واقفیت کے لیے مولانا ظفر مہدی گوہر کو استاد مقرر کیا گیا تھا جبکہ مغربی علوم میں تربیت کے لیے مسٹر جے۔ اے۔ چیپ مین کا تقرر کیا گیا تھا۔ جرمن زبان کی تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معروف پروفیسر عبدالستار خیری کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ کے لا مارٹینری کالج میں داخل کرایا گیا۔ اس نے دل لگا کر پڑھا اور اسی کالج سے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔

ابھی اس کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد امیر احمد خان صرف سولہ سال کی عمر میں مسند آرائے ریاست ہوئے۔

اب وہ امیر احمد خان نہیں، راجا صاحب محمود آباد تھے۔ یہ وقت ہندوستان کے لیے نہایت آزمائش کا تھا۔ چند ماہ قبل ہی محمد علی جوہر لندن میں انتقال کر چکے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے جو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے سیاسی حالات اور گول میز کانفرنس میں غیر مسلم عناصر کا طرزِ عمل دیکھ کر نہ صرف کانفرنس میں مزید شرکت سے خود کو روک دیا تھا بلکہ یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اب وہ لندن میں سکونت اختیار کر لیں گے۔ موتی لال نہرو بھی لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ مہاراجا محمود آباد کے انتقال کے بعد اعتدال پسند قوم پرستوں کے حوصلے بالکل ہی پست ہو گئے۔

اس غیر منظم دور میں جب راجا صاحب محمود آباد نے ریاست کی باگ ڈور سنبھالی تو بہت سے سوالات سامنے تھے۔ وہ ان سوالوں پر غور کرتے رہے لیکن عملی سیاست سے دور رہے۔ اس کی ایک وجہ تو ریاست کے انتظامات کی مشغولیت تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی سیاست غیر مبہم تھی۔ وہ اپنے لیے کوئی راستہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ انہی دنوں 1933ء میں انہوں نے مشرق وسطیٰ اور یورپی ممالک کا دورہ کیا تاکہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت بھی کر سکیں اور عالمی تناظر میں ہندوستان کے حالات کا بھی جائزہ لے سکیں۔

اس دورے میں جب وہ لندن پہنچے تو قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کے لیے ان کی رہائش گاہ پر بھی گئے۔ انہیں وہ وقت یاد آ گیا جب بچپن میں قائداعظم ان کے گھر آئے تھے۔ انہیں یاد آیا کہ وہ اسکول سے واپس آیا ہی تھا کہ اس کے والد اسے قائداعظم کے پاس لے گئے تھے۔ قائداعظم اس وقت چائنیز سلک کا سوٹ اور کسی قدر اونچے کالر کی قمیص زیب تن کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے راجا صاحب کو اپنے پاس بلایا تھا اور تعلیم کے بارے میں دریافت کیا تھا پھر انہوں نے ایک سوال کیا تھا۔ ''تم کیا ہو، پہلے مسلمان یا ہندوستانی۔''

لندن میں قائداعظم کی رہائش گاہ ان کے سامنے تھی اور وہ اپنی سوچوں میں گم تھے۔ وہ اب امیر احمد نہیں راجا صاحب تھے۔ انہوں نے بچپن کے خیالوں کو ذہن سے جھٹکا اور انہی خوشگوار یادوں کو لیے ہوئے اپنی آمد کی اطلاع قائداعظم تک پہنچائی۔ انہیں ایک مرتبہ پھر ماضی کی یاد نے آواز دی۔ ان کی شادی کے موقع پر قائداعظم بمبئی سے لکھنؤ آئے تھے۔ شادی میں شرکت بھی کی تھی اور قیمتی تحائف سے بھی نوازا تھا۔

وہ ابھی کچھ اور سوچتے کہ قائداعظم نے طلب کر لیا۔

وہ انہیں چچا کہا کرتے تھے۔ قائداعظم کا برتاؤ بھی ان کے ساتھ ویسا ہی شفقت آمیز تھا۔ اس وقت بھی وہ ان سے اسی محبت سے مل رہے تھے۔ دیر تک گلے سے لگائے رہے۔ وہ ان کے لیے اب بھی امیر احمد تھے، راجا صاحب

محمود آباد نہیں۔

انہوں نے اپنی بیٹی دینا سے انہیں ملوایا جو اُن کے قریب ہی تشریف فرما تھی۔

وہ ان کے گھر آئے تھے لہٰذا قائد بڑے خوش تھے۔ انہیں اپنے پورے مکان کی سیر کرائی۔ پھر ایک بڑے ہال نما کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

گفتگو کا آغاز ہوا۔ زیادہ تر گفتگو خاندان اور جائیداد کے امور کے بارے میں ہوئی کیونکہ جناح، ریاست محمود آباد کے ٹرسٹیوں میں سے تھے۔

اس ذاتی گفتگو کا اختتام ہوا تو بات ہندوستان کی نکل آئی۔

"ہندوستان کی موجودہ تشویش ناک صورتِ حال اس بات کی متقاضی ہے کہ آپ ہندوستان جائیں اور مسلمانانِ ہند کی قیادت سنبھالیں۔"

"برخوردار، یہ مشورہ مجھے تم دے رہے ہو۔ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا مجھے احساس نہیں۔"

"چچا، میں نے مشورہ نہیں دیا۔ اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔"

"میں خود ساختہ جلاوطنی ختم کر کے ہندوستان واپسی پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اکثر زعما بضد ہیں کہ میں ہندوستان واپس آؤں لیکن برخوردار میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم نے اب تک عملی سیاست میں قدم کیوں نہیں رکھا۔ ہندوستان کو تمہاری بھی تو ضرورت ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے میں نے کس پُرآشوب دور میں ریاست کا انتظام سنبھالا ہے لیکن آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے ہندوستان آنے کے بعد آپ کے مشوروں سے سیاست میں حصہ ضرور لوں گا۔"

"مجھے تمہاری ضرورت پڑے گی۔"

قائداعظم اپنے جذبات کے اظہار میں بہت محتاط رہا کرتے تھے۔ گفتگو بھی مختصر کرتے تھے لیکن راجا صاحب محمود آباد کی بات اور تھی۔ وہ انہیں اولاد کی طرح سمجھتے تھے اور جب ملتے تھے گھنٹوں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اپنا قیمتی وقت ان کے سپرد کرتے رہے۔

جب راجا صاحب لندن سے واپس آنے لگے تو قائداعظم نے انہیں "برکلے ہوٹل" میں الوداعی عشائیہ دیا۔ اس موقع پر بھی راجا صاحب نے اپنا مطالبہ دہرایا۔

"آپ کو بہت جلد ہندوستان واپس آنا چاہیے۔"

"میرے بیٹے، میں بہت جلد ہندوستان واپس آ رہا ہوں۔"

قائداعظم کا یہ وعدہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے ٹلتا رہا اور پھر بالآخر وہ ہندوستان پہنچ گئے۔ قائداعظم کا خط آیا جس میں انہوں نے راجا صاحب کو تاکید کی تھی کہ وہ دہلی آ کر ان سے ملاقات کریں۔

راجا صاحب کو تو جیسے پیامِ مسرت مل گیا۔ وہ فوراً دہلی پہنچے اور "میڈنز" ہوٹل میں سامان رکھ کر قائداعظم سے ملنے چلے گئے۔

یہ ملاقاتیں روز ہونے لگیں۔ ان ملاقاتوں میں ظاہر ہے ہندوستانی سیاست ہی موضوعِ بحث بنتی تھی۔ ایک روز وہ راجا صاحب کو اپنے ایک دوست دیپ نرائن سنگھ سے ملانے کو لے گئے۔ یہ قوم پرست رہنما تھے۔ راجا صاحب کے والد کے دوست رہ چکے تھے۔ راجا صاحب نے ان سے ملاقات کی تو والد صاحب کے حوالے سے انہیں بہت مہربان پایا۔ جلد ہی یہ گفتگو سیاسی مراحل طے کرتی ہوئی راجا صاحب کی ذات پر آ کر رک گئی۔ قائداعظم انہیں عملی سیاست میں قدم رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔

"کیا آپ سیاسی میدان میں میرا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔"

"میں شانتی نکیتن سے وابستہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہو۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی میرے اس ارادے کی توثیق کر دی ہے۔"

قائداعظم تو شاید اس کے اس منصوبے پر خاموش ہو جاتے لیکن دیپ نرائن خاموش نہ رہ سکے اور راجا صاحب کو ٹوکا۔ "قائد جی ٹھیک کہتے ہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ آپ کو سیاست میں شمولیت اختیار کر کے اپنے انکل (جناح) سے تعاون کرنا چاہیے۔ جناح کے ساتھ تعاون کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اپنے ہاتھ ایک عظیم محبِ وطن ہندوستانی اور قوم پرست کے ہاتھ میں دے دیے ہیں۔"

دیپ نرائن سنگھ نے یہ باتیں کچھ اس انداز سے کیں کہ راجا صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قائداعظم کے ساتھ سیاست میں تعاون کریں گے۔

یہ راجا صاحب کی تربیت کا زمانہ تھا۔ انہوں نے

قلعہ معلیٰ محمود آباد

معمول بنا لیا تھا کہ جب موقع ملتا وہ بمبئی یا دہلی (قائداعظم جہاں ہوتے) جا کر قائداعظم کے ساتھ قیام کرتے۔

ان ملاقاتوں اور ان ملاقاتوں کی صورت میں تربیت نے راجا صاحب کو اس فیصلے پر پہنچا دیا کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر کے محمد علی جناح کی قیادت میں اپنا سیاسی کردار ادا کریں۔

اس شمولیت کے فوراً بعد انہیں یو۔ پی کے گورنر کی جانب سے ظہرانے کی دعوت ملی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انہیں کس لیے یہ اعزاز بخشا گیا ہے۔

گورنمنٹ ہاؤس میں داخلہ ایک اعزاز تھا جس کی تمنا ہر شخص کو ہوتی تھی۔ راجا صاحب نے بھی اسے اپنے لیے ایک اعزاز ہی سمجھا اور گورنر صاحب سے ملاقات کے لیے چلے گئے۔ یہ دیکھ کر البتہ تعجب ہوا کہ اس ظہرانے میں وہ گورنر کے تنہا مہمان تھے۔

چائے کے پُرتکلف دور میں گفتگو کا آغاز ہو گیا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی ہے۔"

"آپ کی معلومات درست ہیں۔ میں نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا۔"

"کیا آپ اپنے اس اقدام کے نتائج سے آگاہ ہیں؟"

"میں اسے کوئی خطرناک بات نہیں سمجھتا۔ سیاست میں شرکت ایک عام اور ذاتی سی بات ہے۔"

"آپ یہ تو یقیناً جانتے ہوں گے کہ آپ کی ریاست برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے لیے ضروری ہے۔" یہ باور کرانے کا مقصد یقیناً یہ تھا کہ وہ دھمکی دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اس کی مزید وضاحت بھی کر دی۔

"میں آپ کو کچھ وقت دینا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے موقف پر ازسرِ نو غور کر لیں بلکہ بہتر ہے کہ مسلم لیگ سے قطع تعلق کر لیں۔"

"گورنر صاحب، آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔ میں مسلم لیگ سے الگ ہو جاؤں تو پھر کیا کروں۔" راجا صاحب چاہتے تھے کہ گورنر سے ان کے دل کی بات اگلوا لیں۔

"انگریز حکومت بہت جلد مسلم لیگ کی سرگرمیوں پر

پابندی عائد کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس جماعت سے وابستگی آپ کے مستقبل کے لیے خوش آیند نہیں۔ آپ کو نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کرلینا چاہیے۔"

"جناب، میں آپ کا مشورہ ضرور مان لیتا لیکن میں مسٹر جناح سے وعدہ کرچکا ہوں۔ اپنے وعدے سے منحرف ہونا شرافت سے بعید سمجھتا ہوں۔ پھر مسلمان ہوں، مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ رہا ہوں۔ ان کے ساتھ کیسا سلوک ہورہا ہے یہ آپ سے بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔"

گورنر نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا لیکن راجا صاحب کو اندازہ ہوگیا کہ برطانوی حکومت ان کو جھکانے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہے۔ اس اندازے کے ساتھ ہی انہوں نے یہ فیصلہ بھی کرلیا کہ وہ مسلم لیگ کا ہر طرح سے ساتھ دیں گے۔ سیاست میں چند دن گزارنے کے بعد انہیں یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور یہ کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے راستے الگ الگ ہیں۔ کانگریس مسلمانوں کا بھلا نہیں چاہتی ہے۔

راجا صاحب نے مسلم لیگ میں شامل ہوتے ہی مسلم لیگ کے لیے اپنے خزانے کے دروازے کھول دیے۔ ریاست محمود آباد کو 25 لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی جو اس وقت کسی ریاست کی بہت زیادہ آمدنی تصور کی جاتی تھی۔

اتنی بڑی مالی امداد کا سہارا مسلم لیگ کو مل جانا کانگریس کے لیے بڑا سوہانِ روح تھا۔

1936ء کے آخر میں مسلم لیگ کا چوبیسواں سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ کیا گیا کہ آیندہ صوبائی انتخابات میں حصہ لیا جائے گا اور قائداعظم کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ایک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کریں جو 54 افراد پر مشتمل ہو۔

قائداعظم نے ملک بھر کے دورے کرنے کے بعد مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے 54 اراکین کے ناموں کا اعلان کردیا۔ ان میں ایک نام امیر احمد خان راجا صاحب محمود آباد کا بھی تھا جو ورکنگ کمیٹی کے رکن اور مسلم لیگ کے خزانچی کے طور پر پہلے ہی کام کررہے تھے۔

راجا صاحب مسلمانوں کی محبت میں مسلم لیگ پر اتنا کثیر سرمایہ خرچ کررہے تھے کہ سر فضل حسین (جن کی قیادت میں یونینسٹ پارٹی پنجاب میں حکومت کررہی تھی) نے سر آغا خان کو ایک ٹیلی گرام ارسال کیا جس میں انہوں نے آغا خان کو مطلع کیا تھا کہ جناح محمود آباد کے سرمائے کے ساتھ پنجاب پر توجہ دے رہے ہیں۔ انہوں نے اس سرمائے سے پنجاب کے رہنماؤں اور اخبارات پر اپنا اثرورسوخ بڑھالیا ہے۔

اس ٹیلی گرام کے بعد انہوں نے آغا خان کے نام ایک خط بھی تحریر کیا جس میں لکھا کہ راجا صاحب محمود آباد کی جانب سے جناح کو ملنے والے فنڈ نے ہمارے کام کو مشکل بنادیا ہے کیونکہ عام طور پر اخبارات اور خاص طور پر اردو اخبارات کے مالی حالات بہتر نہیں ہوتے ہیں لہٰذا وہ ہمہ وقت کسی مالی مدد کے محتاج رہتے ہیں۔"

قائداعظم یہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کو علاقائی اور صوبائی سیاست سے نکال کر ہندوستان گیر سطح پر ایک منظم سیاسی جماعت بنادیا جائے۔ اس کے لیے وہ خود بھی ملک گیر دورے کررہے تھے اور ایسے لوگوں کو آگے بڑھا رہے تھے جن کا سیاسی کردار بے داغ تھا۔ اور ان میں سرفہرست راجا صاحب کی ذات تھی اسی لیے راجا صاحب محمود آباد کو آگے بڑھایا جارہا تھا۔

مسلم لیگ کو فعال اور منظم کرنے کے لیے لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس بلایا گیا۔ اس اجلاس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین راجا صاحب تھے جبکہ محمد علی جناح کو صدر منتخب کیا گیا۔

راجا صاحب کی مصروفیت میں حددرجہ اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ نہ صرف لیگ کے مرکزی رہنماؤں سے رابطے میں تھے بلکہ اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف اضلاع کے دورے بھی کررہے تھے۔ قائداعظم سے خط وکتابت بھی جاری تھی۔ وہ چونکہ قائداعظم کو اپنا سرپرست تصور کرتے تھے لہٰذا ہر کام ان کی مرضی کے مطابق کررہے تھے۔

یہ اجلاس جہاں مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کے حوالے سے اہم ثابت ہوا وہیں راجا صاحب کو ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں نہ صرف شہرت ملی بلکہ ان کی سیاسی بصیرت اور انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ بھی ہوا۔

ایک ایسے دور میں جب کانگریس یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ بہت جلد مسلم لیگ کو نیست ونابود کردے گی راجا صاحب نے قائداعظم کے مشورے سے مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد کرکے کانگریس کو بوکھلا دیا۔ یہ صوبہ جواہر لال نہرو کا رہائشی صوبہ تھا اور اس صوبے کا دارالحکومت لکھنؤ تھا۔ تمام

تاج پوشی کے وقت (R+L) مہاراج کمار محمد امیر حیدر۔ مولانا رضی احمد (اتالیق) مولانا ظفر مہدی (استاد) جناب راجا صاحب محمود آباد

کانگریسی یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ اجلاس ناکام ہوجائے گا۔ یہ افواہیں بھی گرم تھیں کہ بم پھینکے جائیں گے۔ سیاہ جھنڈیوں سے محمد علی جناح کا استقبال کیا جائے گا اور انہیں مجبور کردیا جائے گا کہ وہ لکھنؤ سے واپس چلے جائیں۔

راجا صاحب یہ سن رہے تھے مگر عزم کا پہاڑ بنے اجلاس کے انعقاد کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ انہی کی کوششوں سے یہ اجلاس نہ صرف منعقد ہوا بلکہ ایسا کامیاب ہوا کہ مسلم لیگ کی تاریخ کا ایک روشن باب بن گیا۔

پورے لکھنؤ شہر کو سجایا گیا۔ قائداعظم کو ریلوے اسٹیشن سے بڑے جلوس کی شکل میں قیصر باغ لے جایا گیا۔ قائداعظم کی کار کے آگے راجا صاحب محمود آباد ایک نواب ہوتے ہوئے بھی عام رضاکار کی طرح ان کے ہمراہ پیدل چل رہے تھے۔ جلسہ گاہ میں پرچم کشائی کی رسم کے بعد راجا صاحب نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔

"...... ہمارے ملک میں نازک سیاسی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ جس جماعت کی اکثریت ہے وہ مسلم جماعت کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتی اور قومی ترقی کے لیے ہمارے رہنماؤں کے ساتھ کسی اتحاد کے لیے تیار نہیں ہے...... ہم نے اپنے برادرانِ وطن کو بار بار یقین دلایا ہے کہ جنگِ آزادی میں ہم ان کے دوش بدوش کھڑے ہیں مگر اپنی ہستی کو بالکل مٹا نہیں سکتے۔ ہم نے ایک متحدہ محاذ کا مطالبہ کیا ہے مگر کانگریس نے آزادی کی جنگ کو حقوق کے حصول کی جنگ بنادیا ہے لہٰذا ہمیں مجبوراً مسلم لیگ کے ذریعے اپنی زبان، اپنے تمدن اور معاشرتی وسیاسی حقوق کا تحفظ کرنا پڑا...... آج یہاں کوئی ایسا مسلمان نہیں جو خیال وعمل کی آزادی کا خواہاں نہ ہو اور جو ایک آزاد مملکت میں رہنے کا خواہش مند نہ ہو۔ جو لوگ ہمیں رجعت پسند کہتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مسلمانوں سے خطاب کررہے ہیں جن کے مذہب نے انہیں آزادی کی تعلیم دی ہے...... ہم اپنے ملک کی آزادی چاہتے ہیں مگر ہم اپنی جماعت کی آزادی کے بھی خواہش مند ہیں...... جمہوریت کا لازمی جز ہے کہ اقلیتوں کو بھرپور نمائندگی ملے۔ مسلمانوں کی شرکت کے بغیر کوئی سیاسی جدوجہد مناسب وموثر طور پر قابلِ عمل نہیں ہوسکتی۔"

اس کے بعد انہوں نے ایک تاریخی جملہ کہا اور خطاب ختم کردیا۔

"ہم یہاں تاریخ کی تقلید کے لیے نہیں بلکہ تاریخ کی

تحقیق کے لیے جمع ہوئے ہیں۔"

راجا صاحب نے اس اجلاس میں دو قراردادیں پیش کیں جنہیں کثرتِ رائے سے منظور کرلیا گیا۔ پہلی قرارداد اردو زبان کے بارے میں تھی۔

"سرکاری مدارس میں اردو کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت دی جائے اور اس کی بہتر تعلیم کے لیے ضروری لوازم مہیا کیے جائیں۔ حکومت کے تمام دفاتر، عدالتوں اور قانون ساز جماعتوں میں نیز ریلوے اور ڈاک کے محکموں میں اردو زبان کے استعمال کے لیے مناسب انتظامات کیے جائیں۔"

دوسری قرارداد میں راجا صاحب نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کو تجویز پیش کی کہ وہ ایک اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی پروگرام مرتبہ کرے جس کے ذریعے مطلوبہ مقاصد حاصل ہوسکیں۔

راجا صاحب کے اس انقلابی طرزِ عمل اور لکھنؤ اجلاس کی کامیابی نے انہیں مسلم لیگ کے سرکردہ رہنماؤں کی صف میں لاکھڑا کیا۔ پورے ہندوستان میں ان کی عمومی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

اس اجلاس کی کامیابی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ضمنی انتخابات میں مسلم لیگی امیدواروں کو مسلم نشستوں پر زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔

اس کامیابی کا تمام تر سہرا راجا صاحب کے سر تھا۔ اس لیے بھی کہ انہوں نے اس کامیابی کے لیے فضا ہموار کی تھی اور اس لیے بھی کہ تمام انتخابی اخراجات انہوں نے برداشت کیے۔ جبکہ اس وقت راجا صاحب کی عمر صرف 23 سال تھی۔

اگر اس وقت کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ ضمنی انتخابات ہار جاتی تو مسلم لیگ کا مستقبل تاریک تر ہوجاتا اور پھر اس کا سنبھلنا ناممکن ہوجاتا۔ اور نہ آج اسلام کا یہ قلعہ پاکستان اتنی جلدی وجود میں آجاتا۔

یہ راجا صاحب کی انتھک محنت اور ان کے خزانوں کے دروازے تھے جو کھلے تو مسلم لیگ کو مسلم لیگ بنا گئے۔ لکھنؤ کے اجلاس کی کامیابی نے مسلمانوں اور بالخصوص نوجوانوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کردیا۔ قائداعظم سیاست میں طالب علموں کی براہِ راست شرکت کے خلاف تھے لیکن راجا صاحب سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے کہ طالب علموں کی سطح پر کسی ایسی تنظیم کو متعارف کرایا جائے جو آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہوسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کی نظر طلبہ کی ایک تنظیم "آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن پر پڑی جو کانگریس کی اعانت سے قائم ہوئی تھی اور کانگریس کے آلہ کار کے طور پر کام کررہی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی اس تنظیم کا ایک حامی گروہ موجود تھا۔

راجا صاحب نے ان طلبہ رہنماؤں سے رابطے شروع کردیے اور انہیں اس بات پر آمادہ کرنے لگے کہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں جو مسلمان طلبہ ہیں وہ اپنی تنظیم الگ قائم کریں۔ اس دوران وہ قائداعظم کو بھی آمادہ کرتے رہے اور جب بات کسی نتیجے پر پہنچنے کے قریب ہوئی تو ان طلبہ کے ایک وفد کی ملاقات انہوں نے قائداعظم سے کرادی۔ جب ان طلبہ نے قائد کے سامنے مسلم طلبہ کی ایک علیحدہ تنظیم قائم کرنے کی تجویز رکھی تو انہوں نے اس تجویز کی تائید کی اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

علی گڑھ یونین کے ایک جلسہ میں باقاعدہ قرارداد پیش کرکے اسے منظور بھی کرالیا گیا۔

علی گڑھ میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد کا پڑنا تھا کہ پورے ہندوستان میں مسلمان طالب علموں نے صوبائی سطح پر اپنی تنظیم شروع کردی۔ لکھنؤ میں مسلم طلبہ نے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں طلبہ کی کثیر تعداد شریک ہوئی۔ اس اجلاس میں ایک کل ہند اجلاس بلانے کی قرارداد بھی منظور کی گئی۔ جلد ہی اس فیڈریشن کی شاخیں بنگال تک قائم ہوگئیں۔

راجا صاحب کا شمار رؤسا میں ہوتا تھا لیکن ان کی درویشی ضرب المثل تھی۔ اس کا بہترین مظاہرہ طالب علموں سے ان کے میل جول میں ہوا۔ اس فیڈریشن کے جتنے جلسے اور اجلاس ہوئے راجا صاحب ان میں شرکت بھی کرتے رہے اور مالی امداد سے بھی ہاتھ نہیں کھینچا کیونکہ ان کے نزدیک اس فیڈریشن کی طاقت مسلم لیگ کی طاقت تھی۔

راجا صاحب کی آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے بہ حیثیت صدر وابستگی نے نہ صرف فیڈریشن کے تنظیمی معاملات کو فزوں تر کیا بلکہ نوجوانوں میں ایک ایسا جذبہ پیدا کردیا جو خود مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافے کا باعث بنا اور یہ مقبولیت روز بروز بڑھتی رہی۔

مسلم لیگ کی تنظیمی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت قبول کرلینے کی بنا پر راجا صاحب کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا اور وہ ایک قومی رہنما سمجھے جانے لگے تھے۔

1938ء کو قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے لیگ کی ایگزیکٹیو کونسل کے ارکان کے ناموں کا اعلان کیا جس میں راجا صاحب کا بھی نام شامل تھا اور یہ ایسے وقت میں تھا جب راجا صاحب بسترِ علالت پر تھے۔ مصروفیات منقطع ہوگئی تھیں۔ خطوں کے ذریعے ہی قائد سے رابطہ کررہے تھے۔ انہوں نے خصوصی اجلاس میں شرکت سے معذوری کردی تھی لیکن دل بمبئی میں اٹکا ہوا تھا بالآخر تقریباً ایک ماہ بعد بمبئی آمد کی اطلاع دی۔ اس کے ایک ماہ بعد راجا صاحب دہلی پہنچ گئے جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ کونسل کے اجلاس سے قبل ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں راجا صاحب نے خطابت کے جوہر دکھائے۔

"میں نے قائداعظم کو ذاتی طور پر مسلسل اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کانگریس کے پاس بہت سے جواہر لال اور گاندھی موجود ہیں اور ہمارے پاس صرف ایک ہی جناح ہے جو سیاست کا قائداعظم ہے اور شروع سے آج تک اپنی زبان اور عمل کا پابند ہے۔ مسلم لیگ جو مردہ ہوچکی تھی اسے دوبارہ زندہ کرنا تھا۔ اس مرحلے پر قائداعظم ہی ہمارے سامنے آئے اور انہوں نے ہماری کامیابی کا بیڑا اٹھایا۔ ہماری حالت اس وقت چیکوسلواکیہ سی ہے۔ ہم کہتے ہیں ہم آٹھ کروڑ ہیں لیکن ہماری ہمتیں پست ہوچکی ہیں۔ ضمیر کی آزادی کی ضرورت ہے......

اجلاس منعقد ہوا تو اس میں مسلم لیگ کی فنڈ کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کمیٹی کا کنوینر راجا صاحب کو مقرر کیا گیا۔

یہ ایک اور اہم عہدہ تھا جو انہیں ملا۔

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر کی حیثیت سے جہاں وہ نوجوانوں سے رابطے میں تھے وہاں مسلم لیگ کے ایک اہم رہنما ہونے کی وجہ سے یوپی میں ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ان کو اکثر قومی اجلاسوں میں بلایا جاتا تھا۔ والدہ کی علالت کے باوجود ان کی یہ مصروفیات جاری تھیں۔ کبھی بمبئی میں اجلاس ہورہا ہوتا تھا کبھی دہلی میں تو کبھی کلکتہ میں۔ راجا صاحب کا ہر اجلاس میں ہونا ضروری ہوتا تھا۔

اقلیتی صوبوں میں کانگریس حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کا طرزِ عمل معاندانہ تھا لہٰذا مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہورہا تھا کہ اگر انگریز چلا گیا تو اکثریتی فرقے کی بنیاد پر کانگریس برسرِ اقتدار آجائے گی اور مسلمانوں کا رہنا دوبھر ہوجائے گا۔ اس لیے یہ خیال دلوں میں جاں گزیں ہوگیا تھا کہ جب تک مسلم لیگ مستحکم نہیں ہوپائی اس وقت تک نہ تو مسلمان برطانوی حکومت سے اپنے مطالبات منواسکتے ہیں اور نہ کانگریس کے دباؤ سے باہر آسکتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کا جھکاؤ مسلم لیگ کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

صوبہ سندھ میں مسلمان اگرچہ اکثریت میں تھے لیکن ان کو صوبے کی سیاست میں وہ مقام حاصل نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا لہٰذا اس صوبے کے سرکردہ لوگوں نے خاص طور پر سر عبداللہ ہارون کراچی میں سندھ صوبائی لیگ کانفرنس منعقد کرنے کا پروگرام بنایا۔ یہ کانفرنس ہوئی اور اس میں ہندوستان کے اہم مسلم رہنماؤں نے بھی شرکت کی۔

یہ کانفرنس اس لیے بھی اہمیت اختیار کرگئی کہ اس میں ہندوستان کو مسلم اور غیر مسلم دو وفاقوں میں تقسیم کردینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اور ایسا اس لیے ہورہا تھا کہ کانگریس کے متعصبانہ رویے نے ہی مسلمانوں کو ہندوستان کی ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی صورت میں تقسیم پر آمادہ کردیا تھا۔

اس کانفرنس کے حوالے سے بھی راجا صاحب کی انتظامی صلاحیتیں ناقابلِ فراموش تھیں چنانچہ کانفرنس کے جنرل سیکریٹری پیر علی محمد راشدی نے اپنی رپورٹ میں کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے جن رہنماؤں کا شکریہ ادا کیا ان میں راجا صاحب محمود آباد سرِفہرست تھے۔

سندھ صوبائی لیگ کانفرنس کے اختتام پر سندھ مسلم اسٹوڈنٹس کانفرنس راجا صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی جس سے قائداعظم اور راجا صاحب نے خطاب کیا۔ راجا صاحب نے اپنی تقریر میں کہا۔ "ہندوؤں نے ہمیشہ آپ کو تعلیم کے حصول سے روکا ہے اور وہ کبھی آپ کو ترقی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے لہٰذا آپ کو اپنی مدد آپ کرنا ہوگی۔"

کراچی کے چند روزہ قیام نے یہاں کے لوگوں میں راجا صاحب کو بے حد مقبول بنادیا۔ ان کی شخصیت، ان کی کم عمری، ان کا جوشِ خطابت یہ سب چیزیں ایسی تھیں جن سے لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچ رہے تھے۔ ایک روز ایک مقامی تنظیم کے کچھ افراد ان کے پاس آئے۔ "ہماری تنظیم کا

نام انجمن بہار اسلام ہے۔ ہم آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ایک استقبالیہ دینا چاہتے ہیں۔ ہماری دعوت کو قبول کیجیے۔"

راجا صاحب کو قائداعظم کے ہمراہ سندھ کے دورے پر نکلنا تھا لیکن آپ سے گوارا نہیں ہوا کہ آپ ان کی دعوت کو ٹھکرائیں۔ آپ نے وعدہ کرلیا۔

کراچی کے خالقدینا ہال میں اس تنظیم کے تحت راجا صاحب کو استقبالیہ دیا گیا۔ مقررین نے آپ کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

اس کے فوراً بعد راجا صاحب اور دیگر رہنما قائداعظم کی ہمراہی میں اندرونِ سندھ کے دورے پر نکلے اور جیکب آباد پہنچے۔ اسٹیشن پر تقریباً دو ہزار افراد ان کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے جو اس چھوٹے سے شہر میں یہ بہت بڑی تعداد تھی۔

ان افراد میں سر عبداللہ ہارون، شیخ عبدالمجید سندھی، پیر علی محمد راشدی اور ہاشم گزدر جیسے قدآور لوگ شامل تھے۔

ایک جلوس تیار ہوگیا جو شہر میں گشت کرتا رہا۔ ہر طرف مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ یہ جلوس جب عیدگاہ میدان پہنچا تو عوام کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

مسلم رہنماؤں کا یہ وفد اسی دن شکارپور پہنچا۔ یہاں بھی ان کا شاندار استقبال ہوا۔ یہاں بھی قائداعظم اور راجا صاحب نے اپنی تقاریر کے دوران کانگریس کے رویے کی مذمت کرتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہوجائیں۔

شکارپور سے یہ وفد سکھر اور پھر لاڑکانہ گیا۔ لاڑکانہ میں بھی وفد کا شاندار استقبال کیا گیا۔ لوکل بورڈ آفس میں استقبالیہ دیا گیا اور پرچم کشائی ہوئی۔ یہاں ہونے والے جلسے سے بھی راجا صاحب اور دیگر رہنماؤں نے خطاب کیا۔ اس کامیاب دورے کے بعد یہ وفد کراچی واپس آگیا۔

راجا صاحب کی سیاسی بصیرت کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی۔ مسلم لیگی رہنماؤں میں انہیں ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قائداعظم ان پر بہت اعتبار کرتے تھے۔ یہ ان کی مقبولیت ہی تھی کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس جب دہلی میں منعقد ہوا تو اجلاس میں نہایت تجربہ کار اور زیرک رہنماؤں کی موجودگی کے باوجود اس وقت راجا صاحب کو اجلاس کی صدارت تفویض کی گئی جب قائداعظم کو آیندہ سال کے لیے مسلم لیگ کا صدر منتخب کرنے کے لیے غور کیا جا رہا تھا۔

تحریک کی منظوری کے بعد راجا صاحب نے قائداعظم کے صدر منتخب ہونے کا اعلان کیا۔

اسی اجلاس میں مسلم لیگ کے موقف اور کانگریس کے اقلیتوں کے ساتھ سلوک کو آشکار کرنے کے لیے تین وفود ترتیب دینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کے ارکان میں راجا صاحب کا نام بھی شامل تھا۔

مسلم لیگ کا 26 واں اجلاس 1938ء میں پٹنہ (بہار) میں ہوا۔ راجا صاحب نے اس اجلاس میں یوپی کے کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ شرکت کی۔

ایک قرارداد کے ذریعے راجا صاحب کو اعزازی خازن (خزانچی) منتخب کرنے کا اعلان کیا گیا۔

اسی اجلاس میں مسلم لیگ کے لیے ایک فنڈ کمیٹی بھی قائم کی گئی جو راجا صاحب اور سر کریم بھائی ابراہیم پر مشتمل تھی۔

مسلم لیگ کے پنڈال ہی میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت راجا صاحب نے کی۔ انہوں نے اپنے خطاب میں کہا۔ "میں نے ملک میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کو موجود پایا ہے۔ لیگ امن و انصاف پر یقین رکھتی ہے لیکن امن و انصاف اس وقت تک بے معنی لفظ ہے جب تک ہم اس کے نفاذ کے لیے صدقِ دل سے کوشش نہ کریں۔"

مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد راجا صاحب لکھنؤ آئے۔ یہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ ان کی والدہ سخت علیل ہیں۔ انہیں اپنی والدہ سے سخت محبت تھی۔ یہی موقع تھا کہ وہ خود کو والدہ کی خدمت کے لیے وقف کردیں۔ انہوں نے قائداعظم کو بذریعہ خط مطلع کیا اور معذرت کے ساتھ تحریر کیا کہ وہ ابھی تک قومی فنڈ کے سلسلے میں کسی سے رابطہ نہیں کرسکے ہیں۔ میرٹھ میں کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ راجا صاحب کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ والدہ بدستور علیل تھیں لیکن وہ قومی مفاد کو پسِ پشت نہ ڈال سکے۔ کانفرنس میں شریک بھی ہوئے اور خطاب بھی کیا۔ یہی وہ کانفرنس تھی جس میں نوابزادہ لیاقت علی خان نے اپنے صدارتی خطبے میں یہ اہم نکتہ اٹھایا تھا۔ جس کی تائید راجا صاحب نے کی تھی۔ "اگر ہندو اور مسلمان امن و آشتی کے ساتھ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تو ملک کو باہم تقسیم کرلیں اور الگ الگ ہوجائیں۔"

راجا صاحب میرٹھ سے علی گڑھ پہنچے جہاں انہیں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ایک کانفرنس کی صدارت کرنا تھی۔ اس کانفرنس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس سے قائداعظم کو بھی خطاب کرنا تھا۔

راجا صاحب نے قائداعظم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اگر کوئی سائنس داں ایسی مشین ایجاد کرلے جو دل کے اندر کی تصویر لے سکتی ہو تو یقیناً آج تمام مسلمانوں کے دلوں میں قائداعظم کی تصویر مرتسم ملے گی۔"

اس ایک جملے نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے جذبات کی عکاسی کردی تھی اور یہ جملہ تاریخِ پاکستان کا تاریخی جملہ بن گیا۔

علی گڑھ سے راجا صاحب دہلی آئے۔ یہ اپریل کا مہینا تھا۔ 1939 کا سال چل رہا تھا۔ اس ماہ کی 8 تاریخ کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ اس کے علاوہ راجا صاحب کو پہلی دہلی پراونشل مسلم لیگ پولیٹیکل کانفرنس کی صدارت بھی کرنا تھی۔

راجا صاحب نے خطاب کیا۔ "ہندوستان کی موجودہ سیاسی صورتِ حال میں ایک بات بہت واضح ہوکر سامنے آئی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اس بات پر آمادہ ہوگئے ہیں کہ وہ مساوی بنیادوں پر زندگی گزاریں گے، کسی کے تابع ہوکر نہیں۔ مسلمانوں کے لیے اب یہ مسئلہ نہیں کہ ملک کس طرح چلایا جا رہا ہے بلکہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ وہ آیندہ ہندوستان میں کس طرح رہیں گے۔ مسلمانوں نے بہ یک آواز یہ اعلان کردیا ہے کہ اگر ہندوستان میں انہیں مناسب درجہ نہیں دیا گیا تو وہ کسی فیڈریشن کو قبول نہیں کریں گے۔ اب چونکہ برطانوی پارلیمنٹ کی تیار کردہ اسکیم میں مسلمانوں کو وہ درجہ نہیں دیا گیا ہے اس لیے انہوں نے اچھی طرح واضح کردیا ہے کہ وہ اس اسکیم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔"

اس اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے "مسلم نیشنل گارڈ" کے قیام کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ راجا صاحب کو اس کمیٹی کا کنوینر مقرر کیا گیا۔

راجا صاحب کی مصروفیات ایک مرتبہ پھر والدہ کی علالت کی بنا پر محدود ہوگئیں لیکن وہ قائداعظم سے مسلسل رابطے میں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اس لیے محمود آباد میں رہتے ہوئے بھی تحریک کی خبروں سے مسلسل جڑے ہوئے تھے۔

1939ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا تھا۔ وائسرائے ہند کی ہندوستانی عوام سے اپیل شائع ہوئی تھی کہ وہ اس جنگ میں برطانیہ سے تعاون کریں۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں تعاون پر آمادہ نہیں تھے۔ کانگریس نے بطور احتجاج وزارتوں سے مستعفی ہونے کا اعلان کردیا۔ مسلم لیگ نے ان استعفوں کی خوشی میں "یومِ نجات" منانے کا اعلان کردیا۔

قائداعظم کی اس اپیل پر ہندوستان بھر میں جلسے جلوس منعقد کیے۔

اب یہ تاثر ابھرنے لگا تھا کہ مسلمانوں کو ایک الگ وطن درکار ہوگا۔ راجا صاحب نے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "آج کا ہندوستان مسلم ہند اور غیر مسلم ہند میں واضح طور پر تقسیم ہوچکا ہے۔ شمال میں موجود صوبے جو مسلم اکثریتی صوبے ہیں اب تیزی سے ایک بلا جبر اور آزادانہ زندگی کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ ایک بے روک ٹوک اور بے خطر زندگی چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی منزل کا تعین چاہتے ہیں اور ان کی اس خواہش سے ہی اس تصور کی ابتدا ہوتی ہے جو عام طور پر "تحریکِ پاکستان" کے عنوان سے معروف ہے۔

راجا صاحب وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پاکستان کا لفظ استعمال کیا۔ ورنہ چند سال قبل چوہدری رحمت علی نے Now or Never نامی کتابچے میں Pak Asthan نام سے ایک الگ ملک کا مطالبہ کیا تھا لیکن وہ ایک نوجوان طالب علم تھا اس لیے اس کے چند ورقیہ کتابچے کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جبکہ راجا صاحب ایک اہم رہنما تھے اس لیے ان کی زبان سے ادا ہوتے ہی یہ نام مقبولِ عام ہوگیا۔

یوم نجات کی کامیابی نے کانگریس اور برطانوی حکومت کو مسلمانوں کی اہمیت کا احساس دلادیا۔ خود مسلمانوں کو بھی یہ احساس ہوگیا کہ وہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا یہ مطالبہ جائز ہے کہ ہندوستان میں ایک علیحدہ مسلم ریاست قائم کی جائے۔

راجا صاحب کی مصروفیات دوہری تھیں۔ ایک طرف مسلم لیگ سے وابستگی دوسری جانب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر کی حیثیت سے ذمے داریاں۔ انہیں سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔ دیکھنے والے یہ سوچنے میں

حق بہ جانب تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کی خدمت کی خاطر اپنی ریاست کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ یہ سو فیصد صحیح بات تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے اپنی ریاست کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

1940ء میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن بہار نے اپنی صوبائی کانفرنس کے موقع پر یوم جوہر کا انعقاد کیا۔ راجا صاحب کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ وہ بذریعہ کار روانہ ہوئے۔

راجا صاحب دوقومی نظریہ کے داعی تھے اور وہ مسلمانوں کی نجات اسی میں تصور کرتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہو جہاں وہ اپنے مذہب اور تمدن کی روشنی میں زندگی گزار سکیں۔ مسلم لیگ کی قیادت بھی کم از کم 1938ء کے بعد ان کے اس خیال سے متفق ہو چکی تھی۔ علامہ اقبال مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کہہ چکے تھے۔ ”میری ذاتی خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومت خود مختاری حاصل کرے یا اس کے باہر۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔“

راجا صاحب نے صاف لفظوں میں یہ بات کہہ دی تھی کہ ہم پاکستان چاہتے ہیں لیکن افسوس کہ وہ والدہ کی علالت کے باعث اس اجلاس میں شریک نہ ہو سکے جس میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مسلم وطن کے قیام کی قرارداد پاس کی جانے والی تھی۔

مسلم لیگ کے کامیاب اجلاس اور مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کی قرارداد کی منظوری نے ہندوستانی سیاست میں ہلچل مچادی۔ برطانوی حلقوں میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ کانگریس پر بھی کچھ کم گھبراہٹ طاری نہیں تھی۔ کانگریس نے اس مطالبے کی شدید مذمت کی۔

کانگریس کی مخالفت نے مسلمانوں کو اپنے مطالبے میں مزید پختہ کر دیا اور یہ تاثر عام ہونے لگا کہ ہندوؤں کو کسی طرح بھی مسلمانوں کی خوش حالی قبول نہیں۔ وہ مسلمانوں کو پیروں تلے، اپنی ٹھوکروں میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں ہندو قوم پرست جماعت ”ہندو مہا سبھا، آر ایس ایس اور سناتن دھرمی جماعتوں نے کھلم کھلا بولنا شروع کر دیا تھا۔ خود راجا صاحب کی ریاست کے اندر اور آس پاس کے علاقوں میں راجا صاحب کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں مگر راجا صاحب کو مطلق فکر نہ تھی، لوگ کہتے کہ اگر پاکستان بن گیا تو آپ کی ریاست پر ہندوستان کا قبضہ ہو جائے گا کیونکہ محمود آباد یوپی میں ہے اور آپ کا مطالبہ ہے کہ شمال مغرب کے علاقے کو پاکستان بنادیا جائے۔ تب راجا صاحب کہتے کہ میری ریاست کا کیا ہے، رہے نہ رہے لیکن قوم کے بچوں کا مستقبل تو محفوظ ہو جائے گا۔

علیحدہ وطن کے تصور نے مسلمانوں کے اذہان میں ایسا ولولہ پیدا کر دیا تھا جو اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

گو کہ راجا صاحب اس اجلاس میں تو شریک نہیں ہو سکے تھے جس میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن کی قرارداد پیش کی گئی تھی۔ لیکن انہوں نے اس مطالبے کی وضاحت اور مسلمانوں کو اس کے حق میں ہموار کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا کیونکہ ان کے دل کی آواز تھی۔ اس وقت مسلمان ہر اس شخص کو آنکھ کا تارا بنا رہے تھے جو علیحدہ وطن کے حق میں تھا لہٰذا راجا صاحب مسلمانوں کے محبوب لیڈر بن گئے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب راجا صاحب بمبئی پریذیڈنسی مسلم لیگ کانفرنس کی صدارت کے لیے بمبئی پہنچے۔ اس کانفرنس میں راجا صاحب نے جو خطبۂ صدارت پیش کیا وہ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ”دو ماہ قبل ہماری مرکزی تنظیم کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تھا جس نے پہلی مرتبہ ایک ایسی قرارداد منظور کی جس میں الفاظ و معانی کا کوئی ابہام نہ تھا۔ یہ قرارداد نہ صرف مسلمانوں کے جذبات کی بیّن طور پر آئینہ دار تھی بلکہ دوٹوک تھی لہٰذا اب ہمارا مستقبل مبہم نہیں بلکہ بہت واضح ہے۔

...... ہمارا بھی برطانیہ سے وہی خود مختاری کا مطالبہ ہے جو کانگریس کا ہے۔ ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ ہندوستان میں چمکنے والے سورج کی روشنی میں ہم کو بھی ایک ایسا علاقہ ملنا چاہیے جہاں ہم اپنی اسلامی حکومت قائم کر سکیں۔ بالآخر ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک ایسا مطمح نظر پا لیا ہے، جس کے لیے وہ زندہ رہ سکیں اور مر سکیں۔ اس قرارداد کی ہمارے مخالفین غلط تاویلات کر رہے ہیں مگر ان کو منہ کی کھانی پڑ رہی ہے...... میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ مخالفین کے پروپیگنڈے پر اعتبار نہ کریں۔“

اس کانفرنس کے اختتام کے بعد وہ کچھ عرصہ بمبئی میں مقیم رہے۔ اس دوران قائداعظم سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی اور نہایت عجلت میں لکھنؤ آنا پڑا کیونکہ یہاں ان کی والدہ کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔

وہ اپنی والدہ کی تیمارداری میں لگے ہوئے تھے کہ ایک اندوہناک خبر ملی۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ سر سکندر حیات نے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندو مسلم مفاہمت کے لیے کانگریس سے مذاکرات شروع کر دیے تھے۔ گویا مسلمان ہوتے ہوئے بھی انہوں نے مسلمانوں کا ساتھ نہ دیا۔

راجا صاحب نے فوراً قائداعظم کو ٹیلی گرام ارسال کیا۔ ”سر سکندر حیات کا یہ اقدام شرمناک اور مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف ہے۔ مسلمان آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور آپ کے ساتھ ہی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے رہیں گے۔“

والدہ کی تیمارداری سے ذرا فرصت ملی اور والدہ کی حالت قدرے سنبھلی تو انہوں نے والدہ سے بمبئی جانے کی اجازت طلب کی۔

”امی جان، جی تو یہی چاہتا ہے کہ زندگی بھر آپ کے قدموں میں بیٹھا رہوں۔ ریاست کے کام الگ مجھے روکتے ہیں لیکن اس وقت ہندوستان کے مسلمان نہایت نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اس وقت ذرا سی کوتاہی ان کے مستقبل کو تاریک کر سکتی ہے۔ بمبئی میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہونے والا ہے۔ آپ کی اجازت ہو تو میں اس اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی چلا جاؤں۔“

”بیٹا میں تمہیں قومی کاموں سے کس طرح روک سکتی ہوں۔ تمہارے والد اللہ بخشے مرتے دم تک برطانیہ سے لڑتے رہے۔ میرا خاندان بھی ایسے ہی مجاہدوں سے بھرا پڑا ہے۔ تم میری فکر مت کرو۔ جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا۔ تم فوراً جاؤ اور محمد علی جناح کے ہاتھ مضبوط کرو۔“

والدہ کی اجازت ملتے ہی آپ اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی روانہ ہو گئے۔

راجا صاحب نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں چند ذاتی مجبوریوں کی بنا پر تجویز پاکستان کے وقت لاہور اجلاس میں شریک نہ ہو سکا لیکن مجھے ہندوستان کے جن صوبوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا میں نے پاکستان اسکیم کا صحیح مفہوم لوگوں کو سمجھانے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ ہمارے مخالفین یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسکیم ناقابلِ عمل ہے لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان اسکیم ہی مسلمانوں کے حقوق کی سچی ضامن ہے۔

اسی دوران کچھ ایسے معاملات پیش آئے کہ کانگریس کی سازش سے آل بنگال مسلم اسٹوڈنٹس لیگ نہ صرف دو حصوں میں تقسیم ہو گئی بلکہ آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے بھی طالب علم بددل ہونے لگے۔ اس ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو روکنے میں راجا صاحب نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ فیڈریشن کی حیثیت سے انہوں نے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی نے ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی جو راجا صاحب نے قائداعظم کو ارسال کر دی۔ یہ رپورٹ ارسال کر کے راجا صاحب مسلم لیگ کے ایک وفد کے ہمراہ پٹنہ چلے گئے جہاں انہیں مسلم لیگ کے تنظیمی امور پر مقامی رہنماؤں سے تبادلہ خیال کرنا تھا۔ یہاں ایک جلسہ بھی ہوا جس میں وفد کے تمام ارکان نے خطاب کیا۔ اس جلسے میں بھی راجا صاحب نے پاکستان اسکیم کی وضاحت کی۔ ”پاکستان ہماری منزل ہے۔ ہم اس منزل پر پہنچنے کا عزم کر چکے ہیں۔ ہمیں یہ منزل حاصل کرنا ہے۔“

اس دوران وہ مسلسل سفر میں رہے۔ یہ وقت انہوں نے پنجاب اور صوبہ بہار میں مسلم لیگی رہنماؤں اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں سے تنظیمی امور پر تبادلہ خیال کرنے میں گزارہ۔

1940ء کے نومبر میں وہ ایک مرتبہ پھر بہار کے دورے پر گئے جہاں برپا ہونے والی پاکستان کانفرنس کی صدارت کی۔ یہاں انہوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”اسلام کی دولت مشترکہ میں رنگ و نسل کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام میں سب ایک ہیں۔ انسانیت کو آزاد کرانے اور اللہ کے پیغام کو تمام دنیا میں پھیلانے کے لیے لازم ہے کہ پہلے آپ اپنے اندر کی برائیوں کو دور کریں۔ اسلام ایک عملی دین ہے صرف عقیدے کا نام نہیں۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود وہ ہمیشہ قائداعظم سے رابطے میں رہتے تھے۔ ایک ایک پل کی خبریں بذریعہ خط ارسال کرتے رہتے تھے۔

راجا صاحب مجاہدانہ مزاج رکھتے تھے اس لیے خاکسار تحریک کے اکثر لوگوں سے بھی ان کا رابطہ رہتا تھا۔ خاکساروں اور پنجاب حکومت کے درمیان تنازع شدت اختیار کر گیا تو یہ رابطہ مزید تیز ہو گیا۔ اس دوران ان کے ایک دوست خاکسار تحریک کے ایک ایسے عہدے پر مامور ہو گئے جو علامہ مشرقی کے بعد سب سے اہم عہدہ سمجھا جاتا

تھا۔ راجا صاحب نے انہیں اعتماد میں لے کر یہ کوشش کرنی چاہی کہ خاکسار تحریک اور مسلم لیگ میں تعاون کی فضا بحال ہوجائے تاکہ تمام مسلمان مل کر مشترکہ مقاصد کے لیے جدوجہد کریں۔

"کیا آپ یہ نہیں چاہیں گے کہ برصغیر کے تمام مسلمان مشترکہ جدوجہد کریں۔" راجا صاحب نے اپنے دوست سے کہا جو خاکسار تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام "باقی" تھا۔

"سب کو اپنی اپنی حیثیت باقی رکھنے کا حق ہوتا ہے۔"

"میں یہ نہیں کہتا کہ اپنی حیثیت گنوا کر کوئی ہمارا ساتھ دے۔" راجا صاحب نے قدرے توقف سے کہا۔ "میں تو صرف تعاون کی بات کررہا تھا۔ منزل ایک ہو تو اپنے اپنے کارواں کے ساتھ بھی منزل تک جایا جاسکتا ہے۔"

"راجا صاحب، میں آپ کا مطلب بھی سمجھ رہا ہوں اور آپ کی باتوں کا دل سے قائل بھی ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں طرف سے خیرسگالی کے جذبے کا اظہار ہو۔"

"آپ فرمائیں میری جماعت سے آپ کس خیرسگالی کا اظہار چاہتے ہیں۔"

"دیکھیے اس وقت علامہ مشرقی نظر بند ہیں۔ اگر لیگ کی مقامی تنظیمیں ایسے جلسے منعقد کریں جن میں علامہ صاحب کی رہائی کا مطالبہ کیا جائے۔ اس سے خاکساروں کے دلوں میں لیگ کے لیے نرم جذبات پیدا ہوں گے۔"

"آپ کی تجویز صائب ہے لیکن اس کے لیے مجھے قائداعظم کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔"

راجا صاحب نے کئی دن تک چلنے والی اس گفتگو کو قائداعظم تک پہنچا دیا۔ یہ بھی لکھ دیا کہ اگر آپ حکم دیں تو میرے یہ دوست آپ سے ملاقات کے لیے بھی تیار ہیں۔

قائداعظم نے اس تجویز کا خیرمقدم کیا اور لکھا کہ وہ کراچی سے واپس آکر مسٹر باقی سے ملیں گے۔

راجا صاحب کارکنوں کی اقتصادی اور سیاسی تربیت کے لیے دیہات کے دورے پر نکل گئے۔

راجا صاحب وہ واحد رہنما تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران تنظیم کو مقبول بنانے کے لیے کم و بیش تمام شہروں کے دورے کیے بلکہ چھوٹے سے چھوٹے دیہات میں بھی گئے اور عام مسلمانوں میں اس قدر گھل مل گئے کہ تمام اقتصادی اور سماجی محرومیاں ان پر ظاہر ہوگئیں۔ یہ دورے وہ اکثر کرتے رہتے تھے۔

وہ اگرچہ ایک دولت مند ریاست کے نواب تھے۔ ان کے لہو میں شاہی طریق موجزن تھے لیکن غریب پروری مزاج کا حصہ تھی۔ فلاح و بہبود کے لیے اقدامات کرنا ان کی ترجیحات میں شامل تھا۔ حتیٰ کہ اس مقصد کے لیے انہوں نے مسلم لیگ کا پلیٹ فارم بھی استعمال کیا اور سالانہ اجلاس لکھنؤ کے موقع پر آپ نے ایک قرارداد پیش کی جس میں مسلمانوں کی اقتصادی، سماجی اور تعلیمی ترقی کے لیے اقدامات تجویز کیے۔

مسلمانوں کی اقتصادی صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے تنظیمی سطح پر کارروائی کا یہ موقع سالانہ اجلاس (1941ء) مدراس کے موقع پر آیا۔

مدراس کے لیے روانہ ہوتے ہوئے دورانِ سفر قائداعظم اچانک علیل ہوگئے۔ جب ٹرین مدراس کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو قائداعظم نے فرمایا۔ "راجا صاحب، میری نمائندگی تم کروگے۔ جو کام مجھے کرنے تھے وہ تم کروگے۔"

یہ وہ اعتبار تھا جو قائداعظم ان پر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ راجا صاحب، قائداعظم کے نمائندے کے طور پر اس مخصوص گاڑی میں سوار ہوئے جس میں قائداعظم کو سوار ہونا تھا۔ جلسہ گاہ میں پہنچ کر پرچم کشائی کا فریضہ بھی آپ ہی نے انجام دیا اور قائداعظم کی نمائندگی کرتے ہوئے تقریر بھی کی۔

اس اجلاس میں نوابزادہ لیاقت علی خان بھی موجود تھے لیکن راجا صاحب کو قائداعظم کی نیابت کا ملنا ان کی خدمات کا بے لوث اعتراف تھا۔

ورکنگ کمیٹی کے ارکان بھی ان کے قائل تھے اس لیے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اجلاس میں کئی قراردادیں پیش کی گئیں۔ ایک قرارداد یہ بھی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی، سماجی اور سیاسی ترقی کے لیے ایک پانچ سالہ منصوبہ تیار کرے۔ راجا صاحب کو اس کمیٹی کا کنوینر مقرر کیا گیا جبکہ وہ قائداعظم کی نمائندگی کرتے ہوئے اجلاس کی صدارت بھی کررہے تھے۔

راجا صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا جارہا تھا۔ مسلم لیگ کی صوبائی اور ضلعی شاخوں سے مسلسل دعوت نامے موصول ہورہے تھے۔

ان مصروفیات نے انہیں اپنی ریاست کی طرف سے غافل کردیا تھا۔ وہاں کچھ ایسے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تھے جن کی وجہ سے وہ خاصے پریشان تھے۔ اور یہ مسائل مسلم لیگ کے دشمنوں کے پیدا کردہ تھے۔ انہوں نے گھبرا کر قائداعظم کو خط ارسال کیا اور خود محمود آباد پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے خط تحریر کیا۔

"بارش کی کمی کی وجہ سے ریاست کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ میری موجودگی یہاں ضروری ہے البتہ میں صوبائی تنظیموں سے خط و کتابت کرتا رہتا ہوں۔" لفظ بارش بارانِ رحمت کو مدِنظر رکھ کر انہوں نے استعمال کیا تھا کیونکہ جانتے تھے کہ یہ بات پھیلی تو کانگریس جی جان سے اس آگ کو ہوا دینے میں جٹ جائے گی۔

راجا صاحب صرف دو مہینے اپنی ریاست میں رہ سکے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ قائداعظم کانپور آرہے ہیں تو وہ بھی ان سے ملاقات کے لیے کانپور پہنچ گئے لیکن قائداعظم سے ملاقات نہ ہوسکی۔ قائداعظم اسی روز کانپور پہنچے تھے۔ اپنے شاندار استقبال اور جلوس کی گہما گہمی میں اتنے تھک گئے کہ ڈاکٹر عبدالصمد کے مکان پر کچھ دیر کے لیے ٹھہر گئے۔

راجا صاحب ملاقات کے لیے پہنچے تو معلوم ہوا وہ سوچکے ہیں۔ راجا صاحب کے پاس وقت نہیں تھا۔ انہیں ایک اجلاس میں شرکت کے لیے لکھنؤ پہنچنا تھا۔ انہوں نے قائداعظم کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور قائداعظم کے نام ایک رقعہ لکھ کر لکھنؤ چلے گئے۔

وہ ابھی لکھنؤ میں تھے کہ بہار میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ وہ فوراً بہار پہنچے۔ انہوں نے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور بذاتِ خود امدادی کاموں کی نگرانی کی۔ واپسی پر انہوں نے کلکتہ میں قیام کیا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ایک بیان جاری کیا۔

"میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے تنظیمی دورے پر تھا کہ میں نے بہار کے خوفناک فسادات کی خبر سنی لہٰذا اپنا دورہ منسوخ کرکے بہار آگیا تاکہ میں اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی حالت دیکھ سکوں۔ میں فساد زدہ علاقوں اور بستیوں میں گیا اور میں نے دیکھا کہ مسلمانوں نے اپنی جان بچانے کے لیے پوری پوری بستیاں خالی کردی تھیں۔ خاکستر مکانات، ویران مساجد، گرے ہوئے مینار اور کھلی ہوئی قبروں کے نظارے سے زیادہ دردناک کوئی واقعہ نہیں ہوسکتا۔ مسلم لیگی کارکن امدادی کام کررہے ہیں۔"

انہوں نے اس بیان میں مسلمانانِ ہند کے مطالبۂ پاکستان کا اعادہ کیا اور کہا کہ پاکستان ہی ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل ہے۔"

راجا صاحب اس وقت وہ کام کررہے تھے جس سے قائداعظم کو بے پناہ سہولتیں مل رہی تھیں۔ وہ مسلسل سفر میں تھے اور ہر جگہ کے حالات کی رپورٹیں تواتر سے قائد کی خدمت میں روانہ کررہے تھے۔ ان رپورٹوں کی روشنی میں قائداعظم کو فیصلے کرنے میں آسانی ہورہی تھی۔ مثلاً ایک خط میں انہوں نے تحریر کیا۔ "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس وقت تک مسلم لیگ کی نئی ورکنگ کمیٹی کے ارکان کے ناموں کا اعلان نہ کریں جب تک میں آپ کو بنگال کی صورتِ حال کے بارے میں اپنی رپورٹ ارسال نہ کردوں۔"

قائداعظم نے یہی کیا اور جب رپورٹ مل گئی اس کے بعد ناموں کا اعلان کیا۔

کہاں کیا ہورہا ہے۔ کس مسئلے سے کس طرح نمٹنا ہے۔ یہ قائد کو راجا صاحب مطلع کررہے تھے اور قائداعظم بمبئی میں بیٹھ کر ملک کے دور دراز گوشوں سے باخبر رہتے تھے۔

ایک آدمی اتنے کام کرسکتا ہے۔ اس کا یقین راجا صاحب کو دیکھ کر ہوتا تھا۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ذمے داریاں الگ جس کی شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔

راجا صاحب کی مصروفیات ہشت پہلو تھیں۔ وہ سیاست اور مذہب پر یہ یک وقت عمل پیرا تھے یہی وجہ تھی کہ انہیں صرف ہندوستان سے سروکار نہیں تھا۔ ان کو عالم اسلام کی بالادستی اور امن بہت عزیز تھا۔ اس جذبے کے تحت انہوں نے کابل جانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے لیے انہیں قائد کی اجازت کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے انہوں نے قائد کو خط لکھا لیکن اس کا جواب نہیں آیا۔ راجا صاحب نے ایک خط پھر لکھا۔

"شاید وہ خط آپ کو نہیں مل سکا جس میں آپ سے میں نے کابل روانگی کی اجازت طلب کی تھی۔ میں آپ کے پاس کابل جانے سے قبل آنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن چونکہ میں اپنے عطیے کے بارے میں انتظام نہیں کرسکا تھا اس لیے مجھے خالی ہاتھ آپ کے پاس آنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

قائداعظم نے اس خط کا جواب دینا ضروری سمجھا۔

”مجھے آپ کا سابقہ خط مل گیا تھا اور یہ ضروری تصور نہیں کرتا کہ آپ افغانستان جانے کے لیے میری اجازت کے منتظر ہوں گے۔ بہرحال اگر آپ میرے رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو موجودہ حالات میں افغانستان جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ لحہ بہ لحہ حالات بدل رہے ہیں، کسی وقت بھی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کرسکتا ہوں۔ جہاں تک آپ کے بمبئی آنے کا تعلق ہے تو میں متوقع تھا کہ آپ بمبئی آرہے ہیں۔ آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ جب تک مسلم لیگ کے فنڈ کے لیے عطیہ نہیں دیں گے اس وقت تک میری صورت نہیں دیکھیں گے۔ آپ صرف اس لیے خالی ہاتھوں میرے پاس آرہے ہیں کہ آپ نے جس بیش بہا عطیے کا طے کر رکھا ہے اس کا ابھی انتظام نہیں ہوا۔ آپ اپنے گھر آرہے ہیں۔ برائے مہربانی عطیہ کے بارے میں زیادہ فکر مند نہ ہوں۔“ (عطیہ کی خاطر راجا صاحب نے بہت سارے گاؤں نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کردیئے تھے)

کانگریس کی جانب سے ”ہندوستان چھوڑ دو“ تحریک کا آغاز کردیا گیا تھا۔ یہ تحریک اگرچہ بظاہر حکومت کے خلاف تھی لیکن اس کے دوررس اثرات مسلمانوں پر پڑنا لازمی تھے لہٰذا اس کا جائزہ لینے کے لیے قائداعظم نے بمبئی میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کرلیا۔

راجا صاحب نے افغانستان جانا ملتوی کردیا اور بمبئی پہنچ گئے۔

حکومت نے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے تمام اراکین کو گرفتار کرلیا۔

قائداعظم کے مکان پر مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہوا جو چار دن تک جاری رہا۔ چار دن کے بحث ومباحثہ کے بعد اراکین اس نتیجے پر پہنچے کہ اس وقت نہ تو کانگریس کا ساتھ دینے کی ضرورت ہے اور نہ برطانیہ سے جنگ مول لینے کی۔ جو قرارداد منظور کی گئی اس میں کہا گیا تھا۔ ”مسلم لیگ مسلمانوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ کانگریس کی شروع کردہ تحریک سے ہر طرح دور رہیں اور پُرامن زندگی گزارنے کی جدوجہد کریں۔“

راجا صاحب قائداعظم کے اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھے اس لیے اجلاس ختم ہوجانے کے بعد بھی وہ بمبئی میں رکے رہے اور اس قرارداد پر تفصیلی بحث کی لیکن دو دن کے اندر ہی ان پر ثابت ہوگیا کہ قائداعظم کا فیصلہ صحیح تھا۔

قائداعظم کی یہ دلیل نہایت مضبوط تھی۔ ”کانگریس کی موجودہ تحریک کا مقصد ملک میں آباد تمام افراد کے لیے آزادی کا حصول نہیں بلکہ ہندو راج کا قیام ہے تاکہ مسلمانوں کی حتمی منزل پاکستان پر کاری ضرب لگائی جاسکے لہٰذا اس مرحلے پر مسلمانوں کو انگریزوں سے جنگ شروع کرنے کے بجائے خود کو منظم اور طاقتور بنانے کی طرف مکمل توجہ دینا چاہیے۔“

انہوں نے یہ جواز بھی پیش کیا۔ ”یہ تحریک مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کیے بغیر شروع کی گئی ہے لہٰذا لیگ سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ اس تحریک میں شمولیت اختیار کرے گی۔“

ان دلیلوں کے بعد راجا صاحب مطمئن ہوگئے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔ یہ اجلاس دہلی میں راجا صاحب کی صدارت میں ہوا۔

راجا صاحب نے ملک کی سیاسی صورتِ حال پر مفصل تبصرہ کرنے کے بعد طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ کانگریس کی موجودہ تحریک سے خود کو مکمل طور پر علیحدہ رکھیں۔

اس اجلاس میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی۔ ”مسلمان طالب علم ملک کی آزادی کے لیے کسی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن یہ ہندو نہ ہندوؤں کے لیے آزادی چاہتے ہیں، نہ مسلمانوں کے لیے۔ وہ اس تحریک کے ذریعے مسلمانوں کے مطالبۂ خودمختاری کو پس پشت ڈال کر ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی مسلمان کبھی اجازت نہیں دیں گے۔“

اس کے بعد راجا صاحب پشاور کے دورے پر روانہ ہوگئے۔ وہاں انہوں نے سرحدی قبائل کو مطالبۂ پاکستان کے حقائق سے آگاہ کیا اور مختلف اجتماعات سے خطاب کرتے رہے۔

صوبہ سرحد سے واپسی پر آپ لاہور آئے۔

صوبہ سرحد اور پنجاب کے دوروں کے بعد راجا صاحب علیل ہوگئے لہٰذا لکھنو چلے آئے اور ایک مرتبہ پھر ان کی سیاسی سرگرمیاں معطل ہوگئیں۔

راجا صاحب تحریک پاکستان کے وہ مجاہد تھے جو کسی وقت بھی اپنے کام سے غافل نہیں رہتے تھے۔ علالت کے زمانے میں جب وہ دورے موقوف کردیا کرتے تھے تو خطو کتابت کے ذریعے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچاتے رہتے تھے۔ کبھی کسی کو فنڈ اکٹھا کرنے کی تلقین کررہے ہیں۔ کسی کو پمفلٹ شائع کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ کسی مسئلے پر قائداعظم سے مشورہ طلب کررہے ہیں۔ ان کی بیماری کا کمرا چھوٹا سا دفتر بن کر رہ جاتا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے نتائج سامنے آرہے تھے۔ اقتصادی اور معاشرتی بدحالی کا سامنا تھا۔ کانگریس کی تحریکِ سول نافرمانی صورتِ حال کو سنگین بنارہی تھی۔ کانگریس کے تمام رہنما جیل میں تھے۔ مسلم لیگ کو اپنی ساکھ بحال رکھنے میں سخت جدوجہد کا سامنا تھا۔ ایسے میں بنگال میں قحط پڑگیا اور ہزاروں افراد ہلاک ہوگئے۔ بنگال کے وزیراعلیٰ مولوی فضل الحق سے مسلم لیگ کے تعلقات بگڑ گئے تھے۔

اتنے مسائل میں گھرے ہوئے راجا صاحب محمود آباد مایوسی کا شکار ہوگئے اور انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ راجا صاحب شروع ہی سے سیاست اور مذہب پر بہ یک وقت عمل پیرا تھے۔ اچانک ان پر یہ کیفیت طاری ہوئی کہ ان کا جھکاؤ مذہب کی طرف بہت بڑھ گیا اور سیاست سے جزوی طور پر کنارہ کش ہوگئے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کے اندر جذبۂ ایمانی کو فروغ نہیں دیا جائے گا اور قرآن مجید کے پیغام پر عمل کرنے کی انہیں ترغیب نہیں دی جائے گی اس وقت تک ہندوستان میں مسلمانوں کی کامیابی کا کوئی راستہ ہموار نہیں ہوگا۔

سیاست سے ان کی کنارہ کشی قائداعظم کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ ان کا دستِ راست ان سے چھن رہا تھا۔ ان کو کسی ایسے آدمی کی تلاش ہوئی راجا صاحب جس کی بات مان سکیں اور اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں۔ ان کی نگاہِ انتخاب مرزا ابوالحسن اصفہانی پر پڑی۔

راجا صاحب لکھنؤ سے محمود آباد چلے گئے تھے۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی ان سے ملاقات کے لیے محمود آباد گئے۔ راجا صاحب لوگوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ اتنی فرصت نہیں تھی کہ راجا صاحب سے گفتگو کا موقع ملتا۔ آخر کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد تنہائی ملی اور گفتگو کا موقع ملا۔ کھل کر گفتگو کی اور مسٹر اصفہانی انہیں یہ باور کرانے میں کسی حد تک کامیاب ہوگئے کہ سیاست میں ان کی موجودگی کتنی ضروری ہے۔

”آپ کی سیاست سے دست برداری اور محمود آباد کے قلعے کی چاردیواری کے اندر مذہب پر کُل وقتی توجہ غلط فہمیوں کو ہوا دے رہی ہے۔“

مرزا اصفہانی نے ان پر زور دیا کہ وہ کلکتہ آئیں اور بنگال میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو منظم کریں۔

”آپ کہتے ہیں تو میں ضرور کلکتہ جاؤں گا۔“

”صرف کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس وقت تک آپ پر نظر رکھوں گا جب تک یوپی خصوصاً اپنا شہر چھوڑ نہیں دیتے۔“

”آپ مجھ پر نگران مقرر ہوئے ہیں تو میں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دوں گا۔“

انہوں نے واقعی زیادہ انتظار نہیں کرایا اور گوشہ نشینی سے باہر نکلے۔ ایک مرتبہ پھر لکھنو کو مستقر بنایا اور دہلی کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی سے کیے گئے وعدے کو پورا کیا اور کلکتہ چلے گئے۔ یہاں انہیں نوجوانوں کو منظم کرنا تھا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے نہ صرف مسلم لیگ کو مستحکم کیا بلکہ طالب علموں کی تنظیم پر بھی بھرپور توجہ دی۔ یہاں سے انہوں نے قائداعظم کے نام ایک خط لکھا۔

”آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بنگال کے طالب علم منظم ہوچکے ہیں اور ان کا اجلاس اگست (1943ء) سے ہورہا ہے۔ وہ آپ سے اس اجلاس کے افتتاح کی درخواست کرچکے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ بنگال کے طالب علم مسلم لیگ کے ساتھ مضبوط وفاداری رکھتے ہیں اور یہ بات بلاتامل کہی جاسکتی ہے کہ وہ مسلم لیگ سے ان افراد کے مقابلے میں زیادہ سرگرم تعاون کررہے ہیں جو بنگال میں مسلم لیگ کی نمائندگی کررہے ہیں۔ انہوں نے نہایت جرات سے فضل الحق کی وزارت کی جانب سے لاٹھی چارج اور دیگر ظالمانہ کارروائیوں کا مقابلہ کیا ہے۔

میں آپ سے ملتمس ہوں کہ ان طالب علموں کی درخواست قبول کرلیجیے۔ اجلاس کی تاریخ آپ پر چھوڑ دی ہے۔ قائداعظم نے وعدہ کرلیا تھا مگر اس سے پہلے ہی ایک خاکسار نے قائداعظم پر قاتلانہ حملہ کیا۔ قائداعظم اس میں بچ گئے لیکن مسلمانوں کو اس واقعے نے خوفزدہ کردیا۔ مسلمانوں میں جہاں عدم تحفظ پیدا ہوا وہیں قائداعظم سے عقیدت میں بھی اضافہ ہوا۔ جگہ جگہ جلسے منعقد ہونے لگے۔ راجا صاحب لکھنو آئے اور یوم تشکر سے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ پھر بمبئی جاکر قائداعظم سے ملاقات کی۔

”آپ کلکتہ سے کیوں آگئے۔ آپ میری جان کی

پروا کیے بغیر کلکتہ جائیں اور اپنا کام جاری رکھیں۔"

قائد کے لہجے میں ایسی خفگی تھی کہ راجا صاحب اسی روز کلکتہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ بنگال پہنچتے ہی انہوں نے قحط سے متاثرہ علاقوں کا تفصیلی دورہ کیا اور مسلم لیگ کی جانب سے ہونے والے انتظامات کا جائزہ لیا۔ ان کے سامنے صرف قحط زدہ علاقے ہی نہیں تھے بلکہ بنگال کے طالب علموں کا انتشار بھی ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں سے کام لے کر ٹکڑیوں سے بٹے ہوئے طلبہ کو یکجا کیا۔

جب وہ سب کو ایک پلیٹ فارم پر لے آئے تو اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت راجا صاحب نے کی۔

طلبہ نے بھی ان کی ملی خدمات کو سراہتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے جلسے منعقد کیے۔ ان جلسوں سے انہوں نے پھر وہی اپنا پرانا مطالبہ دہرایا۔ "مطالبۂ پاکستان کو تسلیم کرلینا ہی وہ واحد راستہ ہے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آزادی حاصل ہوسکتی ہے۔"

مسلم طلبہ کے لیے راجا صاحب کی چند سالہ خدمات ناقابلِ فراموش رہی تھیں۔ طلبہ کی رہنمائی کے لیے ملک گیر دورے کیے تھے ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو ابھارنے میں ان کی مدد کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ طالب علم اپنے مسائل ان سے کہتے تھے۔ قائداعظم کی طرح ان کا بھی طلبہ کو یہی مشورہ تھا کہ وہ عملی سیاست سے دور رہیں۔

"عملی سیاست سے الگ رہ کر صرف حالات کا مشاہدہ کریں تاکہ وہ خود کو مستقبل کے لیے بہتر طور پر تیار کرسکیں۔"

نئے ملک پاکستان کا بھی ان کی نظروں میں ایک خاص تصور تھا۔

مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے 46-1945 کے انتخابات کا زمانہ آگیا۔ مسلم لیگ انتخابی لائحہ عمل کے تحت کام کررہی تھی۔ راجا صاحب مسلمان طالب علموں کو انتخابی مرحلے کے لیے منظم کرنے کی جانب پوری توجہ صرف کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے تین سال کے تعطل کے بعد فیڈریشن کا ترجمان جریدہ The Awakening علی گڑھ سے جاری کیا اس جریدے کے "اسلامی کیمپ نمبر" کے لیے راجا صاحب نے طلبہ کے نام پیغام جاری کیا جس میں انہیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔ "صرف اسلامی طرزِ زندگی ہی ایک علیحدہ وطن کے مطالبہ کے لیے مضبوط دلیل ثابت ہوسکتی ہے۔"

1945 کے انتخابات میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں پر مسلم لیگ نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ راجا صاحب بمبئی میں قائداعظم کے حلقہ انتخاب میں مصروف تھے لیکن انہیں لکھنؤ سے نامزد بھی کیا تھا۔ یہ ان کی مقبولیت کی انتہا تھی کہ انہوں نے اپنے حلقہ انتخاب کا ایک مرتبہ بھی دورہ نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ مخالف امیدوار کی ضمانت ضبط ہوگئی۔

مسلم لیگ کی کامیابی مطالبۂ پاکستان کی منزل کو مزید قریب لے آئی کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ نے ان انتخابات میں نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر حصہ لیا تھا۔

ان انتخابات سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آگئی کہ ہندوستان میں صرف دو بڑی جماعتیں ہیں۔ ہندوؤں کے لیے کانگریس اور مسلمانوں کے لیے مسلم لیگ۔

اب مسلم لیگ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مسلم لیگ کی اس تاریخی فتح نے نیشنل کانگریس کو تو خیر سخت ہزیمت سے دوچار کیا ہی تھا، ان مسلمانوں کو بھی شکست سے دوچار کیا جنہوں نے مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی۔ ان میں سے بعض نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ ان شامل ہونے والوں میں کچھ ایسی کالی بھیڑیں بھی تھیں جنہیں اپنے مفادات عزیز تھے یا انہوں نے شمولیت ہی اس لیے اختیار کی تھی کہ مسلم لیگ کو نقصان پہنچائیں۔ اس کے لیے انہوں نے یہ کوششیں شروع کردیں کہ کسی طرح مسلم لیگ کے دیرینہ اور مخلص رہنماؤں کو سیاسی منظر سے ہٹادیں۔ راجا صاحب ان مخالفتوں کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ انہوں نے ان مخالفین سے الجھنے کے بجائے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو محدود کردیا۔

مطالبۂ پاکستان کی منزل قریب سے قریب تر آتی جارہی تھی۔

1946 میں ایک کیبنٹ مشن ہندوستان پہنچا۔ وزیراعظم برطانیہ نے اس مشن کا مقصد لفظوں میں بیان کیا۔

"ہندوستان کو جلد از جلد آزادی حاصل کرنے میں مدد دینا ہے...... ہم اقلیتوں کے حقوق سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہ فیصلہ ہندوستانیوں کو کرنا ہے کہ وہ کس قسم کی آزادی چاہتے ہیں۔"

اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے

فرمایا "مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ خود مختاری ان کا حق ہے...... ہندوستان کے مسلمان تقسیم ہند چاہتے ہیں اور یہی ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل ہے۔"

دہلی میں مسلم لیگ کے صوبائی اور قومی اسمبلی کے نو منتخب ارکان کا کنونشن ہونے والا تھا۔ اس کنونشن کی تیاریوں میں راجا صاحب پیش پیش تھے۔ اینگلو عرب کالج دہلی کو کنونشن کے انعقاد کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے قافلے دہلی پہنچنا شروع ہوگئے۔

چھ سو مہمانوں کے لیے حکومتِ ہند کے جدید تعمیر شدہ خوبصورت کوارٹروں میں قیام کا بندوبست کیا گیا تھا اور اس آبادی کا نام "پاکستان کالونی" رکھا گیا۔

مسلمانوں کا جذبہ دیدنی تھا۔ پاکستان کالونی میں آتے ہی مسلمان سمجھتے تھے پاکستان آگئے۔ دہلی کے مختلف ہوٹلوں میں بھی مسلم لیگی رہنما جو دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے تھے آکر ٹھہر گئے۔ پورا دہلی پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ یہ سب راجا صاحب کے مشنِ تدبیر کی عملی شکلیں تھیں۔

اس وقت شہر کی فضا میں ناقابلِ فراموش گرمی پیدا ہوگئی جب قائداعظم کا یہ بیان سامنے آیا۔ "مسلمان پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں" کنونشن میں ایک حلف نامے پر بھی دستخط کیے گئے جس میں کہا گیا تھا۔ "پاکستان اور صرف پاکستان ہی مسلمانانِ ہند کے لیے راہِ نجات ہے۔ پاکستان کے حصول کے لیے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔"

کنونشن کے اختتام پر آل انڈیا مسلم لیگ فیڈریشن کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس راجا صاحب کی صدارت میں ہوا جس میں لیگ کے نومنتخب ارکان اسمبلی نے کنونشن میں منظور کی جانے والی قراردادوں کی حمایت کرتے ہوئے قائداعظم کو ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

اجلاس میں مسلم طلبہ سے اپیل کی گئی کہ وہ متحد رہیں اور ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے خود کو تیار رکھیں لیکن قائداعظم نے تجویز کو رد کردیا۔ وہ قیام پاکستان کے سوا کچھ لینے کو تیار نہیں تھے۔ اس دوران ایک عارضی حکومت کی تجویز بھی سامنے آئی لیکن اس میں مطالبۂ پاکستان کو رد کردیا گیا تھا لیکن قائداعظم کا اصرار یہی تھا۔

"مکمل خودمختار مملکت پاکستان کا قیام ہی ہندوستان کے آئینی مسئلے کا واحد حل ہے۔"

کیبنٹ مشن... کوئی نتیجہ برآمد ہونے سے پہلے ہی رخصت ہوگیا۔ مشن کی روانگی کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس کی بقا اسی میں تھی کہ ہندوستان کے مسئلے کا حتمی حل نکال لیا جائے۔ قائداعظم کا اصرار تھا کہ اگر ہندو چاہتے ہیں کہ ہندوستان آزاد ہو تو اس کا بہترین حل یہ ہے کہ وہ پاکستان کو قبول کرلیں۔

کانگریس اس پر تیار نہیں تھی۔ یہ مسئلہ بظاہر تعطل کا شکار ہوگیا تھا لیکن یہ بات طے ہوگئی تھی کہ قیامِ پاکستان کے علاوہ کوئی حل نہیں۔

راجا صاحب اس تمام عرصے میں مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہوتے رہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کیبنٹ مشن کے ارکان سے ملاقاتیں کرکے مسلم لیگ کا موقف ان تک پہنچاتے رہے۔ مختلف جلسے منعقد کیے اور وہ گفتگو عوام تک پہنچاتے رہے جو اُن کے اور کیبنٹ کے ارکان کے درمیان ہوتی رہی تھی۔

ان کی یہ کاوشیں اس لائق تھیں کہ انہیں سراہا جاتا لیکن ان کی مقبولیت بعض لوگوں کو ہضم نہیں ہوئی۔ اندر ہی سے مخالفتیں شروع ہوگئیں۔

ان رہنماؤں کے طرزِ عمل سے وہ اس قدر کبیدہ خاطر ہوئے کہ تحریک پاکستان کے آخری ایام میں ان کی مصروفیات صرف قائداعظم کے ایک سپاہی کی حیثیت تک محدود ہوکر رہ گئیں۔ اتنے مایوس ہوئے کہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ہندوستان چھوڑ کر عراق میں مستقل رہائش کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ ایک ایسا شخص جس نے اپنی جوانی کے تمام سنہرے دن تحریکِ پاکستان پر قربان کردیے وہ ایسی مایوسی کا شکار ہوجائے۔ یہ المیہ نہیں تو کیا تھا۔

قائداعظم خرابی صحت کی وجہ سے کراچی میں مقیم تھے کہ پے در پے دو تبدیلیوں نے سیاسی گرمجوشی میں اضافہ کردیا۔ حکومت برطانیہ کا یہ اعلان سامنے آیا۔ "حکومت برطانیہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جون 48 سے قبل ہی اقتدار اہلِ ہند کے سپرد کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔"

دوسری تبدیلی یہ آئی کہ وائسرائے ہند لارڈ ڈیول کو سبکدوش کرکے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا نیا وائسرائے مقرر کردیا گیا۔

....

قائداعظم کراچی سے دہلی آگئے۔

راجا صاحب نے بھی پرواز کی اور کلکتہ سے دہلی آگئے

تاکہ قائد سے ملاقات کریں اور نئی صورتِ حال میں ان کے شانہ بشانہ رہیں۔

اسی دوران راجا صاحب نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جسے مسلم لیگ نے ہمیشہ یاد رکھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایشین کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں مصر کا وفد بھی شرکت کے لیے آیا۔ اس وفد کے شرکاء میں ایک سرگرم نوجوان مصطفیٰ مومن بھی شامل تھا۔ جواہر لال نہرو نے اس نوجوان کے کچھ ایسے کان بھرے کہ اس نے ایک انٹرویو میں مسلم لیگ پر بڑی لعن طعن کی اور اس کی سیاست کی مذمت کی۔ راجا صاحب نے اس انٹرویو کا سختی سے نوٹس لیا اور روزنامہ ”ڈان“ کے جنرل منیجر مرزا علی اظہر برلاس کو مصطفیٰ مومن سے رابطے پر مقرر کیا تاکہ وہ اسے اصل صورتِ حال سے باخبر کریں اور اپنا بیان بدلنے پر زور دیں۔

مرزا علی اظہر برلاس راجا صاحب کا پیغام لے کر اس کے پاس گئے اور اپنی طرف سے بھی اسے اصل صورتِ حال سے باخبر کیا۔ مصطفیٰ مومن پر جب مسلم لیگ کا موقف ظاہر ہوا اور کانگریس کی سیاست اس پر منکشف ہوئی تو اس نے نہ صرف مسلم لیگ کے حق میں بیان جاری کیا بلکہ یہ اعلان بھی کیا کہ وہ مصر واپس جا کر مسلم لیگ کو عام کرے گا۔

راجا صاحب نے جب دیکھا کہ پہلی چوٹ کاری لگی ہے تو انہوں نے مصطفیٰ مومن کو ڈنر پر مدعو کیا۔ بس پھر کیا تھا، راجا صاحب سے ملتے ہی وہ ان کے اخلاق کا ایسا گرویدہ ہوا کہ ہندوستان کے قیام کے دوران ہی اس نے عالمی بنیادوں پر مسلم نوجوانوں کے درمیانِ اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے ایک تنظیم کے قیام کا اعلان کیا۔ اس تنظیم کا نام اس نے ”ورلڈ برادر ہڈ آف مسلم یوتھ“ رکھا اور یہ اعلان کیا کہ سالِ رواں کے اختتام پر تنظیم کا اجلاس قاہرہ میں بلایا جائے گا۔ (آگے چل کر اسی کے کارکنوں نے مسلم برادر ہڈ کو فروغ دیا جسے حسن البنا کی اخوان المسلمین کہا گیا جس کی جانب سے مصری صدر مرسی منتخب ہوئے جن کی حکومت گرانے پر آج کل مصر میں سورش برپا ہے)

وزیراعظم برطانیہ کے اعلان کے بعد پورے ہندوستان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی پاکستان بننے والا تھا۔ طویل جدوجہد کے بعد آزادی ملنے والی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ صورتِ حال راجا صاحب کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ انہوں نے روحانی قوت کے حصول کے لیے تیس افراد پر مشتمل ایک قافلے کے ساتھ عراق روانگی اختیار کی۔ عراق کے وزیراعظم اور شہنشاہ ایران نے ان کو ملاقات کا اعزاز بخشا۔ آپ نے بغداد، زاہدان، مشہد اور تہران وغیرہ کے دورے بھی کیے اور ہر جگہ قیام پاکستان کے مقاصد کو واضح کیا اور عام لوگوں سے بھی حمایت کے طالب ہوئے۔ نتیجتاً ایران کی کئی تنظیموں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے حق میں بیان دینا شروع کر دیا۔

آپ بغداد سے واپس آئے تو صورتِ حال بدستور وہی تھی۔ فسادات کا وہی دور دورہ تھا۔ انگریز واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ پاکستان بننے کا انتظار ہو رہا تھا۔ آپ ان فسادات سے بچتے بچاتے، خون کا دریا عبور کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح لکھنؤ پہنچے۔ سخت بے بسی اور مایوسی کا عالم تھا۔ دشمن تاک میں تھے۔ خواب کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے تھے۔ آپ نے اسی بے بسی کے عالم میں اپنی ہمشیرہ کو ساتھ لیا اور کھوکھراپار کی سرحد عبور کر کے حیدرآباد سندھ پہنچ گئے۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی بھی ساتھ تھے۔

قیام پاکستان کا اعلان ہوا۔ جشن آزادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجا صاحب کو وہ تمام مناظر یاد آ رہے تھے۔ وہ تمام صعوبتیں ذہن پر دستک دے رہی تھیں جو پاکستان کی تحریک چلاتے ہوئے انہوں نے برداشت کی تھیں۔ اپنی ریاست کی تمام دولت لٹا دی تھی خزانہ خالی کر دیا تھا۔ اور اب یہ عالم کہ انہیں اسی پاکستان کے جشنِ آزادی کا دعوت نامہ تک نہیں ملا تھا۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ اربابِ اقتدار کو خبر نہیں تھی کہ راجا صاحب پاکستان آ چکے ہیں لیکن مخالفین اور مفاد پرستوں نے وطن پرستوں اور قربانی دینے والوں کو اقتدار سے دور رکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ جمال میاں فرنگی محلی ان سے اصرار کر رہے تھے کہ اس جشن آزادی پر سب سے زیادہ حق تمہارا ہے۔ کراچی سے اس قدر نزدیک ہوتے ہوئے تمہیں اس جشن آزادی میں ضرور شریک ہونا چاہیے لیکن انہوں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا اور حیدرآباد سے کوئٹہ چلے گئے۔ جشن آزادی کی خبریں کوئٹہ تک پہنچ رہی تھیں۔ انہیں شاید ان خبروں سے بھی تکلیف پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے کوئٹہ میں بھی رکنا گوارا نہیں کیا اور زاہدان کے راستے ایران چلے گئے۔ ان کے مخالفین کا داؤ چل گیا تھا۔

وہ قیامِ پاکستان کی خوشی صرف اس قدر منا سکے کہ

کوئٹہ کے ایک پارک میں منعقد جلسے سے خطاب کیا اور پاکستانی پرچم کو سلامی دے کر عازمِ ایران ہو گئے۔

قیام پاکستان کی خوشی سب کو ہوئی تھی لیکن جدوجہدِ پاکستان میں حصہ لینے والے یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کیا ان اندوہ ناک حالات و واقعات کی متقاضی تھی؟ کیا یہ کبھی سوچا تھا کہ اس بڑے پیمانے پر فسادات ہوں گے۔

راجا صاحب بھی تقسیم کے بعد پیدا شدہ صورتِ حال سے تشویش میں مبتلا تھے۔ انہوں نے ہجرت ضرور کی لیکن یہ فیصلہ بھی کیا کہ وہ پاکستان میں قیام نہیں کریں گے۔ وہ جو کوئی کام قائد سے پوچھے بغیر نہیں کرتے تھے، یہ فیصلہ ان سے پوچھے بغیر ہی کر لیا۔ ان سے ملاقات تک نہیں کی۔ صرف اس لیے کہ اب قائد کے ہاتھ مضبوط کرنے والے اور بہت سے ہیں۔

پاکستان سے تعلق کی بنا پر راجا صاحب نے ہندوستان میں ہونے والے فسادات کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور اس کا ذمے دار کانگریس کو ٹھہرایا۔

وہ سفر کے دوران جہاں بھی قیام کرتے وہاں یہی باتیں کر رہے تھے۔ اس کے خطرناک اثرات مرتب ہوئے۔ بعض ہندی نژاد افراد آپ کے دشمن ہو گئے۔ جب راجا صاحب بغداد جانے لگے تو دو افراد نے انہیں قتل کرنے کے لیے ان کا پیچھا کیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مقامی حکومت کو ان کی نقل و حرکت پر شبہ ہوا اور وہ دونوں گرفتار ہوئے۔ انہیں عراق بدر کر دیا گیا۔

وہ بغداد اس لیے نہیں آئے تھے کہ مستقل قیام کریں گے لیکن ان کے بغداد پہنچتے ہی یہ خبریں بلکہ افواہیں پھیلنے لگیں کہ راجا صاحب نے بغداد میں مستقل قیام کر لیا ہے۔ ان افواہوں سے انہوں نے یہ مراد لی کہ کچھ لوگ میری پاکستان واپسی کو پسند نہیں کر رہے ہیں لہٰذا انہوں نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا کہ اب میں بغداد ہی میں رہوں گا۔

اس میں کچھ صداقت بھی تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلم لیگ کی جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہونے کے بعد ختم ہو گئی ہے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان کی سیاست ان خطوط پر استوار نہیں ہو سکے گی جس کے خواب تحریکِ پاکستان کے دوران دیکھے گئے تھے۔

1948 میں یو پی کی گورنر مسز سروجنی نائیڈو بغداد آئیں، انہیں جب معلوم ہوا کہ راجا صاحب محمود آباد بغداد میں ہیں تو وہ ان سے ملنے آئیں۔ ان کے راجا صاحب سے خاندانی مراسم تھے۔ ان کے والد کی زندگی میں سروجنی نائیڈو ایک نہیں سیکڑوں بار ان کے گھر آئی تھیں۔ وہ انہیں ”پھوپی“ کہا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اسی شفقت سے مل رہی تھیں۔ جب بہت سی باتیں کرنے کے بعد اٹھ کر جانے لگیں تو راجا صاحب کو بھارت کے دورے کی دعوت دی جو راجا صاحب نے قبول کر لی۔

یہ سرکاری نہیں ذاتی دعوت تھی۔

بغداد سے بھارت جاتے ہوئے کراچی پہنچے تو قائد اعظم سے ملاقات کا خیال آیا۔ کم از کم ایک سال بعد ان کی ملاقات اپنے قائد سے ہو رہی تھی۔ راجا صاحب اپنے اصولوں کی حفاظت کے لیے پاکستان کی نئی سیاست سے کنارہ کش ہوئے تھے، قائد کی طرف سے کوئی گرہ دل میں نہیں تھی۔ ملنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ وہ ان سے ملنے گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئے۔ اپنا کارڈ اندر بھجوایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک نحیف و نزار آدمی ان کے سامنے تھا جو اچانک بوڑھا ہو گیا تھا۔ یہ قائداعظم تھے۔ ذمے داریوں کے بوجھ سے دبے ہوئے قائداعظم۔ انہوں نے آگے بڑھ کر راجا صاحب کو گلے لگایا۔ چند ہڈیاں تھیں جو اُن سے لپٹ گئی تھیں۔

”امیر احمد، جس کے لیے تم نے اتنی کوشش کی تھی وہ مملکت قائم ہو گئی ہے۔ تم جلاوطنی کیوں اختیار کیے ہوئے ہو۔ یہاں کیوں نہیں رہتے۔ پاکستان کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”فی الوقت تو میں بھارت جا رہا ہوں۔“

”وہاں قیام کرنے کا ارادہ ہے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اسے ایک دورہ ہی سمجھیے۔ میری درخواست تو یہ ہے کہ آپ کو بھی بھارت کا دورہ کرنا چاہیے اور ان مسلمانوں کی ڈھارس بندھانا چاہیے جنہوں نے پاکستان بنانے کی جدوجہد میں حصہ لیا اور پاکستان نہ آ سکے۔ دیکھنا تو چاہیے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اس مرحلے پر اگر میں نے پاکستان چھوڑا تو نئی مملکت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔“

انہوں نے چائے کا ایک کپ راجا صاحب کی طرف بڑھایا تو کمزوری سے یا شدتِ جذبات سے ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

راجا صاحب کو محسوس ہوا کہ نہایت مضبوط اعصاب کے مالک قائداعظم کچھ پریشان ہیں لیکن اپنی پریشانی ظاہر نہ کرنے کی عادت ہمیشہ سے تھی اس وقت بھی رہی۔

قائداعظم سے اس مختصر سی ملاقات کے بعد راجا صاحب روانہ ہوگئے۔

دہلی پہنچ کر وہ جواہر لال نہرو سے ملنے "تین مورتی ہاؤس" پہنچے، اس وقت وزیراعظم جواہر لال نہرو ایک سرکاری میٹنگ میں تھے۔ سیکریٹری نے راجا صاحب کا کارڈ ان کے سامنے رکھ دیا۔ کارڈ پر ایک نظر ڈالتے ہی وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"باقی باتیں پھر ہوں گی۔ راجا صاحب محمود آباد آئے ہیں۔ میں انہیں انتظار نہیں کرا سکتا۔"

میٹنگ برخاست کردی اور فوراً ڈرائنگ روم میں آگئے۔

راجا صاحب سے نہرو خاندان کے پرانے مراسم تھے۔ گھروں میں اسی طرح آنا جانا تھا جیسے رشتے داری ہو۔ سیاسی مخالفت اپنی جگہ لیکن نہرو تمام تلخیاں فراموش کرکے بے حد تپاک سے ملے۔

راجا صاحب نے چند رسمی باتوں کے بعد اپنی گفتگو کو پاکستان ہندوستان کے تعلقات اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار تک محدود رکھا۔ انہوں نے اتنی دلسوزی سے مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا کہ خود نہرو بھی آبدیدہ ہوگئے۔

"راجا صاحب! ہندوستانی مسلمانوں کو سہارا دینے کے لیے آپ جلاوطنی ختم کرکے ہندوستان کیوں واپس نہیں آجاتے۔ آپ واپس آجائیں میں آپ کو شہریت دے دوں گا۔"

"آپ کا شکریہ! مجھے ملکوں سے کم اور انسانوں سے زیادہ دلچسپی ہے اور انسانوں کی خدمت آدمی ہر ملک میں کرسکتا ہے۔"

اس کے بعد وہ لکھنو چلے گئے اور اپنے آبائی مکان میں اترے۔

وہ ابھی لکھنو میں ہی قیام پذیر تھے کہ انہیں قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال کی اندوہ ناک خبر ملی۔ انہوں نے فوراً محترمہ فاطمہ جناح کو جنہیں وہ پھوپی کہا کرتے تھے ٹیلی گرام ارسال کیا۔

"اس غم و اندوہ کے لمحے میں میری طرف سے دلی تعزیت قبول کیجیے۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔"

پاکستان کے نام پر ایک قائداعظم ہی تو تھے جن سے راجا صاحب کو کچھ امید تھی۔ جب وہ ہی نہیں رہے تو سب کچھ لایعنی ہوگیا۔ وہ اگر پاکستان میں رہنے کا سوچتے بھی ہوں گے تو اب یہ سوچ ان کے ذہن سے نکل گئی۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ باقی ماندہ زندگی عراق میں گزاریں گے۔

انہوں نے راجا ہوتے ہوئے درویشوں کی زندگی گزاری تھی۔ خود کو آرام و آسائش کی زندگی کا عادی ہونے ہی نہیں دیا تھا لہٰذا جلاوطنی کے مصائب بہ آسانی جھیلتے رہے۔

اس دوران وہ ایک آدھ مرتبہ پاکستان آئے بھی تو سیاست داں کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مذہبی اسکالر کی حیثیت سے آئے۔ راجا صاحب کی دانش ورانہ حیثیت مسلمہ تھی۔ دنیا بھر کے اسکالروں سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔

1956 میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا چودہ سو سالہ جشن پاکستان میں منانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ یہ طے کیا گیا کہ اس جشن میں عراق کے علما کو بھی مدعو کیا جائے۔

علامہ رشید ترابی اور علامہ حافظ کفایت حسین ایران، عراق کے علما کو دعوت دینے کے لیے روانہ ہوئے۔ بغداد پہنچ کر ان دونوں حضرات نے راجا صاحب سے بھی ملاقات کی اور ان کو ان یادگار تقریبات میں نہ صرف شرکت کی دعوت دی بلکہ استقبالیہ کمیٹی کے سربراہ کا عہدہ قبول کرنے کی بھی درخواست کی۔

راجا صاحب نے یہ دعوت قبول کرلی۔

جشنِ مرتضویؑ کی تقریبات میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لائے۔

کچھ ایسے حالات ہوئے۔ پُرخلوص دوستوں نے کچھ ایسی ضد کی کہ انہوں نے پاکستان میں مستقل رہائش کا فیصلہ کرلیا اور کراچی کو قیام گاہ بنایا۔

پاکستان کے اس وقت کے گورنر جنرل اسکندر مرزا نے جب یہ سنا کہ راجا صاحب نے پاکستان میں مستقل قیام کا فیصلہ کرلیا ہے تو انہیں راجا صاحب کی آبادکاری کا خیال آیا اور ایک ملاقات میں انہوں نے راجا صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

"آپ ہندوستان میں رہ جانے والی اپنی جائداد کی ایک فہرست فراہم کردیں تاکہ حکومت پاکستان اس کے عوض آپ کو معقول معاوضہ ادا کردے۔"

راجا صاحب نے جواب دیا۔ "حکومت پاکستان ایسی کوئی فہرست بھارت کی حکومت سے فراہم کرنے کو کہے۔ میں کیوں ایسی کوئی فہرست فراہم کروں۔" راجا صاحب نے کہا اور پھر ایک اور سوال ان سے کرڈالا۔ "کیا ہندوستان سے آنے والے ہزاروں مہاجرین جو اپنی جائدادیں چھوڑ کر آئے ہیں، ان کو معاوضہ دے دیا گیا ہے۔ یہ عنایت مجھ پر ہی کیوں کی جارہی ہے۔ اگر مجھے معاوضہ دینا ہی ہے تو میں اس وقت تک ہرگز کوئی معاوضہ نہیں لوں گا جب تک تمام مہاجرین کی تلافی نہیں کردی جاتی۔"

اسکندر مرزا یہ توقع بھی نہیں کرسکتے ہوں گے کہ کوئی شخص ایسا بھاری معاوضہ یکسر ٹھکرا سکتا ہے جبکہ وہ اپنے ارد گرد مفادات کی چھین جھپٹ دیکھ رہے تھے۔

ان کے کراچی کے قیام کو نعمت تصور کرتے ہوئے پاکستان مسلم لیگ سے وابستہ کچھ رہنماؤں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لیں تاکہ یہ جماعت اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرسکے لیکن آپ نے انکار کردیا۔

"وہ مسلم لیگ جس نے آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی اور جس نے پاکستان حاصل کیا تھا قائداعظم کے انتقال کے بعد ختم ہوگئی۔ اب میرا مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہیں۔"

انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے سے انکار کردیا تھا لیکن وہ طلبہ کے اجتماعات میں ..... جس قسم کی تقریریں کررہے تھے اور سیاست دانوں پر جس طرح تنقیدیں کررہے تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی پروگرام ان کے ذہن میں کروٹیں لے رہا ہے۔

ان کے ذہن میں ممکن ہے کوئی پروگرام ہو لیکن اس کے اظہار کا موقع نہ آسکا اور ملک میں مارشل لا آگیا۔ جنرل ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

راجا صاحب جیسے جمہوریت پسند شخص کو اس اقدام سے تکلیف پہنچنا لازمی تھا۔ انہوں نے ایک اسلامی اور جمہوری ملک کے لیے جدوجہد کی تھی۔ اب وہ اس ملک کو پابند سلاسل دیکھ رہے ہیں۔ وہ کچھ دنوں تک تو حالات کے سدھرنے کا انتظار کرتے رہے لیکن انہیں یقین ہوگیا کہ یہ تاریک رات گزرنے والی نہیں تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس وقت یہ بھی مشہور ہوا تھا کہ ایوب خان، پاکستان مسلم لیگ کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے اور راجا صاحب پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لیں اور لیگ کے ذریعے ایوب خان کے اقتدار کو طول دیں۔ راجا صاحب نے انکار کردیا اور کسی ممکنہ آفت سے بچنے کے لیے 1962 کے وسط میں یورپ کے طویل دورے پر روانہ ہوگئے۔ انہوں نے ایران اور عراق میں قیام کے علاوہ بیروت میں بھی چند ہفتے گزارے اور وہاں سے فرانس چلے گئے۔

ان کے یہ دورے بھی ان کے مشن کا حصہ تھے۔ وہ جہاں بھی گئے بے شمار افراد سے ملاقاتیں کیں۔ ان میں ادیب وصحافی بھی تھے۔ سیاستدان بھی اور ماہرینِ اقتصادیات بھی، ان ملاقاتوں کے ذریعے وہ ایسے منصوبوں پر غور کرتے رہے جن کا مقصد سماجی اور اقتصادی ترقی کو فروغ دینا تھا۔

فرانس سے راجا صاحب لندن چلے گئے۔ یہاں بھی مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ان ملاقاتوں، مشاورتوں اور منصوبہ بندیوں کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے اور اس کا انہوں نے اظہار بھی کیا کہ پاکستان، ہندوستان اور ایشیا کے دیگر ممالک اس وقت تک اپنے مسائل حل نہیں کرسکتے جب تک کہ وہ اپنے نظام کی بنیاد مساوات پر قائم نہیں کرتے۔

راجا صاحب ابھی لندن میں تھے کہ ایوب خان حکومت نے پاکستان میں سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھالی، سیاسی جماعتیں اپنے اپنے پروگرام مرتب کرنے لگیں۔ پاکستان مسلم لیگ میں بھی جان سی پڑ گئی۔ اس کے دو دھڑے ہوچکے تھے۔ ایک کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس دھڑے نے ایک ملک گیر کنونشن کے انعقاد کا منصوبہ بنایا۔ یہ طے ہوا کہ اس کنونشن کی صدارت کے لیے راجا صاحب کو لندن سے بلایا جائے۔ دلیل یہ دی گئی تھی کہ راجا صاحب تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن اور قائداعظم کے قریبی ساتھی رہے ہیں۔ اس لیے صدارت کے لیے ان سے بہتر نام کسی اور کا نہیں ہوسکتا۔

کنونشن کی صدارت کے لیے ان سے مسلسل رابطے کیے جاتے رہے لیکن وہ مسلسل انکار کرتے رہے اور آخرکار یہ کہہ کر انہوں نے ملاقات ہی ختم کردی۔ ''میں آمریت کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والی کسی سیاسی جماعت کی سرپرستی نہیں کرسکتا۔''

پھر ایک تفصیلی خط میں لکھا۔

''جن حالات میں مسلم لیگ کا وجود عمل میں آیا تھا اس کا اب کوئی وجود نہیں۔ یہ جماعت جن اقدار کو لے کر آگے بڑھی تھی، وہ اقدار اب دم توڑ چکی ہیں اور تبدیل شدہ حالات میں یہ جماعت کسی طرح بھی سود مند ثابت نہیں ہوگی۔ مسلم لیگ نے اپنا مقصد ''پاکستان'' حاصل کرلیا اور وہ ہم کو ایک آزاد ملک دے کر باعزت طور پر مرگئی۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اس ملک کو جمہوری، غیر نسلی، اور ترقی پسندانہ خطوط پر ترقی دیں۔''

راجا صاحب نے مزید لکھا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے جلد وطن واپس آکر ان افراد سے مذاکرات کروں گا جو ملک میں اقتصادی پروگرام پر مبنی ایک پارٹی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔''

لیگ کے منتظمین نے راجا صاحب کے انکار کے بعد چوہدری خلیق الزماں کی صدارت میں کنونشن منعقد کیا۔

اس کنونشن کے انعقاد کے بعد راجا صاحب کا یہ بیان سامنے آیا کہ وہ جلد پاکستان آئیں گے اور مشرقی و مغربی پاکستان کا تفصیلی دورہ کریں گے تاکہ وہ ایک غیر گروہی سیاسی جماعت کے امکانات کا جائزہ لے سکیں۔ اس جماعت کے مقاصد میں مزدوروں، کسانوں اور عام آدمی کے حالات کو بہتر بنانا شامل ہوگا۔

اس اعلان کے فوراً بعد متعدد رہنماؤں نے راجا صاحب سے تعاون کا اعلان کردیا۔ ان میں مشرقی پاکستان کے رہنما عبدالحمید بھاشانی بھی تھے۔

مولانا بھاشانی نے راجا صاحب سے جلد وطن واپسی کی درخواست کی اور کہا کہ میں ذاتی طور پر ان کی قیادت میں کام کروں گا۔ طالب علموں اور مزدور رہنماؤں نے بھی ان سے وطن واپسی کی درخواست کی۔ ''سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ آپ پاکستان واپس آئیں اور ایک نئی جماعت کی بنیاد رکھیں۔''

جب مطالبات بڑھنے لگے تو راجا صاحب جنوری 1963ء میں کراچی آگئے اور ایک سیاسی جماعت کے قیام کے لیے عوام و خواص سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کردیا۔

ان کا یہ خواب سیاسی انتشار کا شکار ہوتا چلا گیا۔ نفسا نفسی کی بھیڑ میں، خود غرضیوں کے ہجوم میں وہ صرف خواب دیکھ سکتے تھے اور دیکھتے رہے۔ وہ لوگوں کی توجہ موجودہ پاکستان کی حالت زار کی طرف دلاتے رہے۔ منادی کرنے والا منادی کررہا تھا لیکن سننے والا کون تھا۔

''پاکستان قائم ہونے کے بعد یہاں بدعنوانیوں نے سر اٹھایا۔ اکثر لوگ لالچ میں گرفتار ہوگئے۔ یہ تکلیف لاکھوں مسلمانوں کے قتل سے زیادہ تکلیف دہ تھی کیونکہ اس سے ہمارا اخلاق تباہ ہوگیا۔''

''ہمارے پیٹ اور معدے بک گئے ہیں اور ہمیں اپنی خوراک خیرات اور قرضوں سے ملتی ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو ہمارے ذہن اور ہماری روح کا بھی نیلام ہوجائے گا۔''

1963ء میں .... پاکستان کی نوساختہ قومی اسمبلی جب آئین سازی کررہی تھی تو راجا صاحب نے قومی اسمبلی کے اراکین اور اسپیکر کے نام ایک ٹیلی گرام ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا کہ وہ فی الحال ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان نہ رکھیں کیونکہ ہماری اخلاقی حالت اس وقت بہت پست ہے۔ ہمارے لیے وہ نام اختیار کرنا ٹھیک نہیں جس کے ہم مستحق نہیں۔

وہ سیاست سے کنارہ کش ہوگئے تھے لیکن پاکستان کی محبت انہیں محتسب کا کردار ادا کرنے پر مجبور کررہی تھی۔ وہ حکومت کی طرف سے غالباً مایوس ہوچکے تھے۔ ان کا کام اب یہ رہ گیا تھا کہ عوام کی تربیت پر زور دیتے رہیں تاکہ مہذب افراد سامنے آسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ان کی ساری توجہ طلبہ کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔ انہیں جو کچھ کہنا ہوتا تھا طلبہ سے کہتے تھے۔

حیدرآباد میں طلبہ سے خطاب کیا تو امریکی امداد کو پاکستان کے عوام کی عزتِ نفس کے لیے ایک چیلنج قرار دیا اور جلد سے جلد چھٹکارے کی دعوت دی۔

''جتنی جلد ممکن ہوسکے ہمیں غیر کی محتاجی سے نکلنا چاہیے خواہ اس مقصد کے حصول کی خاطر ہمیں ایک وقت روکھا سوکھا بھی کیوں نہ کھانا پڑے۔''

انہوں نے سیاسی پارٹی کا منصوبہ بنایا ضرور تھا لیکن سیاست دانوں کو دست و گریباں ہوتے دیکھ کر اس کوچے میں قدم نہ رکھ سکے۔

وہ پاکستان کی سیاسی صورتِ حال سے ایسے دلبرداشتہ ہوئے تھے کہ انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخاب میں بھی کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''پاکستان کی سیاست جس رخ پر نکل کھڑی ہوئی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قائداعظم کی بہن کو بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔''

ایوب خان جیت گئے فاطمہ جناح ہار گئیں۔

انہوں نے انتخابات میں کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا لیکن جب ایوب خان کے حامیوں نے ''جشنِ فتح'' کا جلوس نکالا تو کراچی کے کچھ علاقوں میں فسادات پھوٹ پڑے۔ راجا صاحب تڑپ اٹھے۔ یہ تو وہی صورتِ حال تھی جو کبھی بھارت میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے فوراً شہر کے معززین کا ایک اجلاس کراچی پریس کلب میں طلب کیا۔ اس کی صدارت مرزا ابوالحسن اصفہانی نے کی۔ راجا صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''اس نوعیت کے ہنگامے نہ تو مسلمانوں کے شایانِ شان ہیں اور نہ انسانیت کے لیے باعثِ فخر لہٰذا ایسے تمام لوگ جو خوفِ خدا رکھتے ہیں، انسانیت کے ہمدرد ہیں اور پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے خواہش مند ہیں شہر میں امن و امان کی بحالی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔''

امن کی بحالی کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ راجا صاحب کو اس کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔

ابھی کراچی کا امن پوری طرح بحال نہیں ہوا تھا کہ بھارت نے پاکستان پر جنگ مسلط کردی۔ راجا صاحب ایک مرتبہ پھر متحرک ہوئے۔ ایک اجلاس کراچی پریس کلب میں طلب کیا۔

یہ تمام برادریوں کا نمائندہ اجلاس تھا جس میں پنجاب اور کشمیر میں پھیلنے والی تباہی کا جائزہ لیا گیا اور امداد کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی فنڈ قائم کیا گیا۔ کراچی کے شہریوں سے اپیل کی گئی کہ وہ مصیبت زدگان کے لیے زیادہ سے زیادہ عطیات جمع کرائیں۔

یہ اجلاس کرکے راجا صاحب خاموش نہیں ہوگئے بلکہ چھوٹے بڑے کئی اجلاس اور بھی کیے۔ اپنے تعلقات استعمال کرکے سرمایہ داروں سے فنڈ اکٹھا کیا۔

وہ شخص جس نے کبھی اپنی ریاست کے خزانے کھول دیے تھے اور مسلم لیگ کو مالا مال کردیا تھا، اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ لوگ اپنا ایک آدھ مکان چھوڑ کر آئے تھے وہ ریاست چھوڑ کر پاکستان آگیا تھا۔ صرف ایک نام ساتھ لے کر آیا تھا اور وہ نام تھا راجا صاحب محمود آباد۔

طلبہ اور تعلیم سے ان کا تعلق ہمیشہ قائم رہا تھا۔ ان کے دونوں ہاتھ خالی تھے لیکن دل بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے چند اساتذہ کی مدد سے کراچی میں ''سراج الدولہ'' کالج قائم کیا۔

''مجھے اس کالج کے قیام کے لیے مختلف لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑا۔ میں کسی بھی حالت میں کسی اور مقصد کے لیے ایسا ہرگز نہ کرتا۔ یہ کالج اب قائم ہوگیا ہے اور اسے قائم رکھنا آپ کی ذمے داری ہے۔''

یہ بات بھی دیدنی ہے کہ اگر وہ چاہتے تو بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرکے آرام کی زندگی گزارتے لیکن انہوں نے کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔ وہ پاکستان کو قائداعظم کی امانت تصور کرتے تھے۔ پاکستان کی سلامتی اور استحکام کے لیے کوشش کرتے رہے۔

ان کی یہ بے لوث کوششیں بھی بعض لوگوں کو گوارا نہیں تھیں۔ انہیں قدم قدم پر احساس ہورہا تھا کہ چند مداحوں کے علاوہ دیگر لوگ خاص طور پر وہ جن کا تعلق حکومت سے ہے ان کے ساتھ مخلص نہیں حالانکہ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں ان کی جو خدمات رہی تھیں اس کے بعد تو وہ بہر طور اسی کے مستحق تھے۔ انہیں افسوس ہوتا تھا کہ ان کے سیاسی عزائم نہیں وہ صرف سماجی کاموں تک خود کو محدود رکھ رہے ہیں اس کے باوجود انہیں قدم قدم پر خاموش مخالفت کا سامنا ہے۔ جو لوگ ان سے تعاون کا دم بھر رہے ہیں وہی پسِ پشت مخالفوں کا کردار ادا کررہے ہیں۔

سراج الدولہ کالج کے قیام کے لیے انہوں نے شدید محنت کی۔ جھولی پساری، ہاتھ پھیلائے لیکن اس کالج کے انتظامی و مالی معاملات کی پیچیدگیوں نے انہیں اس قدر صدمہ پہنچایا کہ وہ عارضہ قلب میں مبتلا ہوگئے۔ صاحبِ فراش ہوئے تو سماجی کاموں سے بھی دست کش ہوگئے۔ مخالفین یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑی خوبصورتی سے راجا صاحب کو دیوار سے لگادیا۔

ایک بوڑھا آدمی، تحریک آزادی کا ہر دلعزیز سپاہی باتھ آئی لینڈ میں واقع اپنی کوٹھی میں لیٹا رہتا تھا۔ اس کے پاؤں متحرک نہیں رہے تھے لیکن آنکھیں گردش میں رہتی تھیں۔ وہ اس زمانے کو یاد کرتا تھا جب اس نے معرکے

سر کیے تھے۔ وہ لوگ یاد آتے تھے جو سب کے سب مخلص تھے۔ اختلافات اس وقت بھی ہوتے تھے لیکن سب کے سامنے ایک منزل تھی جس کی طرف وہ رواں دواں تھے۔ اسے تو یہ امید تھی کہ جب یہ منزل مل جائے گی تو اس خلوص میں مزید اضافہ ہوگا لیکن منزل ملتے ہی مفادات کی جنگ شروع ہوگئی۔ اپنا مفاد سب کو عزیز ہوگیا۔ پاکستان کو سب نے بھلا دیا۔ مفاد پرستوں کے لشکر میں ایک پُرخلوص سپاہی کیا کرسکتا ہے۔ ماضی کے گرد چکر لگانے کے بعد وہ اپنی طرف لوٹ آتا تھا۔ ''اہلِ پاکستان مجھ سے جو کام لے سکتے تھے وہ نہیں لے سکے۔''

اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے ان کے چند مخلص دوست ان کے پاس آجاتے تھے۔ وہ ان دوستوں میں قائداعظم کو ڈھونڈتے تھے۔ پھر سوچتے تھے اچھا ہوا وہ نہیں رہے۔ اپنے خواب کی ایسی تعبیر دیکھ کر وہ کتنے دل شکستہ ہوتے۔ جب نہیں تو اب مرجاتے جیسا کہ میں مرنے کو بیٹھا ہوں۔

وہ اس تنہائی اور خیالی مجلسوں کے درمیان بیٹھے گھر میں یہ خبریں سن رہے تھے کہ ان کا بیٹا راجکمار سلیمان اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لندن جانے والا ہے۔ انہوں نے سلیمان میاں کو بلا کر دل کی بات کہہ دی۔

''سلیمان، لوگ مجھے راجا سمجھ کر اپنی ضرورتیں لے کر میرے پاس آتے ہیں۔ اب میں وہ راجا نہیں رہا جو محمود آباد میں ہوا کرتا تھا۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے جب میں ان کی ضرورتیں پوری کرنے کا متحمل خود کو نہیں سمجھتا۔ دوسری طرف حکومت ہے جو یہ سمجھے بیٹھی ہے کہ اس بے بسی کے دور میں وہ مجھے خرید لے گی۔ مجھے خریدنے کے لیے جال پھینکتی رہتی ہے۔ میں اگر ایک مرتبہ پھر پاکستان چھوڑ کر چلا جاؤں تو ضرورت مندوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بھی بچ جاؤں گا اور حکومت کی دسترس سے بھی نکل جاؤں گا۔ انسان ہوں کیا خبر کسی وقت بک ہی جاؤں اور زندگی بھر کی ایمانداری ضائع ہوجائے۔ اس مقتل گاہ سے مجھے جلدی نکلنا ہوگا۔''

''آپ کہاں جانے کا ارادہ کررہے ہیں۔''

''تم اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جارہے ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ لندن چلا جاتا ہوں۔ میں وہاں کوئی نوکری کرلوں گا۔ تمہاری تعلیم کے لیے حکومت پاکستان سے فارن ایکسچینج کی استدعا کرنے سے بھی بچ جاؤں گا۔''

راجا صاحب لندن چلے گئے۔

حکومت برطانیہ اور حکومت مصر کے درمیان ایک معاہدے کے تحت لندن میں ''اسلامک کلچرل سینٹر'' قائم ہوا تھا۔ لندن پہنچ کر راجا صاحب ملازمت کے حصول کے لیے سرگرداں تھے کہ پاکستان کے وزیرِ خارجہ سید شریف الدین پیرزادہ نے لندن میں پاکستان ہائی کمشنر ایس کے دہلوی سے راجا صاحب کا ذکر کیا۔

''نیرنگیِ زمانہ دیکھیے بلکہ ستم ظریفی کہ راجا صاحب جو کبھی ایک ریاست کے مالک تھے اب دیارِ غیر میں ملازمت کے طالب ہیں۔ آپ سے جو کچھ بن سکے کیجیے اور ان کے لیے ان کے شایانِ شان کسی ملازمت کا بندوبست کیجیے۔''

''اسلامک کلچرل سینٹر میں ڈائرکٹر کا عہدہ خالی ہے۔ یہ ملازمت راجا صاحب کے مزاج کے مطابق بھی ہوگی۔ میں ٹرسٹ کا رکن بھی ہوں۔ یہاں بھی سب لوگ راجا صاحب سے واقف ہیں۔ مجھے امید ہے انہیں یہ ملازمت مل جائے گی۔ بس آپ راجا صاحب کی رائے لے لیں۔ کہیں وہ اسے حکومت پاکستان کا احسان سمجھ کر اس ملازمت کو ٹھکرا نہ دیں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اس سفارش کو سرکاری رنگ نہ دیا جائے۔ آپ سے راجا صاحب کی دوستی ہے۔ آپ دوست کی حیثیت سے راجا صاحب کو یہ پیش کش کریں۔''

ہائی کمشنر کے توسط سے راجا صاحب کا تقرر ڈائرکٹر کے عہدے پر ہوگیا۔ یہ ملازمت واقعی ان کے مزاج کے مطابق تھی بلکہ دیرینہ خواہش کے مطابق تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایک ایسے عالمگیر اسلامی معاشرے کے آرزومند تھے جہاں بلا کسی تفریق رنگ و نسل ہر مسلمان کو نہ صرف اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع میسر آسکیں بلکہ معاشرتی اور اقتصادی استحصال کا خاتمہ ہوسکے۔ پاکستان کی جنگ بھی انہوں نے اسی لیے لڑی تھی اور پاکستان سے مایوس بھی اسی لیے ہوئے تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل وہ سیاست سے کنارہ کش ہوکر عراق بھی اسی لیے گئے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران انہوں نے ''اسلامی جماعت'' بھی قائم کی تھی۔ ان کی اپنی زندگی بھی نہایت سادہ تھی۔ عالم شہزادگی میں بھی امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے دور سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ بہت سے ہندو ایسے تھے جنہوں نے ان سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرلیا تھا۔ یہ نوکری گویا ان کے خوابوں کی تعبیر تھی۔

انہوں نے اس تقرری کے فوراً بعد ایک کثیرالمقاصد

منصوبے پر کام کرنا شروع کردیا۔ وہ اس ملازمت سے پہلے بھی اس منصوبے پر کام کرتے رہے تھے اور اب تو وسائل بھی ان کے پاس تھے۔ وہ سینٹر میں ایک ایسی عالیشان مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں بہ یک وقت ایک ہزار نمازی مرکزی ہال میں اور ایک ہزار تہ خانے میں نماز ادا کرسکیں۔ مسجد کی بالکونی میں آٹھ سو خواتین کے لیے نماز کی ادائیگی کا انتظام ہو۔ اس مسجد میں روشنی اور حرارت کا جدید ترین انتظام موجود ہو۔

انہوں نے تین ارکان پر مشتمل ایک ٹیم قائم کی جس میں ایک انگریز، ایک پاکستانی اور ایک اسپینی شامل تھے۔ اس ٹیم سے کہا گیا کہ وہ مسجد کے لیے ایک شاندار ڈیزائن تیار کریں تاکہ بعد میں اس کی منظوری ٹرسٹیوں سے لے سکیں۔

ٹرسٹ کے پاس مسجد سے ملحق 9 ہزار مربع گز کا ایک قطعہ اراضی بھی موجود تھا جس پر انتظامی دفاتر، سیمینار کے انعقاد کے لیے کمروں کی تعمیر کی گنجائش بھی رکھی گئی تھی۔

راجا صاحب کے ذہن میں لائبریری کے لیے بھی ایک عظیم منصوبہ تھا جس میں اسلامی موضوعات پر اہم کتابیں موجود ہوں۔ اس سینٹر میں اردو کتابوں کا ایک شعبہ بھی ان کے ذہن میں تھا جس سے پاکستان کے رہنے والے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

ایک سال کی کاغذی کارروائیوں کے بعد وہ پاکستان آئے۔ یہاں نہ صرف اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور اسلامک کلچرل سینٹر لندن کے تعمیراتی پروگرام پر روشنی ڈالی بلکہ پبلشروں سے اپیل کی کہ وہ سینٹر کی لائبریری کے لیے تاریخ و ثقافت، فقہ و حدیث وغیرہ پر اپنی شائع کردہ کتابیں ارسال کریں۔

انہوں نے اپنی قیام گاہ پر صحافیوں کو بھی استقبالیہ دیا۔ اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ وہ اسلامک کلچرل سینٹر کے تعمیراتی پروگرام کے متعلق اپنے منصوبے سے انہیں آگاہ کریں۔ اس موقع پر انہوں نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے پاکستانی سیاست پر بھی لب کشائی کی۔

''پاکستان میں ایک ایسی ملک گیر سیاسی جماعت کی ضرورت ہے جس کے پاس قومی خدمت اور عوامی بہبود کا واضح اقتصادی پروگرام موجود ہو۔ مسلم لیگ جس نے پاکستان بنایا تھا اپنا مقصد پورا کرچکی۔ اب پاکستان کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔''

ان صحافیوں کے سامنے انہوں نے ان افواہوں کی بھی تردید کی جن کے مطابق پاکستان میں کسی اہم عہدے پر ان کا تقرر کیا جارہا ہے۔

1970ء میں انہوں نے اسلامک کلچرل سینٹر کے زیرِ اہتمام ''ورلڈ اسلامک فیسٹول'' کا انعقاد کیا۔ یہ فیسٹول ان کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس میں پوری دنیا سے مندوبین کو مدعو کیا گیا تھا۔

اس فیسٹول کے انعقاد کے نتیجے میں جہاں عالمِ اسلام کے اتحاد کا ایک رخ واضح ہوا، اس کے علاوہ تعمیراتی اور انتظامی ضرورتوں کے لیے سرمائے کی فراہمی کا بھی مستقل دروازہ کھل گیا۔

یہ سب ان کی انفرادی کوششوں سے ہوا۔

ایک مرتبہ وہ پھر کراچی آئے۔ بہت کمزور نظر آرہے تھے۔ دوستوں نے انہیں دیکھا تو بہت تشویش ہوئی۔ بعض نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ کراچی میں قیام کو ذرا طول دے دیں تاکہ مسلسل آرام سے طبیعت کچھ بحال ہو۔ انتھک محنت سے صحت پر جو برے اثرات پڑے ہیں ان کا کچھ ازالہ ہوسکے۔

مشورہ مناسب اور بروقت تھا۔ غالباً وہ خود بھی یہی چاہتے ہوں گے لیکن جس مشن پر وہ کام کررہے تھے اس کا تقاضا یہ تھا کہ کام کو آرام پر ترجیح دیں۔ انہوں نے دوستوں کے مشورے کو رد کردیا۔ ''آپ کا یہ مشورہ درست سہی لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا کیونکہ اس طرح لندن میں اسلامک سینٹر جسے میں نے جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی ہے منتشر ہوجائے گا۔''

وہ زندگی کا سفر طے کرتے ہوئے وہاں تک آگئے جب انہوں نے 1971ء میں سقوطِ ڈھاکا کی خبر سنی۔ یہ خبر ایک ایسے شخص کے لیے بڑا سانحہ تھی جس نے قائداعظم کے ساتھ مل کر حصولِ پاکستان کے لیے شبانہ روز محنت کی تھی۔ انہوں نے یہ خبر کس دل سے سنی ہوگی۔ سارا بوجھ دل پر لے لیا اور یہ کہہ کر گردن جھکالی۔ ''یہ صورتِ حال بہت پہلے سے متوقع تھی۔''

کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن دل پر قیامت گزر گئی۔ ایک شور سا مچا عارضۂ قلب کی تکلیف جو پہلے سے تھی اسپتال جانے کی ضد کرنے لگی۔ قلب پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے تو نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ معلوم ہوا دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ ڈاکٹروں کی بروقت کارروائی نے دل کی دھڑکن بحال کردی۔

وہ جو ایک ایک لمحہ قومی کاموں میں صرف کرنے کے

عادی تھے، ایک ماہ تک اسپتال کے بستر پر پڑے رہے۔ یہاں بھی آنے والوں سے اسلامک کلچر سینٹر کی باتیں ہی کرتے رہے۔

ایک ماہ بعد جب اسپتال سے گھر آئے تو موصولہ ڈاک کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ڈاکٹروں نے منع کیا تھا کہ لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ نہ کریں لیکن یہ مروت سے بعید تھا کہ کسی نے خط لکھا ہو تو وہ اس کا جواب نہ دیں۔ وہ جوابی خطوط لکھنے بیٹھ گئے۔ بیشتر خطوط سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے تھے اور ان کے پاس یہی ایک جواب تھا۔

”جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ برصغیر میں تدبر کا فقدان ہے۔ اب 1971ء سے قبل کی صورتِ حال کے بحال ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پورا برصغیر آگ کی زد پر ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بھی مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کرسکتا۔“

ایک اور خط سامنے آیا تو انہوں نے بڑے دکھ سے جواب لکھا۔

”وہ پاکستان جو 1947ء میں معرضِ وجود میں آیا تھا اب تاریخ کے سپرد ہو چکا۔ بنگلہ دیش ایک حقیقت بن چکا ہے۔ برصغیر میں اس تغیر کے اثرات ابھی تو معلوم نہیں ہوسکیں گے البتہ چند سال میں یہ نقشہ اور بھی بدلے گا۔“

وہ ضعیف العمر بے یارومددگار لکھنے کو سب کچھ لکھتے رہے، کہنے کو سب کچھ کہتے رہے۔ اسلامک سینٹر کے امور کی نگرانی بھی تندہی سے کرتے رہے لیکن اندر ہی اندر روتے رہے۔ سقوط ڈھاکا کا دکھ انہیں دیمک کی طرح چاٹتا رہا۔

اب اسلامک سینٹر کی تعمیر ہی آخری سہارا تھا جو اُن سے کہتا رہتا تھا جیتے رہو اور اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤ لیکن جینا کوئی اپنے بس میں ہوتا ہے۔ وہ خوش رہنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جب پاکستان کا خیال آتا تھا تو ملول ہو جاتے تھے۔

اسلامک سینٹر کے منصوبے کی منصوری مل گئی تھی۔ اب یہ سینٹر ہی ان کا چھوٹا پاکستان تھا جسے تعمیر کرنا تھا۔

تعمیر کا کام شروع ہوا تو راجا صاحب نے بہ نفس نفیس اس میں حصہ لیا۔ بالائی منزل سے کتابیں ذیلی منزل پر خود پہنچائیں۔

کتابوں سے ان کا عشق انہیں سخت محنت پر آمادہ کر رہا تھا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس سخت جسمانی محنت کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ یہ محنت رنگ لائی۔ 13 اکتوبر 1973ء کو دل کا شدید دورہ پڑا انہیں اسپتال پہنچادیا گیا لیکن اس مرتبہ عالمِ دل کچھ اور تھا۔ چوبیس گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے اور 14 اکتوبر 1973ء کو 59 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

پھر وہ ہوا جو زندگی میں نہیں ہوتا، مرنے کے بعد ہوتا ہے۔ عالمِ اسلام پر سوگ کی فضا طاری ہوگئی۔ پاکستان میں اس خبر کو آنسوؤں نے لکھا آہوں نے بیان کیا۔ صدرِ مملکت اور وزیراعظم کے علاوہ ہزاروں رہنماؤں اور تنظیموں نے تعزیتی بیانات جاری کیے۔

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنا بیان جاری کیا۔

”وہ قائداعظم محمد علی جناح کے ایک بااعتماد ساتھی تھے۔ پوری قوم ان کے انتقال پر افسردہ ہے۔“

گورنر سندھ بیگم رعنا لیاقت علی خان نے کہا ”راجا صاحب محمود آباد تحریکِ پاکستان کے ایک جرأت مند اور ایماندار رہنما تھے۔“

بھارت کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے ریاست محمود آباد کے حکمرانوں کی 1857ء کی جنگِ آزادی میں خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ میرے والد اور راجا صاحب اگرچہ حصولِ آزادی کے حوالے سے مختلف نظریات کے حامل تھے لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان ذاتی تعلقات کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ راجا صاحب کو میرے والد ہمیشہ بھائی صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ وہ اودھ کی ثقافت و تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔“

اخبارات و جرائد نے بھی اپنے اداریوں میں راجا صاحب کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان اداریوں اور مضامین کا لب لباب یہی تھا کہ

”قائداعظم کے ایک معتمد ساتھی، آل انڈیا مسلم لیگ کے خازن اور آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر کی حیثیت میں راجا صاحب نے جو خدمات انجام دیں اور قیامِ پاکستان کے بعد ملک و قوم کی ترقی اور استحکام کے لیے جو رہنمائی فرمائی وہ ہماری تحریک کا سنہری باب ہے۔ ان کا انتقال ایک قومی سانحہ ہے۔“

راجا صاحب کی میت ایک خصوصی طیارے سے لندن سے تہران لائی گئی اور اسے مشہد مقدس میں حضرت امام علی رضا کے مقبرے کے احاطے میں سپردِ خاک کردیا گیا۔

تلخیص: راجا صاحب محمود آباد حیات و خدمات خواجہ رضی حیدر

ایک الجھی ڈور کو سلجھانے کی دلچسپ روداد

قتل ایک بڑی واردات ہے، مہذب معاشرے میں سب سے بری بات ہے۔ قاتل اگر آزاد رہے تو معاشرے میں بے لگامی پھیلتی ہے معاشرے کو گر تہذیب کے دائرے میں رکھنا ہے تو قانون کو مضبوط رکھنا ضروری ہے۔ قانون پرست معاشرے میں جرم کا پیچھا کیسے کیاجاتا ہے اس کی ایک جھلک، قاتل تک پہنچنے کی سعیِ مسلسل کی داستان۔

الجھی ڈور

ابن کبیر

وہ ایک منحوس رات تھی۔ چہار سو سناٹا طاری تھا۔ سڑکوں پر برفیلی ہوائیں رقص کرتی تھیں اور گھنے، تاریک جنگل میں خوف کا عفریت انگڑائی لے رہا تھا۔

ایڈا ریاست اوکلاہوما کا پُرامن ترین علاقہ تھا۔ رات گئے تک گھروں کی کھڑکیاں کھلی رہتیں۔ فقط موسمِ سرما میں انہیں بند کرنے کا تردد کیا جاتا۔ لیکن 11 دسمبر 1982 کی اُس ٹھٹھرتی رات ایڈا کے باسی تحفظ کے لطیف احساس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہونے والے تھے۔ اندیشوں کا

آسیب حملہ کرنے کو تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے جینا کو چونکا دیا۔ اُس نے وال کلاک کی سمت دیکھا۔ گھڑی کا مرکزی کانٹا دو کے ہندسے کو چھونے کی جستجو میں تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم پر نگاہ ڈالی۔ پارٹی اختتام کی جانب بڑھ رہی تھی۔ مہمان بس رخصت ہونے کو تھے۔

وہ کچن میں رکھے ٹیلی فون کی جانب بڑھی۔ ”بھلا اس وقت کون فون کرسکتا ہے؟“ بڑبڑاتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو جینا‘ ڈیبی بول رہی ہوں... تم فوراً میرے گھر چلی آؤ۔ یہاں... کوئی ہے۔“

لمحے کے ہزارویں حصے میں حیرت اور خوف کے احساس نے جینا کو آلیا۔ ڈیبی کی ٹیلی فون کال، اُس کی لرزتی آواز انتہائی غیر متوقع تھی۔ پہلی بار اُس نے ڈیبی کو اتنا خوف زدہ پایا۔ وہ اندیشوں میں اتر گئی۔

”کیا ہوا ڈیبی، سب ٹھیک تو ہے؟“ اُس نے فوراً سوال کیا۔

”نہیں‘ پلیز تم یہاں آجاؤ۔“ ڈیبی نے تیزی سے کہا۔

جینی نے ایک نظر ڈرائنگ روم پر ڈالی پھر گہرا سانس لیا۔ ”ٹھیک ہے‘ میں کچھ دیر میں پہنچ رہی ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔“

جینا فون رکھ کر اپنے مہمانوں کی سمت بڑھی جو موسم کی شدت پر تبصرے کررہے تھے۔ جینا ان کی گفتگو میں شامل ہونے سے قاصر رہی۔ اس کا ذہن ڈیبی کے الفاظ میں الجھا تھا۔

”بھلا وہاں کون ہوسکتا ہے جس نے ڈیبی کو اتنا پریشان کردیا؟ وہ ایک بہادر لڑکی ہے۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے، مجھے فوراً نکلنا ہوگا۔“

ابھی وہ ان ہی خیالوں میں گم تھی کہ فون پھر بجا۔

”ہیلو جینا‘ ڈیبی بول رہی ہوں۔“ اس بار آواز گھبراہٹ کی آمیزش سے پاک تھی۔ ”میں نے تمہیں خواہ مخواہ پریشان کیا۔ سب ٹھیک ہے‘ تمہیں آنے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے؟“ جینا کے لہجے میں غیر یقینی تھی۔ ”اگر تم کہو تو میں چلی آؤں۔“

”نہیں سب ٹھیک ہے۔ شکریہ اور شب بخیر۔“ ڈیبی نے معمول کے لہجے میں کہا اور ٹیلی فون رکھ دیا۔

وہ آخری موقع تھا جب جواں سال ڈیبی سوکارٹر نے کسی کو شب بخیر کہا۔

وہ ایک منحوس رات تھی... جنگل میں خوف کا عفریت انگڑائی لے رہا تھا۔

☆☆☆

الارم کی چنگھاڑ نے رون ولیم سن کی سماعتوں کو جھنجوڑ ڈالا۔ پہلے تو وہ تکیے کے نیچے سر دبے اس سے فرار کی کوشش کرتا رہا، پھر جھنجلا کر اٹھا اور پوری قوت سے گھڑی پر ہاتھ مارا۔ الارم خاموش ہوگیا۔

اس نے جمائی لی۔ سورج کی کرنیں کھڑکی پر دستک دے رہی تھیں۔ صبح ایڈا پر اتر آئی تھی۔

ٹھیک پینتالیس منٹ بعد اُسے... دفتر میں موجود رہنا تھا، مگر رون کی حالت دیکھتے ہوئے یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ گزشتہ رات اس نے خاصی پی لی تھی۔ تین بجے وہ بہ مشکل اپنے بستر تک پہنچ سکا۔ ایسی حالت میں دفتر جانا لگ بھگ غیر امکانی تھا۔

اس نے انگڑائی لی۔ ہڈیاں چٹخیں۔ آنکھیں کھلی رکھنے کی اپنی سی کوشش کی مگر وہ از خود بند ہوگئیں۔ چند پلوں بعد کمرا اس کے خراٹوں سے گونج رہا تھا۔ وہ سوچکا تھا، اس بات سے لاعلم کہ آج کا دن اُس کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دے گا۔

☆☆☆

وہ بدھ کی صبح تھی۔ آسمان پہ سورج دمک رہا تھا۔ ہوا میں نغمگی تھی۔

شاید موسم کا اثر تھا یا تگڑے ناشتے کی برکت، آفیسر کرس روز خاصے خوشگوار موڈ میں نظر آرہا تھا۔

”صبح بخیر۔“ آفس میں داخل ہوتے ہی اس نے بہ آواز بلند سراغ رساں ڈینی باربیٹ کو مخاطب کیا، جو کافی سے لطف اندوز ہورہا تھا۔

”صبح بخیر دوست۔“ ڈینی مسکرایا۔ ”آج کا دن شان دار ہے۔“

”بلاشبہ۔“ کرس نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ ”امید ہے آج کوئی نابنجار ڈرائیور ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔“

”ایسا مت کہو دوست۔“ ڈینی نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ ”ورنہ ایڈا پولیس اسٹیشن میں سناٹا چھا جائے گا۔ فقط چالان کرنے کے ہمارے پاس کام ہی کیا ہوتا ہے۔“

”خوب کہا۔“ کرس نے آنکھ ماری۔

ہنستے مسکراتے، ایک دوسرے کو چٹکلے سناتے پولیس افسران اس بات سے لاعلم تھے کہ وہ روشن صبح جس نے انہیں بشاشت سے بھردیا ہے، فقط ایک التباس ہے۔ ایک پردہ... درحقیقت وہ آفت زدہ ہے۔

صبح کے آفت زدہ ہونے کا ادراک سب سے پہلے جواں سال ڈوتو ہیلمیپو کو ہوا جس نے پونے گیارہ بجے اپنی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ ڈیبی سوکارٹر کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر تھی جہاں حادثے کی تیزابی بو پھیلی تھی۔ دہلیز پر شیشے کی کرچیاں بکھری تھیں اور اندر سے موسیقی کی تیز آواز آرہی تھی۔

ڈوتو پریشان ہوگئی۔ ڈیبی اُس کی بچپن کی دوست تھی۔ ایک ہی اسکول سے دونوں نے تعلیم حاصل کی۔ ڈیبی کو دوستوں کے حلقے میں ایک خودمختار لڑکی کے طور پر شناخت کیا جاتا تھا۔ گزر بسر کے لیے وہ دو دو ملازمتیں کیا کرتی۔ صبح ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتی اور شام میں ایک بیئر بار میں کھڑی ہوتی۔ چند ماہ قبل وہ آٹھویں اسٹریٹ پر واقع اس پُرسکون اپارٹمنٹ میں منتقل ہوئی تھی۔

ڈوتو کا گھر اپنی دوست کے نئے اپارٹمنٹ سے چند ہی میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ صبح دفتر جاتے ہوئے ڈیبی کو پک کر لیتی اور ریسٹورنٹ کے نزدیک اتار دیتی۔ آج بھی وہ اسی ارادے سے گھر سے نکلی تھی... مگر اب یہ ممکن نہیں تھا!

کرچیاں بکھری ہوئی تھیں اور موسیقی کا شور بلند ہورہا تھا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ ڈوتو نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ ہیبت اس کی منتظر تھی۔

ڈرائنگ روم کسی ڈراؤنی فلم کا منظر پیش کررہا تھا۔ چیزیں بکھری ہوئیں، لیمپ اور صوفے الٹے ہوئے۔ دیوار پر سرخ رنگ سے کچھ لکھا ہوا تھا جسے پہلی نظر میں وہ سمجھنے سے قاصر رہی۔ اُس کا ذہن تو ڈیبی میں اٹکا تھا۔ ہر گزرتے پل کے ساتھ یہ اندیشہ قوی ہورہا تھا کہ اس کی دوست کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہے۔

”ڈیبی... کہاں ہو تم؟“ اس کی کھوکھلی آواز اپارٹمنٹ میں گونجی۔ شیشے کی کرچیاں پیروں تلے چٹخیں۔

”ڈیبی؟“ وہ چند قدم اور آگے بڑھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر پڑے ریڈیو سے بلند ہونے والی بے ہنگم موسیقی ماحول کو ہیبت ناک بنا رہی تھی۔ ڈوتو نے آگے بڑھ کر اسے بند کردیا..... تب اس کی نظر میز پر پڑی، جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ بکھرے ہوئے، ٹوٹے پھوٹے الفاظ پر مشتمل ایک عجیب تحریر تھی: ”میرا... یا ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

اس کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ بیڈروم کی جانب بڑھی جہاں ایک ایسا منظر اس کا منتظر تھا جسے وہ مرتے دم تک نہیں بھولنے والی تھی۔

ڈیبی فرش پر اوندھی پڑی تھی۔ وہ برہنہ تھی۔ اردگرد تاریں بکھری تھیں۔ گردن پر کپڑا لپٹا تھا اور جسم پر زخموں کے نشانات نظر آرہے تھے۔

زمین نے جیسے ڈوتو کے پیر پکڑ لیے۔ وہ دروازے ہی پر رک گئی۔

”ڈ... ڈیبی...“ اس نے لرزتے ہوئے پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ جاچکی تھی۔ بہت دور۔

ڈوتو کا دل خوف سے بھر گیا۔ ”اگر قاتل یہیں ہوئے تو وہ مجھے بھی...“ اچانک جنم والے اس خیال نے اُسے وحشت میں دھکیل دیا۔ دوڑتے ہوئے وہ اپارٹمنٹ سے باہر آگئی۔

قریب ہی ایک ٹیلی فون بوتھ تھا۔ کانپتے ہوئے اُس نے جینا کا نمبر ڈائل کیا۔

”کسی نے... ڈیبی کو قتل کردیا ہے۔“ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

پہلے تو جینا سمجھ ہی نہیں سکی کہ ڈوتو کیا کہہ رہی ہے۔ مگر جب الفاظ نے اپنے معنی عیاں کیے، وہ صدمے سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے کانوں میں ڈیبی کے الفاظ گونج رہے تھے۔

”شب بخیر!“

☆☆☆

آفیسر کرس روز کو جب قتل کے اِس ہیبت ناک واقعے کی اطلاع ملی، وہ سکتے میں آگیا۔

”صورتِ حال بے حد گمبھیر ہے سر۔“ فون کے دوسرے طرف جونیئر آفیسر جیمس اسپارک تھا جس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ”آپ فوراً یہاں پہنچیں۔“

کرس فون رکھ کر سراغ رساں ڈینی کی طرف مڑا۔

”بری خبر ہے۔ ایک قتل ہوگیا ہے۔“

”قتل!“ ڈینی کو جھٹکا لگا۔ اُس کا ردِعمل متوقع تھا۔ گزشتہ دس برس سے شہر میں قتل کی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی۔

”ہاں۔“ کرس کھڑا ہوگیا۔ ”معاملہ پیچیدہ لگتا ہے۔ ہمیں اوکلاہوما بیورو آف انویسٹی گیشن کو بھی مطلع کرنا ہوگا۔“

جائے وقوعہ پر پہنچنے والی ٹیم کو لمحوں میں احساس ہوگیا کہ ان کی زندگیاں ایک آسیب زدہ صبح کے نرغے میں آگئی ہیں۔

اپارٹمنٹ کا منظر اتنا ہیبت ناک تھا کہ مضبوط اعصاب کے مالک کرس روز کا بھی جی متلانے لگا۔ ایک اہل کار نے تو باہر جا کر قے کر دی۔

ہمت اکٹھی کر کے پولیس نے اپنا کام شروع کیا۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر پڑے لیمپ، ٹوٹی ہوئی میز، شیشے کی کرچیوں اور ادھڑے ہوئے صوفوں کی تصاویر اتاری گئیں۔

پھر پولیس ٹیم ڈائننگ ٹیبل پر خون سے لکھی تحریر کی جانب متوجہ ہوئی۔ سرخ روشنائی سے اپارٹمنٹ کی مرکزی دیوار پر لکھی تحریر کو کیمرے میں محفوظ کیا جو کچھ یوں تھی "جم اسمتھ: اگلا شکار!"

کچھ دیر بعد پولیس اہل کار بیڈ روم میں تھے۔ برہنہ ڈیبی کارٹر اوندھی پڑی تھی۔ فقط پیروں میں سفید رنگ کے موزے تھے۔

پہلی ہی نظر میں کرس نے اندازہ لگا لیا کہ بدقسمت لڑکی کی آبروریزی کی گئی ہے پھر بعد میں پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔

بہ ظاہر ڈیبی کی موت دم گھٹنے سے ہوئی تھی۔ گلے کے گرد کپڑا لپٹا تھا جس کا ایک کنارہ اس کے منہ میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ لاش کے نیچے چند تاریں پڑی تھیں۔ سامنے والی دیوار پر خون سے سنی ہتھیلی کا نشان تھا۔ قریب ہی چٹنی کی ایک بوتل رکھی تھی جس کی وہاں موجودگی عجیب معلوم ہوتی تھی۔

لاش کے معائنے کے بعد پولیس کو اندازہ ہوا کہ پُراسرار تحریریں فقط دیوار اور ٹیبل تک محدود نہیں، وہ مقتولہ کے جسم پر بھی موجود تھیں۔ اس کی کمر پر سرخ روشنائی سے "ڈیوک ویلز" لکھا تھا۔ پیٹ پر نیل پالش سے لفظ "موت" لکھا نظر آیا۔ کرائم سین سے پولیس کو چند انسانی بال اور جسمانی رطوبتیں ملیں جنہیں محفوظ کر لیا گیا۔

جب کرس روز اپارٹمنٹ سے لوٹا، وہ خاصا مضمحل تھا۔ اکتائی ہوئی آواز میں اس نے ڈینی باریٹ سے کہا۔ "کام پر لگ جاؤ دوست، شہر کا سکون غارت ہو چکا ہے۔"

☆☆☆

سولہ ہزار نفوس پر مشتمل ایڈا میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جسے بھی اس واقعے کی اطلاع ملی وہ سناٹے میں آ گیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دسمبر کا وہ روشن دن ایک لرزہ خیز قتل کی اطلاع لائے گا۔ ایسی اطلاع جو انہیں خوف کی کھائی میں دھکیل دے گی۔ انہیں اس اندیشے میں مبتلا کر دے گی کہ ایک جنونی سڑکوں پر دندناتا پھر رہا ہے، جس کی وحشت انہیں بھی اپنا شکار بنا سکتی ہے... اب وہ مزید محفوظ نہیں... ان کا شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل چکا ہے۔

یہ خوفناک خبر نشر ہونے سے قبل ہی مقتولہ کی ماں پیگی کارٹر کو اس منحوس سانحے کی اطلاع پہنچا دی گئی، جسے اس کے قبول کرنا کسی طور سہل نہیں تھا۔

پولیس نے براہِ راست پیگی سے رابطہ کرنے سے اجتناب برتا۔ انہوں نے پیگی کی چھوٹی بہن کو مطلع کیا، وہ فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گئی جہاں بھاری صدمہ اس کا منتظر تھا کہ اُس کی پیاری بھانجی وحشیانہ طریقے سے قتل کی جا چکی تھی۔

جس پل پیگی کارٹر کی بہن اُسے لرزہ خیز واقعے سے آگاہ کر رہی تھی، اُس نے براہِ راست پیگی کی آنکھوں میں دیکھنے سے اجتناب برتا کیونکہ اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

سب کچھ بدل چکا تھا!

☆☆☆

ہواؤں میں اداسی بس گئی اور ماحول میں یاسیت تیرنے لگی۔

ایڈا پر غمگین رات اتر آئی تھی۔ تاہم رون ولیم سن ہر فکر سے آزاد بیئر بار میں قہقہے لگا رہا تھا۔

نشے میں دھت اس کا دوست ڈینس فریز سامنے بیٹھا تھا۔ میز پر شراب کی بوتل رکھی تھی اور دونوں بیہودہ لطیفوں سے ایک دوسرے کا دل بہلا رہے تھے۔

ڈینس، کیسز سٹی کے ایک اسکول میں سائنس کا مضمون پڑھایا کرتا تھا۔ وہ طلاق یافتہ شخص ایک بیٹی کا باپ تھا۔ بدقسمتی سے وہ گھریلو اور پیشہ ورانہ محاذ... دونوں ہی پر ناکام ثابت ہوا۔ نہ تو وہ اچھا استاد تھا، نہ ہی ذمّے دار باپ۔ اس کی غفلت سے برانگیختہ ہو کر بالآخر اس کی بوڑھی ماں کو اپنی دس سالہ پوتی کی ذمّے داریاں سنبھالنی پڑیں۔

ڈینس کا زیادہ وقت اپنے اوباش دوست رون ولیم سن کی معیت میں گزرتا، جو اپنی عیاش طبیعت اور غیر سنجیدگی کے باعث گزشتہ ایک برس میں تین ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

رون کا مکان ٹھیک اُس اپارٹمنٹ کے سامنے تھا جہاں آج صبح ایک تشدد زدہ لاش ملی تھی۔ جس نے شہر کو اداسی میں دھکیل دیا تھا۔ مگر رون اور ڈینس کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ نشے میں دھت تھے۔

اچانک رون کی نظر نیلی آنکھوں والی ایک لڑکی پر پڑی جو بل کی ادائیگی کے بعد اٹھنے کو تھی۔

رون اور ڈینس نے ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں چند اشارے کیے۔ جیب سے چند مڑے تڑے نوٹ نکال کر انہوں نے میز پر رکھے اور باہر کی سمت چل دیے۔

کچھ دیر بعد وہ تاریک پارکنگ ایریا میں کھڑے تھے۔ نظریں اس لڑکی پر ٹکی تھیں جو دھیرے دھیرے اپنی کار کی جانب بڑھ رہی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

اوکلاہوما اسٹیٹ نے ڈیبی کارٹر کے کیس کی ذمّے داری ایڈا پولیس ڈیپارٹمنٹ کے افسران کرس روز اور مائیک ملر کو سونپی۔ سراغ رساں ڈینی باریٹ بھی اس ٹیم میں شامل تھا۔

مقتولہ کے روزمرہ معمولات کے جائزے سے انہوں نے اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔

اطلاعات کے مطابق ڈیبی سو کارٹر ایک خوش مزاج لڑکی تھی۔ اسکول میں وہ ایک خواب دیکھنے والی دوشیزہ کے طور پر مشہور تھی مگر اپنے خوابوں کا تعاقب کرتے ہوئے اُس نے کبھی منفی ہتھکنڈے نہیں آزمائے۔ اُس کا ٹریک ریکارڈ بالکل صاف تھا۔ اسکول چھوڑنے کے فوراً بعد وہ ایک کافی شاپ میں ویٹرس ہو گئی۔ ساتھ ہی رات کے اوقات میں کنٹری ویسٹرن کلب میں ملازمت اختیار کر لی۔ جلد ہی قسطوں پر ایک گاڑی بھی خرید لی۔ اپارٹمنٹ کے حصول میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا۔

ڈیبی کی زندگی کا خاکہ پولیس کے سامنے تھا مگر اُس کی موت کا معما حل کرنے میں یہ معاون ثابت نہیں ہونے والا تھا۔ قطعی نہیں!

سچ تو یہ ہے کہ ایڈا پولیس ڈیپارٹمنٹ شدید مشکل میں تھا۔ وہ اس قسم کے کیس پر کام کرنے کے تجربے سے عاری تھا، مگر افسران کا دباؤ تھا اس لیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

تفتیش کا آغاز جم اسمتھ اور ڈیوک ویلز کے ناموں سے کیا گیا، جو بڑے ہی پُراسرار اور پریشان کن انداز میں پولیس تک پہنچے تھے۔ ایک نام اپارٹمنٹ کی دیوار پر لکھا ہوا تھا اور دوسرا... مقتولہ کی کمر پر۔

شروعات جم اسمتھ سے کی گئی جو ایک اڑیل اور بدمعاش شخص کی شہرت رکھتا تھا۔ وہ ایک غصیل نوجوان تھا مگر تفتیش شروع ہوتے ہی یہ واضح ہو گیا کہ جم اسمتھ ڈیبی کا قاتل نہیں کیونکہ وہ قتل والی رات ایڈا اسینٹرل جیل میں مقید تھا۔ ڈکیتی کی واردات میں چند ماہ قبل اُسے ڈھائی برس کی سزا ہوئی تھی۔

پولیس افسران اب ڈیوک ویلز کی جانب متوجہ ہوئے جو شک کے چوکھٹے میں بالکل فٹ بیٹھتا تھا۔

ڈیوک ایک مقامی بیئر بار کا مالک تھا اور ایک جھگڑالو شخص کے طور پر شناخت کیا جاتا تھا۔ بار میں وہ بندوق لے کر بیٹھا کرتا۔ مار پیٹ کے ایک واقعہ میں وہ چند ہفتوں کی سزا بھی کاٹ چکا تھا۔

جس صبح پولیس نے ڈیوک کو اسٹیشن آنے کی ہدایت جاری کی، شہر کے مرکزی قبرستان میں ڈیبی کارٹر کی تدفین جاری تھی۔

قبرستان بھرا ہوا تھا۔ وہاں سیکڑوں افراد تھے جن کی آنکھوں میں نمی تھی، جن کے قدموں کے نیچے درختوں کے خشک پتے چرچرا رہے تھے۔ ان کے لیے ڈیبی یکسر اجنبی تھی، مگر وہ اُسے خود سے جڑا ہوا محسوس کرتے تھے۔ وہ اس کے اہلِ خانہ کا غم بانٹنا چاہتے تھے۔ انتظامیہ کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ وہ ڈیبی کے قاتلوں کی گرفتاری تک خاموش نہیں بیٹھنے والے۔

☆☆☆

"میں دس بجے تک بار میں تھا۔ پھر اپنی بیوی کے ساتھ گھر چلا گیا!" ڈیوک ویلز براہِ راست سراغ رساں ڈینی باریٹ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم اس بات کو ثابت کر سکتے ہو؟" ڈینی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"بالکل! آپ میری بیوی سے پوچھ سکتے ہیں۔ میرے ملازمین سے تصدیق کر سکتے ہیں۔" لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔

"قتل رات دو سے تین کے درمیان ہوا ہے۔ اُس وقت تم کہاں تھے؟"

"میں اُس وقت اپنے مکان ہی پر تھا۔" وہ آگے کی طرف جھکا۔ "دیکھو دوست، میں اس لڑکی کو نہیں جانتا۔ کبھی اس سے ملا بھی نہیں۔ اس کے ساتھ واقعی بہت برا ہوا، مگر معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ... وہ میرے ٹائپ کی نہیں تھی۔ شہر میں اس سے زیادہ حسین لڑکیاں موجود ہیں۔ آبروریزی کے لیے وہ بہتر آپشن ہیں۔" ایک مکروہ قہقہہ بلند ہوا۔ کمرے کی فضا مکدر ہو گئی۔ ڈینی کو کراہت کا احساس ہوا۔

"ٹھیک ہے۔" سراغ رساں نے گہرا سانس لیا۔

"آپ کے تعاون کا شکریہ! اگر آنے والے دنوں میں آپ بیرون شہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، تو پولیس کو مطلع کرنا مت بھولیے گا۔"

ڈیوک کے جانے کے بعد ڈینی نے اُس کے ملازمین اور دوستوں سے رابطہ کیا۔ سب نے ڈیوک کے بیان کی تصدیق کی۔

کچھ دیر بعد ڈینی، کرس روز کے سامنے بیٹھا تھا۔

"میرے خیال میں کوئی اُسے پھنسانا چاہتا ہے۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

کرس خاموشی سے اپنے ساتھی کو دیکھتا رہا۔ اس نے بات آگے بڑھائی۔ "میں نے ریکارڈ چیک کیا ہے۔ کچھ عرصے قبل ڈیوک اور جم اسمتھ کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تھی۔ جم نے اُسے قتل کرنے کی دھمکی بھی دی تھی۔ شاید قاتل اس واقعے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم اب بھی وہیں کھڑے ہیں۔" کرس نے گہرا سانس لیا۔ "ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے۔"

"میرے خیال میں ہمیں ڈیبی ہی کی جانب پلٹنا ہوگا۔" ڈینی نے کہا۔ "شاید اس کی زندگی کی آخری چند گھڑیاں ہمیں کوئی سراغ دے سکیں۔ قتل والی رات وہ ایک مقامی کلب کوچ لائٹ بار میں ایکسٹرا شفٹ کر رہی تھی۔ آج شام میں وہاں کا چکر لگانے والا ہوں۔"

"اچھا خیال ہے۔" کرس نے تھوڑی کھجائی۔ "عوام کو بھی متحرک کرنا ہوگا کہ وہ پولیس کی مدد کے لیے سامنے آئیں۔" وہ فون اٹھا کر میڈیا کوآرڈینیٹری کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

شام سات بجے، خبرنامہ کے بعد ریڈیو اور ٹی وی چینل نے ایڈا پولیس کی اپیل نشر کی، جس میں شہریوں سے تعاون کی درخواست کی گئی تھی۔

اپیل نشر ہونے کے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد آفیسر کرس روز کو ایک چوبیس سالہ لڑکی کی کال موصول ہوئی۔ مگر اس کا مقصد ڈیبی سے متعلق معلومات فراہم کرنا نہیں تھا۔ وہ تو ان دو بدمعاشوں کی رپورٹ درج کروانا چاہتی تھی، جو کل رات تعاقب کرتے ہوئے اس کے اپارٹمنٹ تک آگئے تھے اور کافی دیر تک سڑک پر کھڑے رہے۔

"میں بہت ڈری ہوئی ہوں۔" لڑکی نے دھیرے سے کہا۔ "خاص طور پر ڈیبی کارٹر قتل کے بعد..."

"آپ فکر نہ کریں محترمہ۔" کرس نے اطمینان دلایا۔ "میں ایک ٹیم آپ کی طرف روانہ کر دیتا ہوں۔"

سوا آٹھ بجے اُسے مقتولہ کی قریبی دوست جینا کی کال موصول ہوئی جس نے پولیس افسر کو قتل والی رات ڈیبی کی غیر متوقع ٹیلی فون کال کی بابت مطلع کیا۔

"وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ چاہتی تھی کہ میں اس کے اپارٹمنٹ آجاؤں۔ مگر چند منٹ بعد حیرت انگیز طور پر اُس نے فون کر کے مجھے منع کر دیا۔ اگر میں اس رات وہاں چلی جاتی تو..." جینا نے ہچکی لی۔

"ہوں..." کرس گہری سوچ میں غرق تھا۔ "اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ اس رات ڈیبی کے اپارٹمنٹ میں تھے، وہ اُس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" جینا نے تائید کی۔ "ورنہ وہ انہیں اپارٹمنٹ میں داخل نہیں ہونے دیتی۔"

"میں چاہوں گا کہ کل آپ پولیس اسٹیشن آکر اپنا تفصیلی بیان ریکارڈ کروائیں۔" کرس نے کہا۔

ریسیور رکھنے کے بعد وہ پھر ڈیبی مرڈر کیس کی فائل پر جھک گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تمام پہلوؤں سے وہ کیس کا جائزہ لے رہا تھا مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

رات دس بجے جب کرس دفتر چھوڑنے کو تھا، ایک بار پھر فون بجا۔ اس نے بے دلی سے فون اٹھایا مگر اگلے ہی لمحے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

فون کرنے والا اپنی شناخت خفیہ رکھنے پر مُصر تھا۔ جب کرس نے اُسے تحفظ کی یقین دہانی کروائی تب وہ بات کرنے کو تیار ہوا۔

"جس بار میں ڈیبی کارٹر نائٹ شفٹ میں کام کیا کرتی تھی..." فون کرنے والے نے دبی دبی آواز میں کہا۔ "وہاں ایک نوجوان باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ قتل والی رات وہ اس کے پیچھے پارکنگ ایریا تک گیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے، وہاں ان کے درمیان جھگڑا بھی ہوا۔"

کرس کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ "کون تھا وہ نوجوان؟"

"اُس کا نام..." فون کرنے والے نے توقف کیا۔ "گلن گور ہے۔ وہ ایک بیس بال کوچ ہے۔"

"گلن گور۔" کرس نے نام دہرایا۔ "آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔"

☆☆☆

"بے شک میں وہاں تھا مگر جناب ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔" گلن گور کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ کسرتی بدن کا حامل ایک خوش شکل نوجوان تھا۔

"لیکن ہمیں پتا چلا ہے کہ تمہارے اور اس کے درمیان تلخ کلامی ہوئی تھی۔" ڈینی نے کاغذ پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔

"یہ درست نہیں جناب! میں اور ڈیبی ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ تھوڑی بیمار تھی اس رات تو میں نے پیشکش کی کہ اسے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے، مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور جہاں تک جھگڑے کا تعلق ہے..." وہ آگے جھکا۔ میز پر کہنیاں ٹکائیں۔ "جیسے میں نے کہا کہ ہمارے درمیان دوستانہ تعلقات تھے۔ میرے ایک مذاق پر اس نے آہستہ سے مجھے دھکا دیا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں جناب کہ یہ خالصتاً دوستانہ عمل تھا۔"

سراغ رساں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ گلن اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ بچوں کے بیس بال کوچ کی حیثیت سے وہ ایک معروف آدمی تھا۔ جس کلب سے منسلک تھا، ڈینی کا بیٹا بھی اس کا ممبر تھا۔ جب بھی وہ اپنے بیٹے کو کلب چھوڑنے جاتا تو اس کا گلن سے ضرور سامنا ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ دوستانہ مزاج کا حامل ایک شائستہ شخص تھا۔

ڈینی کو وہ کسی زاویے سے مجرم نہیں لگا، مگر یہ قانونی معاملہ تھا۔ ایک لڑکی کو وحشیانہ انداز میں قتل کیا گیا تھا۔ ڈینی رسک نہیں لے سکتا تھا۔

اُس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "گلن، میں چاہتا ہوں کہ تم خوب سوچ سمجھ کر جواب دو۔ کیا تم کبھی ڈیبی کے اپارٹمنٹ گئے تھے؟"

"نہیں۔" گلن نے ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کیا۔ "قطعی نہیں جناب۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

"میری درخواست ہے کہ آپ اپنی قمیص اتار دیں۔" آخر کار ڈینی نے خاموشی توڑی۔

گلن کھڑا ہو گیا۔ تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ تاحال مسکرا رہا تھا۔ اس نے شرٹ اتاری۔ اس کا کسرتی بدن ڈینی کے سامنے تھا۔

نہیں، وہاں ایک بھی خراش نہیں تھی۔ کوئی ایسا نشان نہیں تھا جو قتل والی رات اس کی مقتولہ کے اپارٹمنٹ میں موجودگی ثابت کر سکے۔

ڈینی کے اشارہ پر اس نے قمیص پہن لی۔

"مسٹر گلن، ڈیبی کے بار سے رخصت ہونے کے بعد کا وقت آپ نے کہاں گزارا؟"

"میں بار ہی میں تھا۔" گلن نے جواب دیا۔ "میں لگ بھگ ڈیڑھ بجے تک وہاں رہا۔ بار میں موجود ایک شخص رون ویسٹ نے مجھے لفٹ دی تھی۔"

"رون ویسٹ!" ڈینی نے دھیرے سے نام دہرایا۔ "اور اُس نے تمہیں کہاں اتارا؟"

"اسٹریٹ 7 پر۔ وہاں میری والدہ کا گھر ہے جناب! میں سیدھا وہیں گیا۔" گلن نے کہا۔ "آپ رون ویسٹ سے تصدیق کر سکتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد ڈینی ٹیلی فون پر رون ویسٹ سے بات کر رہا تھا۔

"ہاں گلن گور... مجھے یاد آیا۔" رون ویسٹ کی آواز دُور سے آتی محسوس ہوئی۔ "میں نے اُسے اسٹریٹ 7 پر ہی اتارا تھا۔ شاید اس کے کسی رشتے دار کا گھر تھا وہاں!"

"او کے مسٹر رون! میں تعاون کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔" ڈینی نے فون رکھ دیا۔

وہ کمرے میں لوٹ آیا جہاں گلن اُس کا منتظر تھا۔

"ٹھیک ہے مسٹر گلن۔" ڈینی نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کے وقت کا شکریہ۔ ضرورت پڑی تو آپ سے پھر رابطہ کیا جائے گا۔"

"ضرور جناب۔" گلن مسکرایا۔ "جب آپ کہیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

گلن کے جانے کے بعد ڈینی نے گہرا سانس لیا اور اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔

سراغ کی تلاش میں آج پھر اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اب وہ ناکامیوں کے اِس سلسلے سے تھک چکا تھا!

☆☆☆

پوسٹ مارٹم رپورٹ آچکی تھی۔

بلاشبہ ڈیبی کارٹر کی موت دم گھٹنے سے ہوئی تھی۔ قتل سے قبل اس پر شدید تشدد کیا گیا۔ رپورٹ میں دیگر تفصیلات بھی تھیں، مگر ان سے پولیس کو مدد نہیں ملنے والی تھی... تفتیشی ٹیم تاحال اندھیرے میں کھڑی تھی۔

دوسری جانب عوامی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ڈیبی کے قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ اوکلاہوما کے گورنر کی جانب سے بھی اس ضمن میں بیان جاری ہو چکا تھا۔

پولیس نے کوششیں جاری رکھیں۔ آنے والے دنوں

میں کئی افراد سے رابطہ کیا گیا۔ کڑیاں ملانے کے بڑے جتن کیے، مگر ہر کوشش ناکام گئی۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔

موسم سرما گزر گیا۔ پت جھڑ کا موسم آگیا۔ شاخیں سونی ہو گئیں۔ پھر نئی کونپلیں پھوٹیں۔ باغوں میں پھول کھل اٹھے۔ مگر پولیس اگلے سراغ کا انتظار ہی کرتی رہی۔

یہ سراغ ڈیبی کے قتل کے ٹھیک تین ماہ بعد ایک ایسی خاموش شام اُن کے ہاتھ آیا جب کسی انوکھی اطلاع کی آمد لگ بھگ غیر امکانی تھی۔

آفیسر کرس روز ایک پرانے کیس کی فائل دیکھ رہا تھا کہ فون بجا۔ دوسری طرف ایڈا کاؤنٹی جیل کا سپرنٹنڈنٹ جم فیری تھا۔

"کیسے ہو جم۔" کرس چہکا۔ "بڑے دنوں بعد یاد کیا۔ کوئی خاص خبر!"

"خاص بلکہ بہت اہم خبر ہے دوست۔" جم نے دبی آواز میں کہا۔ "اور یہ ڈیبی کارٹر سے متعلق ہے۔"

کرس کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "کہو میں سن رہا ہوں۔"

"معاملہ تھوڑا عجیب ہے۔" جم نے کہا۔ "دراصل آج دوپہر کھانے کی میز پر دو قیدیوں میں زبردست جھگڑا ہوا۔ وحشیوں کی طرح لڑے وہ دونوں بدمعاش۔ ایک قیدی سیاہ فام تھا، دوسرا سفید فام۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کھدیڑ ڈالا۔ خاصے زخم آئے۔ میں نے اُن بدمعاشوں کو قید تنہائی میں ڈال دیا ہے۔ چند روز میں عقل ٹھکانے آجائے گی سالوں کی۔"

"جم مدعا پر آؤ۔" کرس نے دھیرے سے کہا۔

"اوہ ہاں، یاد آیا۔" جم کی جھینپی ہوئی ہنسی سنائی دی۔ "دراصل جھگڑے کا سبب ڈیبی کارٹر بنی۔ میرا مطلب ہے کہ اُس کے ذکر پر یہ جھگڑا شروع ہوا۔ دراصل سیاہ فام قیدی جس کا نام الیگزینڈر ہے، اپنے ساتھی سے ڈیبی کارٹر قتل کیس سے متعلق بات کر رہا تھا کہ ایک قیدی آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے... الیگزینڈر پر حملہ کر دیا۔"

"اوہ۔" کرس چونکا۔

"اہم بات یہ ہے کہ جب ڈیبی کا قتل ہوا تھا الیگزینڈر پر حملہ کرنے والا قیدی آزاد تھا۔ اور اہم ترین بات یہ ہے کہ..." جم نے ڈرامائی وقفہ لیا۔ "وہ ٹھیک ڈیبی کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔"

"کیا... اس کا نام کیا ہے؟" کرس نے فوراً کہا۔

"رون ولیم سن!"

☆☆☆

ٹھیک تین گھنٹے بعد رون ولیم سن کی فائل کرس کے سامنے تھی۔

آفیسر ملر اور سراغ رساں ڈینی باریٹ اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ چہروں پر سنجیدگی منجمد تھی۔ وہ رون کی فائل کا مطالعہ کر چکے تھے جو ایک پریشان کن کہانی سنا رہی تھی۔

ایک ریپ کیس میں دو ماہ قبل گرفتار ہونے والا رون ولیم سن کسی زمانے میں ایڈا کا چہیتا ہوا کرتا تھا۔ اسکول کے زمانے میں وہ بیس بال کا شاندار کھلاڑی تھا۔ اس کے مداحوں کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ جلد ٹاؤن کی ٹیم میں جگہ بنا لے گا، مگر پھر... منشیات کا بڑھتا ہوا استعمال اس کے کیریئر کو دیمک کی طرح چاٹ گیا۔ رون ناکامی کے بھنور میں گھر گیا۔

منشیات کی لت سے جان چھڑانے کے بعد بھی اس بدبخت کی زندگی ڈگر پر نہیں آسکی۔ وہ کہیں ٹک کر ملازمت نہیں کر سکا۔ جن اداروں میں وہ ملازم رہا تھا، اس کے مالکان اس کی لاابالی طبیعت سے نالاں تھے۔ مجبوراً انہیں اُسے نکالنا پڑا۔

رون کی فائل کے مطابق وہ گزشتہ ایک برس سے کثرت سے شراب نوشی کر رہا تھا۔ فائل میں ایک میڈیکل رپورٹ بھی نتھی تھی، جو اُس کی نفسیاتی حالت پر روشنی ڈالتی تھی۔ معالجین کے مطابق اس کا ذہنی توازن دھیرے دھیرے بگڑ رہا تھا۔ رویے پر تشدد غالب آتا جا رہا تھا۔ وہ اکثر چوک پر کھڑے ہو کر لوگوں کو گھورتا ہوا پایا گیا تھا۔ ایڈا پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ماہرِ نفسیات نے اُسے سماج کے لیے نقصان دہ قرار دے دیا تھا۔

"ایک ناکام شخص، ایک نفسیاتی مجرم۔" بالآخر کرس نے خاموشی توڑی۔ "جو ڈیبی کارٹر کا نام سن کر آپے سے باہر ہو گیا، شک کے چوکھٹے میں پوری طرح فٹ بیٹھتا ہے۔"

"بلاشبہ۔" ملر نے اُس کی تائید کی۔ "وہ ایک غصیل شخص ہے، جسے ریپ کے الزام ثابت ہونے پر چند ہفتے قبل گرفتار کیا گیا۔"

"ہاں۔" ڈینی نے فائل کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔ "اس کی سابق گرل فرینڈ نے بھی اس کے پُرتشدد رویے کی شکایت کی تھی۔ اس پر ریپ کے دو الزامات تھے، پولیس جن میں سے ایک ہی کو ثابت کر سکی۔ شاید..." اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ "ڈیبی کارٹر کا ریپ بھی اُسی درندے نے کیا ہو۔"

"میرے خیال میں ہمیں ایڈا کاؤنٹی جیل کا چکر لگانا چاہیے۔" کرس نے سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کل صبح نو بجے ہم وہاں ہوں گے۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ جم فیری سے بات کر لی ہے۔"

☆☆☆

"بکواس! میں نے اُسے قتل نہیں کیا۔" رون کی دہاڑ نے کمرے کی فضا کو مکدر کر دیا۔ تینوں افسران کے چہروں پر ناپسندیدگی سمٹ آئی۔

"پھر تم نے الیگزینڈر پر حملہ کیوں کیا؟" کرس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کمینہ سیاہ فام شخص۔" اس کے چہرے پر کراہت تھی۔ "وہ اس کا حق دار تھا۔ ہر ایک کو یہ کہتا پھر رہا تھا کہ رون ولیم سن ایک جنسی درندہ ہے۔ اس نے ڈیبی کارٹر کا قتل کیا ہے۔"

"کیا تم ڈیبی کارٹر کو جانتے تھے؟ پہلے کبھی اس سے ملے تھے؟" ملر کا لہجہ سرد تھا۔

"نہیں کبھی نہیں۔" رون کی آواز کھوکھلی تھی۔

"یہ جھوٹ ہے۔" کرس نے تیزی سے کہا۔ "ڈیبی کوچ لائٹ بار میں ملازم تھی اور ہمیں پتا چلا ہے کہ تم اکثر وہاں آیا کرتے تھے۔"

"یہی نہیں۔" ڈینی نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ "ڈیبی نے ایک مرتبہ بار کے مالک سے تمہارے رویے کی شکایت بھی کی تھی۔ وہ تمہیں جانتی تھی اور تم اسے۔ برائے مہربانی اب جھوٹ بولنا بند کر دو۔"

رون نے سر پکڑ لیا۔ "ٹھیک ہے۔" بالآخر اس نے چہرہ اٹھایا۔ آنکھوں میں مایوسی تھی۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اسے جانتا تھا۔ میں... تھوڑا ڈر گیا تھا۔ ہاں بار میں اس سے کئی مرتبہ میرا سامنا ہوا۔ مگر میں نے اسے قتل نہیں کیا۔"

"کیا تم یہ ثابت کر سکتے ہو؟" ملر کا لہجہ تا حال سرد تھا۔

"ہاں... ہاں میں یہ ثابت کر سکتا ہوں۔ میں اس وقت گھر پر تھا۔ میری ماں اس کی تصدیق کر سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم پھر ملیں گے۔" کرس کھڑا ہو گیا۔ "اور میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ دورانِ تفتیش جھوٹ بولنے سے اجتناب برتو۔"

پولیس اسٹیشن پہنچ کر تینوں افسران کو ایک اور اہم اطلاع ملی۔

جونیئر آفیسر جیمس اسپارک نے کرس کو مطلع کیا کہ چند ماہ قبل

فاس

مراکش کا ایک شہر اور سلطان کا مقامِ سکونت۔ آبادی دو لاکھ سے زائد۔ محلِ وقوع انتہائی اہم اور شاندار ہے۔ فاس درحقیقت دو شہروں پر مشتمل ہے۔ فاس الجدید (نیا شہر) اور فاس البالی (پرانا شہر) فاس الجدید سرکاری دفاتر کا شہر ہے۔ صرف دار المخزن ہی نصف سے زیادہ شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ دار المخزن ان عمارتوں اور احاطوں کا مجموعہ ہے جہاں حکومتِ مراکش کے مرکزی دفاتر واقع ہیں۔ وزرائے دفاتر اور کوشک سلطانی بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ وہ محلات ہیں، جہاں سلطان اپنے کنبے کے ساتھ سکونت رکھتا ہے اور جو اپنی سبز رنگ کی ٹائلوں کی چھتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کے لیے ایک مخصوص کوشک، شاہی چڑیا گھر، اسلحہ خانہ اور باغات ہیں۔ متعدد مساجد ہیں، جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مسجد جامع، جامع احمر اور جامع اخضر ہیں۔ یہ مساجد اپنے میناروں کے رنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ فاس الجدید، دراصل فاس البالی کا ایک ذیلی قصبہ ہے۔ فاس البالی کا نقشہ نئے شہر کی نسبت بہت متنوع اور دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ یہ شہر دریائے فاس کی تنگ وادی کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مکانات، مساجد اور باغات ان پہاڑیوں کی ڈھلواں چٹانوں پر واقع ہیں جو وادی کی گزرگاہ کو اس فصیل تک گھیرے ہوئے ہیں جو چٹانوں کے پشتوں پر بنائی گئی ہے۔ فاس صرف اپنے محلِ وقوع کی خوبصورتی کی وجہ ہی سے نہیں، بلکہ اپنی مذہبی یادگاروں کی اہمیت کی بدولت بھی سارے مغرب اقصیٰ میں ممتاز و معروف ہے۔ یہاں مختلف شاہی خاندان یکے بعد دیگرے سریر آرائے سلطنت ہوئے اور انہوں نے ہمیشہ اس قسم کی یادگاروں سے شہر کو مالا مال کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ چنانچہ شہر میں تمام سلسلوں کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی آٹھ سو پچاس مذہبی عمارتیں، مساجد، مدرسے، عبادت خانے، زاویے یا معبد ہیں جو کسی نہ کسی بزرگ کے مقبرے کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔

مرسلہ: سلطان محمد، کویت

جس عورت نے دو آدمیوں کی جانب سے اپنا تعاقب کرنے کی شکایت درج کروائی تھی، اُس نے انہیں شناخت کر لیا ہے۔

''ان میں سے ایک رون ولیم سن تھا۔'' جونیئر آفیسر نے کہا۔

''مجھے توقع تھی۔'' کرس مسکرایا۔ ''اور دوسرا؟''

''وہ اس کا دوست تھا۔ ڈینس فریز۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک استاد ہے۔''

''برائے مہربانی مسٹر ڈینس فریز کو ہم تینوں کی طرف سے پولیس اسٹیشن آنے کی دعوت دیں۔ ہم ان سے ملنا پسند کریں گے۔'' ملر کی سپاٹ آواز کمرے میں گونجی۔

چند گھنٹوں بعد ڈینس فریز پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ وہ ایک گھبرایا ہوا شخص تھا، جو ہکلانے کی عادت میں مبتلا تھا۔

''کیا تم ڈیبی کارٹر کو جانتے تھے؟'' ڈیبی نے سوال کیا۔

''ہاں.. میرا مطلب ہے نہیں۔ میں نے اخبارات میں اس کے متعلق پڑھا ہے، مگر میں اس سے کبھی ملا نہیں۔''

''کیا تم اپنے دوست رون ولیم سن کے ساتھ کوچ لائٹ کلب نہیں جایا کرتے تھے؟'' اس بار کرس نے سوال داغا۔

''کبھی کبھار۔ میں نے سنا ہے کہ ڈیبی کارٹر وہاں کام کیا کرتی تھی، مگر میرا کبھی اس سے سامنا نہیں ہوا۔''

''دو ماہ قبل ایک عورت نے تمہارے اور رون سے متعلق شکایت درج کروائی تھی کہ تم اس کا تعاقب کر رہے تھے۔''

''اوہ وہ معاملہ....'' وہ دھیرے سے ہنسا۔ ''وہ ایک مذاق تھا۔ اور پھر وہ رون کی تجویز تھی۔ میں نے تو اُسے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر....''

''مسٹر ڈینس فریز۔'' ملر کی پاٹ دار آواز کمرے میں گونجی۔ میں تم سے ایک سیدھا سادا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ تم ہاں یا نہ میں جواب دو۔ کیا تم نے اور رون ولیم سن نے... ڈیبی سو کارٹر کا قتل کیا ہے؟''

''قتل؟'' وہ بری طرح چونکا۔ ''نہیں قطعی نہیں۔ بالکل نہیں۔''

''قتل والی رات تم کہاں تھے؟'' ڈیبی نے سوال کیا۔

''میں ... میں....'' اس کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ آنکھیں کھوکھلی ہو گئیں۔ ''میں... کچھ یاد نہیں آ رہا۔ میں شاید....'' اس نے اپنا سر تھام لیا۔

''ٹھیک ہے۔'' کرس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ چہرے پر اطمینان تھا۔ ''اب تم اور رون ولیم سن پولی گراف مشین کے حوالے۔ وہ خود ہی سچ [illegible] جھوٹ کا فیصلہ کر لے گی۔''

ٹھیک سولہ گھنٹے بعد ڈینس اور رون پولی گراف ٹیسٹ کے مرحلے سے گزرے۔

رون کے بیان کی تصدیق ایڈا کاؤنٹی جیل میں کی گئی [illegible] ڈینس کی سینٹرل پولیس اسٹیشن میں۔ اور نتائج یکساں رہے۔ دونوں ہی ٹیسٹ میں بری طرح فیل ہو گئے۔

وہ دونوں... جھوٹ بول رہے تھے!

☆☆☆

''ڈیبی مرڈر کیس میں دو افراد سے تفتیش!''

''پولی گرافک ٹیسٹ نے قلعی کھول دی!''

''کیا پولیس نے قاتلوں کو تلاش کر لیا؟''

اگلے دن کے اخبارات خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ ڈینس اور رون ایڈا میں غیر مقبول ترین شخصیات کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ خصوصاً رون جو داغ دار ماضی کا حامل تھا۔ ڈیبی کارٹر کے اہلِ خانہ نے تو پولی گراف ٹیسٹ میں ناکامی کے فوری بعد مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر دیا تھا مگر پولیس ایسا کرنے سے قاصر تھی۔

جب جونیئر آفیسر جیمس اسپارک نے کرس روز کے سامنے چارج شیٹ تیار کرنے کی تجویز رکھی تو کرس نے قہقہہ لگایا۔ ''نوجوان، جلد بازی مت کرو۔ پولی گراف ٹیسٹ کی عدالت میں کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی بنیاد پر گرفتاری کی کارروائی ایک نیم پختہ اقدام ہوگا۔''

کرس صحیح کہہ رہا تھا۔ ماضی میں کئی بار ایسا ہوا جب پولی گراف ٹیسٹ میں ناکام رہنے والے افراد بعد میں بے قصور ثابت ہوئے اور اس مرحلے کو بہ آسانی عبور کرنے والے قاتل ٹھہرے۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' جونیئر آفسر نے سوال کیا۔

''ہم کام روک نہیں سکتے۔'' کرس گہری سوچ میں غرق تھا۔ ''پہلے مرحلے میں ہمیں اپارٹمنٹ سے ملنے والے فنگر پرنٹس کو ڈینس اور رون کی انگلیوں کے نشانات سے میچ کرنا ہوگا۔''

تفتیشی عمل میں فنگر پرنٹس کو مجرموں تک پہنچنے کا تیر بہدف نسخہ تصور کیا جاتا ہے، مگر ڈیبی کارٹر کیس ایک بدقسمت کیس تھا۔ یہ نسخہ بے ثمر ثابت ہوا۔ اپارٹمنٹ سے ملنے والے فنگر پرنٹس ڈینس اور رون کی انگلیوں کے نشانات سے یکسر مختلف تھے۔

اِس ناکامی نے تفتیش پر جمود طاری کر دیا۔ سراغ سے محروم افسران اکتاہٹ کا شکار ہو گئے۔ اُن کی سرگرمیاں دھیرے دھیرے سُکڑنے لگیں۔ وہ دیگر معاملات میں الجھ گئے۔

موسم بدلے تو ایڈا کے باسیوں کی دلچسپیوں کا رخ بدلنے لگا۔ مقتولہ کی یاد اُن کے ذہنوں سے محو ہونے لگی۔ البتہ ڈیبی کے اہلِ خانہ اور دوستوں نے اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے اپنی مہم جاری رکھی۔ خصوصاً مقتولہ کی ماں پیگی کارٹر کے بیانات وقفے وقفے ہی سے سہی مگر اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔

دکھیاری ماں کے ان حزنیہ بیانات نے جن افراد کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی، ان میں پبلک پراسیکیوٹر بل پیٹرسن بھی شامل تھا جو ایک سخت گیر شخص کی شہرت رکھتا تھا۔ ماضی میں وہ کئی شاطر مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچا چکا تھا۔ ڈیبی کے قتل کے تین برس بعد بل نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔

سالانہ تعطیلات کے بعد دفتر میں قدم رکھتے ہی بل نے اعلان کر دیا کہ وہ خود کو کلی طور پر اِس کیس کے لیے وقف کر چکا ہے۔ کیس سے متعلق تمام فائلز دفتر منگوا لیں اور اگلے چند روز اُن کے مطالعے میں صرف کیے۔

فنگر پرنٹس کے بعد جائے وقوعہ سے ملنے والے بالوں کے تجزیے کو اس زمانے میں خصوصی اہمیت دی جاتی تھی۔ گو آج کے برعکس اُس زمانے میں بالوں کی سو فیصد جانچ لگ بھگ ناممکن تھی، مگر اُن کے ذریعے مجرموں تک رسائی کا امکان ضرور تھا۔

بل پیٹرسن نے ڈیبی کارٹر کیس پر کام کرنے والے افسر کرس روز سے رابطہ کیا۔ جائے وقوعہ سے پولیس نے جسمانی رطوبتیں، خون اور بالوں کے 17 نمونے اکٹھے کیے تھے۔ پیٹرسن نے ان بالوں کو ڈینس اور رون کے بالوں کے نمونے سے پرکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''میں آپ کی کوششوں کی قدر کرتا ہوں مسٹر پیٹر، مگر آپ جانتے ہیں کہ بالوں کی جانچ کو مستند ثبوت تصور نہیں کیا جاتا۔'' کرس روز نے اسے متنبہ کیا۔ ''اور پھر بلڈ گروپ یکساں ہونا تو کچھ بھی ثابت نہیں کرتا۔ دنیا میں ایک جیسے بلڈ گروپ کے کروڑوں افراد ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' پیٹر کی آواز میں اعتماد تھا۔ ''لیکن پھر بھی یہ کوشش کرنا چاہوں گا۔''

حیرت انگیز طور پر یہ کوشش کامیاب رہی۔ ایڈا فارنسک لیبارٹری کی رپورٹ کے مطابق جائے وقوعہ سے ملنے والے بالوں کے نمونے بڑی حد تک ڈینس اور رون کے بالوں جیسے تھے۔ ساتھ ہی جو انسانی رطوبتیں ملی تھیں، ان کی جانچ سے سامنے آنے والا بلڈ گروپ وہی تھا جو ملزمان کا تھا۔

''یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔'' بل ٹیلی فون پر کرس روز سے مخاطب تھا۔

''جناب میں اب بھی یہی کہوں گا کہ یہ ناکافی ثبوت ہیں۔'' کرس نے دھیرے سے کہا۔

''ہم مزید ثبوت اکٹھے کریں گے۔ ان دونوں بدمعاشوں کو سلاخوں کے پیچھے دھکیلے بغیر میں چین سے نہیں بیٹھنے والا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

پولیس کو اپارٹمنٹ کی دیوار پر خون سے سنی ہتھیلی کا ایک پُراسرار نشان ملا تھا۔ ایک ایسا معاملہ جس پر تا حال توجہ نہیں دی گئی تھی۔

پیٹرسن نے اس نشان کو ڈینس اور رون کے ہاتھوں کے نشانات سے میچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کوشش سودمند ثابت ہوگی لیکن فارنسک لیب سے آنے والی فون کال نے اُس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

''تو کیا قاتل کوئی اور شخص ہے؟'' اس نے خود سے کہا۔ ''کوئی ایسا شخص جو تا حال شک کے دائرے میں نہیں آیا۔''

اچانک ایک امکان کی بازگشت اسے سنائی دی۔ دو گھنٹے بعد وہ مقتولہ کی ماں کے سامنے بیٹھا تھا۔

''پیگی میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔'' اس کی آواز میں ہمدردی تھی۔

پیگی خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ شکستہ حال اور مضمحل معلوم ہوتی تھی۔

''کیا تم قاتل کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہو؟'' اس نے چپ توڑی۔

''بلاشبہ۔'' پیگی نے فوراً کہا۔ ''چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی حد تک جانا پڑا۔''

''میں یہی سننا چاہتا تھا۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''میں تم سے ڈیبی کی قبر کشائی کی اجازت چاہتا ہوں۔ چند معاملات ہیں، جو ادھورے رہ گئے ہیں۔''

پیگی کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ اس کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

''قبر کشائی؟'' اس نے دہرایا۔

”ہاں بیگی۔ یہ ضروری ہے۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔”ہم قاتل تک پہنچ سکتے ہیں۔ بس مجھے تمہاری اجازت درکار ہے۔“

”تمہیں اجازت ہے۔“ بوڑھی عورت نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔”بس میں قاتل کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

قبر کشائی کے معاملے نے میڈیا کی خصوصی توجہ حاصل کی۔ جب یہ عمل وقوع پذیر ہوا، کئی اخباری نمائندے قبرستان میں موجود تھے۔

فارنسک ٹیم نے ڈیبی کی ہتھیلیوں کے نشانات لیے۔ جن کی جانچ سے انکشاف ہوا کہ بیڈروم کی دیوار سے ملنے والا خون سے سنا نشان قاتل کا نہیں تھا...وہ مقتولہ کا تھا...ڈیبی سو کارٹر کا...جو موت کے لمحے اس کی آخری جدوجہد کی نشانی تھی!

تفتیش پھر تاریک سرنگ میں داخل ہوگئی!

☆☆☆

”اگر آپ میں سے کوئی شخص ڈیبی سو کارٹر مرڈر کیس کے بارے میں کچھ جانتا ہے، تو برائے مہربانی ایڈا پولیس سے رابطہ کرے!“

87ء کے اوائل میں شائع ہونے والا یہ اشتہار بڑی حد تک روایتی تھا۔ پولیس کی جانب سے پرانے کیسوں سے متعلق اکثر اس طرح کے اشتہارات جاری کیے جاتے تھے، جن کا خال خال ہی کوئی ردِعمل آتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایڈا پولیس اس طرح کے کسی اشتہار کی اشاعت میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی، یہ تو پیٹرسن کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

اشتہار کی اشاعت کے ٹھیک تین روز بعد کرس روز کو ایک غیر متوقع اور بڑی حد تک حیران کن کال موصول ہوئی۔ کال کرنے والا شخص پولیس کو کچھ بتانا چاہتا تھا۔

کرس کی دھڑکن تیز ہوگئی۔”آپ پولیس اسٹیشن چلے آئیں۔“

ڈھائی گھنٹے بعد فون کرنے کا والا شخص سراغ رساں ڈینی باریٹ کے سامنے بیٹھا تھا، جسے پہچاننے میں اُسے ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ وہ گلن گور تھا...وہی بیس بال کوچ جو تین برس قبل خود تفتیش کے مرحلے سے گزرا تھا۔

”تمہاری آمد میرے لیے حیران کن ہے۔“ ڈینی نے کہا۔”ہماری تفصیلی بات ہوئی تھی۔“

”بالکل جناب۔“ اُس کے چہرے پر روشن مسکراہٹ تھی۔”مگر حالیہ برس ہونے والی پیش رفت کے بعد اس میں نئے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ حضور والا، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ کی سودمند کوششوں سے یہ کیس کافی حد تک واضح ہوگیا ہے۔ اور میری یادداشت پر چھائی دھند بھی چھٹ گئی۔ کچھ ایسا یاد آگیا ہے، جسے میں بھلا بیٹھا تھا۔“

اس کے شائستہ انداز نے ڈینی پر خوشگوار تاثر چھوڑا۔

”کہو میں سن رہا ہوں۔“

”جناب، چند روز قبل میں نے ڈینس فرنز اور رون ویلیم سن کے بالوں کے نمونوں اور بلڈ گروپس کے جائے وقوعہ سے ملنے والے نمونوں کے ساتھ جانچ کے نتائج کی تفصیلات اخبارات میں پڑھیں۔ اور تب...میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔“

وہ خاموش ہوگیا۔ ڈینی اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا جہاں خاص نوع کا اطمینان تھا۔

”اس رات...“ وہ آگے جھک گیا۔”کوچ لائٹ کلب میں رون ویلیم سن بھی موجود تھا...اور جہاں تک مجھے یاد ہے جناب، وہ ڈیبی کارٹر کو لبھانے کی کوشش کر رہا تھا، جس میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔“

”کیا تمہیں یقین ہے؟“ ڈینی سیدھا ہو کر بیٹھا گیا۔

”سو فیصد حضور والا۔“ اس نے پشت سے ٹیک لگا لی۔ ”دراصل یہ واقعہ شام آٹھ بجے ہوا تھا اسی وجہ سے میرے ذہن سے اتر گیا مگر جیسا میں نے کہا آپ لوگوں کی کوششوں سے میرے ذہن پر چھائی دھند چھٹ گئی۔ اور میرا خیال ہے...“ اس نے ایک ڈرامائی وقفہ لیا۔”آپ قاتل تک پہنچ گئے ہیں۔“

گو کرس روز اور ڈینی باریٹ بھی اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ ایک گواہ، بالوں اور خون کے نمونوں کی بنیاد پر کارروائی کی جاسکتی ہے، مگر جذباتی بل پیٹرسن اپنا ذہن بنا چکا تھا۔

”خدا کی پناہ! اب ہم انہیں کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟“ وہ شدید غصے میں تھا۔”خون اور بالوں کے نمونے لگ بھگ میچ ہو چکے ہیں۔ گواہ بھی موجود ہے۔ اب بھلا کیا رکاوٹ ہے۔ میں ابھی ورانٹ کا انتظام کرتا ہوں۔“

وہ ایک باا‌ثر شخص تھا۔ ورانٹ کے حصول میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

87ء کے موسم خزاں کی ایک اداس رات ڈینس فرنز کو ریاست میسوری میں واقع اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا جو یہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ پولیس نے اسے کیوں گھیر رکھا ہے۔

البتہ جب اس کی نظر آفیسر کرس روز اور آفیسر ملر پر پڑی تو اس پر واضح ہوگیا کہ تین برس پرانی ڈیبی کارٹر کی لاش بول پڑی ہے۔ پھر پولیس افسران نے رون ویلیم سن کے گھر کا رخ کیا۔

رون ویلیم سن چند ہی ماہ قبل رہا ہوا تھا اور اس رات ایڈا میں واقع اپنی ماں کے گھر تھا۔ جب وہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے اپنے مکان سے باہر آیا، اس کی نظر سڑک کے دوسری طرف موجود اپارٹمنٹ پر پڑی، جو آسیبی معلوم ہوتا تھا۔

اپارٹمنٹ کی تاریک کھڑکی سے کوئی جھانک رہا تھا۔

☆☆☆

وہ دوپہر ہلچل سے بھرپور تھی۔

عدالت میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ڈیبی کارٹر کے اہلِ خانہ اور دوستوں کے علاوہ سماجی تنظیموں اور میڈیا کے نمائندوں کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی، جن کی آنکھوں میں کٹہرے میں کھڑے ڈینس فرنز کے لیے شدید نفرت تھی۔ خصوصاً مقتولہ کی ماں کے لیے تو وہ شخص ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اس کے لیے ایک دردناک انجام کی دعا کر رہی تھی۔

چھ برس قبل ہونے والے قتل کے شواہد گو مکمل نہیں تھے مگر ڈینس کا وکیل پبلک پراسیکیوٹر بل پیٹرسن کی مہارت کا مقابلہ نہیں کرسکا جس نے ابتدائی سیشن ہی میں جیوری کو قائل کرلیا کہ قتل کے لرزہ خیز واقعے میں ڈینس براہِ راست شامل تھا۔

فیصلے والی صبح معمولی فہم رکھنے والا شخص بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

ڈینس کے لیے پائی جانے والی نفرت سے اُس روز کورٹ روم بھرا ہوا تھا۔ جیوری نے اس کے خلاف فیصلہ صادر کیا۔ اُسے عمر قید کی سزا سنادی گئی۔

اس دوپہر کورٹ روم میں موجود ڈینس کے وکیل کے علاوہ ہر چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ڈیبی کے اہلِ خانہ اور دوستوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ بل پیٹرسن کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ جیت چکا تھا۔

ڈینس فرنز کو ٹھکانے لگانے کے بعد عدلیہ رون ویلیم سن کی جانب متوجہ ہوئی، جو بے حد خراب ٹریک ریکارڈ کا حامل ایک نفسیاتی مریض تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا کرائم ریکارڈ ہی اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ اُس کا بچنا لگ بھگ ناممکن تھا۔

جیوری کے لیے وہ مجرم تھا۔ اُسے سزائے موت سنادی گئی۔

جونہی جج نے فیصلہ صادر کیا، ویلیم سن آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے چلّانا شروع کردیا۔”میں بے قصور ہوں۔ بے قصور ہوں میں۔“ اس نے میز الٹ دی۔

پولیس اہل کاروں نے اس بدمعاش کو قابو کرلیا۔ جب اسے کورٹ سے باہر لے جایا گیا، اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ چہرہ بگڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

”نہیں...میں نے تمہیں قتل نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں!“

یہ سزائے موت کے قیدیوں کا سیل تھا، جہاں تعینات اہل کاروں کے لیے یہ جملے قطعی اجنبی نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا ماخذ رون ویلیم سن کی کوٹھری ہے جو اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی حالت بگڑ چکی تھی۔ نفسیاتی مرض عود کر آیا۔ اس کی روح کو دیمک لگ گئی۔ وہ اکثر اپنے سیل میں بڑبڑاتا ہوا پایا جاتا۔ اس نے اپنے وکیل سے شکایت کی تھی کہ اسے سیل میں کسی لڑکی کی چیخیں سنائی دیتی ہیں جن کی وجہ سے وہ سو نہیں پاتا۔

رون کے مقابلے میں ڈینس کی حالت خاصی بہتر تھی۔ اس نے وقت ضائع کرنے کے بجائے قانون کی کتابوں کا مطالعہ شروع کردیا۔ وہ اپیل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اُسی کی تجویز پر رون کے وکیل نے بھی، جو اپنے موکل کی ذہنی حالت کی وجہ سے امید کھو چکا تھا، اپیل کرنے کا فیصلہ کیا۔

سزا سنائے جانے کے ٹھیک ایک برس بعد رون اور ڈینس کی اپیلوں کی سماعتیں ہوئیں۔

وہ ایک لاحاصل کوشش تھی۔ پورا اوکلاہوما انہیں قاتل گردانتا تھا۔ اپیلیں رد کردی گئیں۔

اس ناکامی کے بعد رون نفسیاتی مرض کی بھول بھلیوں میں کھو گیا اور ڈینس مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں اتر گیا۔ تھکن اور اکتاہٹ کے آسیب نے اُنہیں آن لیا تھا۔

☆☆☆

کیا رون ویلیم سن اور ڈینس فرنز واقعی قاتل تھے؟ کیا ڈیبی کارٹر ان ہی کی درندگی کا شکار ہوئی؟

ایڈا کے ہر شخص کو اِس بات پر یقین تھا۔ اور اب... پولیس ڈیپارٹمنٹ نے بھی اس صورتِ حال کو قبول کرلیا تھا۔ ان کے لیے یہ کیس بند ہو چکا تھا۔ البتہ اخبارات کو برابر مسالے دار خبر مل رہی تھیں۔ ہر چند ماہ بعد کسی اخبار یا ٹی وی چینل کا نمائندہ جیل پہنچ جاتا۔ رون اور ڈینس کے انٹرویوز ہوتے، جس میں وہ دونوں بڑی شدت کے ساتھ خود کو بے قصور

گردانتے۔ یہ انٹرویوز خصوصی صفحات پر شائع کیے جاتے۔ اسی طرح ان کی جانب سے دائر کی جانے والی اپیلیں بھی میڈیا کی توجہ حاصل کرتیں۔ اس ضمن میں قانونی ماہرین کے تجزیے شائع ہوتے، پیش گوئیاں کی جاتیں۔

بہ ظاہر تو قاتلوں کا تعین ہو چکا تھا مگر اس کیس میں تاحال چند پیچیدگیاں تھیں۔ ایک سبب تو شواہد کا ناکافی ہونا تھا۔ اور پھر... وقت کے ساتھ ساتھ چند عجیب و غریب کردار بھی سامنے آرہے تھے۔

پہلا مسئلہ اس وقت کھڑا ہوا، جب رکی جو سیمون نامی ایک شخص کی منظر میں آمد ہوئی۔

اس کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ آگے کے دانت ٹوٹ چکے تھے۔ چہرے پر زخم کا نشان تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ ڈیبی سوکارٹر کو درحقیقت اس نے قتل کیا ہے۔

میڈیا نے اس دعوے کو بہت اہمیت دی مگر قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اسے درخورِ اعتنا نہیں جانا۔ انہوں نے تو اس سے پوچھ گچھ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ انہیں مجبوری کی حالت میں اس وقت سیمون کو تھانے بلوانا پڑا، جب رون ولیم سن نے عدالت میں ایک اپیل دائر کی کہ خود کو ڈیبی کا قاتل بتانے والے اس شخص سے کم از کم تفتیش تو کرلی جائے۔

یہ تفتیش رون اور ڈینس کی توقعات کے برعکس لاحاصل ثابت ہوئی۔ سیمون منشیات کا عادی ایک نفسیاتی مریض تھا۔ اس نے پوری واردات کی جو منظر کشی کی، وہ اتنی مضحکہ خیز تھی کہ تفتیشی آفیسر کی ہنسی چھوٹ گئی۔

سیمون کے منظر سے غائب ہونے کے چند ماہ بعد ایک اور شخص میڈیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ ایک سیاہ فام قیدی تھا۔ اس کے نظروں میں آنے کا سبب وہ ٹیلی فون کال تھی جو اس نے موسم برسات میں جیل سے اپنی ماں کو کی۔

کال کے اختتام پر اس نے یہ کہتے ہوئے ریسیور پٹخ دیا تھا... "میں تمہیں بھی ڈیبی کارٹر کی طرح قتل کردوں گا۔"

پولیس نے اس معاملے کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا اور اس کا سبب تھا کہ قتل والی رات وہ شخص کال کوٹھری میں تھا۔ شاید اس نے اپنی ماں کو ڈرانے کے لیے یہ بات کہی تھی۔

اس ٹیلی فون کال کے کئی ماہ بعد تک خاموشی چھائی رہی۔ کہانی میں اگلا موڑ اس وقت آیا، جب رون ولیم سن کی سابق گرل فرینڈ نے، جو ماضی میں اس کے پُرتشدد رویے کی شکایت درج کرواچکی تھی، یہ بیان داغ دیا کہ رون بے گناہ ہے۔

"قتل والی رات تو وہ میرے ساتھ تھا۔" اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "وہ بے قصور ہے۔"

شاید ایڈا پولیس اس معاملے کو سنجیدگی سے لیتی مگر بل پیٹرسن تو اس میں دلچسپی لینے کو قطعی تیار نہیں تھا۔

"اپنے عاشق کو بچانے کی احمقانہ کوشش۔" اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

"خاتون کا بیان رون کے بیان سے براہِ راست متصادم ہے، جس نے دعویٰ تھا کہ قتل والی رات وہ اپنی ماں کے گھر تھا۔ تو آخر وہ تھا کہاں؟" اس نے ایک نظر اخباری نمائندوں پر ڈالی۔ "اپنی ماں کے پیر دبا رہا تھا یا اپنی محبوبہ کے ہاتھ کا کھانا کھا رہا تھا؟"

☆☆☆

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔

ایڈا میں زندگی اپنی ڈگر پر آگئی۔ میڈیا ڈیبی کارٹر کیس کو بھول گیا۔ اور یہ متوقع تھا، مجرم قرار پانے والے دونوں افراد گزشتہ گیارہ برس سے جیل میں تھے۔ ان کی اپیلیں ختم ہوچکی تھیں۔ وہ اپنے دردناک انجام کے قریب تھے۔

رون تو دماغی مریض بن چکا تھا۔ اکثر اسے بجلی کے جھٹکے دیے جاتے۔ دوسری جانب ڈینس بھی امید کھو چکا تھا۔ اسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ جیتے جی یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ اب وہ کسی معجزے کا منتظر تھا۔

بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ یہ معجزہ نئے ہزاریے سے فقط ایک برس قبل وقوع پزیر ہوگا۔

دراصل جس عرصے میں رون اور ڈینس جیل کی تاریکیوں میں اپنی زندگی کاٹ رہے تھے، سائنس کے میدان میں انقلاب آچکا تھا۔ خاص کر فارنسک سائنس نے بہت ترقی کرلی تھی۔ ڈی این اے ٹیسٹنگ ٹیکنالوجی میں آنے والی جدت نے تفتیش کو اب نئے رخ پر ڈال دیا تھا۔

ڈینس فرنز اور رون ولیم سن نے ایک آخری کوشش کی۔ انہوں نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے اس ٹیکنالوجی کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ گو اپیلیں ختم ہوچکی تھیں، مگر اس دلیل کی بنیاد پر کہ ڈی این اے ٹیسٹنگ کی سہولت ماضی میں موجود نہیں تھی، عدالت نے اپیل سماعت کے لیے منظور کرلی۔

جب بل پیٹرسن کو یہ اطلاع ملی، وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔ آفیسر کرس روز اور ڈینی باریٹ نے بھی اس خبر کو توجہ نہیں دی۔ ڈیبی کے اہلِ خانہ نے بھی تو زیادہ تردد نہیں کیا۔

سچ تو یہ ہے کہ دونوں مجرموں کے اہلِ خانہ کے علاوہ کس شخص نے اس میں دلچسپی نہیں لی۔

پیٹرسن نے عدالت کے احکامات پر بالوں اور خون کے نمونے اور جائے وقوعہ سے ملنے والی انسانی رطوبتیں ایڈا فارنسک لیبارٹری روانہ کردیں، جہاں ماضی کے برعکس اب جدید ٹیکنالوجی برتی جارہی تھی۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد اسے لیبارٹری سے کال موصول ہوئی۔ ایک ایسی کال، جسے وہ زندگی بھر نہیں بھولنے والا تھا۔

"مسٹر بل پیٹرسن! میں ایڈا فارنسک لیب کا انچارج پرکاش راج بات کررہا ہوں۔" فون کرنے والے نے ایشیائی لہجے میں کہا۔ "میں چاہتا ہوں جناب کہ آپ تحمل سے میری بات سنیں۔"

پیٹرسن کو یہ جملے ناگوار گزرے۔ "بولیے مسٹر راج، میں سن رہا ہوں۔"

"شکریہ جناب۔" پرکاش اس کی آواز سے جھلکتی ناپسندگی نظرانداز کرگیا۔ "آپ نے جائے وقوعہ سے ملنے والی رطوبتیں اور بال روانہ کیے تھے، تاکہ ہم انہیں ڈینس اور رون کے نمونوں سے میچ کرسکیں۔"

"جی بالکل! آپ کو اس بات پر حیرت ہے یا اعتراض؟" اس نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

"نہ مجھے حیرت ہے جناب نہ اعتراض۔" پرکاش نے دھیرے سے کہا۔ "دراصل ان ہی کی بنیاد پر رون اور ڈینس کو مجرم ثابت کیا گیا تھا۔ مگر اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ...." اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ "ہماری جانچ کے مطابق ڈیبی کارٹر کے گھر سے اکٹھے کیے جانے والے نمونوں میں سے کوئی ایک بھی...." اس نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی ایک بھی ڈینس اور رون کے بالوں، خون یا رطوبت سے میچ نہیں کرسکا۔"

"کیا؟" پیٹرسن اچھل پڑا۔ "کیا بکواس کررہے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ بالکل پُرسکون ہوجائیں مسٹر پیٹرسن اور میری بات سنیں۔" پرکاش نے گہرا سانس لیا۔ "کوئی ایک نمونہ بھی رون اور ڈینس کے ڈی این اے سے میچ نہیں کرسکا ہے اور یہی حقیقت ہے۔ جناب، مجھے لگتا ہے آپ نے غلط آدمیوں کو گرفتار کرلیا تھا۔ قاتل اب تک آزاد ہے۔ میں رپورٹ آج شام ہی آپ کو...."

☆☆☆

شواہد ناقابلِ تردید تھے۔

چندرہ اپریل والے روز عدالت کو فیصلہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ یہ تو منٹوں کا معاملہ تھا۔ رون ولیم سن اور ڈینس فرنز کو باعزت بری کرنے کے سوا عدالت کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ عدلیہ کی جانب سے ان سے معذرت بھی کی گئی۔

ڈینس اور رون اس روز خوشی کے ناقابلِ یقین تجربے سے گزرے۔ وہ اپنے اہلِ خانہ سے لپٹ گئے۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ گیارہ سال کی تلخ یادوں کو بھول جانا چاہتے تھے۔ ایک نئی زندگی شروع ہونے کو تھی۔

ڈیبی کارٹر کے خیرخواہوں کو اس فیصلے سے شدید جھٹکا لگا۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ رون اور ڈینس بے قصور

مُلاّ محمود فاروقی

1585ء_1652ء

مُلاّ محمود بن محمد بن شاہ محمد جونپوری۔ ہندوستان کے ایک عظیم عالم اور منطقی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور اس کے بعد استاذ الملک محمد افضل جونپوری سے حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں منطق اور فلسفے کی تکمیل کی۔ جب ان کی شہرت شاہجہان بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے انہیں آگرے میں طلب کیا اور اپنے وزیر اعلیٰ سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ ان کے شہر پہنچنے پر ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ بالآخر انہیں درباری علما میں شامل کرلیا گیا اور سہ صدی کے منصب سے نوازا گیا۔ وہ مصاحب کی حیثیت سے سفر میں شہنشاہ کے ساتھ رہے۔ لاہور کے شاہی دورہ کے موقع پر مُلاّ شاہ میر بدخشی نے انہیں سختی سے فہمائش کی کہ وہ دنیاداری میں بہت زیادہ الجھ گئے ہیں اور بادشاہ کی ملازمت ترک کرنے کی ہدایت کی۔ اس بات سے متاثر ہوکر مُلاّ موصوف نے شاہی ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنے گاؤں واپس جاکر تدریس کا کام شروع کردیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہجہان کے دوسرے بیٹے اور اس وقت کے بنگال کے حاکم شاہ شجاع نے، جو اُن سے فلسفے اور منطق کی کتابیں پڑھتا رہا تھا، انہیں ڈھاکا بلالیا۔ فلسفے اور علم البلاغت پر ایک عظیم سند کی حیثیت سے انہیں بلند عالم مانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے منہ سے کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں کہا جسے بعد میں واپس لینا پڑا ہو، اور نہ کبھی کسی حلفیہ بیان کی تردید کی۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ان کا شمار قدیم شیعی فقہا میں کیا ہے۔ جونپور میں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے۔ مُلاّ صاحب کی تصانیف یہ ہیں۔ 1۔ الشمس البازغۃ۔ 2۔ الفرائد فی شرح الفوائد۔ 3۔ الفرائد المحمودیہ۔ 4۔ حاشیہ علی الآداب الباقیہ۔

مرسلہ: نوازش علی، کراچی

ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بل پیٹرسن سمیت قانون نافذ کرنے والے اداروں کے چند افسران نے بھی اس فیصلے کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان کے لیے رون اور ڈینس تاحال مجرم تھے، جن کا تعاقب کرنے، حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کا وہ ارادہ باندھ چکے تھے۔

ڈینس اور رون کی زندگی کو ڈگر پر آنے میں خاصا وقت لگا۔ سماج میں قبولیت حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ پولیس انہیں شک کی بنیاد پر دوبارہ نہ دھرلے۔

وہ پہلا قدم جس نے ان کی بے گناہی کے تصور کو تقویت پہنچائی، 2001 کے اواخر میں اٹھایا گیا، جب انہوں نے ایڈا شہر اور اوکلاہوما ریاست کی انتظامیہ کے خلاف نااہلی اور غفلت کا کیس دائر کردیا۔

کیس کی سماعت شروع ہوتے ہی ریاست کے معروف قانون دانوں نے پیش گوئی کردی کہ رون اور ولیم یہ کیس بہ آسانی جیت جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ 2003 میں عدالت نے ایڈا سٹی کو رون اور ڈینس کو پانچ لاکھ ڈالر جیسی خطیر رقم ادا کرنے کا حکم جاری کردیا۔ اوکلاہوما کی انتظامیہ نے اس فیصلے کو دیکھتے ہوئے عدالت کے باہر ہی تصفیہ کرنے کو ترجیح دی۔ عام خیال ہے کہ انہوں نے بھی کیس واپس لینے کے لیے رون اور ولیم کو لاکھوں میں ادائیگی کی۔

☆☆☆

رون اور ڈینس کی رہائی پر آگ بگولا ہوجانے والے بل پیٹرسن کو جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اُسے جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا۔

اس نے کرس روز سمیت کیس پر کام کرنے والے افسران کے ساتھ ایک طویل میٹنگ کی، جس میں ایک بات پر اتفاق کیا گیا کہ انہیں عدالت کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے نئے سرے سے کام شروع کرنا ہوگا۔

''خوش قسمتی سے ہمارے پاس نیشنل ڈیٹا بیس جیسی جدید سہولت ہے۔'' کرس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''کروڑوں افراد کے ڈی این اے سیمپل کا ریکارڈ اس میں محفوظ ہے۔ سب سے پہلے ہمیں فارنسک لیب سے حاصل ہونے والے ڈی این اے کو اس ریکارڈ سے میچ کرنا چاہیے۔''

''ضروری نہیں کہ قاتل کا ڈی این اے ریکارڈ بھی ہمارے پاس موجود ہو۔'' پیٹرسن نے فوراً کہا۔

''اتنے قنوطی مت بنو دوست۔'' کرس نے قہقہہ لگایا۔ ''ہمیں کہیں نہ کہیں سے تو آغاز کرنا ہی ہوگا۔''

کون سوچ سکتا تھا کہ یہ معمولی اقدام سترہ سال پر محیط ایک پیچیدہ کیس کو، جسے اخبارات میں اب معما کہا جانے لگا تھا، بہ آسانی حل کردے گا۔

انہوں نے معلومات کو نیشنل ڈیٹا بیس میں داخل کیا۔ کمپیوٹر نے جانچ شروع کی۔ اور دھیرے دھیرے ایک شبیہہ بننے لگی۔

اپارٹمنٹ سے ملنے والے بال، خون اور جسمانی رطوبتیں ڈیٹا بیس میں موجود ایک شخص کے ریکارڈ کی جانب اشارہ کررہی تھیں۔

چند گھنٹوں بعد رپورٹ کرس روز کے سامنے تھی۔ وہ قاتل تک پہنچ گئے تھے۔ مگر اُسے گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ قطعی نہیں... کیونکہ اس وقت وہ جیل میں تھا۔

ڈیٹا بیس نے جس شخص کی جانب اشارہ کیا تھا، وہ ڈکیتی، اغوا اور پولیس اہل کاروں پر فائرنگ کرنے کے الزام میں چودہ برس کی جیل کاٹ رہا تھا۔

جب کرس روز نے اس شخص کی شناخت سے سراغ رساں ڈینی باریٹ کو آگاہ کیا، اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''ہم سے بھیانک غلطی ہوگئی۔''

ڈینی صحیح کہہ رہا تھا، کیونکہ نیشنل ڈیٹا بیس نے جس شخص کو شناخت کیا تھا، اُس کا نام تھا... گلن گور!

وہی بیس بال کوچ جو سترہ برس قبل شک کے دائرے میں آیا تھا، جس سے ڈینی باریٹ نے تفتیش کی تھی۔ وہی شاطر شخص جس کے جھوٹے بیان کی وجہ سے ڈینس اور رون کو گیارہ برس سلاخوں کے پیچھے گزارنے پڑے تھے۔ وہی شخص درحقیقت ڈیبی سوکارٹر کا قاتل تھا۔

''وہ ہماری آنکھوں کے سامنے تھا، مگر ہم اسے پہچان نہیں سکے۔'' ڈینی نے کہا۔

''مگر اب ہم نے اسے پہچان لیا ہے۔'' کرس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ ''اور کل صبح ہم اس سے ملاقات کرنے جارہے ہیں۔''

کرس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی۔ ان کے سینٹرل جیل پہنچنے سے ٹھیک تین گھنٹے قبل گلن جیل توڑ کر فرار ہوگیا۔

☆☆☆

بل پیٹرسن اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ چہرے پر غصہ تھا۔ سامنے گلن گور کی فائل رکھی تھی۔ اچانک فون بجا۔ دوسری طرف آفیسر کرس روز تھا۔

"ایک بری خبر ہے پیٹر۔" کرس کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"اچھا۔" لہجے میں طنز تھا۔ "کیا اب کسی بری خبر کا امکان باقی ہے؟"

کرس نے طنزیہ لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے اُسے گلن گور کی تازہ کارروائی سے مطلع کیا۔

"حد ہوگئی۔" پیٹرسن بپھر گیا۔ "شرمناک۔"

کرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند ساعت خاموشی رہی، پھر اس نے گہرا سانس لیا۔ "خیر، وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔ ہم اسے شناخت کر چکے ہیں۔ پولیس اسے ڈھونڈ نکالے گی۔ مگر میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں دوست۔ کیا اس شخص نے واقعے کے چار برس بعد اپنا بیان تبدیل کیا تھا؟"

"ہاں۔" کرس نے دھیرے سے کہا۔ "یہ درست ہے۔"

"حیرت انگیز۔" پیٹرسن کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ "کیا تمہیں علم ہے کہ اُس کے پہلے بیان کی کاپی کبھی مجھ تک پہنچی ہی نہیں۔ شاید وہ ایڈا پولیس اسٹیشن ہی میں دفن ہوگئی۔ تمہارے ڈیپارٹمنٹ کی غفلت نے میرے کیریئر کو داغ دار کر دیا۔ قانون کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ بیان تبدیل کرنے والا گواہ ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ اور اِسی گواہ کی بنیاد پر ہم نے..."

"شانت ہو جاؤ پیٹر۔" کرس نے کہا۔ "ہم دونوں گزشتہ تیس برس سے مجرموں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اور ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ پیچیدہ کیس میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔ بلاشبہ ہم سے غلطی ہوئی، جس کا خمیازہ ہم بھگتنے کے لیے تیار ہیں، لیکن ابھی..." وہ سانس لینے کو رکا۔ "موضوع اُس بدمعاش کے خلاف کیس تیار کرنا اور اُسے کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔ میری درخواست ہے کہ غصہ تھوک کر اس جانب اپنی توجہ مبذول کرو۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ اب وہ بچ نہیں سکے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ گلن گور کے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ چھ دن بعد اس دروغ گو نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

گرفتاری کے چند گھنٹے بعد وہ اپنی کھوکھلی آنکھوں کے ساتھ کرس روز اور ڈینی پاریٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔

وہ ڈیبی سوکارٹر کو قتل کرنے کے الزام سے انکاری تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ رات اس نے اپنی والدہ کے اپارٹمنٹ میں گزاری تھی، مگر پولیس جانتی تھی کہ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اُن کے پاس ٹھوس شواہد تھے۔ درحقیقت وہ بار سے لوٹنے کے بعد سیدھا ڈیبی کے گھر گیا تھا۔

ماضی کی روایت برقرار رکھتے ہوئے دورانِ تفتیش گلن نے اس بار بھی کمالِ مہارت سے اپنا بیان بدل لیا۔

سترہ برس قبل اس نے کہا تھا۔ "میں کبھی ڈیبی کے گھر نہیں گیا۔" مگر اس بار اس نے اقرار کیا کہ وہ تین بار اس اپارٹمنٹ میں ڈیبی کے ساتھ رات گزار چکا تھا۔

"ہاں، وہ مجھے پسند تھی۔ میں وہاں جاتا رہتا تھا۔ مگر میں نے اُسے قتل نہیں کیا۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں چاہوں گا کہ اب تم جھوٹ بولنا ترک کر دو گلن۔" ڈینی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ہم تھک چکے ہیں۔ تم نے کہا تھا کہ ولیم سن اس رات بار میں تھا، درحقیقت وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ یہ فقط خود کو بچانے کی گھٹیا کوشش تھی۔"

"نہیں۔ وہ وہاں تھا۔" اس نے فوراً کہا۔ "اسی نے ڈیبی کو قتل کیا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" کرس کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ "تمہاری وجہ سے ہماری بہت سبکی ہوئی، مگر اب مزید نہیں۔ قانون تم تک پہنچ چکا ہے۔"

☆☆☆

گو مجرم الزامات سے انکاری تھا، مگر پولیس اس واردات کا خاکہ تیار کر چکی تھی۔

خاکہ کچھ یوں تھا کہ خوبرو ڈیبی سوکارٹر کے ساتھ شب بسری کرنے کا خواہش مند نشے میں دھت گلن گور لگ بھگ رات دو بجے اُس کے اپارٹمنٹ پہنچا۔ چونکہ ڈیبی اسے جانتی تھی، اس لیے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی، مگر اس کے مذموم ارادے کا علم ہونے پر سراسیمہ ہو کر ڈیبی نے مدد کے لیے اپنی دوست جینا کو فون کر دیا۔

شاطر گلن اس موقع پر ڈیبی کو یقین دلانے لگا کہ وہ جلد لوٹ جائے گا۔ شیطان صفت مجرم کی کوششیں رنگ لائیں۔ معصوم ڈیبی نے فون کر کے اپنی دوست کو اپارٹمنٹ آنے سے منع کر دیا۔ بس... اُسی لمحے اس درندے نے ڈیبی سوکارٹر پر حملہ کر دیا۔ اُسے قابو کرنے کے لیے بدترین تشدد کا سہارا لیا۔ پولیس کا اندازہ تھا کہ اس رات گلن نے ایک سے زائد بار اس کی آبروریزی کی۔ پہلی بار اس وقت جب وہ اس کے تشدد کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی... اور دوسری اس وقت... جب وہ اسے ہلاک کر چکا تھا۔

مجرم نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے کرائم سین کو ایک بھیانک منظر میں بدل دیا۔ پولیس کو گمراہ کرنے کے لیے اس

نے ڈیبی کے جسم، میز اور دیوار پر عجیب وغریب تحریریں چھوڑیں۔ تاریں اور مختلف اشیاء پُراسرار انداز میں پھیلا دیں۔ ریڈیو چالو کر دیا اور وہاں سے نکل گیا۔

وہ اپنے منصوبے میں کامیاب رہا۔ پولیس واقعی بھٹک گئی اور وہ برسوں آزاد گھومتا رہا۔ مگر اب اس کی آزادی کے دن ختم ہو چکے تھے۔

2003 میں گلن گور پر مقدمہ شروع ہوا۔ عدالتی کارروائی کے دوران بھی الزامات سے انکار کرتا رہا، مگر ثبوت ناقابلِ تردید تھے۔ جیوری نے اسے موت کی سزا سنائی دی۔

☆☆☆

گلن گور کا قصہ تو تمام ہوا، مگر ڈینس فرِٹز اور رون ولیم سن کی کہانی جاری تھی۔

گو ولیم سن ایڈا اور اوکلاہوما کی حکومتوں کے خلاف دائر کیے جانے والے مقدمے میں کامیاب ٹھہرا، مگر زندگی کے محاذ پر ناکامی کا آسیب اس پر چھا گیا۔ وہ نفسیاتی امراض اور جوانی میں کثرت سے کی جانے والی شراب نوشی کے اثرات سے نکل نہیں سکا، جنہوں نے جیل کے گیارہ برسوں میں ایک عفریت کی شکل اختیار کر لی تھی اور اُس کے وجود کو چاٹ ڈالا تھا۔

رہائی کے ٹھیک پانچ برس بعد وہ ایک نرسنگ ہوم میں دم توڑ گیا۔

ڈینس خوش قسمت رہا۔ دھیرے دھیرے ہی سہی اس کی زندگی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی۔ اس نے ''انوسنز پراجیکٹ'' کے نام سے جیل میں قید اُن افراد کے لیے ایک فلاحی منصوبہ شروع کیا، جو ٹھیک اس کی مانند ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے تھے۔ اس نے اپنے تلخ تجربے کو Journey Toward Justice نامی ایک کتاب میں بھی سمویا، جسے اوکلاہوما میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

آج ڈینس فرِٹز میسوری میں مقیم ہے اور اپنی بیٹی کے ساتھ بے قصور افراد کو انصاف دلانے کی کوششوں میں جُتا ہے ــــ اِن ہی کوششوں کے دوران ایک انتہائی خوشگوار لمحہ اس کی زندگی میں در آیا۔

یہ میسوری پر اترنے والی اُس حسین صبح کا ذکر ہے، جب ڈیبی کارٹر کی ماں پیگی کارٹر اُس سے ملنے آئی۔

ڈینس اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ پیگی اندر داخل ہوئی۔ بوڑھی عورت کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

چند برس قبل ڈینس کو ان آنکھوں میں اپنے لیے شدید نفرت نظر آتی تھی، مگر آج... ان میں احترام تھا، خلوص تھا۔

پیگی کے لب وا ہوئے۔ ''برسوں تک میں نے تم سے نفرت کی ہے ڈینس۔ میں تمہیں موت کا حق دار خیال کرتی تھی، مگر سچ تو یہ ہے کہ تم دعاؤں کے حق دار ہے۔ تم ایک نیک انسان ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور ڈینس کو گلے لگا لیا۔

وہ ایک قیمتی لمحہ تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ خوشی کے آنسو۔

☆☆☆

بکس آئٹم:

جون گریشام اور ڈیبی مرڈر کیس

ڈیبی کے قتل کا قصہ شاید ایڈا ہی تک محدود رہتا، اگر بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی ناول نگار جون گریشام اس پر قلم نہ اٹھاتا۔

جون کا شمار موجودہ عہد کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اس کے ناولوں کی 300 ملین کاپیاں اب تک فروخت ہو چکی ہیں۔ جہاں اس نے اپنے زرخیز تخیل کی مدد سے کہانیاں بیان کیں، وہیں حقیقی واقعات میں چھپے اسرار کو بھی اپنی کتابوں میں سمویا، جس میں سب سے زیادہ مقبولیت 2006 میں شائع ہونے والی جون کی کتاب The Innocent Man کو حاصل ہوئی۔

یہ کتاب بیس بال کے کھلاڑی رون ولیم سن کی زندگی کے گرد گھومتی ہے، جو ناکامیوں کے بھنور میں پھنس جاتا ہے، جس کے بعد منحوس واقعات کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور وہ جیل میں پہنچ جاتا ہے، جہاں اسے گیارہ برس تک شدید اذیت سہنی پڑتی ہے۔

جون گریشام کے بہ قول ڈیبی مرڈر کیس کے منطقی انجام کے بعد اس نے کہانی بیان کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسے اپنی اہم ترین تخلیقات میں شمار کرتا ہے۔ قارئین اور ناقدین اس سے متفق ہیں۔ اس کتاب میں حقیقی واقعات کو تجسس اور غیر متوقع سانحات کے ساتھ اس خوبصورتی اور مہارت سے ایک لڑی میں پرویا گیا ہے کہ قاری کی دلچسپی اپنے اوج پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں یہ کتاب ولیم سن کا المیہ بیان کرتی ہے، وہیں یہ امریکی نظامِ قانون کی خامیوں اور جذباتی اور نااہل پولیس اہل کاروں کی نشان دہی بھی کرتی ہے، جن کی غفلت کے باعث بے گناہ افراد کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

زندگی جیت گئی

امیمہ سلیم

وہ ایک تجرباتی اڑان پر نکلے تھے۔ انہیں لیبیا کے صحرائی علاقے پرسے گزرنا تھا کہ جہاز حادثے کا شکار ہوگیا۔ وہ دونوں بھوکے پیاسے جلتی ریت میں بھٹکتے رہے۔ سسکتی ہوئی موت قدم بہ قدم ہمرکاب تھی۔ ان پر جوگزری یہ اہلِ دنیا کے لیے سبق ہے۔ اللہ کس کس طرح اپنے بندوں کو محفوظ رکھتاہے، صحرا میں بھی غذا کا اہتمام کردیتا ہے۔ بے شک اللہ ہی بہتر رزق دینے والا اور محافظ ہے۔

ایک پائلٹ اور اس کے ساتھی پر گزرنے والی افتاد کا ذکر

یہ دوسری جنگ عظیم سے قبل کا واقعہ ہے۔ فرانس نے اپنے ایک جیٹ فائٹر میں کچھ ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ فرانسیسی ایرو ناٹیکل انجینئروں کا دعویٰ تھا کہ یہ جیٹ فائٹر فرانس کے ہوائی بیڑے میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ اس کی رفتار دوسرے فرانسیسی لڑاکا طیاروں کی نسبت دوگنی تھی۔ انجینئرز نے اس کے انجن کے ساتھ ساتھ اس کے آٹومیٹک سسٹم میں بھی بہت سی تبدیلیاں کی تھیں۔

اب جہاز آزمائشی پرواز کے لیے تیار تھا۔ جہاز کے

معائنے کے لیے ایئر بیس کے تقریباً تمام ہی ہواباز وہاں موجود تھے۔ ان میں انتہائی ماہر پائلٹ بھی تھے۔

”سر! اس آزمائشی پرواز کا پائلٹ کون ہوگا سر؟“ اس نے ایئر کموڈور سے پوچھا۔ وہ خاص طور پر طیارے کے تکنیکی نظام کا جائزہ لینے آیا تھا۔

”آپ بہتر سمجھتے ہیں؟“ ایئر کموڈور نے کہا۔ ”ویسے میرا خیال ہے کہ اس آزمائشی پرواز پر اینٹوئن کو جانا چاہیے۔“ ایئر کموڈور نے میری طرف توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ میرے لیے ایک اعزاز تھا۔ وہاں فرانسیسی ایئر فورس کے بہترین پائلٹ موجود تھے۔ مجھے بھی ہوابازی کا تجربہ تھا، مہارت بھی تھی لیکن وہاں مجھ سے کہیں زیادہ سینئر اور ماہر ہواباز موجود تھے۔ میرا سینہ فخر سے کچھ پھول گیا۔ دوسرے آفیسر مجھے رشک آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ مجھے ایئر کموڈور نے منتخب کیا تھا۔

”اینٹوئن!“ کمانڈر نے کہا۔ ”تمہارے ساتھ جو انجینئر جائے گا اس کا انتخاب تم خود کرو۔“ اگرچہ یہ کوئی جنگی مہم نہیں تھی لیکن اس کے باوجود کمانڈر اصول و ضوابط کی پابندی کررہا تھا۔

ایئروناٹیکل انجینئر پریواٹ نہ صرف ماہر انجینئر تھا بلکہ وہ میرا بہترین دوست بھی تھا۔ میں نے فوراً پریواٹ کا نام لے دیا۔

☆☆☆

دوسرے دن علی الصباح ہمیں اس مختصر آزمائشی پرواز پر روانہ ہونا تھا۔ ہمیں فرانس کے ایئر بیس سے پرواز کرکے انڈوچائنا تک جانا تھا۔ انڈوچائنا اس وقت فرانسیسی نوآبادی تھا۔ جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں لیبیا کے وسیع و عریض صحرا کو عبور کرنا تھا۔ یہ بھی معمول کی بات تھی۔ اس سے قبل میں پروازوں میں نہ جانے کتنے دریا، سمندر، پہاڑ اور صحرا عبور کرچکا تھا۔

میں نے ایئر فورس میں ملازمت تو بعد میں کی تھی لیکن بہت نوعمری سے ہوابازی کررہا تھا۔ میں نے تو اپنے طور پر ایک طیارہ خود بھی بنایا تھا۔ اس لیے یہ آزمائشی پرواز بھی میرے لیے معمول کی ایک پرواز تھی۔

ایئر بیس کے crew نے طیارے کو ہر طرح سے چیک کرنے کے بعد پرواز کے لیے گرین سگنل دے دیا۔

پریواٹ نے اپنے طور پر پہلے ہی جہاز کے انجن وغیرہ کا جائزہ لے لیا تھا۔

میں اپنی چمکتی ہوئی کلف دار یونیفارم میں باہر نکلا اور طیارے کے کاک پٹ میں سوار ہوگیا۔ پریواٹ پہلے سے ہی طیارے میں موجود تھا۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور طیارے کو بہت مہارت سے اوپر اٹھالیا۔

”آج موسم بہت خوش گوار ہے اینٹوئن۔“ پریواٹ نے مسکرا کر کہا۔

”لیکن پرواز کے دوران تم بیئر کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔“ میں نے اسے سختی سے تاکید کی۔

میں جانتا تھا کہ جب وہ موسم خوش گوار ہونے کی بات کرتا تھا تو ضرور بیئر کی بوتل کھول لیتا تھا۔

”یار تمہاری یہ ہی عادت مجھے اچھی نہیں لگتی۔“ پریواٹ نے منہ بنا کر کہا۔ ”ہم کون سا کسی جنگی مہم پر جارہے ہیں؟“

”ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے پریواٹ۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم تو اس سے پہلے بھی میرے ساتھ بہت سی پروازوں میں شریک رہ چکے ہو۔“

”ہاں یار، رہ چکا ہوں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”لیکن ہر مرتبہ بھول جاتا ہوں کہ تم کسی بھی قیمت پر ڈرنک کی اجازت نہیں دو گے۔ اوکے، میں طیارے کے لینڈ کرنے کے بعد ساری کسر پوری کرلوں گا۔“

”طیارے کی رفتار واقعی بہت زبردست ہے۔ ہم نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ فاصلہ طے کرلیا ہے۔ واقعی یہ فرانسیسی ایئروناٹیکل انجینئروں کا زبردست کارنامہ ہے۔“ پھر میں ہنس کر بولا۔ ”میں طیارے کو انتہائی بلندی پر لے جا کر ایک دم نیچے کی طرف لاؤں گا۔ ممکن ہے فضا میں جہاز دو تین قلابازیاں بھی لگائے اس لیے اپنی سیٹ بیلٹ مضبوطی سے باندھ لو۔“

”میں نے سیٹ بیلٹ کھولی ہی کب ہے؟“ پریواٹ نے کہا۔

میں نے اچانک طیارے کا رخ اوپر کی جانب کیا اور اسے انتہائی بلندی تک لے گیا۔

”یار یہ کرتب دکھانے کا موقع نہیں ہے۔“ پریواٹ نے کہا۔ ”ہمیں ایک ڈائریکشن میں چلنا ہے۔ تمہارے کرتبوں سے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم کسی دوسرے جنگی طیارے یا مسافر بردار طیارے سے ٹکرا جائیں۔ کنٹرول ٹاور کو کیا معلوم کہ ان کا ماہر ہواباز آزمائشی پرواز کے موقع پر کرتب دکھا رہا ہے۔“

”ارے یار، یہ بھی تو اس آزمائشی پرواز کا حصہ ہے۔“ میں نے کہا۔ میں نے اچانک طیارے کو فضا میں دو قلابازیاں کھلائیں اور پھر تیزی سے نیچے کی طرف آنے لگا۔

اچانک جہاز کے پینل پر لگی ہوئی ایک لائٹ بلنک کرنے لگی۔ اس میٹر میں سرخ نقطہ بار بار روشن ہورہا تھا۔

”اب طیارے کی رفتار ہموار رکھنا۔“ پریواٹ نے کہا۔ ”میں اپنی سیٹ بیلٹ کھول کر پینل کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ یہ سرخ نقطہ آخر کیوں بار بار جل بجھ رہا ہے۔“

میں نے طیارے کی اڑان نہ صرف ہموار کردی بلکہ اس کی رفتار بھی کم کردی۔ مجھے خود بھی تشویش ہورہی تھی کہ یہ ریڈ لائٹ کیوں بلنک کررہی ہے؟

طیارے کا ڈیش بورڈ دوسرے طیاروں کے مقابلے میں خاصا مختلف تھا۔ طیارے نے اچانک ہلکا سا ایک جھٹکا کھایا۔

پریواٹ چیخ کر بولا۔ ”اینٹوئن! طیارے کا ایندھن دیکھو۔“ حالانکہ وہ خود بھی پورے پینل کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ایندھن ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔“ میں نے پینل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اسی وقت طیارے نے دوسرا جھٹکا کھایا اور اس کی رفتار میں نمایاں کمی آگئی۔

پریواٹ کے ساتھ ساتھ اس صورتِ حال سے میں بھی پریشان ہوگیا۔

”اینٹوئن!“ پریواٹ چیخ کر بولا۔ ”طیارے کے ایک انجن نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ وہ تیزی سے طیارے کے ڈیش بورڈ پر جھکا مختلف آلات پر طبع آزمائی کررہا تھا۔ ”میں نے کنٹرول ٹاور سے رابطہ کرنا چاہا لیکن طیارے کا ریڈیو سسٹم کام نہیں کررہا۔“

”کوشش کرو اینٹوئن!“ پریواٹ نے کہا۔ ”ہمارا رابطہ کسی دوسرے ایئر بیس یا مسافر بردار کنٹرول ٹاور سے ہوجائے۔“

”میں کوشش کررہا ہوں لیکن ریڈیو کام نہیں کررہا ہے۔“ شور کی وجہ سے ہمیں چیخ چیخ کر بولنا پڑ رہا تھا۔ ہمارے کانوں پر لگے ہوئے ہیڈ فون بھی کام نہیں کررہے تھے۔

”بٹن دبا کر طیارے کے باہر آجاؤ۔“ پریواٹ نے کہا۔ ”اس کے علاوہ ہم اب کچھ بھی نہیں کرسکتے۔“

میں نے طیارے کے پینل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اب تو یہ بھی ممکن نہیں ہے پریواٹ۔ ہم لوگ بہت نیچے آچکے ہیں۔ نیچے لیبیا کا وسیع و عریض صحرا ہے۔ میں اس صحرا میں کریش لینڈنگ کی کوشش کرتا ہوں۔“

”تم پاگل تو نہیں ہوگئے اینٹوئن!“ پریواٹ نے کہا۔ ”اس صحرا میں تم لینڈنگ کروگے؟“

”دوسری صورت میں طیارہ زیادہ قوت کے ساتھ زمین سے ٹکرائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”گرتے ہی طیارے میں آگ لگ جائے گی پھر ہم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔“ میں نے طیارے کے پینل سے الجھتے ہوئے کہا۔

زمین بہت تیزی سے نزدیک آرہی تھی۔ بس اب دو منٹ کی دیر تھی۔ طیارے کے وہیل میں نے پہلے ہی کھول دیے تھے۔ اچانک ایک زوردار دھچکا لگا۔ اگر ہم لوگوں کے جسم سیٹ بیلٹس سے بندھے ہوئے نہ ہوتے تو ہم میں سے کسی کی گردن یا ریڑھ کی ہڈی ضرور ٹوٹ جاتی لیکن حیرت انگیز طور پر ہم دونوں ہی محفوظ تھے۔ طیارہ البتہ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔

ہم دونوں نے بہت عجلت میں اپنی سیٹ بیلٹ سے نجات حاصل کی پھر کود کر طیارے سے باہر آگئے۔ طیارہ جس مقام پر گرا تھا یا میں نے جہاں کریش لینڈنگ کی احمقانہ کوشش کی تھی۔ وہاں ریت میں خاصا گہرا گڑھا پڑ گیا تھا۔ طیارے کے ٹکڑے چاروں طرف دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ یہ ایک آزمائشی پرواز تھی۔ اگر ہم لوگ کسی جنگی مشن پر ہوتے تو ہمارا جینا محال تھا۔ طیارے میں موجود ایمونیشن ہی سب سے پہلے پھٹتا۔ اس کے ساتھ ہمارے بھی پرخچے اڑ جاتے اور طیارے کے بھی۔

طیارے سے باہر آکر ہم دونوں کچھ دیر تک ریت پر لیٹے رہے۔ صبح کا وقت تھا اس لیے ابھی ریت میں حدت پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی کچھ ہی دیر بعد سورج آگ برسائے گا اور صحرا کی ریت ہمیں جھلسا کر رکھ دے گی۔ میں اس سے پہلے ہی کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پریواٹ ابھی تک ریت پر پڑا تھا اور مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اس کی ناک سے خون بہہ رہا

ہے۔

میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ ”تم ٹھیک تو ہو پریواٹ؟“

”ہاں، کسی صحرا میں طیارہ تباہ ہونے کے بعد میں جتنا ٹھیک ہوسکتا ہوں، ٹھیک ہوں۔“

”تمہاری ناک سے خون بہہ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا چوٹ زیادہ آئی ہے؟“

”اس وقت تو مجھے احساس نہیں ہورہا ہے۔“ پریواٹ نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں نے اس کے زخم کا جائزہ لیا۔ وہ جھٹکا لگنے سے ہیلمٹ سمیت طیارے کی چھت سے ٹکرا گیا تھا۔ دھچکا اتنا شدید تھا کہ چھت سے ٹکرانے کے بعد اس کی ناک کسی اور چیز سے ٹکرائی ہوگی۔ میں نے اس کی ناک کا جائزہ لیا۔ معمولی سا زخم تھا۔ میں نے رومال نکال کر اس کی ناک اور چہرے پر بہتا ہوا خون صاف کردیا۔

ہم کسی دور دراز کی پرواز یا مشن پر ہوتے تو ہمارے پاس لنچ کٹ بھی ہوتا۔ پرواز سے پہلے ایک بار کٹ میں کچھ سینڈوچز، کافی کا تھرماس وغیرہ رکھ دیا گیا تھا۔ پانی کی دو بوتلیں بھی تھیں اور بیئر کے دو تین ٹن اور ایک بوتل پریواٹ اپنے طور پر لے کر آیا تھا لیکن اب وہ چیزیں نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ طیارے میں ایک فرسٹ ایڈ باکس بھی ہوتا ہے۔ مجھے اس کی تلاش تھی۔

طبیعت بحال ہونے کے بعد پریواٹ اٹھا اور بے چینی سے کچھ تلاش کرنے لگا۔ میں تو فرسٹ ایڈ باکس کی تلاش میں تھا لیکن وہاں نہ فرسٹ ایڈ باکس تھا نہ کھانے پینے کی کوئی چیز۔ میں نے پریواٹ سے پوچھا۔ ”تم کیا تلاش کررہے ہو؟“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ کھانے پینے کی کوئی چیز محفوظ ہے؟“ پریواٹ نے جواب دیا۔

”ہماری پرواز بہت طویل نہیں تھی اس لیے صرف کچھ سینڈوچز اور کافی کا تھرماس تھا۔ پانی کی دو بوتلیں بھی تھیں۔ بیئر کی بوتلوں کا علم تمہیں ہوگا لیکن اب یہاں سوائے طیارے کے بچے ہوئے ڈھانچے اور ریت کے کچھ بھی نہیں ہے۔“

”اب...... اب کیا ہوگا اینٹوئن؟“ پریواٹ نے پوچھا۔

”اسی سوال کا جواب تو سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم پائلٹ کے طور پر ان صحراؤں سے کسی حد تک واقف ہو۔ تم نے اس صحرا کے اوپر سے بے شمار پروازیں کی ہوں گی۔ نقشے دیکھے ہوں گے۔ تمہیں کچھ اندازہ تو ہوگا کہ اس وقت ہم کسی آبادی سے کتنا دور ہیں؟“ پریواٹ نے روہانسی لہجے میں پوچھا۔

”نقشے دیکھنا اور صحراؤں کے اوپر سے پرواز کرنا علیحدہ بات ہے اور کسی صحرا میں راستہ تلاش کرنا بالکل مختلف ہے پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔ ہمارے پاس تو قطب نما تک نہیں ہے۔ ابھی جب سورج نکلے گا تو اتنی شدید گرمی ہوگی کہ سانس لینا بھی دشوار ہوجائے گا۔ مجھے خود تو اس کا تجربہ نہیں ہے لیکن میں نے ایسے کئی افراد کی داستان سنی ہے جو صحرا میں راستہ بھٹک گئے تھے۔ بہرحال، آؤ کوشش کرتے ہیں۔ شاید ہم کسی آبادی تک پہنچ ہی جائیں۔“

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ سورج طلوع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ یہ تو غنیمت تھا کہ کلائیوں میں بندھی گھڑیاں محفوظ تھیں۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ ہمیں دس بجے تک اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ مجھے ایک امید تھی کہ جب ہم مقررہ وقت پر وہاں نہیں پہنچیں گے تو وہ لوگ تشویش میں مبتلا ہوں گے اور ہماری تلاش میں کوئی طیارہ یا ہیلی کاپٹر ضرور بھیجیں گے۔

ہم نے چلنا شروع ہی کیا تھا کہ کچھ فاصلے پر مجھے ریت میں پانی کی دو بوتلیں دبی دکھائی دیں۔ ان کا صرف کچھ حصہ نظر آرہا تھا ورنہ ہم انہیں دیکھے بغیر گزر جاتے۔

پریواٹ نے بھی شاید وہ بوتلیں دیکھ لی تھیں۔ وہ تیر کی طرح جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی ریت ہٹانے لگا۔

اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ دونوں بوتلیں نہ صرف محفوظ تھیں بلکہ ریت ہٹانے کے بعد اسے بیئر کی ایک بوتل بھی مل گئی۔

یہ ایک نیک شگون تھا۔ گویا قدرت ہم پر مہربان تھی۔ پریواٹ نے ایک بوتل کا ڈھکنا کھولا اور اسے منہ سے لگانے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک دیا اور کہا۔ ”یہ چار لیٹر پانی ہمیں بہت کفایت شعاری سے خرچ کرنا ہوگا۔ ہمیں اس صحرا میں راستہ ڈھونڈتے نہ جانے کتنی دیر لگ جائے۔“

بات پریواٹ کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے پانی کا صرف ایک گھونٹ پیا اور بوتل کا ڈھکنا بند کردیا اور بولا۔ ”اینٹوئن! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر ہم کفایت شعاری سے کام لیں تو یہ پانی کئی گھنٹے تک استعمال کرسکتے ہیں۔“

ہم نے سب سے پہلے اپنے پیراشوٹ سے نجات حاصل کی تھی لیکن انہیں ضائع نہیں کیا تھا بلکہ ریت میں دبادیا تھا اور نشانی کے طور پر جہاز کا لمبا سا ایک ٹکڑا ان پر گاڑ کر اس ٹکڑے پر اپنا ہیلمٹ رکھ دیا تھا۔ اب اگر فضا سے کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ صحرا میں کوئی شخص ہیلمٹ پہنے کھڑا ہے۔

میری پشت پر جو تھیلا تھا میں نے اس میں سے اضافی سامان نکال کر پھینک دیا۔ صرف ایک طاقت ور دوربین اور بڑا سا ایک شکاری چاقو اپنے پاس رکھ لیا۔ میں نے پانی کی ایک بوتل بھی اسی تھیلے میں ٹھونس دی اور سورج کے رخ پر اندازے سے چلنا شروع کردیا۔

تاحد نگاہ ریت ہی ریت تھی...... سرمئی ریت۔ اس وسیع و عریض صحرا کو دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا۔ دور دور تک انسانی زندگی تو در کنار کسی جانور کے آثار بھی نہیں تھے۔

جب ہمیں چلتے چلتے ڈیڑھ گھنٹا ہوگیا تو ہماری حالت تباہ ہوگئی۔ سورج گویا آگ برسا رہا تھا۔ ریت اتنی گرم تھی کہ اس میں چلتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم آگ پر چل رہے ہوں۔

پریواٹ کے مقابلے میں میری صحت بھی اچھی تھی اور مجھ میں قوت برداشت بھی زیادہ تھی۔

اس سے قبل بھی مجھے ایک بار ہنگامی طور پر طیارے سے چھلانگ لگانا پڑی تھی۔ طیارہ زمین سے قریب تھا اس لیے میرا پیراشوٹ نہ کھل سکا اور میں درختوں کے جھنڈ میں جا پھنسا۔ اس وقت اگر میری زندگی نہ ہوتی تو شاید کسی درخت کی ابھری ہوئی شاخ میرے جسم کے آر پار ہوجاتی۔ اس کے باوجود درختوں کے جھنڈ میں گرنے سے میرے جسم پر نہ صرف شدید خراشیں آئی تھیں بلکہ میری کمر اور گھٹنوں میں بھی شدید چوٹ لگی تھی۔ صرف میرا سر اور چہرہ ہیلمٹ کی وجہ سے محفوظ رہ گیا تھا۔

وہاں بھی اس وقت دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں پیراشوٹ سمیت درخت میں پھنسا ہوا تھا۔

میں نے کوشش کرکے اپنی پشت پر بندھے ہوئے تھیلے سے چاقو نکالا تھا لیکن اس کوشش میں میری کراہیں نکل گئی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ نہ صرف میری کمر بلکہ کندھوں اور کہنیوں میں بھی شدید چوٹ آئی تھی۔

میں نے کچھ دیر دم لیا اور پھر ایک ایک کرکے پیراشوٹ کی ڈوریاں کاٹ دیں۔ اس ذرا سی مشقت ہی سے میں بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ میں درخت سے کیسے اترا وہ ایک انتہائی اذیت ناک تجربہ تھا پھر مجھے مزید ایک گھنٹے تک اس گھنے جنگل میں بھٹکنا پڑا تھا۔ ہر لمحے یہ ہی خوف تھا کہ کسی جھاڑی کی اوٹ سے کوئی جانور نکل کر مجھ پر حملہ نہ کردے۔ اسی دوران میں مجھے امدادی ٹیم نے ڈھونڈ نکالا تھا اور میں مزید اذیت سے بچ گیا تھا لیکن مجھے تین ماہ تک اسپتال میں گزارنا پڑے تھے۔

موجودہ تجربہ اس سے زیادہ ہولناک تھا۔ اس میں تو امدادی ٹیم کی ہم تک پہنچنے کی امید بھی برائے نام ہی تھی اس وسیع و عریض صحرا میں وہ ہمیں کیسے تلاش کرسکتے تھے۔

اب سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ہمارے کپڑے پسینے سے یوں شرابور ہورہے تھے جیسے ہم نے ابھی ابھی کسی سوئمنگ پول میں غوطہ لگایا ہو۔

پریواٹ کا رنگ جھلس کر جلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگیا تھا۔ یقیناً یہ ہی حال میرا بھی ہوگا۔ ہمارے بال ریت میں اٹے ہوئے اور ریت کے ذرات ہوا سے اڑ کر ہمارے بھیگے لباس اور جسموں پر چپک گئے تھے۔ اس سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہمارے جسموں میں بے شمار سوئیاں پیوست ہوگئی ہوں۔

انتہائی کفایت شعاری سے پانی استعمال کرنے کے باوجود ہم ایک چوتھائی بوتل خالی کرچکے تھے۔

پریواٹ چلتے چلتے لڑکھڑایا اور اوندھے منہ ریت پر گر پڑا۔ وہ مجھ سے چند قدم پیچھے رہ گیا تھا۔ میں ریت میں پیر دھنساتا ہوا بہ مشکل اس تک پہنچا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ ریت پر اوندھا گرنے کی وجہ سے اس کی سانسوں سے بھی ریت اڑ رہی تھی۔

میں نے اسے ہلایا جلایا اور آواز دی۔ ”پریواٹ! اٹھو، کیا تم اسی ریت میں دفن ہونا چاہتے ہو؟“

میں نے کئی دفعہ اسے پکارا، اس کے چہرے پر تھپڑ مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو پھر وہ پُرامید لہجے میں بولا۔ ”کیا امدادی ٹیم آگئی؟ پہلے تو میں خوب ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیوں گا پھر......“

”ہوش میں آؤ پریواٹ۔“ میں نے اس کی بات

جامعہ

اصطلاح میں جامعہ کا اطلاق اعلیٰ مذہبی تعلیم کے قدیم اداروں مثلاً جامعہ الازہر وغیرہ پر ہوتا۔ موجودہ دور میں سرکاری طور پر اس لفظ کا اطلاق جدید طرز کی ایسی یونیورسٹی تک محدود ہے جسے مغربی نمونے پر چلایا جا رہا ہو۔

جامعہ کی اصطلاح پہلی بار انیسویں صدی کے وسط میں استعمال کی گئی۔ یونیورسٹی کے معنوں میں جامعہ کا لفظ پہلی بار 1906ء میں استعمال ہوا جب جامعہ المصریہ کے قیام کے لیے مصر کے چند دانشوروں اور مصلحین نے ایک تحریک کی ابتدا کی۔ اسی زمانے سے اسلامی ملکوں میں جامعہ یونیورسٹی کا ہم معنی قرار پایا۔ بعض اسلامی ممالک میں جامعہ کے علاوہ چند اور اصطلاحات بھی استعمال کی جانے لگیں اور یہ اصطلاحات یا تو قومی زبانوں سے ماخوذ تھیں یا پھر یورپ سے مستعار لی گئی تھیں۔ مثلاً ترکی میں (UNIVERSITE) پاکستان میں ''یونیورسٹی'' بھارت و بنگلہ دیش میں ''وِشوودالیہ'' ایران میں ''دانش گاہ'' اور انڈونیشیا میں (UNIVERSITAS) ذیل میں ہم صرف چند بڑی اور مشہور یونیورسٹیوں کا ذکر کریں گے۔

برِعظیم پاک و ہند میں سر چارلس ووڈ کی سفارشات پر عمل کرتے ہوئے 1857ء میں کلکتہ، ممبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور تقریباً پچیس سال تک پورے ہندوستان میں انہیں یونیورسٹیوں سے کام چلایا جاتا رہا۔ 1882ء میں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی قائم کی گئی۔ 1887ء میں الٰہ آباد میں ایک اور یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد سے پہلی جنگِ عظیم تک کوئی اور یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی۔ لیکن دو مختلف ادوار میں یعنی 1915ء سے 1921ء کے درمیان اور دوسرے تقسیم پاک و ہند کے بعد یونیورسٹی اداروں نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔

برِصغیر میں دو یونیورسٹیاں ایسی ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنا ہے۔ ان میں ایک تو علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔ سر سید احمد خان نے 1875ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جسے 1920ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ جس کا مقصد مسلمان نوجوانوں کو جدید سائنسی تعلیم سے بہرہ ور کرنا تھا۔ دوسری یونیورسٹی حیدر آباد دکن کی جامعہ عثمانیہ 1918ء میں قائم ہوئی اس یونیورسٹی میں اسلامی علوم کی طرف خاص توجہ دی گئی تھی۔

پاکستان میں سب سے قدیم یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی ہے جو 1882ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔ پشاور یونیورسٹی 1950ء اور کراچی یونیورسٹی 1951ء میں قائم ہوئیں۔ لاہور میں ایک انجینئرنگ یونیورسٹی اور فیصل آباد میں زرعی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ حال ہی میں چند اور یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ جن میں ملتان یونیورسٹی، اسکردو یونیورسٹی، اسلام آباد میں قائداعظم یونیورسٹی، گومل یونیورسٹی، ہزارہ یونیورسٹی، کوئٹہ یونیورسٹی شامل ہیں۔ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو بھی اب باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

مرسلہ: زاہد حسین زاہد، کامل پورسٹی

کاٹ دی۔ ''کوئی امدادی ٹیم نہیں آئی ہے۔ تم چلتے چلتے بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ اس وقت سورج شدید آگ برسا رہا ہے اور اس سے بچنے کے لیے ہمیں کوئی پناہ گاہ ڈھونڈنا ہوگی۔''

''پناہ گاہ۔'' پریواٹ نے مایوسی سے کہا۔ ''اس لق و دق صحرا میں ریت کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟''

''تم اٹھو تو سہی۔'' میں نے کہا۔ ''میں کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں جہاں فوری طور پر ہم اس قیامت خیز تپش سے بچ سکیں۔'' مجھے اپنے الفاظ خود ہی کھوکھلے سے لگے تھے۔

میں نے بہ مشکل پریواٹ کو اٹھایا اور ایک ٹیلے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ریت کا خاصا اونچا ٹیلا تھا اور ایسے رخ پر تھا جہاں اس کا سایہ بھی موجود تھا۔

ہم لوگ گرتے پڑتے وہاں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچنے سے اتنا ضرور ہوا کہ سورج کی جھلسا دینے والی کرنیں اب براہ راست ہمارے جسموں پر نہیں پڑ رہی تھیں۔ کھلے آسمان کے مقابلے میں یہ جگہ بہرحال نسبتاً بہتر تھی لیکن ریت کی تپش کا وہی عالم تھا۔

ٹیلے کے سائے میں بیٹھ کر ہم نے پانی کی بوتل نکالی جو اب تقریباً ختم ہونے کے قریب تھی۔ گویا انتہائی کفایت شعاری اور احتیاط کے باوجود ہم نے چند گھنٹوں میں ڈیڑھ لیٹر پانی پی لیا تھا۔ یہ اچھی علامت نہیں تھی۔ ابھی پانی کی ایک بوتل موجود تھی لیکن وہ بھی کب تک ساتھ دے سکتی تھی۔

اس کے علاوہ بھوک کا عذاب الگ تھا۔ میں نے روانگی سے قبل بہت ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا۔ دو سلائس اور ایک مگ کافی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ لنچ سے پہلے ہی ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

پریواٹ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صحرا میں تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی ریت کو دیکھ رہا تھا پھر چیخ کر بولا۔ ''اینٹوئن! مجھے کچھ فاصلے پر ایک دریا دکھائی دے رہا ہے۔ چلو وہاں پانی تو ملے گا ہی۔ کچھ کھانے کو بھی مل جائے گا۔''

میں نے اس سمت دیکھا مجھے بھی ایسا لگا جیسے وہاں کوئی دریا موجود ہو۔ میں نے دوربین آنکھوں سے لگا کر دور دور تک جائزہ لیا۔ فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہاں کوئی دریا نہیں بلکہ نظر کا دھوکا ہے۔ صحرا میں اس قسم کے سراب عموماً نظر آتے ہیں۔

''چلو ناں اینٹوئن کیا سوچ رہے ہو؟'' پریواٹ نے بے تابی سے کہا۔ صحرا کا وہ سراب دیکھ کر اسے یقین آ گیا تھا کہ وہاں کوئی دریا موجود ہے۔

''وہاں کوئی دریا نہیں ہے پریواٹ۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ سب نظروں کا دھوکا ہے۔ اسے سراب کہتے ہیں۔ تم نے شاید اس سے پہلے کوئی صحرا نہیں دیکھا؟ میں نے بہت سے صحرا دیکھے ہیں لیکن صرف تفریحی طور پر۔''

''ہم کبھی کسی انسانی آبادی تک پہنچ بھی سکیں گے؟'' پریواٹ نے کہا۔

''اگر ہم ہمت سے کام لیں تو پہنچ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اینٹوئن! میں تو ایک ایروناٹیکل انجینئر ہوں۔ تم تو پائلٹ ہو۔ تمہارے ذہن میں تو ان راستوں کے نقشے بھی ہوں گے اور رستہ تلاش کرنے کے طریقے بھی آتے ہوں گے۔''

میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ راستہ دیکھنے کے لیے قطب نما جیسے پرانے آلے سمیت اب بہت سے جدید آلات ہوتے ہیں جن سے راستہ سیکنڈوں میں معلوم ہو جاتا ہے اور میں پائلٹ تھا مجھے ایئر روٹ کا علم تھا۔ کوئی ٹرک ڈرائیور نہیں تھا کہ زمینی راستوں سے بھی واقف ہوتا لیکن یہ بات کہہ کر میں اس کا حوصلہ نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پریواٹ بہترین ایروناٹیکل انجینئر تھا۔ طیارے کے جہاز میں کیسی بھی خرابی کیوں نہ ہو وہ اسے ٹھیک کر لیتا لیکن یہاں تو سرے سے انجن تھا ہی نہیں، طیارے کا ملبہ۔

سورج کی تمازت کچھ کم ہو چلی تھی۔ میں نے ریت کی ڈھیری سی بنا کر تکیہ بنایا اور اس پر سر ٹکا کر لیٹ گیا۔ ریت اس وقت بھی گرم تھی لیکن اتنی گرم نہیں تھی کہ ناقابلِ برداشت ہوتی۔ کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ میں بھی اتنا تھکا ہوا تھا کہ بھوک اور نقاہت کے باوجود مجھے نیند آ گئی۔

میری آنکھ سورج کی جھلسا دینے والی تپش اور چہرے اور جسم پر سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی ریت سے کھلی۔ میں بوکھلا کر اٹھا تو مجھ سے اٹھا نہ گیا۔ میرا آدھے سے زیادہ جسم ریت میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ ٹیلا غائب تھا جس کے سائے میں ہم بیٹھے تھے۔ صحرا کی تیز ہواؤں نے اس ٹیلے کو گرا دیا تھا۔

میں نے پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے ریت اپنے جسم سے ہٹائی اور اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے اور زبان بالکل اینٹھ کر رہ گئی تھی۔ بھوک کے باعث شدید نقاہت طاری تھی۔

اچانک مجھے پریواٹ کا خیال آیا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے سوچا، کہیں میری طرح وہ بھی صحرا کی اس اڑتی ہوئی ریت میں دفن تو نہیں ہو گیا۔ میں نے دیوانہ وار اردگرد کا جائزہ لیا۔ میں نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں پریواٹ بیٹھا تھا لیکن وہاں اب چمکیلی اور دہکتی ہوئی ریت کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے نقاہت کے باوجود دیوانہ وار اس جگہ سے ریت ہٹانا شروع کر دی جہاں پریواٹ کی موجودگی کا امکان تھا۔ میں جنون کے عالم میں ریت کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا ہی چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پریواٹ کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس وقت میں اپنی آواز خود بھی بہ مشکل سن سکتا تھا۔

اچانک میرا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میرے

ہاتھ کسی کھوپڑی سے ٹکرائے تھے۔ میں لرز کر رہ گیا کہ پریواٹ کیا ریت میں زندہ دفن ہو گیا۔

میں.... نے بہ غور اس کھوپڑی کا جائزہ لیا تو مجھے اپنی حماقت پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔

وہ کوئی کھوپڑی نہیں بلکہ بڑا سا ایک تربوز تھا جس کی اوپری سطح مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ مارے خوشی کے میں نقاہت کے باوجود بے ساختہ اچھلنے لگا پھر میں نے ریت دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی ہٹا کر وہ تربوز نکال لیا۔ وہ خاصا بڑا تربوز تھا۔ بیل آگے بھی تھی مگر پتا نہیں کتنی دور تک بیل پھیلی ہوئی تھی میں نے سنا تو تھا کہ صحرا میں تربوز خود بخود اگ آتے ہیں لیکن اس کا عملی تجربہ مجھے پہلی بار ہو رہا تھا۔

وہ تربوز خاصا وزنی تھا۔ میں نے بہ مشکل تمام اسے گڑھے سے نکالا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ پانی کی دوسری بوتل تو میرے پاس ہی تھی۔ تھیلا میری پشت پر بندھا ہوا تھا۔ میں نے بوتل نکال کر دو گھونٹ پانی کے پیے تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے تن مردہ میں نئی جان آگئی ہو۔

میں نے پھر پوری قوت سے پریواٹ کو پکارا۔ "پریواٹ...... پریواٹ......" اس مرتبہ میری آواز بہت بلند اور جان دار تھی۔ نہ جانے یہ اس دو گھونٹ پانی کا کمال تھا یا تربوز ملنے کی خوشی تھی۔ میں چاہتا تو پورا تربوز اکیلے ہی ہضم کر سکتا تھا لیکن ابھی مجھ پر وہ وقت نہیں آیا تھا۔ مجھے جنگ عظیم اوّل کے بہت سے واقعات یاد آئے جب کچھ فوجی فرار ہو کر صحرا میں بھٹک گئے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے اور ایک دوسرے کے مرنے کی تمنا کرتے تا کہ اس کے حصے کا راشن بھی دوسروں میں تقسیم ہو۔

میں نے پریواٹ کو پھر زور سے چیخ کر آواز دی۔ "پریواٹ!"

"یار کیوں گلا پھاڑ رہے ہو۔ میں یہاں ہوں۔" پریواٹ کی نحیف آواز میرے عقب سے آئی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے عجیب الخلقت ایک شخص نظر آیا۔ اس کے سر کے بالوں اور کپڑوں میں بے تحاشا ریت تھی۔ جسم کی جلد جھلس کر جلے ہوئے تانبے کی طرح سیاہ ہو چکی تھی اور وہ اپنی عمر سے دگنا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پریواٹ تھا اور ویران ویران نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کہاں گئے ہوئے تھے تم؟" میں نے پوچھا۔

جب سورج کی تپش سے میری آنکھ کھلی تو مجھے اونٹوں کا ایک کارواں دکھائی دیا۔ وہ مقامی بدو تھے اور عربی زبان میں کوئی نغمہ گاتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے چیخ کر انہیں آواز دی۔ ان میں سے ایک نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں دیوانہ وار گرتا پڑتا انہیں آوازیں دیتا ان کی طرف دوڑا لیکن وہ قافلہ فوراً ہی ریت کے اس صحرا میں اوجھل ہو گیا۔"

"تم نے کوئی قافلہ نہیں دیکھا پریواٹ۔" میں نے کہا۔ "یہ سب سراب تھا۔ وہ اگر سچ مچ کے انسان ہوتے تو ہماری مدد کو نہ آتے۔ چھوڑو اس بات کو۔ میں نے آج کے کھانے کا بندوبست تو کر ہی لیا ہے۔"

"تم نے بندوبست کر لیا ہے؟" پریواٹ نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میرے ذہنی توازن پر شبہ ہو۔ اس نے کہا۔ "اینٹوئن! لگتا ہے میری طرح تم بھی سراب کا شکار ہونے لگے ہو۔ کھانے میں ہرن کا بھنا ہوا گوشت، پنیر اور بکری کے دودھ کے ساتھ رس بھری کھجوریں بھی ہوں گی؟" اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے ایک تربوز ملا ہے۔ یہ آج کے دن ہم دونوں کے لیے کافی ہوگا۔ ہمارے پاس کوئی برتن بھی نہیں ہے۔ اسے کاٹنے میں اس کا کچھ پانی ضائع ہو جائے گا۔"

پریواٹ نے تربوز دیکھا تو اسے بھی یقین آگیا کہ یہ کوئی سراب نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ "میں نے پیراشوٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا کاٹ کر اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ وہ اس وقت ہمارے کام آئے گا۔" اس نے اپنے تھیلے سے پیراشوٹ کا وہ ٹکڑا نکالا جو بلاشبہ خاصا بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ اسے بچھا کر ہم دونوں اس پر لیٹ بھی سکتے تھے۔

پیراشوٹ کا وہ ٹکڑا بچھانے کے بعد میں نے اپنے بیگ سے چاقو نکالا اور تربوز دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کا کچھ پانی پیراشوٹ پر گرا لیکن ہم نے اسے مزید پیراشوٹ پر نہیں گرنے دیا اور بھوکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ اپنے اپنے حصے کے تربوز کا پانی پینے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے مجھ میں زندگی کی نئی لہر دوڑ رہی ہو۔ یہی حال پریواٹ کا بھی تھا پھر ہم چاقو سے اس کا گودا نکال کر کھانے لگے۔

میں نے فوراً ہی پریواٹ کو روک دیا۔ "سارا تربوز ایک ہی وقت میں ختم مت کرو۔ ہمیں راستہ تلاش کرنے میں مزید نہ جانے کتنی دیر لگے۔" ہم نے اپنے اپنے حصے کا بچا

ہوا تربوز اسی پیراشوٹ کے ٹکڑے میں باندھ لیا اور ہم نے ایک نئے عزم سے سفر کا آغاز کیا۔

"اس مرتبہ ہم مخالف سمت میں راستہ تلاش کریں گے۔" میں نے کہا۔ "لگتا ہے، ہم نے شروع میں ہی غلطی کی ہے ورنہ اب تک کسی آبادی تک پہنچ چکے ہوتے۔"

ہم نے اس وقت تک صحرا میں تقریباً چھتیس میل کا سفر طے کیا تھا۔ ہم گرتے پڑتے پھر اسی جگہ آگئے جہاں ہمارے جہاز کا ملبہ تھا۔

"یار اینٹوئن! مجھے امدادی ٹیم کی بے حسی پر حیرت بھی ہے اور غصہ بھی۔ آخر وہ لوگ ہماری تلاش میں کیوں نہیں آئے؟"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ہماری تلاش میں نہیں آئے۔ یہ صحرا میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ممکن ہے امدادی ٹیمیں ہماری تلاش میں کہیں اور بھٹک کر واپس چلی گئی ہوں۔"

جہاز کے ملبے تک پہنچتے پہنچتے ہماری زبانیں اور حلق پھر خشک ہو گئے تھے۔ میں نے ایک ایک گھونٹ پینے کے لیے اپنے تھیلے سے پانی کی بوتل نکالی وراسے منہ سے لگایا ہی تھا کہ بوتل میرے ہاتھ سے پھسل کر ریت پر ایسی جگہ گری جہاں جہاز کا ملبہ تھا۔ وہ نہ جانے جہاز کے کس ٹکڑے سے ٹکرائی کہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔ ہم دونوں کے حلق سے ایک ساتھ بھرپور چیخ نکلی۔ جیسے اس بوتل میں ہماری جان ہو۔ بوتل سے گرنے والا پانی لمحوں میں صحرا کی جھلستی ہوئی پیاسی ریت نے جذب کر لیا۔ اب ہمارے پاس تربوز کے صرف دو ٹکڑے تھے۔

ہم دونوں کچھ دیر صدمے کی حالت میں یوں بیٹھے رہے جیسے اپنے کسی عزیز کی موت کا سوگ منا رہے ہوں پھر پریواٹ چیخ کر بولا۔ "تمہیں احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا اینٹوئن۔ تم کیا بچے ہو؟"

"میں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا۔" میں نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ بوتل نہ جانے کیسے میرے ہاتھ سے پھسل گئی اور گری بھی تو تباہ شدہ جہاز کے کسی ٹکڑے پر۔ اگر ریت پر گرتی تو پانی تو ضائع نہ ہوتا۔"

"اگر یوں ہوتو یہ ہوتا مگر یہ نہیں ہوا تو کیا ہوا۔" پریواٹ نے کہا۔ "یہ اگر مگر چھوڑو یہ سوچو کہ اب کیا کرنا ہے؟"

"پریواٹ!" میں نے کہا۔ "یہ محض ایک حادثہ تھا۔ ہاں، اس وقت تو میں اسے حادثہ ہی کہوں گا۔ ہم اگر آپس میں لڑتے رہے تو کبھی کسی آبادی تک نہیں پہنچ سکیں گے اور اسی صحرا میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔"

بات شاید پریواٹ کی سمجھ میں آگئی۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "سوری یار! تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں آپس میں الجھنا نہیں چاہیے۔" (اس دور میں پلاسٹک کی بوتلیں اور برتن استعمال نہیں ہوتے تھے۔)

اس مرتبہ ہم نے مخالف سمت میں سفر شروع کیا اور چند میل چل کر ہی ہانپنے لگے۔ مزید چند میل چلنے کے بعد مجھے زور کا چکر آیا اور میں اوندھے منہ ریت پر گر پڑا۔ پریواٹ فوراً میری طرف لپکا اور بولا۔ "اینٹوئن! تم ٹھیک تو ہو؟ ابھی تک تم مجھے حوصلہ دے رہے تھے اب خود چکرا کر گر پڑے۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ "خدا کی پناہ، تمہیں تو بہت شدید بخار ہے۔"

میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا جسم ہلکا پھلکا ہو کر پرندوں کی طرح فضا میں پرواز کر رہا ہو۔

"اینٹوئن! پلیز ہمت کرو ہم دونوں ریت کے اس صحرا میں دفن ہو جائیں گے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ریت کی چمک

آنحضرت ﷺ نے ابوسعید بن المعلیٰؓ سے فرمایا: کیا نہ سکھلاؤں میں تجھ کو ایسی سورت جو قرآن میں (از روئے فضائل) سب سورتوں سے بڑی ہے۔ پھر فرمایا وہ سورۂ الحمد للہ رب العالمین ہے۔ وہ سات آیات ہیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن ہے بڑا کہ دیا گیا ہے مجھ کو۔ اس حدیث کے آخری کلمات میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ولقد اٰتینٰک سبعًا من المثانی والقرآن العظیم (اے پیغمبر) دیں ہم نے تم کو سات آیتیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں نماز میں یا ثنا کی گئی ہے ان کی فصاحت و اعجاز کے متعلق۔ اور دیا ہم نے تم کو قرآن عظیم۔ اس سے مراد فاتحہ ہے چونکہ یہ قرآن کا جزو اعظم ہے۔ اس لیے اس کو قرآن عظیم سے تعبیر فرمایا۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلوپیڈیا
مرسلہ: احسن فاروق، کوٹ ادو

سے میری بینائی زائل ہو رہی ہے۔"

میں ہمت کرکے کھڑا ہوگیا اور گرتا پڑتا پھر اپنے نامعلوم سفر پر روانہ ہوگیا۔ ہم اس دن بھی صحرا میں میلوں بھٹکے لیکن کسی آبادی، کسی کارواں کا کوئی نشان نہ ملا۔ رات تک تھک ہار کر ہم پھر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ تربوز کے ٹکڑے بھی ہم نے دن بھر میں ختم کردیے تھے بلکہ ان کے چھلکے تک کھالیے تھے۔

ہم لوگوں کو پھر شدید پیاس لگ رہی تھی لیکن اب تو پینے کے لیے ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔

رات کو خنکی بہت ہوگئی تھی مجھے بخار بھی تھا اس لیے شدید سردی محسوس ہو رہی تھی۔ پریواٹ نے پیراشوٹ کا وہی ٹکڑا مجھے اوڑھنے کے لیے دے دیا۔ اس سے سردی میں کچھ کمی واقع ہوئی لیکن ریت بھی ٹھنڈی ہوچکی تھی اس لیے مجھے شدید سردی لگ رہی تھی۔

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ میں پریواٹ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میری حالت بہت ابتر تھی۔ ساری قوت ارادی اور قوت مدافعت خاک میں مل گئی تھی۔

صبح طیارے کے پروں پر شبنم کے جمع ہونے والے قطروں کو ہم نے روئی میں جذب کیا اور اسے نچوڑ لیا۔ اس طرح گریس ملا ہوا اتنا پانی میسر آگیا کہ ہمارے ہونٹ اور حلق تر ہوگئے۔

گریس والا بدذائقہ پانی پینے کے بعد پریواٹ نے کہا۔ "اس سے تو بہتر تھا کہ ہمارے پاس ریوالور ہوتے پھر ہم یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ مرتے۔"

میں پریواٹ کی جانب لپکا۔ اس کا ذہنی توازن آہستہ آہستہ جواب دے رہا تھا۔ اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہمارے پاس ریوالور نہیں تھے۔

"دیکھو پریواٹ!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "یہ ہماری قوت برداشت اور قوت ارادی کی آزمائش ہے۔ مجھے شروع ہی سے مقدر پر یقین ہے۔ اگر ہماری زندگی ہوئی تو ہم بچ جائیں گے لیکن آخری سانس تک ان حالات کا مقابلہ کریں گے۔"

پھر ابتر حالت کے باوجود ہم نے نئے سرے سے ہمت باندھی اور مخالف سمت میں پانی کی تلاش میں نکلے۔ لیبیا کے اس عظیم صحرا کے بارے میں میرے پاس معلومات بہت تھی لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ بھٹکنے کی صورت میں راستہ کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ویسے تو لیبیا کے صحرا میں نمی کا تناسب تقریباً چالیس، پینتالیس فی صد ہے لیکن جس علاقے میں ہم اس وقت موجود تھے، وہاں صحرا میں نمی صرف اٹھارہ فی صد تھی یعنی اس صورتِ حال میں زندگی بخارات کی شکل میں اڑ جاتی ہے۔

مقامی افراد اور وہاں نوآباد کار اطالین افسروں کے لیے بتایا گیا تھا کہ صحرا کے اس علاقے میں انسان پانی پیے بغیر انیس گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

اگر ہمیں وہ تربوز نہ ملتا تو اب تک ہم بھی صحرا کی اڑتی ہوئی گرم ریت میں دفن ہوچکے ہوتے۔ دوسری خوش گوار بات یہ تھی کہ صحرا میں شمال مشرق سے چلنے والی ہوا میں نمی نسبتاً زیادہ تھی۔ اس وجہ سے اب تک ہم زندہ تھے۔ اب یہ ہماری قوت مدافعت پر منحصر تھا کہ یہ ہوا ہمیں مزید کتنی دیر تک زندہ رکھ سکتی تھی۔

صحرا میں تا حد نگاہ چمکیلی ریت بکھری ہوئی تھی۔ اس وسیع و عریض اور بے کراں صحرا کو دیکھ کر ہی دم گھٹنے لگتا تھا۔ سورج کی کرنیں چمکیلی ریت پر پڑتی تھیں تو وہ مزید چکا چوند پیدا کرتی تھیں۔ وہ منظر دیکھ دیکھ کر ہماری بینائی متاثر ہونے لگی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں کچھ گھنٹے زندہ بھی رہ گیا تو اپنی بینائی ضرور کھو بیٹھوں گا۔

اگر یہ آزمائشی پرواز نہ ہوتی اور ہم کسی مشن پر ہوتے تو ہمارے پاس بہت سازوسامان ہوتا۔ آنکھوں پر لگانے والے گہرے رنگ کے چشمے ہوتے، کھانے پینے کا سامان ہوتا۔ صحراؤں، جنگلوں اور ہوائی علاقوں میں چلنے والی چوڑے پہیوں اور چھوٹے انجنوں کی موٹر سائیکلیں ہوتیں۔ وہ موٹر سائیکل وزن میں بہت ہلکی ہوتی تھیں لیکن پائلٹ اگر کسی ناگہانی افتاد میں پڑجائے تو ان کے ذریعے وہ میلوں کا سفر کرسکتا تھا۔ وہ چھوٹی اور ہلکی موٹر سائیکلیں امریکا کی ایک کمپنی نے بنائی تھیں اور پہلی جنگ عظیم میں انہیں بہت کامیابی سے استعمال کیا گیا تھا۔ زمین سے ان کی اونچائی بہ مشکل ڈیڑھ فٹ ہوگی۔ اس پر سفر کرنے والا یوں بیٹھتا تھا جیسے کسی بچے کی ٹرائی سائیکل پر بیٹھ گیا ہو لیکن سکڑ سمٹ کر بیٹھنا پیدل چلنے سے بہر حال بہتر تھا۔

ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے اب اپنے ڈپارٹمنٹ پر بھی غصہ آیا۔ آزمائشی پرواز تو آزمائشی ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی لمحے دھوکا دے سکتی ہے۔ طیارہ کسی حادثے کا شکار ہوسکتا ہے پھر ہمارے انجینئرز اور افسران نے یہ بات کیوں نہیں سوچی کہ اگر ہم کسی حادثے کا شکار ہوگئے تو اس صورت میں کیا کریں گے۔

یہ سب سوچنا اب بعد از وقت تھا۔ میں خود بھی پرواز پر روانہ ہونے سے پہلے اس نکتے پر غور کرسکتا تھا لیکن مجھے تو اپنی اور پریواٹ کی مہارت پر ناز تھا۔ ہم کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اس آزمائشی پرواز پر روانہ ہوگئے تھے۔

اچانک میں بری طرح چونک اٹھا۔ مجھے ایک کارواں نظر آیا تھا اور مجھے دیکھ کر ایک شخص نے ہاتھ بھی ہلایا تھا۔ کارواں میں اونٹ بھی تھے اور گدھے بھی۔ گویا پورے صحرا میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں پوری قوت سے چیخا۔ "ٹھہرو ہم آرہے ہیں۔"

"تم کس سے بات کر رہے ہو انٹونئن؟" پریواٹ کے جھلسے ہوئے چہرے پر حیرت تھی۔

"وہ...... وہ...... وہ دیکھ رہے ہو ایک کارواں جارہا ہے۔ اونٹوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں کیا تمہیں سنائی نہیں دے رہی ہیں؟"

"اب تم پاگل ہو رہے ہو۔" پریواٹ نے کہا۔ "یہاں دور دور تک اس جھلستی ہوئی بے رحم ریت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

دوسرے ہی لمحے مجھے بھی احساس ہوا کہ یہ سب میرے تصور کی کارفرمائی ہے۔ انسان کو سراب بھی وہی دکھاتا ہے جو وہ سوچتا ہے۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ ہم انسانوں کے درمیان پہنچ جائیں۔

ہم دونوں نہ جانے کس طرح شام تک جھلستے ہوئے اس صحرا میں چلتے رہے۔ چلتے کیا گھسٹتے رہے۔ مجھے یہ سوچ کر آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے بھوک اور شدید پیاس کے عالم میں میلوں کا وہ سفر کیسے طے کیا تھا۔

یہ سوچ کر میری پریشانی مزید بڑھ گئی کہ اب ہم اپنے اصل ٹھکانے سے بھی بہت دور ہیں۔ شام کا جھٹ پٹا پھیل رہا تھا اور اب واپس جانا بھی بے فائدہ تھا پھر واپس جاکر ہم کربھی کیا سکتے تھے صرف ایک امید کہ شاید ہماری تلاش میں کوئی امدادی ٹیم وہاں پہنچی ہو۔

پریواٹ بھی شاید میری طرح یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے اصل ٹھکانے سے بہت دور نہ جانے کتنے میل کے فاصلے پر ہم ہیں۔ ہم دونوں کی جسمانی حالت کے ساتھ ساتھ ذہنی حالت بھی لحہ بہ لحہ ابتر ہوتی جارہی تھی اور ہم دونوں ہی ذہنی طور پر سراب کا شکار ہوگئے تھے۔

کبھی پریواٹ وحشیوں کی طرح چیختا کہ مجھے ابھی صحرا میں کچھ بدو دکھائی دے رہے ہیں۔ "وہ دیکھو وہ جارہے ہیں۔" وہ دوڑنے کی کرتا تو میں اسے روک لیتا۔ کبھی مجھے کسی کارواں کے گزرنے کا احساس ہوتا تو پریواٹ مجھے تھام لیتا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی سراب کا شکار ہوتا تھا۔ دوسرے کا ذہن اس وقت فعال ہوتا تھا ورنہ دونوں اگر سراب کے پیچھے بھاگ نکلتے تو تھوڑی دیر میں ریت پر کہیں نہ اٹھنے کے لیے گر جاتے۔ سراب کے پیچھے جتنا دوڑو وہ اتنی ہی تیزی سے آگے دوڑتا ہے۔

دو گھنٹے مزید چلنے کے بعد بھی جب ہمیں آبادی کا کوئی نشان نہ ملا تو مجھ سے زیادہ پریواٹ وحشت زدہ ہوگیا اور وہ بلند آواز میں دعائیں پڑھنے لگا جو اسے یاد تھیں۔

میں نے پہلی دفعہ اسے جھڑک دیا اور کہا۔ "پریواٹ! تمہارے اس شور شرابے سے میرا ذہن مزید ماؤف ہوجائے گا۔ مجھے سوچنے دو، سورج کس طرف غروب ہوا ہے۔ ہم اگر تھوڑی ہمت کرلیں تو کسی آبادی تک پہنچ جائیں گے۔" میرا لہجہ اور الفاظ دونوں کھوکھلے تھے۔

ہم دونوں ایک گھنٹا مزید گھسٹ کر چلتے رہے پھر اچانک مجھے زوردار چکر آیا اور میں ایک مرتبہ پھر ریت پر اوندھے منہ گر پڑا۔

میں نقاہت اور مدہوشی کی کیفیت سے باہر آیا تو مجھے پریواٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ دو مقامی بدوؤں سے بات چیت کر رہا تھا۔ میرے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گویا ہم نے موت کو شکست دے دی تھی۔ لیبیا کے اس بے کراں صحرا کو شکست دے دی تھی جو نہ جانے اب تک کتنے زندہ انسانوں کو نگل چکا تھا۔

میں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں چیخ کر پریواٹ کو آواز دی۔ "اے پریواٹ!"

دونوں بدو مجھے گھورنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں پہلی دفعہ میری موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

پریواٹ لپک کر میری طرف آیا۔ نقاہت کے باوجود میں کھڑا ہوکر اس سے لپٹ گیا۔ پریواٹ نے مجھے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے انٹونئن؟"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا..... "کیا یہ لوگ آگئے؟ کیا

ہم کسی انسانی آبادی یا کاررواں تک پہنچ گئے؟“

”کون لوگ؟“ پریواٹ نے سرد اور نحیف لہجے میں پوچھا۔ ”یہ دونوں مقامی بدو جن سے تم ابھی باتیں کر رہے تھے؟“

”کون سے بدو؟“ پریواٹ نے الجھ کر کہا۔ ”یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں خود بھی غنودگی میں تھا۔ تمہارے چیخنے سے جاگا ہوں۔“

میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور ریت پر ڈھے گیا۔ ”تو کیا میں پھر کسی سراب کا شکار ہو گیا تھا؟“

”ہاں میرے دوست۔“ پریواٹ نے کہا۔ ”خود کو سنبھالو۔ اگر تم نے بھی ہمت ہار دی تو پھر مجھے کون سنبھالے گا۔ میں تو تمہارے سہارے آگے بڑھ رہا ہوں۔“ پریواٹ کی آواز میں خوف کی لرزش تھی۔

میں نے اپنے سر کو دو تین دفعہ جھٹکا اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ تمام اندیشے اور خطرات بھی ذہن سے جھٹک دیے ہوں جو ہمیں لاحق تھے۔

میں شدید مایوسی کی حالت میں ریت پر ڈھے گیا لیکن پریواٹ پر اپنی مایوسی ظاہر نہیں ہونے دی۔

گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران میں ہمارے پاس صرف اتنا پانی بچا تھا جس سے صرف ایک چمچا بھرا جا سکتا تھا۔

ہم نے پیراشوٹ کو پھیلا دیا کہ اس پر جمع ہونے والی شبنم کو استعمال کر سکیں۔

میں پریواٹ کا اور اس سے زیادہ اپنا دھیان بٹانے کے لیے ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”پریواٹ! تمہیں بھوری آنکھوں اور بھورے بالوں والی وہ لڑکی یاد ہے جو ہمیں پیرس میں ملی تھی؟“

”سلویا!“ پریواٹ نے کہا۔

”ہاں، سلویا۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے ہماری کتنی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔“

”ہاں یار، ہم جب اس کے فلیٹ پر جاتے تھے تو وہ ہماری تواضع بیئر یا وہسکی سے کرتی تھی۔ اکثر وہ ہمارے ساتھ ڈنر پر بھی جاتی تھی۔ وہاں ہم لوگ خوب ہلا گلا کرتے تھے۔ کھاتے پیتے تھے۔ پیرس کے ہوٹلوں میں اچھی شرابوں کے ساتھ صاف شفاف اور ٹھنڈا پانی بھی وافر مقدار میں ملتا ہے۔ پانی...... پانی کتنی بڑی نعمت ہے...... پانی!“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور سائے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اینٹوئن! مجھے کچھ فاصلے پر ایسی آواز آرہی ہے جیسے کوئی دریا بہ رہا ہو۔ سنو...... تم بھی سنو۔“ وہ اپنی باتیں کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر سراب کا شکار ہونے لگا تھا۔

”یار ویسے سلویا......“

”لعنت بھیجو سلویا پر۔“ پریواٹ جھنجلا کر بولا۔ ”اٹھو یہاں نزدیک ہی کوئی دریا بہہ رہا ہے۔“

”پاگل مت بنو پریواٹ۔“ میں نے کہا۔ ”کسی صحرا میں دریا کا بھلا کیا کام۔ تم ایک مرتبہ پھر سراب کا شکار ہو رہے ہو۔“

”لعنت ہے یار، بھوک اور پیاس کی شدت میں سراب کے اس عذاب سے لڑنا بھی ایک آزمائش ہے۔ میری ماں کہتی تھی کہ زندگی میں انسان کو مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔“

”تمہاری ماں کو باغبانی کا بہت شوق تھا۔“ میں نے اس کا دھیان بٹانے کو کہا۔

”ہاں، وہ رنگ برنگے پھولوں کی دیوانی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے لان کو سنوارتی تھیں۔ کیاریاں بنائی تھیں، ان میں روزانہ پانی ڈالتی تھیں...... پانی...... تو پودوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ اینٹوئن! ہم تو انسان ہیں۔“ وہ گھوم پھر کر دوبارہ پانی کے موضوع پر آگیا۔

اس مرتبہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا کیونکہ مجھ پر ایک مرتبہ پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ مجھے نہ جانے رات کے کس پہر نیند آگئی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ڈنڈوں سے مجھے بہت بری طرح مارا ہو۔ میں بہ وقت تمام ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ پریواٹ بھی دھوپ کی شدت سے کسمسا رہا تھا پھر وہ بھی اٹھ گیا۔

ہم نے رات شبنم کے قطروں کے لیے جو پیراشوٹ پھیلایا تھا وہ اس وقت تقریباً شبنم سے گیلا ہو رہا تھا ہم نے پیراشوٹ نچوڑ کر پانی نکالا تو پریواٹ کے پاس پانی کی بچی ہوئی خالی بوتل آدھی بھر گئی۔

ہم دونوں نے پانی پیا اور یوں ہماری پیاس کی شدت کم ہوئی۔ پانی کا رنگ ایسا تھا جیسے پالک کو پانی میں جوش دے کر اس کا سوپ بنایا گیا ہو یعنی سبزی مائل زرد۔ جب میں نے پانی کا پہلا گھونٹ لیا تو مجھے اس کا ذائقہ ہی خاصا ناگوار لگا۔ اس میں عجیب سی بو تھی لیکن میں سب کچھ بھلا کر

وہ پانی پی گیا۔ پیاس میں تو لوگ گندے پانی کے جوہڑوں کا کھڑا ہوا پانی تک پی لیتے ہیں۔ ایسا پانی جسے جانور بھی نہ پینا چاہیں۔

میں نے دیکھا، پانی پینے کے بعد پریواٹ عجیب سی بے چینی کا شکار ہو گیا۔ وہ اٹھ کر دیوانہ وار ٹہلنے لگا۔ خود میری بھی یہی کیفیت تھی۔ کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پریواٹ زمین پر بیٹھا اور اس نے قے کر دی۔

میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ بھوک کی حالت میں قے کرنا کتنا اذیت ناک ہے، اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس اذیت سے گزرے ہوں۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی لیکن اس وقت خود میری طبیعت بھی مالش کر رہی تھی۔ جی متلا رہا تھا پھر چند منٹ بعد میں بھی ریت پر بیٹھا ہوا پریواٹ کی طرح قے کر رہا تھا۔ اس قے سے ہمارے جسموں کی رہی سہی توانائی بھی زائل ہو گئی اور مجھے اپنی موت صاف نظر آنے لگی۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ کیا پیراشوٹ پر کوئی کلر تھا یا پانی میں کوئی اور کیمیکل شامل ہو گیا تھا۔

اب مزید چلنے کی سکت تو نہ تھی لیکن ہم نے بھی آخری سانس تک موت اور اس مہیب صحرا سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہم نے اپنا رخ ایک مرتبہ پھر بدلا اور دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ انسانی زندگی کتنی ڈھیٹ ہوتی ہے یا پھر جینے کی آرزو کتنی شدید ہوتی ہے۔

ہم دونوں اب بغیر سوچے سمجھے اب مسلسل چلے جا رہے تھے۔ ہم نہ جانے کتنے میل تک چلتے رہے پھر نڈھال ہو کر ایک طرف گر پڑے۔

”اینٹوئن! اب مجھ میں مزید چلنے کی سکت نہیں ہے۔ تم میں اگر ہمت ہے تو جاؤ۔ اگر تم کسی طرح بچ جاؤ تو میری گرل فرینڈ کو یہ بتا دینا کہ میں نے آخری سانس تک اسے یاد کیا ہے۔“

پھر وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”حالانکہ اس کی امید صرف ایک پرسنٹ ہے کہ تم بھی کبھی کسی انسانی آبادی تک پہنچ سکو گے۔“

”تم پھر بہک رہے ہو پریواٹ۔“ میں نے

فاضل الدین قادری

سید ابوالفرح محمد، المعروف بہ قطب معظم، پنجاب میں سلسلہ قادریہ فاضلیہ کے بانی۔ گیلانی سادات میں سے تھے۔ انہوں نے گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں روحانیت کی شمع روشن کی اور سلسلہ قادریہ کی اشاعت کا بلخ و بخارا کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں بھی کی۔ ان کے اجداد کئی پشت سے برصغیر کی اسلامی حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے بٹالے میں انہوں نے علوم دینی کے لیے ایک وسیع مدرسہ قائم کیا، جہاں سے بڑے بڑے عالم فارغ التحصیل ہوئے اور متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ بے شمار لوگوں نے ان کے ہاتھ پر سلسلہ قادریہ میں بیعت کی۔ انہوں نے 7 ذوالحج 1151ھ کو بٹالہ میں وفات پائی اور وہیں ان کا مزار ہے۔ ان کی ایک تصنیف ”بیان الاسرار“ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

مرسلہ: نعمان قادری لاہور

کہا۔ ”ہم اب انسانی آبادی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”بس تھوڑی سی ہمت اور کر لو۔“

پریواٹ اپنی ہمت مجتمع کر کے اٹھ بیٹھا اور نحیف لہجے میں بولا۔ ”اگر تم یہ چاہتے ہو کہ لیٹے رہنے کے بجائے چلتے ہوئے میرا جسم بے جان ہو کر اسی ریت پر گر پڑے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ میں اس آخری وقت میں بھی تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔“ وہ حیرت انگیز طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو، کہاں چلنا ہے؟“

اس دن تو واقعی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ میری زندگی کا آخری دن ہو۔ ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا اور سراب تھے کہ پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ہم بار بار سورج کے سائے کی مدد سے اپنی سمت درست کرتے، کچھ دیر گرم گرم ریت پر بیٹھ کر دم لیتے اور آگے روانہ ہو جاتے۔

چلتے چلتے ایک مرتبہ پھر رات ہو گئی۔ ہمارے جسم تھکن سے نڈھال تھے۔ ہم ریت پر گر پڑے اور گہرے گہرے سانس لینے لگے لیکن اس میں بھی تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ ہر سانس پر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ریت

میرے حلق میں جا رہی ہو۔

ہم نے اب کپڑوں اور بالوں میں اٹی ہوئی ریت صاف کرنا بھی چھوڑ دی تھی کیونکہ چند منٹ بعد پھر وہی ریت ہمارے بالوں اور کپڑوں پر جمع ہو جاتی تھی۔

اچانک پریواٹ پُرجوش انداز میں چیخا۔ ’’اینٹوئن! ضروری نہیں کہ ہم ہر بار ہی سراب کا شکار ہوں۔ میں اس وقت پورے ہوش و حواس میں ہوں اور جھیل کے پانی کی بو اچھی طرح سونگھ سکتا ہوں۔‘‘ وہ اچانک اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ’’میں اس جھیل کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ یہاں سے زیادہ سے زیادہ پچیس منٹ کی مسافت پر ہوگی۔‘‘

اس سے پہلے کہ میں پریواٹ کو اس اقدام سے باز رکھتا، وہ حیرت انگیز طور پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ’’واپس آجاؤ پریواٹ، ورنہ تم اس ہیبت ناک صحرا میں گم ہو جاؤ گے۔‘‘

’’مرنا تو ضرور ہے۔‘‘ پریواٹ کی آواز دور سے سنائی دی۔ ’’تو پھر ایک کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔‘‘

میں چاہتا تو دوڑ کر اسے پکڑ سکتا تھا لیکن مجھ میں دوڑنا تو در کنار تیز چلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

میں جانتا کہ اب پریواٹ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ صحراؤں کے سراب بھٹکنے والوں کو مزید بھٹکا دیتے ہیں۔

موت تو میری بھی یقینی تھی پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ ہم دونوں کی موت ایک ساتھ واقع ہوتی ہے یا علیحدہ علیحدہ! میں نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے اور ریت پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔

رات کا اندھیرا ہر سو پھیل رہا تھا۔ میں نے پریواٹ کے بارے میں سوچا، وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ ہم نے بہت سا وقت ایک ساتھ گزارا تھا۔ مجھے اس کے انجام پر صدمہ ہو رہا تھا۔ وہ صحرا میں بھٹک کر نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جائے گا اور لیبیا کا یہ صحرا اسے نگل لے گا پھر یہ سوچ کر مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی کہ انجام تو بالآخر میرا بھی یہ ہی ہونا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے بہرحال صحرا میں راستہ تلاش کرنا تھا۔ پیاس کی شدت سے میرے ہونٹ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ میں نے تھوک نگلنے کی کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ میں اب بھی کچھ نگل سکتا ہوں۔ گویا میرا حلق اب تک سوکھا نہیں تھا۔

میں نے سوچا، مجھے ابھی اور کتنی دور جانا ہے لیکن مجھے اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ منزل کا یقین ہو تو حوصلہ بھی ساتھ رہتا ہے۔ یہاں تو منزل کا کوئی تعین ہی نہیں تھا۔

میں دوبارہ چلنے کے لیے ہمت جمع کر رہا تھا کہ مجھے تقریباً پچاس سو گز کے فاصلے پر ایک لالٹین روشن نظر آئی۔ پریواٹ تھا پھر اس کے پیچھے دوسری لالٹین پھر تیسری لالٹین۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ شاید پریواٹ نے کسی کھوجی ٹیم کو ڈھونڈ لیا تھا یا پھر اس کھوجی ٹیم نے پریواٹ کا سراغ پا لیا تھا۔ میں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’پریواٹ!‘‘ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے مجھے خود اپنی آواز سنائی نہ دی ہو۔ میں نے جسم کی پوری قوت جمع کر کے آواز لگائی۔ ’’پریواٹ!‘‘

جواب میں پریواٹ کی آواز سنائی دی تو مجھے یقین آگیا کہ میری آنکھیں کوئی سراب نہیں دکھا رہی ہیں بلکہ پریواٹ واقعی کسی امدادی ٹیم کے ساتھ آرہا ہے۔ پریواٹ نزدیک پہنچا تو روشنیاں اس سے کچھ فاصلے پر رہ گئیں۔

’’تم نے آخر اس امدادی ٹیم کو ڈھونڈ ہی نکالا۔‘‘ میں نے لرزتی ہوئی نحیف آواز میں کہا۔

’’کون سی امدادی ٹیم؟‘‘ پریواٹ نے کہا۔

’’وہ ٹیم جو تمہارے ساتھ آئی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میرے ساتھ تو کوئی نہیں ہے۔‘‘ پریواٹ نے کہا۔

’’پھر...... پھر...... یہ روشنیاں، یہ لالٹینیں کیسی ہیں؟‘‘

’’کون سی روشنیاں اینٹوئن؟‘‘ پریواٹ مجھ سے بولا۔ روشنیاں اچانک ہی غائب ہو گئیں اور صحرائی ہوا کی سائیں سائیں کے علاوہ کچھ باقی نہ رہا۔

میں بے دم سا ہو کر ریت پر گر گیا۔ ’’ایک اور سراب۔‘‘ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا حلق خشک ہو رہا ہے اور اس میں کانٹے سے پڑ رہے ہیں۔ پریواٹ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ رک رک کر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس نے نحیف لہجے میں کہا۔ ’’اینٹوئن! مجھے تو اب سانس لینا بھی محال ہو رہا ہے۔ میں جھیل کی تلاش میں دور دور تک گیا لیکن آس پاس کوئی جھیل نہیں ملی تو میں لوٹ آیا۔ اب میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں۔‘‘ پھر وہ چونک کر بولا۔ ’’میرے پاس کچھ ایتھر ہے اس سے حلق تر کر لیتے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر پریواٹ نے اپنے تھیلے سے ایتھر کی شیشی نکالی۔ میں نے اس سے پہلے ہی وہ بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی اور اس کا ایک گھونٹ بھرا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی تیز دھار بلیڈ نگل لیا ہو جو میرے حلق سے معدے تک کاٹتا ہوا جا رہا ہو۔

پریواٹ نے بوتل میرے ہاتھ سے لی اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس نے بھی ایتھر کا ایک گھونٹ بھر لیا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ میرے پیٹ میں کھولن سی ہو رہی تھی پھر آہستہ آہستہ میری تکلیف کچھ کم ہو گئی۔

جوں جوں رات بڑھتی جا رہی تھی سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ مغربی سمت سے چلنے والی ہواؤں کا اثر تھا۔ جن ہواؤں کے سہارے ہم ابھی تک زندگی کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا وہی ہوائیں ہمیں سردی سے مار دیں گی۔

مزید ایک گھنٹے بعد سردی اتنی بڑھی کہ میرے ہاتھ پاؤں بلکہ پورا جسم کانپنے لگا اور دانت بجنے لگے۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے ریت میں گڑھا سا بنایا اور اس میں بیٹھ کر خود کو اچھی طرح ریت میں ڈھانپ لیا۔ اب صرف میرا چہرہ باہر تھا۔ فوراً ہی سردی کی شدت کا احساس زائل ہو گیا اور مجھے کافی سکون ملا۔ میں نے پریواٹ کو بھی یہی مشورہ دیا کہ تم بھی ایک گڑھا کھود کر اس میں بیٹھ جاؤ۔

’’مجھے جیتے جی اس ریت میں دفن ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔‘‘ پریواٹ نے کہا۔

مجھے سکون ملا تو تھکن کی شدت سے مجھے نیند آگئی اور میں گہری نیند سو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو اس وقت تک سورج نہیں نکلا تھا اور صبح کا دھندلکا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔

پریواٹ بھی ریت کی ایک ڈھیری سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ سو کیا رہا تھا بلکہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔

ہم نے گزشتہ رات کی طرح پیراشوٹ پھیلایا تھا لیکن وہ بالکل خشک تھا۔ اس رات شبنم نہیں گری تھی۔

میں نے پریواٹ کو آواز دے کر جگایا اور اس سے کہا۔ ’’اٹھو! ہمیں اس وقت روانہ ہو جانا چاہیے۔ سورج نکل آیا تو اس کی گرمی میں ہم زیادہ دور تک نہیں جا سکیں گے۔‘‘

’’تم ٹھیک کہتے ہو۔‘‘ پریواٹ نے کہا۔ ’’گرمی بڑھے گی تو ہم لوگ سفر کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔‘‘

ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور گرتے پڑتے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب ہمارے جسم اتنے لاغر اور کمزور ہو چکے تھے کہ ہم ساٹھ ستر گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بے دم ہو کر ریت پر گر جاتے تھے پھر کچھ دیر دم لے کر آگے بڑھتے تھے۔

چلتے چلتے اچانک مجھے کچھ فاصلے پر جھاڑیاں نظر آئیں لیکن میں انہیں سراب سمجھا۔ اس کے باوجود اس طرف بڑھتا رہا۔

اچانک پریواٹ چلّایا۔ ’’اینٹوئن! تمہیں وہ جھاڑیاں دکھائی دے رہی ہیں؟‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ تمہیں بھی وہ جھاڑیاں نظر آرہی ہیں۔‘‘ میں نے پریواٹ سے پوچھا اور ناامیدی کے کئی قیامت خیز گھنٹوں کے بعد اُمید کی ایک کرن نظر آئی کہ یہ میری نظر کا سراب نہیں تھا۔

ہم دونوں گرتے پڑتے ان جھاڑیوں کی طرف بڑھے۔ جھاڑیاں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہاں واقعی جھاڑیاں تھیں۔ یہ ہماری نظروں کا سراب ہوتا تو جھاڑیاں ہم سے دور ہو جاتیں۔

ہم کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے ان جھاڑیوں تک پہنچ گئے۔

’’پریواٹ! یہ تو واقعی جھاڑیاں ہیں۔ جھاڑیاں اور پودے زندگی کی علامت ہوتے ہیں۔ ہم کسی آبادی کے قریب ہیں۔‘‘

اچانک میرے کان میں مرغ کی آواز آئی۔ میں نے سر جھٹکا کہ اب میرے کان بھی مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ مرغ کی آواز پھر آئی۔ اس مرتبہ آواز بہت واضح تھی۔

’’اینٹوئن! کیا تم کسی مرغ کی آواز سن رہے ہو؟‘‘

’’ہاں، کیا تم بھی وہ آواز سن رہے ہو؟‘‘ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

اچانک سامنے والے ٹیلے پر مجھے ایک بدو نظر آیا۔ وہ ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ہوگا لیکن ہماری طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔

میں نے پوری قوت سے اسے آواز دی۔ ’’او بھائی!‘‘ اس نے میری آواز نہیں سنی اور مسلسل چلتا رہا۔

ہم میں سے کسی میں بھی اتنی سکت نہیں تھی کہ دوڑ کر اس بدو تک پہنچ پاتے۔ پریواٹ نے بھی اسے آواز دی اور پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھ ہلائے لیکن بدو نے ہماری

طرف نہیں دیکھا اور ٹیلے کے پیچھے غائب ہوگیا۔

پھر اچانک اس ٹیلے پر ایک دوسرا بدو نمودار ہوا۔ وہ بھی ہماری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں نے اسے آوازیں دیں لیکن ہمارے حلق سے اتنی ہی آواز نکل رہی تھی کہ ہم خود ہی انہیں سن سکتے تھے۔ ہم دونوں نے دیوانہ وار دونوں ہاتھ لہرائے۔ اس کے باوجود اس بدو نے ہمیں نہیں دیکھا پھر وہ پلٹ کر جانے لگا۔

مجھے یک دم مایوسی نے گھیر لیا کہ شاید یہ بھی کوئی سراب تھا۔ پریواٹ کے چہرے پر بھی مایوسی تھی۔ ہم دونوں ہارے ہوئے جواریوں کی طرح ریت پر دھپ سے بیٹھ گئے۔

اچانک وہ بدو پھر اس ٹیلے پر نمودار ہوا اور دیکھے بغیر سیدھا سیدھا چلنے لگا۔ ہم نے اسے پھر آواز دی، ہاتھ ہلایا لیکن اس نے ہم پر کوئی توجہ نہیں دی۔

ہم ایک دفعہ پھر مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب گئے کہ اچانک گویا معجزہ ہوگیا۔

بدو نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے ہاتھ ہلائے تو جواب میں اس نے بھی ہاتھ ہلائے اور تیزی سے ٹیلا اتر کے ہماری طرف بڑھنے لگا۔

مجھے اب بھی یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ بھی کوئی سراب ہی ہے۔ پہلے کی طرح یہ بدو بھی اچانک غائب ہوجائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب وہ ہمارے نزدیک پہنچا تو ہم دونوں بے اختیار کھڑے ہوگئے۔ اس نے تسلی دینے والے انداز میں ہمارے شانے دبائے تو مجھے یقین آیا کہ یہ سراب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

میں اور پریواٹ دونوں عربی سے نابلد تھے۔ ہم نے بمشکل تمام اشاروں سے اسے سمجھایا کہ ہمارا جہاز صحرا میں گر کے تباہ ہوگیا ہے اور ہم دو دن اور دو راتوں سے اس صحرا میں بھٹک رہے ہیں۔

بدو نے سہارا دے کر ہم دونوں کو ٹیلے پر چڑھنے میں مدد دی پھر اس کا دوسرا ساتھی بھی آگیا۔ وہ بڑے سے ایک برتن میں پانی لے آیا۔ ہم اس برتن سے یوں پانی پینے لگے جیسے جانور پیتے ہیں۔

اس مہربان بدو نے ہمیں مزید پانی پینے سے روکا اور اشارے سے بتایا کہ ایک دم اتنا پانی پینا بھی مناسب نہیں ہے۔

پھر اس نے ہمیں ایک اونٹ پر بٹھایا اور وہاں سے نزدیک ایک اٹالین کیمپ میں لے گیا۔

کیمپ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ سب لوگ ہماری تلا... میں گئے ہوئے تھے۔ ہم نے صحرا میں تو اذیت برداشت ... ہی تھی تین گھنٹے تک اس بدو کے اونٹ پر ہچکولے بھی کھا... تھے۔

ہم دونوں نے غسل کیا اور کیمپ میں موجود گارڈ... لے کر دوسرے کپڑے پہنے۔ میں نے بال سنوارنے کے لیے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ آ... میں کوئی لاغر سا، جلے ہوئے تانبے جیسی چمڑی والا بانس... طرح لمبا ایک شخص کھڑا تھا۔ کئی لمحے بعد مجھے یقین آیا ک... میرا ہی عکس تھا۔ صحرا میں تین دن تک جھلسنے کے بعد میر... جلد کی رنگت سیاہی مائل سرخ ہوگئی تھی۔ وہ جسم جس پر مجھے بہت ناز تھا وہ فاقوں اور مشقت سہتے سہتے ہڈیوں کا ڈھا... بن گیا تھا۔ اس وقت تو مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا۔

یہ ہی حال پرواٹ کا بھی تھا۔ وہ بھی اپنی شکل دیکھ کر... گیا پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پاگلوں کی طر... ہنسنے لگے۔

کیمپ آفیسرز واپس آئے تو انہوں نے سب سے پ... ہمارے کھانے کا بندوبست کیا ہمیں ہلکی پھلکی خوراک د... گئی۔ کیمپ میں ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اس نے مجھے ا... پریواٹ کو کچھ دوائیں دیں تھوڑی دیر بعد ہم دونوں گھوڑ... بیچ کر سو گئے۔ کئی دن بعد ہمیں تحفظ کا احساس ہوا تھا... نیند بھی بھرپور آئی۔

دوسرے دن ان لوگوں نے جیپ کے ذریعے ہم... ایک قریبی ہوائی سفر پر بھیج دیا۔ وہاں سے ایک خصو... طیارے نے ہمیں قاہرہ پہنچا دیا۔

قاہرہ پہنچ کر میں نے بچوں کی طرح جام، پھل، ... اور آملیٹ کھایا۔ مجھے ان چیزوں کا ذائقہ ویسا ہی لگا ج... بچپن میں لگتا تھا۔

بعد میں ہم نے اس صحرا کو دیکھا جس میں ہم بھ... رہے تھے تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم نے اس جھلستے ہوئے ... میں ایک سو بیس میل کا سفر طے کیا ہے۔

مجھے اب بھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑ... ہوجاتے ہیں۔ وہ تجربہ ہی بہت بھیانک تھا۔ ہم نے موت ... خود سے بہت قریب دیکھا تھا۔ اگر زندگی نہ ہوتی تو آج ... دونوں کے ڈھانچے بھی اس صحرا کی ریت میں دفن ہوتے...

اعتراف

ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری

وفا اور بے وفائی کا تصور مشرق سے مشروط ہے لیکن یورپ میں بھی کبھی کبھی ایسے دلچسپ واقعات رونما ہوجاتے ہیں۔ اس نے بیوی پرشک کیا تھا، لیکن جب نتیجہ سامنے آیا تو ......

یورپ سے درآمد ایک دلچسپ روداد

ہماری حویلی دیہات کے ایک دور افتادہ، ویران اور سنسان قطعے میں واقع تھی۔ اونچے اونچے درختوں میں گھری ہوئی اس وسیع و عریض حویلی کی اپنی ایک الگ ہی شان تھی۔ اس کی دیواروں پر جابجا کائی جمی ہوئی تھی جو کسی بوڑھے کے چہرے پر اُگی ہوئی داڑھی کی طرح لگتی تھی۔ یہاں ایک پارک بھی تھا...... جنگل جیسا۔ اس کے چاروں طرف نکاسیٔ آب کے نالے کھدے ہوئے تھے۔ پارک کے آخری سرے پر بڑے بڑے تالاب تھے جو سرکنڈوں سے

بھرے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک چشمہ تھا جس کے کنارے میرے شوہر نے جنگلی بطخوں کا شکار کرنے کے لیے ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا۔

ہمارے پاس عام نوکروں کے علاوہ ایک محافظ بھی تھا جو ذرا وحشی قسم کا تھا مگر تھا بہت تابعدار۔ ایک خادمہ تھی جو خادمہ کم اور میری سہیلی زیادہ تھی۔ سانولی رنگت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی مالک سوسن مجھے بہت چاہتی تھی۔ اس کے گیسو نہایت گھنے تھے اور ہمیشہ پچھوں کی صورت اس کی پیشانی کو چھپائے رکھتے تھے۔ میں اسے پانچ سال پہلے اسپین سے لائی تھی۔ وہ سولہ برس کی تھی لیکن اس کی اٹھان اس غضب کی تھی کہ بیس کی لگتی تھی۔

وہ موسم خزاں کے ابتدائی ایام تھے۔ ہم خوب شکار کرتے تھے۔ کبھی اپنی زمینوں پر، کبھی ملحقہ زمینوں پر......

وہیں میں نے ایک جوان شخص کو دیکھا وہ کوئی نواب تھا۔ بعد میں وہ اکثر ہمارے یہاں آنے لگا تھا پھر اس نے آنا ترک کر دیا۔ میں نے کوئی تردد نہیں کیا لیکن میں نے غور کیا کہ میرے شوہر کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا نظر آنے لگا ہے۔ وہ گم سم ہو گیا تھا اور ہر وقت سوچ میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ میں تنہائی کی خوگر تھی، لہٰذا الگ کمرے میں سوتی تھی۔ اس نے میرے پاس آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ رات میں کبھی کبھی مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ اپنے دروازے کے قریب سنائی دیتی اور چند لمحوں کے بعد دور ہوتی سنائی دیتی۔ میری کھڑکی چونکہ نچلی منزل پر تھی، مجھے اکثر حویلی کے آس پاس کوئی سایہ سا منڈلاتا ہوا محسوس ہوتا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے شوہر سے اس کا ذکر کیا۔ وہ چند لمحے تک مجھے سخت نظروں سے گھورتا رہا اور پھر گویا ہوا ”وہ محافظ ہوگا۔ کسی تردد کی ضرورت نہیں۔“

☆☆☆

وہ ایک عام سی شام تھی۔ ہم رات کا کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔ اس روز میرا شوہر غیر معمولی طور پر خوش اور مسرور نظر آ رہا تھا۔

”کیا تم میرے ساتھ ایک لومڑ کا شکار کرنے چلو گی جو ہر رات آ کر ہماری مرغیاں کھا جاتا ہے۔“ اس نے پوچھا۔ ”تمہیں بندوق کے ساتھ تین گھنٹے گزارنے پڑیں گے۔“

میں اسے حیرت سے تکنے لگی۔ وہ براہِ راست میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میں تھوڑا ہچکچائی اور پھر مخاطب ہوئی ”ٹھیک ہے، چلوں گی۔“

میری حیرت کا سبب یہ تھا کہ میں بھی ایک شکاری تھی اور مردوں کی طرح بھیڑیوں اور جنگلی سؤروں کا شکار کرتی تھی لہٰذا اس کا مجھ سے یہ پوچھنا کیا میں اس کے ساتھ ایک لومڑ کے شکار پر جاؤں گی، مجھے بہت عجیب لگا۔ اچانک ہی وہ بہت گھبرایا گھبرایا سا نظر آنے لگا۔ شام کا حصہ اس نے بے چینی کے عالم میں کبھی اٹھتے کبھی بیٹھتے گزار دیا۔

پھر رات کے تقریباً دس بجے وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”تم تیار ہو؟“

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ حسب سابق میری بندوق اٹھا لایا۔ میں نے پوچھا ”کیا ہم گولیاں لیں یا ہرن کو مارنے والے چھرّے؟“

وہ مجھے قدرے اچنبھے سے گھورنے لگا ”اوہ، ہرن کو مارنے والے چھرّے۔“ بالآخر وہ بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کافی ہوں گے۔“ پھر وہ عجیب سے لہجے میں گویا ہوا ”تم حیرت انگیز طور پر پُرسکون نظر آ رہی ہو۔ میں اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی ”میں؟ کیوں؟ کیا اس لیے کہ ایک لومڑ کا شکار کرنے جا رہی ہوں؟ تم کیا سوچ رہے ہو؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم حویلی سے نکل کر خاموشی سے جنگل عبور کرنے لگے۔ سارے نوکر جا چکے تھے۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ اس کی پیلی چاندنی نے اداس اداس سی پرانی حویلی پر گویا ہلکا پیلا رنگ پھیر دیا تھا۔ اس کی سلیٹی رنگ کی چھت خوب چمک رہی تھی۔ صاف و شفاف رات خاموشی کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ساکت تھا۔ کہیں سے مینڈک کے ٹرانے کی بھی آواز نہیں آ رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب اداسی گھلی ہوئی تھی۔ کوئی اُلّو بھی نہیں چیخ رہا تھا۔

جب ہم پارک میں درختوں کی چھاؤں میں پہنچے مجھے کچھ تازگی کا احساس ہونے لگا۔ یہاں درختوں سے جھڑے ہوئے پتوں کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرا شوہر بالکل خاموش تھا لیکن وہ سن رہا تھا، دیکھ رہا تھا، درختوں کی سونگھ رہا تھا۔ وہ تعاقب کرنے کے جوش میں بھرا ہوا تھا۔

ہم جلد ہی تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔ کھلی ہوا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر تھوڑی سی ہلچل مچ جاتی اور لہریں ایک دائرے میں آپس میں ملتی ہوئی نظر آتیں۔

ہم تھوڑی ہی دیر میں جھونپڑے تک پہنچ گئے جہاں ہمیں شکار کا انتظار کرنا تھا۔ میرے شوہر نے پہلے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا پھر اپنی بندوق لوڈ کر لی۔ لمحے آہستہ آہستہ بیت رہے تھے۔ اس طرح نصف گھنٹا گزر گیا۔ موسم خزاں کی وہ چاندنی رات پہلے کی طرح پُرسکوت تھی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اِدھر سے گزرے گا؟“ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

اس نے یکبارگی جھرجھری لی پھر اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر بولا ”مجھے پورا یقین ہے۔“

ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میری آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔ اچانک مجھے اپنے بازو پر اس کا ہاتھ محسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں ”کیا وہ تمہیں درختوں کے پیچھے نظر آ رہا ہے؟“ وہ سرگوشی میں پھنکارا۔

میں نے دیکھنے کی ناکام سعی کی۔ مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دیا۔ میرے شوہر نے آہستہ سے بندوق سیدھی کر لی۔ اس کی نظریں مجھ پر مرتکز تھیں۔ میں خود بھی فائر کرنے کی تیاری کر رہی تھی کہ ہم سے کوئی تیس قدم پر اچانک ہی ایک شخص چاندنی میں نمودار ہوا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا جا رہا تھا۔ اس کا جسم جھکا ہوا تھا گویا وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی لیکن اس سے پہلے کہ میں پلٹتی میری آنکھوں کے سامنے ایک جھماکا ہوا۔ ساتھ ہی ایک سماعت شکن دھماکا سنائی دیا۔ وہ شخص زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ ایسے ہی جیسے کوئی بھیڑیا گولی کھا کر تڑپتا ہو۔ میں مارے دہشت کے چیخ اٹھی۔ اگلے ہی لمحے میرے شوہر نے میرا گلا دبوچ لیا۔ میں زمین پر گر پڑی۔ اس نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا لیا اور کندھے پر ڈال کر بھاگنے لگا۔ پھر گھاس پر پڑی ہوئی اس کی لاش کے پاس پہنچ کر مجھے اتنے زور سے اس کے اوپر پٹخ دیا کہ جیسے میری گردن توڑنا چاہتا ہو۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ایڑی میری پیشانی تک اٹھائی تھی کہ اچانک کسی نے اسے جکڑ کر زمین پر دے مارا۔ میں اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر جھک کر دیکھا، میری خادمہ سوسن میرے شوہر پر چڑھی بیٹھی تھی اور کسی جنگلی بلی کی طرح نہایت وحشیانہ انداز میں اس کا چہرہ اور داڑھی نوچ رہی تھی۔ اس پر جنون طاری تھا۔ اس نے میرے شوہر کا چہرہ لہولہان کر دیا پھر اچانک ہی وہ یوں رک گئی گویا ذہن میں کوئی دوسرا خیال آ گیا ہو۔ وہ اٹھی اور لاش پر جا پڑی۔ اس نے اپنی باہیں اس مرد کے گرد حمائل کر دیں اور اس کی بے جان آنکھوں اور چہرے پر بوسوں کی بارش کرنے لگی۔

میرا شوہر تھوڑی سی جدوجہد کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے تکنے لگا۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

یکایک وہ میرے پیروں پر گر پڑا ”میری جان، مجھے معاف کر دو۔“ وہ گڑگڑایا ”میں تم پر شبہ کرتا تھا اور میں نے اس لڑکی کے محبوب کو مار ڈالا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرا محافظ اس لڑکی کا عاشق ہے۔“

لیکن میں ایک لاش اور ایک جیتی جاگتی لڑکی کی محبت کا عجیب و غریب منظر دیکھ رہی تھی اور اس کی آہیں اور سسکیاں سن رہی تھی اور خاموش کھڑی سوچ رہی تھی، میں چاہوں تو واقعی اپنے شوہر سے بے وفائی کر سکتی ہوں۔

☆

آغا اشرف

(1914-1996ء)

افسانہ، ڈراما نگار، محقق اور نقاد۔ وہ آغا ارشد حسین کے ہاں لاہور میں پیدا ہوئے، انہوں نے سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی، وہ سعادت حسن منٹو، مختار صدیقی، سلطان کھوسٹ، سید امتیاز علی تاج اور شوکت تھانوی کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے تین ہزار سے زائد کتابیں لکھیں گویا ایک سال میں انہوں نے اوسطاً 50 کتابیں لکھیں۔ ان میں آدھی سے زیادہ بچوں کے لیے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل کئی فلموں میں سائیڈ ہیرو کا رول ادا کیا، متعدد فلموں، ریڈیو اور ٹی وی کے لیے اسکرپٹ لکھے۔ لکھنؤ، دہلی اور لاہور ریڈیو اسٹیشنوں پر بطور صداکار اور اسکرپٹ رائٹر کے کام کیا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ”ایک دل ہزار داستان“ بھی لکھی۔ اہم تصانیف میں افق سے افق تک، کرن کرن اندھیرا، الجھنوں کے بھنور، ہمارے غازی ہمارے شہید، لہولہو مٹی، ایک جنگ ایک المیہ، اسلامی کانفرنس کی کہانی، اجتماع ملتِ اسلامیہ، بدلاں دی چھاں، جہاد، پاکستان، دل ایک دیوا (ناولٹ) شامل ہیں۔ اسلامی کانفرنس کی کہانی پر انعام بھی ملا۔ زندگی کے آخری ایام انتہائی کسمپرسی کی حالت میں گزارے۔ لاہور میں انتقال کیا۔

مرسلہ: سلطان نصیر، سکھر

لارڈ ڈفرن

سید احتشام

لارڈ ڈفرن کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ دنیا ان کے نام سے واقف ہے۔ ان کی زندگی میں کئی ایسے موڑ آئے جس کی توجیہہ پیش کرنا مشکل ہے، عقل سے ماوریٰ ہے کہ ہربار کوئی ماورائی قوت ان کی مدد کو آجاتی تھی۔ یورپ کے اخبارات نے ان خبروں کی تہ تک پہنچنے کی بہت کوشش کی۔ خود لارڈ ڈفرن نے تمام اہلکاروں کو آزمالیا مگر کامیابی نہ ملی۔

ایسے واقعات جو عقل کی کسوٹی پر پرکھے نہ جاسکیں

یہ ایک ایسا محیّرالعقول اور پُراسرار واقعہ ہے جس نے لارڈ ڈفرن جیسی مشہور و معروف ہستی کی جان بچائی جو اس زمانے میں فرانس میں انگلینڈ کے سفیر تھے۔ اس سے پہلے وہ کینیڈا میں گورنر جنرل، اٹلی میں سفیر اور انڈیا میں گورنر جنرل رہ چکے تھے۔ نامور فرانسیسی سائیکولوجسٹ ڈی ماراترے نے نہایت احتیاط اور پوری ذمّے داری کے ساتھ اس واقعے کی تفصیلات کی چھان بین کرکے اپنی رپورٹ برٹش سوسائٹی فار فزیکل ریسرچ کے حوالے کی تھی۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ لارڈ ڈفرن ایک مرتبہ اپنے ایک پرانے دوست سر ہنری پی کی دعوت پر آئرلینڈ گئے تھے۔ وہ ایک سہانی چاندنی رات تھی۔ ہر شے پُرسکون اور خاموش تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے چاندنی نے سحر سا پھونک دیا ہو۔ لارڈ ڈفرن نے آہستہ آہستہ اپنے کپڑے بدلے اور سونے چلے گئے اور جلد ہی سو گئے۔

اچانک بِلا سبب اُن کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے کی پوری فضا حیرت انگیز طور پر بدلی ہوئی تھی۔ لارڈ ڈفرن کو ایسا محسوس ہوا گویا ان کے آس پاس کوئی غیر مرئی شے موجود ہو...... کوئی منحوس اور ناپسندیدہ وجود جسے وہ بیان کرنے سے قاصر تھے۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پورے کمرے میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی لیکن یہ واضح طور پر ایک عجیب، پُراسرار نیلگی سی چاندنی تھی۔ لارڈ ڈفرن نے جلدی سے کمرے کی بتیاں روشن کردیں اور انہیں ان ناقابلِ فہم پرچھائیوں سے نجات مل گئی۔ انہوں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے کہ وہ جاگ رہے تھے اور یہ کوئی بھیانک خواب نہیں تھا، اپنے جسم کو زور سے ہلایا، پھر ایک سگریٹ سلگا لیا اور اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ذہن حیرت انگیز طور پر چوکس تھا لیکن وہ اس عجیب و غریب احساس کو سمجھنے سے قاصر تھے جس نے انہیں گہری نیند میں کسی پُراسرار شے کی موجودگی سے آگاہ کیا تھا۔ کیا یہ ان کی چھٹی حس تھی؟ لیکن ایسا احساس تو انہیں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

”لگتا ہے، میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔“ لارڈ ڈفرن نے سوچا ”یا پھر شاید اس چاندنی کا اثر ہے......“ ”ویسے بھی آئرلینڈ میں یہ ساری پرانی جگہیں آسیب زدہ سمجھی جاتی ہیں۔“

لارڈ ڈفرن ان خرافات پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ایک عملی انسان کی زندگی میں ایسے توہمات کی کوئی گنجائش نہیں تھی...... اور بس اتنی سی بات تھی۔

ان کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں...... وہ سوچ رہے تھے کہ یہ آواز کیسی تھی؟ کیا یہ کسی پرندے کی پھڑپھڑاہٹ تھی...... جھینگر بول رہے تھے اور مینڈک ٹرا رہے تھے لیکن وہ طویل کراہ...... وہ کیا تھی؟ ہوا بالکل ساکت تھی۔ وہ باہر درختوں کی سرسراہٹ یا کمرے کے پردوں کی سرگوشی نہیں ہوسکتی تھی۔ شاید کوئی الو چیخا تھا۔ ہاں، یہی بات ہوگی۔

لیکن...... وہ کراہ پھر سنائی دی۔ معلوم ہوتا تھا، کوئی انسان کسی کرب یا تکلیف میں تھا اور وہ کراہ رہا تھا۔ شاید وہ زخمی تھا۔ لارڈ ڈفرن بستر سے اچھل کر کھڑے ہوگئے اور تیزی سے کھڑکی پر جا کھڑے ہوئے۔ کمرے کی کھڑکیاں لمبی، فرانسیسی طرز کی تھیں اور پختہ فرش اور ایک سرسبز لان میں کھلتی تھیں جہاں پرانے اشجار کا جھنڈ تھا اور لان پر ان کے دیوہیکل سائے پڑ رہے تھے۔ وہ آواز درختوں کے انہی گہرے سایوں میں سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ لارڈ ڈفرن کھڑکی پر کھڑے ان سایوں کو غور سے دیکھنے لگے۔ اچانک کوئی چیز حرکت کرنے لگی۔ کراہنے اور ہانپنے کی آواز بہ دستور آرہی تھی...... اور پھر کوئی ان تاریک سایوں میں سے نکل کر مکمل طور پر چٹکی ہوئی روپہلی چاندنی میں آگیا۔ وہ اپنی پیٹھ پر ایک بہت ہی بھاری بھرکم بوجھ اٹھائے، لڑکھڑاتا ہوا بڑھ رہا تھا لیکن اس کا چہرہ اس سیاہ بکس نما شے سے چھپا ہوا تھا جو وہ اٹھائے ہوئے تھا۔

لارڈ ڈفرن اور وہ شخص اب پوری طرح اس نکھری نکھری سی چاندنی میں تھے۔ اب ڈفرن نے دیکھا کہ وہ شخص ایک بہت بڑا تابوت اٹھائے ہوئے تھا۔ کیا کوئی شخص کوئی لاش چُرا کر لے جا رہا ہے؟ یہ سوچ کر لارڈ ڈفرن نے تیزی سے لان عبور کیا اور اس شخص کے نزدیک پہنچ گئے پھر اس سے مخاطب ہوئے۔

”اے سنو! یہ تم کیا لے جا رہے ہو؟“

ان کے اس طرح روکے جانے پر اس شخص نے اس بوجھ تلے سے اپنا سر ابھارا۔ وہ ایک انتہائی خوف ناک، کریہہ اور بدصورت چہرہ تھا۔ لارڈ ڈفرن گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اس چہرے پر ایسی خباثت، نفرت اور شیطنت تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے لارڈ ڈفرن کے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ گیا تاہم لارڈ ڈفرن نے فوراً اپنے حواس پر قابو پالیا اور چیخ کر مخاطب ہوئے۔

”تم یہ کہاں لے جا رہے ہو؟“ اور اسے روکنے کے لیے آگے بڑھے۔ وہ شخص ان کی آنکھوں کے سامنے غائب ہوگیا۔ لارڈ ڈفرن اس جگہ پہنچے جہاں وہ شخص تابوت اٹھائے ہوئے کھڑا تھا اور جھک کر غور سے زمین کو دیکھنے لگے۔ شبنمی گھاس پر قدموں کے نشانات نہیں تھے۔ صرف چودھویں کے چاند کی روپہلی چاندنی تھی اور پُرہول سناٹا تھا۔

لارڈ ڈفرن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے لیکن وہ گھر کے مکینوں کو جگانا اور انہیں متحرک کرنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا خاموشی سے اپنے کمرے میں لوٹ گئے۔ وہاں انہوں نے قلم سنبھالا اور ڈائری میں وہ سارا واقعہ بے کم و کاست قلم بند کرنے لگے۔ صبح کو ناشتے کی میز پر انہوں نے اپنے دوست سر ہنری سے اس سلسلے میں سوال و جواب کیا۔ سر ہنری کے بیان کے مطابق وہاں حال ہی میں کوئی موت واقع ہوئی تھی، نہ ہی گاؤں میں

ٹب مین، ولیم: 1895-1971ء

لائبیریا کے سیاست دان، باپ پادری اور ایوان نمائندگان کے سابق اسپیکر تھے۔ 1917ء میں قانون کی ڈگری لی۔ 1923ء اور 1939ء میں سینیٹر منتخب ہوئے۔ 1937ء سے 1944ء تک سپریم کورٹ کے نائب صدر رہے۔ 1943ء میں صدارت کے انتخاب میں کامیاب ہوئے۔ 1951ء میں آئین میں تبدیلی کر کے تاحیات صدر بن گئے۔ انہوں نے لائبیریا کے مختلف قبیلوں کو متحد کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

مرسلہ: افراسیاب خان، پشاور

کوئی دفنایا گیا تھا اور نہ ہی کوئی شخص اس آدمی کو شناخت کر سکتا تھا جو تابوت اٹھائے ہوئے تھا۔

یہی سارا اسرار تھا اور اگر یہ واقعہ نتیجہ خیز نہ ہوتا تو اپنی تمام تر سریت کے ساتھ ان واقعات میں سے ایک ناقابلِ فہم اور محیّر العقول واقعہ ثابت ہوتا جو وقت کے غبار میں کھو جاتے ہیں۔

☆☆☆

اس کے چند ہی سال کے بعد 1898ء میں لارڈ ڈفرن فرانس میں سفیر مقرر ہوئے اور اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں پیرس کے گرینڈ ہوٹل میں ایک سفارتی استقبالیہ میں شریک ہوئے۔ ہوٹل کی داخلی گزرگاہ متعدد ممالک کے نمائندوں سے کھچاکھچ بھری ہوئی تھی۔ لارڈ ڈفرن کی سیکریٹری نے لفٹ تک ان کی رہنمائی کی جہاں کئی ریاستی اہلکار احتراماً کھڑے لارڈ ڈفرن کا انتظار کر رہے تھے۔ انگلستان کا سفیر ہونے کی حیثیت سے انہیں فوقیت حاصل تھی۔ لارڈ ڈفرن خوش اخلاقی سے سر ہلا ہلا کر کورنش بجالاتے ہوئے ان اعلیٰ حکام کے پاس سے گزرے۔ لفٹ کا دروازہ کھلا۔ لارڈ ڈفرن لفٹ میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ اچانک ان کی نظر اس شخص پر پڑی جو لفٹ آپریٹ کر رہا تھا۔ لارڈ ڈفرن مارے دہشت کے جلدی سے سمٹ کر پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے ایک ہاتھ اٹھا کر اپنی سیکریٹری کو لفٹ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ آخر ہوا کیا؟

ان کے سامنے وہی بھیانک چہرہ تھا جو انہوں نے آئرلینڈ میں دیکھا تھا اور جو اُن کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ وہ اس خوفناک چہرے والے کو ایک ٹک گھورتے چلے گئے۔ یہ بالکل وہی شخص تھا جو برسوں پہلے آئرلینڈ میں اس چا[ندنی] رات میں تابوت اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے کے مکروہ خدوخال تھے، ایک ایک سلوٹ وہی تھی، وہی آنکھیں تھیں، چہرے پر وہی خباثت اور شیطنت تھی.....

وہ آئرلینڈ کی اس چاندنی رات سے اٹھ کر اچانک یہاں میں گرینڈ ہوٹل کی لفٹ میں کیسے نمودار ہو گیا، شاید سوالات ایک سیکنڈ میں لارڈ ڈفرن کے ذہن میں ابھرے ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

لارڈ ڈفرن کو اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ دیکھنے والوں کو ایسا لگا جیسے انہوں نے ا[پنا] بدل دیا ہو۔ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بڑبڑائے دوسرے حکام سے کہا کہ وہ ان کا انتظار نہ کریں اور سیکریٹری کو وہیں چھوڑ گئے۔ کچھ حکام لفٹ میں داخل ہو[ئے] لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا اور لفٹ اوپر کی طرف روانہ ہو گئی۔ لارڈ ڈفرن لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہوٹل منیجر کے آفس جا گھسے اور اسی لفٹ آپریٹر کے بارے میں پوچھنے لگے کہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟ لیکن اس سے پہلے کہ منیجر جواب دیتا، ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور چیخ و پکار سے ایک قیامتِ صغریٰ بپا ہو گئی۔ لارڈ ڈفرن کی سیکریٹری نمودار ہوئی اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ ایک خوفناک حادثہ پیش آیا تھا۔ وہی لفٹ جس میں ڈفرن داخل ہوتے ہوتے رہ گئے تھے اور جسے وہ بھیانک صورت والا شخص آپریٹ کر رہا تھا، جو انہیں آئرلینڈ میں نظر آیا تھا، پانچویں منزل تک گئی تھی کہ اچانک اس کا کیبل ٹوٹ گیا تھا اور وہ ایک زوردار دھماکے سے نیچے فرش پر آ گری تھی۔ اس لفٹ میں جتنے لوگ موجود تھے، سب ہلاک ہو گئے تھے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس وقت کے اخبارات اس حادثے کی خبر سے بھرے پڑے تھے۔ وہ پُراسرار لفٹ آپریٹر بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی ہلاک ہو گیا تھا لیکن کون جانے اس کی اصلی شکل کیا تھی اور وہ کون تھا؟ لارڈ ڈفرن اپنے تمام اختیارات بروئے کار لا کر بھی اس پُراسرار واقعے کی تہ تک پہنچنے سے قاصر رہے۔ سارے ثبوت موجود ہیں لیکن کوئی بھی حقائق بیان نہیں کر سکا ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ لارڈ ڈفرن کی جان اس پُراسرار طریقے سے بچ گئی۔ میں نہیں جانتا کہ ان واقعات کی کیا توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے، صرف وہی بتا رہا ہوں جو پیش آیا تھا۔

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر ہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ وہ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست وبرخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی پانچویں کڑی

ہم نے خان صاحب سے کہا "بٹ صاحب کیسے خراماں خراماں آرہے ہیں تاکہ لڑکی سے باتیں کرنے کا زیادہ موقع ملے۔"

جواب میں خان صاحب نے سرگوشی کی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو انگریزی بولنے اور سمجھنے والی لڑکیاں کیسے مل جاتی ہیں۔ ہمیں تو انگریزی بولنے والے مرد بھی مشکل ہی سے ملتے ہیں۔"

اتنی دیر میں بٹ صاحب ہم لوگوں کے پاس پہنچ

گئے۔

"السلام علیکم۔" لڑکی نے مسکرا کر ہم سب کو مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔" ہم مرزا کی زبان سے اس قدر گاڑھا سلام سن کر حیران رہ گئے۔

بٹ صاحب نے کہا۔ "ان سے ملیے، یہ ہمارے پاکستانی دوست علی سفیان آفاقی ہیں۔"

لڑکی نے فوراً مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"اور یہ ہمارے پاکستانی دوست خان صاحب ہیں۔ ان کا نام تو بہت لمبا اور مشکل ہے اس لیے مختصر نام بتا رہا ہوں۔"

لڑکی نے مسکرا کر "خوش آمدید" کہا اور خان صاحب سے بھی ہاتھ ملایا۔

"اور یہ مرزا ہیں۔"

"ویلکم ٹو استنبول" لڑکی نے مرزا مشرف کو بھی مصافحے کا شرف بخشا پھر پوچھا "پاکستانی؟"

بٹ صاحب جلدی سے بول پڑے "یہ انڈین مسلم ہیں۔ کئی مہینوں سے استنبول میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر" لڑکی نے مرزا مشرف سے بھی ہاتھ ملا لیا۔

خان صاحب نے اردو میں بٹ صاحب سے پوچھا۔ "اور ان کی تعریف کیا ہے؟"

لڑکی نے بٹ صاحب سے پوچھا "یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"آپ کا نام پوچھ رہے ہیں۔"

"سوری! ویری ویری سوری، مجھے پہلے ہی اپنا نام بتا دینا چاہیے تھا۔ میرا نام فریحہ اغلان ہے۔"

بٹ صاحب نے چپکے سے کہا۔ "شاید شادی شدہ ہے۔ اغلان اس کے شوہر کا نام ہوگا۔"

مرزا صاحب نے پوچھ ہی لیا۔ "اغلان آپ کے شوہر کا نام ہے؟"

وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔ "میں غیر شادی شدہ ہوں۔ اغلان میرے والد کا نام ہے۔"

"سن کر خوشی ہوئی۔" بٹ صاحب بے اختیار بول پڑے۔

خان صاحب نے فوراً کہا "ہم سب شادی شدہ ہیں سوائے مسٹر آفاقی کے۔"

"کوئی گرل فرینڈ تو ہوگی۔" فریحہ نے مُڑ کر پوچھا۔

"ہمارے ہاں منگنی ہوتی ہے یا شادی۔ گرل فرینڈ نہیں ہوتی۔" بٹ صاحب نے صفائی پیش کر دی۔

ہم نے کہا۔ "کیا بہتر نہ ہوگا کہ ہم ریستوران میں بیٹھ کر چائے یا کافی پئیں۔"

فریحہ نے مسکرا کر سر ہلایا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تو پھر آیئے۔" ہم لوگ ایک کاؤنٹر کے سامنے پہنچے جہاں ایک لمبی سی بینچ پڑی ہوئی تھی۔ دراصل یہ ریستوران نہیں تھا۔ ایک کاؤنٹر تھا جہاں سے لوگ اپنے اپنے پسند کی چیزیں خرید کر لے جاتے تھے۔

"آپ لوگ بتائیں کیا پئیں گے؟" مرزا صاحب نے پوچھا۔

ہم سب نے انگلش کافی کی فرمائش کر دی۔ دراصل عربوں اور ترکوں کی کافی بہت زیادہ گاڑھی اور کڑوی ہوتی ہے جسے وہ چینی ملائے بغیر مزے لے لے کر پیتے ہیں مگر ہم لوگوں کے لیے اس کو حلق سے اتارنا مشکل ہو جاتا تھا۔

"اور آپ؟" مرزا صاحب نے فریحہ سے پوچھا۔

"میرے لیے چائے کافی ہے۔"

ترکوں کی چائے ایسی نہیں ہوتی جیسی ہم لوگ پیتے ہیں۔ اس میں دودھ نہیں ملایا جاتا۔ چینی کا استعمال بھی برائے نام ہی کیا جاتا ہے۔ بٹ صاحب نے اس جوشاندے کا نام دیا تھا۔

مرزا صاحب ہم سب کو واحد لکڑی کی لمبی سی بینچ پر بٹھا کر کاؤنٹر کی طرف چلے گئے۔

خان صاحب بولے "یہ بات تو غلط ہے۔ سب کا بل مرزا کو ادا کرنا پڑے گا۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ دعوت بھی تو انہوں نے ہی دی تھی۔"

فریحہ کی سمجھ میں ہماری گفتگو نہیں آ رہی تھی۔ وہ سب کا منہ دیکھ رہی تھی۔

"آپ کون سی زبان بول رہے ہیں؟"

"یہ ہماری اردو زبان ہے۔"

"اردو؟"

"جی، اس کا مطلب ہے کاک ٹیل۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ہم نے بتایا۔ "اردو ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے لشکر، فوج۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہندوستان پر باہر سے آنے والوں نے کافی عرصے حکومت کی ہے۔ ان میں منگول، ایرانی، یونانی، انگریزی، ہندی اور ترکی زبان کے بہت سے الفاظ ہیں جن سے مل کر یہ زبان بنی ہے۔ فوج میں چونکہ ہر ملک کے لوگ ہوتے تھے۔ جب سب کی زبان شامل ہوگئی تو ہر ایک کے لیے سمجھنا آسان ہوگیا۔"

"مگر ترکی نے تو کبھی ہندوستان پر حکومت نہیں کی۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"حکومت تو نہیں کی مگر مختلف نسلوں کے ترک ہندوستان میں آتے رہے۔ ہر بادشاہ فوج میں ترک فوجی ضرور رکھتا تھا۔ ترک نسل کے کئی بادشاہوں نے ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ جیسے سلجوقی، طغرل، سبکتگین، ایبک وغیرہ۔"

ہم نے اپنی عقل کے مطابق معلومات فراہم کر دیں۔

"آپ کا بہت شکریہ۔" فریحہ نے کہا۔ ہم نے محسوس کیا اور دیکھا کہ ترک شکریہ بہت زیادہ ادا کرتے ہیں۔ مثلاً آپ کے آنے کا شکریہ۔ آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ آپ نے ہمیں اپنا قیمتی وقت دیا، بہت شکریہ۔ انگریز اتنی کثرت سے تھینک یو نہیں کہتے جس طرح ترک شکریہ کہتے ہیں۔

دراصل جو بات ترکی جا کر شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ ان کی شائستگی، اخلاق اور اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا مہذب انداز ہے۔ کوئی شخص آپ کو بلند آواز میں بات کرتا ہوا یا کسی کو پکارتا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ لڑائی جھگڑے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بلند آواز سے قہقہہ سنائی نہیں دیتا۔ ریستوران، شاپنگ سینٹر یا کسی اور جگہ جائیں تو بھی وہی نرم گفتاری جسے بٹ صاحب کانا پھوسی کہتے تھے۔

کسی بھی ملک کی تہذیب اور شائستگی کا اندازہ سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ ہر کار اپنی لین میں چلتی نظر آئے گی۔ سگنل پر ٹریفک رک جاتا ہے۔ پیدل چلنے والوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر وہ بے جگہ سے سڑک عبور کر رہے ہوں تب بھی ان کے لیے ٹریفک تھم جاتی ہے۔ ہارن کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ٹریفک کے اصولوں کی پابندی فرض تصور کی جاتی ہے۔ کسی کار کے سامنے سے انڈی کیٹر دیکھنے کے بعد کوئی اس سے آگے نہیں نکلتا، ہمارے ملک میں تو رکشا اور موٹر سائیکل والوں نے ہر ٹریفک قانون کو توڑنا معمول بنا لیا ہے۔ مہذب ملکوں میں ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہی غلط سمت سے کسی کار کو اوورٹیک کیا جاتا ہے۔ ترک خوش قسمت ہیں کہ وہ رکشوں اور موٹر سائیکل والوں سے محفوظ ہیں۔ کہیں کہیں اکا دکا موٹر سائیکل نظر آتی ہے مگر وہ اپنی مقررہ لین سے باہر نہیں نکلتی۔ سیٹ بیلٹ باندھنا تو جیسے ان لوگوں نے پیدا ہوتے ہی سیکھ لیا تھا۔ کیا مجال جو سیٹ بیلٹ باندھے بغیر کوئی کار میں سفر کرنے کا سوچے۔

استنبول (اور ترکی) بھی ایک انتہائی مہذب جگہ ہے۔ صفائی ایسی کہ کوڑے کرکٹ یا گرد و غبار کا سڑک پر نام و نشان تک نہیں ہے۔ راہ گیر فٹ پاتھ کے سوا سڑک پر نہیں چلتے اور نہ ہی فٹ پاتھ دکانداروں کے سامان سے روکی جاتی ہیں۔ کوئی کار کسی دوسری کار کے لیے رک جائے تو گزرنے والا مسکرا کر ہاتھ ہلاتا یا "آپ کا شکریہ" کہتا نظر آتا ہے۔ دکانوں میں دکاندار خریداروں کو ٹوکتے نہیں ہیں اور نہ ہی آئے دن من چاہی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں قانون کا سختی سے نفاذ بھی ایک بڑی وجہ ہے۔ ہم نے استنبول میں کسی پولیس والے کو مسلح یا چھڑی بغل میں دبائے نہیں دیکھا۔ لیکن پولیس کا رعب ایسا ہے کہ پولیس والے کو دیکھتے ہی جرائم پیشہ لوگ بھی سہم جاتے ہیں۔ اور ایک پولیس والا تین چار مجرموں کے ہاتھ سے پستول لے کر اور ہتھکڑی لگا کر لے جاتا ہے۔ وہ بھی خاموشی سے سر جھکائے چلتے ہیں۔ نہ بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں نہ پولیس والے سے ہاتھا پائی کرتے ہیں۔ پولیس والے عوام سے نہایت شائستگی سے بات کرتے ہیں مگر خلافِ قاعدہ بات یا حرکت پر ٹوک بھی دیتے ہیں۔ یہ قصہ تو بہت طویل ہے۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں

مگر ایسے ملکوں میں جا کر یہ احساس شدید ہو جاتا ہے کہ آخر ہم کب بدلیں گے۔ کب یہاں تعلیم عام ہوگی اور لوگ مہذب رویہ اپنائیں گے۔

مرزا مشرف سب کی پسند کے مشروب لے آئے تھے جن سے سب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فریحہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ اسٹوڈنٹ ہیں اور میڈیکل کے آخری سال میں ہیں۔

بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔ "کسی زمانے میں لاہور کے فاطمہ جناح کالج میں بھی تقریباً سبھی طالبات خوبصورت ہوتی تھیں۔ پھر نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ اب تو ایسی ڈاکٹرنیاں تیار ہو رہی ہیں کہ مریض انہیں دیکھ کر زیادہ بیمار ہو جائے گا۔"

خان صاحب بولے۔ "لڑکیوں کے چہرے نہیں بدلے بلکہ آپ بوڑھے ہوگئے ہیں اس لیے جوانی کا وہ جوش

باقی نہیں رہا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں جوانی میں تو گدھی بھی پری نظر آتی ہے۔"

"آپ کو گدھی پری نظر آتی ہوگی۔ مجھے تو گدھی کی گدھی نظر آتی ہے۔ اور کیا میں بوڑھا ہوگیا ہوں؟"

"چلیے بوڑھے نہ سہی ادھیڑ عمر تو ہو ہی گئے ہو۔ اسی عمر میں تو پری بھی گدھی جیسی نظر آتی ہے۔"

ہم نے فوراً دخل در معقولات ضروری سمجھی۔ خان صاحب آپ نے حفیظ جالندھری کا وہ شعر نہیں سنا

یہ بھی کیا مرحلہ عمر ہے یارب کہ مجھے
ہر بری چیز بری چیز نظر آتی ہے

ہر عمر کے اپنے تقاضے خواہشیں اور دیکھنے والی نظر ہوتی ہے۔ آپ خود ذرا غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی پسند ناپسند اور شوق ہر زمانے میں بدلتے رہے ہیں۔"

یکایک ہمیں خیال آیا کہ ایک ترک خاتون ہمارے ساتھ بیٹھی ہمارے منہ دیکھ رہی ہے کیونکہ ہم اپنی زبان میں بات کررہے ہیں جو اس کے پلے نہیں پڑ رہی۔

فریحہ کی طرف دیکھا تو واقعی وہ خاموشی سے ہماری گفتگو دیکھ اور سن رہی تھی۔ اس کے چہرے میں الجھن بھی تھی اور مسکراہٹ بھی۔

ہم نے فریحہ سے کہا "فریحہ خاتون، معاف کیجیے ہمیں خیال ہی نہیں رہا کہ ہم جس زبان میں باتیں کررہے ہیں وہ آپ سمجھ نہیں سکتیں۔"

فریحہ کا چہرہ ایک دم مسکراہٹ سے مزید روشن ہوگیا۔ "اورود؟"

"ہاں، ہم اردو میں بات کررہے تھے۔"

"میں سمجھنے کی کوشش کررہی تھی کیونکہ آپ کی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ترکی میں بھی ہیں مگر آپ انہیں اور طرح بولتے ہیں ہم ترک کسی اور طرح بولتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔ آپ کو بتایا ہے نا کہ اردو میں کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ ترکی کے بھی سیکڑوں الفاظ اردو میں شامل ہیں۔"

"میں سمجھ گئی" وہ ہنس کر بولی۔ "شاید اسی لیے پاکستانی ہم ترکوں کو اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔"

بٹ صاحب بول پڑے "اسی لیے آپ سب بھی ہمیں پرائے نہیں لگتے۔"

فریحہ نے کہا "ایک بات اور بتادوں، ہمارے ہاں خاتون عام طور پر شادی شدہ لڑکیوں کو کہا جاتا ہے۔ میری تو شادی بھی نہیں ہوئی اور آپ نے مجھے فریحہ خاتون کہہ دیا۔"

"سوری، تو پھر ہم آپ کو کیا کہیں؟ فریحہ خانم؟"

"آپ مجھے صرف فریحہ کہہ سکتے ہیں۔"

"اوکے۔ فریحہ یہ بتائیے کہ آپ ڈاکٹر بننے کے بعد کیا کریں گی۔"

"ڈاکٹر علاج کرتے ہیں میں بھی علاج ہی کروں گی۔" وہ کچھ حیرت زدہ ہوکر بولی۔ "کیا آپ کے ملک میں لوگ ڈاکٹر بننے کے بعد کچھ اور کرتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ ہمارے ہاں مرد تو ڈاکٹر بن جانے کے بعد ڈاکٹر ہی بن جاتے ہیں اور مریضوں کا علاج کرتے ہیں لیکن لڑکیاں......" اتنا کہہ کر خان صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

فریحہ نے حیران ہوکر پوچھا۔ "لڑکیاں ڈاکٹر بننے کے بعد کیا کرتی ہیں۔"

"شادی۔"

اس کی حیرت میں اضافہ ہوگیا۔ "شادی! کیا آپ کے ملک میں شادی کرنے کے لیے لڑکیوں کا ڈاکٹر بننا ضروری ہے؟"

"ارے نہیں۔" خان صاحب کھسیانے ہوگئے۔ "پاکستان میں شادی کے لیے لڑکیوں کا ڈاکٹر بننا ضروری نہیں ہے۔ یہ تو لڑکیوں کی اپنی پسند ہے یا پھر ان کے والدین چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر بن جانے سے پہلے وہ بیوی اور ماں بن جائیں تو اچھا؟"

فریحہ نے ایک دو بار اپنی کلائی پر بندھی ہوئی خوبصورت گھڑی پر نظر ڈالی تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم بلاوجہ ایک لڑکی کا وقت ضائع کررہے ہیں جو تکلف کے مارے انکار بھی نہیں کررہی۔

ہم لوگ دوبارہ عرشے پر آگئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دور تک پھیلا ہوا گہرا نیلا سمندر تھا۔ اس کے بعد جہاں سمندر آسمان سے ملتا تھا وہ بھی ایک عجب نظارہ تھا۔ آسمان کا رنگ بھی نیلا تھا لیکن باسفورس کے پانی کے رنگ سے مختلف۔ قدرت نے بھی انسان کو حیران کرنے کے لیے کیسے کیسے معجزے دکھائے ہیں۔ اگر انسان پھر بھی اللہ کی قدرت کا قائل نہ ہو تو اس کو صرف دہریا ہی نہیں عقل سے خارج اور آنکھوں سے اندھا ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ ہماری فیری کے ساتھ ساتھ سفید رنگ کے سمندری پرندے اڑ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہمیں گارڈ آف آنر پیش کررہے ہیں۔ کبھی وہ ایک ڈار کی شکل میں ایک جانب سے نمودار

ہوکر دوسری جانب پرواز کرتے اور کبھی سمندر کی سطح پر اس طرح آرام سے بیٹھ جاتے جیسے جھولا جھول رہے ہیں۔

فریحہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ باسفورس کا حسن اور تازگی کسی بھی انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

بٹ صاحب بولے۔ "کتنی تازہ ہوا ہے۔"

خان صاحب نے فوراً کہا۔ "یہ تازہ نہیں بھیگی ہوئی ہوا ہے۔"

"کیوں، کیا بھیگی ہوئی ہوا تازہ نہیں ہوسکتی؟" ذرا لمبا سانس لے کر دیکھو تو احساس ہوگا جیسے ہمارے پھیپھڑے آکسیجن سے بھر گئے ہیں۔"

مرزا صاحب کافی دیر سے خاموش تھے مگر مزید خاموش نہ رہ سکے۔

"اجازت ہو تو بندہ بھی کچھ عرض کرے۔"

"ضرور عرض کرو۔" بٹ صاحب شاہانہ انداز میں بولے۔ "مگر اپنے شعر اور غزلیں نہ سنانے لگنا۔"

مرزا نے کہا۔ "ایک تو ہم لوگ یہ بدتمیزی کررہے ہیں کہ ایک ترک لڑکی کے سامنے اردو میں باتیں کررہے ہیں۔ یہ بدتہذیبی ہی نہیں بے وقوفی بھی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" خان صاحب نے کہا۔ "آپ کی ایک عرض سن لی۔ اب دوسری بھی عرض کردیں۔"

"ہوسکتا ہے کہ یہ لڑکی کسی اور جگہ جانا چاہتی ہو مگر ہم اسے گھیر کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس بے چاری کو تو بولنے کی مہلت ہی نہیں دے رہے۔"

وہ بے چاری ہم لوگوں کی باتوں سے قطع نظر آس پاس کے مناظر کی تصویریں بنانے میں مصروف تھی۔

بٹ صاحب ناراض ہوگئے۔ "ہم تو اپنی تصویریں بنوانے کے لیے اس کو لے کر آئے تھے، وہ وہیل مچھلیوں اور سمندری پرندوں کی تصویریں بنانے میں لگ گئی۔"

"بٹ صاحب، وہ آپ کی خاندانی فوٹو گرافر تو نہیں ہے۔ جو دو چار تصویریں بنادی ہیں وہ اس کی مہربانی ہے۔" خان صاحب پھٹرخانی کرنے لگے۔ "آپ اپنی شکل دیکھیے اور ان مناظر کو دیکھیے جن کی وہ تصویریں بنارہی ہے۔ ظاہر ہے بہت ذہین اور صاحب ذوق لڑکی ہے۔"

فریحہ جو کچھ فاصلے پر کھڑی تصویریں بنارہی تھی اچانک ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر ہمارے نزدیک آگئی۔ "معاف کیجیے، میں تصویریں بنانے میں لگ گئی۔ آپ سمجھتے ہوں گے کتنی بدتمیز لڑکی ہے۔"

خان صاحب بول پڑے۔ "ہم تو سمجھ رہے تھے کہ ہم لوگ بدتمیزی کررہے ہیں کہ اردو میں اپنی باتوں میں مصروف ہیں۔ آپ کی طرف دھیان دینا ہی بھول گئے۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں تصویر کشی میں لگ گئی تھی۔ جب میں زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں باسفورس کی سیر کو آجاتی ہوں۔"

"اکیلی؟" یہ بٹ صاحب تھے۔

"نہیں، کبھی میری فرینڈز بھی ساتھ آجاتی ہیں لیکن ہر ایک کو ایک ساتھ تو فرصت نہیں ملتی۔"

"کیا اکیلے آکر آپ کا دل لگ جاتا ہے؟"

"اکیلی کیوں! اتنے بہت سے طرح طرح کے لوگ یہاں ہوتے ہیں۔ مگر مجھے تو باسفورس کو دیکھنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ سمندر، آسمان، کناروں پر خوبصورت عمارتیں۔ ٹھنڈی دل کو بے فکر کردینے والی ہوا۔ آس پاس کے خوبصورت محل اور بہت پرانے زمانے کی عمارتیں۔ ساحل پر خوبصورت ریستوران، میں تو اکثر کسی ریستوران میں بیٹھ کر لطف اندوز ہوتی رہتی ہوں۔"

بٹ صاحب انٹرویو لینے پر تلے ہوئے تھے۔ "مگر آپ اکثر اکیلی ہی کیوں آتی ہیں۔" پھر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کا کوئی بوائے فرینڈ یا منگیتر نہیں ہے۔"

بجائے شرمانے کی وہ بے اختیار مسکرا اٹھی۔ "اب آپ مجھ سے راز کی باتیں بھی پوچھیں گے؟"

مرزا صاحب بولے۔ "اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو اور واپسی کی جلدی نہ ہو تو ہم فیری سے اتر کر کسی ساحلی ریستوران میں بیٹھتے ہیں۔ لنچ کا وقت ہوگیا ہے۔"

بٹ صاحب پھر بول پڑے "آپ لنچ کھاتی ہیں یا ڈائٹنگ کرتی ہیں۔"

"مجھے دیکھ کر آپ کو کیا اندازہ ہوتا ہے۔"

ہم سب نے ایک بار پھر غور سے فریحہ کا جائزہ لیا۔ بوٹا سا قد، متناسب جسم، ہلکی نیلی آنکھیں، سنہرے ترشے ہوئے بال۔ جینز اور سفید بلا آستین کی قمیص میں وہ بہت دلکش طالبہ لگ رہی تھی۔

ہم لوگ فیری سے اتر کر زمین پر آگئے جہاں ایک خاتون اور دو خوش شکل گورے چٹے نوجوان شالیں اور گرم سوئٹر اور پل اوور فروخت کررہے تھے۔ بٹ صاحب نے فوراً خریداری شروع کردی۔ "یہ شال تمہاری بھابی کے لیے۔ یہ پل اوور تمہارے بھائی یعنی میرے لیے۔"

بٹ صاحب کی دیکھا دیکھی ہم سب نے بھی کچھ نہ کچھ خریدا۔ فریحہ نے ایک اسمارٹ خاتون کے گلے میں لٹکی ہوئی ٹرے میں سے ایک لاکٹ خرید لیا۔ یہ خیال رہے کہ یہاں بھی اصلی سونے اور ہیرے جواہرات کا استعمال نہیں ہوتا۔ بڑی سے بڑی حیثیت کی خواتین بھی مصنوعی زیورات ہی استعمال کرتی ہیں اور وہ بھی بہت کم۔ لاکٹ یا بریسلٹ بھی پہن لیتی ہیں۔ لیجیے' یہ ان کا زیور تمام ہوا۔ ہم نے کہا۔ ''آپ لوگ شاید بھول رہے ہیں۔ ہم خریداری کرنے نہیں ساحلی ریستوران میں کچھ کھانے پینے کے لیے آئے تھے؟''

''آفاقی صاحب۔'' بٹ صاحب نے کہا۔ ''ساحلی ریستوران کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے۔ مگر یہ چیزیں فروخت کرنے والے شاید ہمیں نہ ملیں۔''

فریحہ اپنی گردن میں لاکٹ لٹکا کر اندازہ لگا رہی تھی کہ کیسا لگتا ہے۔

خان صاحب نے کہا۔ ''بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ اس کو پہن ہی لیں تو بہتر ہے۔''

فریحہ نے ہم سب کو مسکرا کر دیکھا۔ ''کیا آپ سب کی یہی رائے ہے؟''

''جی ہاں'' ہم سب ایک ساتھ بول پڑے۔

فریحہ نے شانوں پر پھیلے ہوئے سنہری بالوں کو سمیٹ کر ایک طرف ہٹایا اور لاکٹ پہن لیا۔ سچ پوچھیے تو اس کے گلے میں یہ لاکٹ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

سڑک عبور کر کے ہم ساحلی ریستورانوں کی طرف پہنچ گئے۔ دنیا کے مختلف ترقی یافتہ ملکوں کے ساحل بہت دلکش ہوتے ہیں۔ طرح طرح کی تفریح کا سامان یہاں موجود ہوتا ہے۔ پھر سیاحوں اور سیر بینوں کی رونق علیحدہ۔ مگر استنبول کے ساحلی ریستوران میں بیٹھ کر جو لطف آیا وہ کسی اور جگہ نہیں آیا۔ یہ ریستوران ساحل کے ساتھ ساتھ ایک نیم دائرے کی شکل میں دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ تازہ ہوا، کھلی فضا، سامنے کشادہ سڑک پر دوڑتی ہوئی کاریں۔ اس سے پرے باسفورس، ہم سوچتے ہیں کہ اگر استنبول میں سب کچھ ہوتا مگر باسفورس نہ ہوتا تو کیا اس کے حسن اور دلکشی میں ایسی ہی کشش ہوتی جیسی کہ اس وقت ہے؟

جب بلند آواز میں ہم نے یہی سوال دوستوں کے سامنے دہرایا تو بٹ صاحب بے تحاشہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور بولے۔ ''آفاقی صاحب' آپ بھی کمال کی سوچتے ہیں۔ سوچیے کہ اگر دنیا میں سرے سے سمندر ہوتے ہی نہیں تو کیا دنیا اتنی ہی خوبصورت ... ہوتی۔ یا اگر پہاڑ نہ ہوتے' دریا نہ ہوتے' چشمے اور جھیلیں نہ ہوتیں تو یہاں تو ہر طرف ریت اڑ رہی ہوتی۔ ایک چٹیل میدان، ریگستان، ریت کے طوفان، ذرا سوچیے تو پھر ہم کیا کرتے؟''

''وہی کرتے جو حالات کے مطابق کر سکتے تھے۔ اگر اللہ میاں نے ایسی دنیا بنائی ہوتی جس کا آپ تصور کر رہے ہیں تو پھر انسانوں کے ماڈلز بھی ان ہی حالات کے مطابق بنائے ہوتے۔''

ہماری اور بٹ صاحب کی گفتگو کے درمیان میں سب لوگ ریستوران کی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے اور مرزا صاحب ہر ایک سے پوچھ رہے تھے کہ آپ کیا پینا پسند کریں گے۔ اس ملک کی چائے پینا صرف اپنے منہ کا مزہ خراب کرنا ہوتا ہے۔ ٹرکش کافی بھی ہم لوگوں کے حلق سے نہیں اترتی۔ ایک بار غلطی سے کافی کا آرڈر دے بیٹھے تھے۔ کافی کے نام پر ایک سیاہ رنگ کی گاڑھی سی چیز پیالیوں میں سامنے آ گئی۔ ساتھ میں دودھ یا چینی کا ذکر تک نہ تھا۔ نہ کوئی چمچہ تھا جسے پیالی میں ڈال کر استعمال کیا جائے۔

بٹ صاحب نے اس پیالی کو دیکھ کر سوچا پھر پوچھا۔ ''یہ کھانے کی چیز ہے یا پینے کی؟''

ہم نے کہا۔ ''بٹ صاحب' یہ کافی ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ اسے کھائیں یا پئیں۔''

بٹ صاحب نے ایک چمچہ منگوا کر اس کو چکھا اور پھر بولے ''پتا نہیں اس کی تاثیر کیا ہوتی ہے مگر مزہ تو بالکل زہر کا ہے۔''

عربوں اور ترکوں کی کافی کے رنگ روپ اور مزے میں ہم نے کوئی فرق نہیں پایا۔ دونوں گاڑھی اور کالی سیاہ ہوتی ہیں اور دودھ یا چینی کے بغیر انہیں پیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب کوئی ایسا موقع آتا تو ہم یہ دریافت کرتے تھے کہ کیا آپ کے ہاں انگریزی کافی ملے گی؟ چھوٹے ریستورانوں میں تو جواب انکار میں ملتا تھا مگر بڑے ریستوران عموماً انگریزی کافی فراہم کر دیا کرتے تھے۔

استنبول میں لوگ چائے کے بہت شوقین ہیں اور ہمارے ملک کی طرح عموماً آنے والوں کو چائے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم نے کبھی کسی ترک کو چائے پینے کی پیشکش پر انکار کرتے نہیں دیکھا۔ خدا جانے ان قوموں کو چینی اور مٹھاس سے اتنی نفرت کیوں ہے۔ یہ جب بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کانوں میں کوئی مٹھاس گھول رہا ہے۔ پھیکی چائے اور اتنی میٹھی زبان' اللہ کی شان ہے۔

ایرانی بھی اس معاملے میں کم و بیش اسی طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایرانی چائے ترکوں اور عربوں کی کافی کی طرح سیاہ اور کڑوی نہیں ہوتی۔ ایرانی شیشے کے فنجانوں میں چائے پیتے ہیں جو عموماً پتلے اور اونچے ہوتے ہیں۔ ایرانی عموماً پھیکی چائے پیتے ہیں۔ اگر کوئی مٹھاس کا خواہش مند ہو تو چینی کا ایک چھوٹا چوکھوٹا ٹکڑا (کیوب) دانتوں میں اس طرح دبا کر رکھتے ہیں کہ چائے کے گھونٹ کے ساتھ پورا کیوب پیٹ میں نہ چلا جائے۔ چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ یہ کیوب گھلتا رہتا ہے یہاں تک کہ چائے اور کیوب دونوں ختم ہو جاتے ہیں۔ تہران کے دورے میں جب ہمیں ایسی چائے پیش کی گئی اور دو تین افراد نے چینی کا ایک ایک کیوب منہ میں ڈالا تو ہم سمجھے کہ شاید یہ دوسرے گھونٹ کے لیے دوسرا کیوب منہ میں رکھ لیں گے مگر توجہ کیجیے۔ کیا مجال جو کسی اللہ کے بندے نے دوسرا کیوب استعمال کیا ہو۔ بس چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ چینی کا یہ کیوب گھلتا رہتا ہے۔

ہم نے پریشان ہو کر جائزہ لیا تو دیکھا کہ ایک صاحب نے چینی کا دوسرا کیوب بھی اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ ہم نے مزید تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے چینی کے چار چھ کیوب اپنی چائے میں ڈالے اور میزبانوں کی حیرانی کو نظر انداز کر کے پی گئے۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''غبارِ خاطر'' میں صبح کاذب سے پہلے چائے بنانے اور اس کے پینے سے لطف اندوز ہونے کا جو بار بار تذکرہ کیا ہے تو کیا مولانا ابوالکلام آزاد بھی چینی کے بغیر ہی یہ خوش رنگ چائے فنجان میں ڈال کر پیتے تھے یا چینی بھی استعمال کرتے تھے، باوجود ذہن پر بوجھ ڈالنے کے کچھ یاد نہیں آیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ان کی قابلیت علمیت اور عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مولانا نابغہ روزگار اور جینئس تھے۔ جو وہ پندرہ سال کی عمر میں ایسے علمی اور دینی مضامین لکھتے تھے کہ مولانا شبلی نعمانی تک ان کی تحریروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہیں اپنے پاس آنے کی دعوت دے دی۔

مولانا شبلی اس زمانے میں ممبئی میں رہائش پذیر تھے۔ ایک روز تحریری کام میں مصروف تھے کہ ملازم نے خبر دی کہ مولانا ابوالکلام آزاد ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں۔ شبلی نعمانی بے اختیار قلم چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ملازم سے کہا کہ انہیں عزت کے ساتھ اندر لے کر آؤ۔

چند لمحے بعد ایک نوعمر لڑکا... شیروانی میں ملبوس اندر داخل ہوا اور بہت ادب سے سلام کیا۔ شبلی نعمانی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے والد صاحب تشریف نہیں لائے؟''

جواب ملا۔ ''حضرت، خاکسار ہی کا نام ابوالکلام آزاد ہے۔''

مولانا شبلی حیرت سے تکتے رہ گئے۔ ان کے سامنے جو نوعمر لڑکا کھڑا تھا ابھی اس کی مسیں بھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں۔ چہرے پر لڑکپن کے آثار تھے۔

مولانا شبلی نے مزید تصدیق کے لیے دریافت کیا۔ ''آپ ہی مولانا ابوالکلام آزاد ہیں؟''

جواب ملا۔ ''جی'، خاکسار کو ہی ابوالکلام آزاد کہتے ہیں۔''

مولانا شبلی ورطۂ حیرت میں مبتلا انہیں دیکھتے رہ گئے۔ جب گفتگو کا آغاز ہوا تو یقین بھی آ گیا کہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں جن کی تحریر، تقریر اور علمیّت کا ہندوستان بھر میں شہرہ ہے۔

جب تک مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں نہیں پڑھی تھیں اور نہ ہی ان کے بارے میں پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا تو ہم مولانا کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ کانگریس کے ایک اہم رکن تھے اور مسلم لیگ اور کانگریس پارٹی کی آپس میں ٹھنی ہوئی تھی۔ مطالعے کے بعد ہم ان کی قابلیت اور علمیّت کے علاوہ ذہانت اور حسِ مزاح کے بھی قائل ہو گئے۔ قائد اعظم نے انہیں ''شو بوائے'' کہا تو ہم نے بھی ان سے اتفاق کیا۔ قائد اعظم کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی توہین کی جائے۔ مراد یہ تھی کہ مولانا کو کانگریس نے جس طرح مسلمانانِ ہند کے نمائندے کے طور پر کانگریس کی صف اول میں جگہ دی تھی (بعد میں کانگریس کے صدر بھی رہے) اس سے وہ دنیا کو اور ہندوستان کے مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتی ہے کہ دیکھیے ہماری جماعت کس قدر تعصب سے پاک ہے کہ ایک مسلمان کو پارٹی کے صدر کا مقام دے دیا ہے۔ یہ محض دکھاوا تھا دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے۔ مولانا کو کانگریس میں حتمی فیصلے کرنے کا اختیار نہ تھا۔ قیام پاکستان کے زمانے میں اور اس کے بعد تو مولانا کی بے بسی کا سب کو

علم ہے۔ دہلی میں مسلمانوں کا قتلِ عام جاری تھا لیکن مولانا ایک بے بس تماشائی تھے۔ دنیا کو دکھانے کے لیے پنڈت نہرو نے بھی بظاہر دہلی کے قتلِ عام کو روکنے کی بہت جدوجہد کی لیکن بے گناہ مسلمانوں کا خون بہتا رہا۔ ان کے مکان جلتے رہے۔ عصمت مآب خواتین بے آبرو ہوتی رہیں۔ پنڈت جی صرف شور مچاتے رہے، ورنہ کانگریس میں پنڈت جی کا جو مقام اور اثر ورسوخ تھا اس کے پیش نظر ان کی ایک آواز پہ دہلی کے مسلمانوں کی جان بخشی ہو سکتی تھی۔

غالباً مولانا ابوالکلام آزاد نے قیام پاکستان کے بعد احساس کیا کہ ان کے خیالات غلط تھے، سچ وہی تھا جو قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ ہندو مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں اور ہندو اکثریت کے دورِ حکومت میں ہندوستان کے مسلمان بے وقعت اور بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔

آزادیٔ ہند کے بعد.... شورش کاشمیری نے، جو بذاتِ خود کٹر احراری تھے لکھا کہ جب دہلی میں امن قائم ہو گیا اور احراریوں کا ایک وفد مولانا سے ملاقات کے لیے پہنچا تو مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں نصیحت کی کہ اب مسلمانوں کا ایک الگ ملک بن چکا ہے۔ آپ سب کو چاہیے کہ اس کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں اور اس کی بھلائی کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

مولانا نے اپنی خودنوشت بھی تحریر کی تھی مگر ساتھ۔۔ یہ وصیت کی تھی کہ ان کی وفات کے بعد ہی اس کو منظرِ عام پر لایا جائے، ایک طویل عرصہ گزر گیا اور دنیا نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالتِ زار بھی دیکھ لی۔ تیس سال کے طویل عرصے کے بعد جب مولانا کی خودنوشت سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ مولانا نے یہ احساس کر لیا تھا کہ کانگریس اور ہندوؤں کے بارے میں ان کے خیالات خوش فہمی اور غلط فہمی کے سوا کچھ نہ تھے۔ مولانا کی خودنوشت پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اپنی ساری سابقہ زندگی پر پچھتاوا تھا۔ ایک احساسِ جرم تھا جو انہیں بے چین کر رہا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی، نظریات اور بعد از مرگ خیالات پڑھنے کے بعد ایک اصول طے ہو جاتا ہے کہ ایک عالمِ دین کو دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینی چاہیے۔ سیاست میں آلودہ ہونے سے دامن بچانا چاہیے۔ ہر عالم اور فاضل میں سیاسی بصیرت نہیں ہوتی۔ اس لیے جب وہ اپنے شعبے کو نظر انداز کر کے سیاست کے میدانِ کارزار میں قدم رکھتے ہیں تو قدم قدم پر غلطیاں کرتے ہیں۔ علما کا فرض دین کی خدمت اور تبلیغ کرنا ہے، سیاست کے سمندر میں پیراکی کرنا انہیں راس نہیں آتا اور نہ ہی زیب دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور دیگر علمائے کرام نے سیاسی میدان میں خطابت، زورِ قلم اور ذہانت کا مظاہرہ تو کیا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی نہ کر سکے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی سیاست کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ راقم الحروف سے لگ بھگ سالو سال قبل انہوں نے ایک انٹرویو میں سوال کے جواب میں کہا تھا کہ اسلامی معاشرہ اور نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے سیاسی اقتدار ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ نظام میں تبدیلی نہیں لا سکتے۔ نظام کو تو وہ نہیں بدل سکے لیکن دین کی خدمت کی طرف سے بھی غافل نہ ہوئے۔ اسلام کی تبلیغ کے لیے ان کی تحریریں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں نے دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونے کے بعد عالمِ اسلام کے علاوہ یورپ اور امریکا کے غیر مسلموں کو بھی اسلام سے متعارف کرایا۔ افسوس کہ مولانا ابوالکلام یہ بھی نہ کر سکے۔ سیاست میں زندگی بسر کر دی۔ وہ کام نہ کر سکے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔

آج کے پاکستان پر نظر ڈالیے تو اس سے بھی زیادہ مایوس کن صورتِ حال نظر آتی ہے۔ ہمارے کم و بیش تمام قابلِ ذکر علمائے کرام نے دین سے منہ موڑ کر دنیا کو اپنا لیا ہے۔ سیاسی جماعتیں بنا لی ہیں۔ انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ اسمبلیوں اور وزارتوں میں شامل ہوتے ہیں۔ ہر وہ کام کرتے ہیں جو علمائے کرام کو زیب نہیں دیتا۔ (گو کہ ایسے علما بھی ہیں جو واقعی دین کی خدمت کر رہے ہیں)

تو پھر دین اور مذہب کی سیادت اور قیادت کون کرے گا؟ ذرا غور کیجیے کہ اگر حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، داتا فرید گنج بخشؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت معین الدین چشتیؒ بھی سیاست کے میدان کی طرف رجوع کر لیتے تو برصغیر میں کیا آج کوئی مسلمان نظر آتا اور اسلام کا بول بالا ہوتا؟

معاف کیجیے، بات سے بات نکل آئی۔ ہم تو استنبول کے ساحلی ریستوران میں بیٹھے ہوئے خوبصورت منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور فریحہ خانم سے مصروفِ گفتگو تھے۔

فریحہ نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں کو برا نہ لگے تو میں کچھ کہوں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' ہم سب ایک زبان ہو کر بول پڑے۔

''کتنی عجیب بات ہے کہ ہم لوگ اتنی دیر سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''

خان صاحب بوکھلا کر بولے۔ ''دراصل ہمارے ملک میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھا جاتا کہ خواہ مخواہ انجان لڑکیوں سے ان کے بارے میں پوچھا جائے یا اپنا تعارف ان سے کرایا جائے۔''

فریحہ ہنسنے لگی۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ چلیے میں پہلے اپنے بارے میں آپ کو بتاتی ہوں۔ میرا نام فریحہ ہے۔ فریحہ ارغلان۔ میرے والد وکیل ہیں۔ میں ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میں بچپن ہی سے ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ڈیڈی مجھے وکیل بنانا چاہتے تھے مگر قانون میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں تو ٹریفک کا قانون بھی ٹھیک سے نہیں جانتی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ مجھے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔''

''ہمیں بھی بتائیے کہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں؟''

وہ ہنسنے لگی۔ ''آپ تو میرا امتحان لینے لگے۔ خیر سنیے، سب سے پہلے تو آپ کو کار کے ضروری کاغذات اور انشورنس اپنے ساتھ رکھنے چاہئیں۔ آپ کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہر وقت ساتھ ہونا چاہیے ورنہ اگر پولیس نے روک لیا تو بہت مشکل ہوگی۔''

''اچھا۔'' ہم سب کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ''اور ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں؟''

''آپ کو چاہیے کہ سیٹ بیلٹ ضرور باندھیں۔ زیبرا کراسنگ پر کوئی ایک راہ گیر بھی گزر رہا ہو تو فوراً کار روک لیں۔ سگنل کا اشارہ کبھی نہ کاٹیں۔ جب سگنل سرخ ہو جائے تو فوراً کار روک لیں۔ سبز لائٹ ہو تو گاڑی چلائیں۔ کار ہمیشہ اپنی لین میں چلائیں۔ تیز رفتار کے لیے پہلی لین ہوتی ہے۔ (ترکی میں بھی امریکا کی طرح رائٹ ہینڈ ڈرائیو کی بجائے لیفٹ ڈرائیو ہے) ہر جگہ سے دوسری کار کو اوورٹیک نہ کیجیے ورنہ پیچھے آنے والی کار سے ٹکرا جائیں گے۔'' پھر اچانک اس نے پوچھا۔ ''آپ کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے؟''

''ہے تو مگر پاکستان کا ہے۔'' بٹ صاحب بولے۔

ہم نے کہا۔ ''ہمارے پاس انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے جیب سے اپنا لائسنس نکال کر دکھایا۔

اس زمانے میں پاکستان سے بیرونِ ملک جانے کے لیے لاہور میں انٹرنیشنل لائسنس بنا دیا جاتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد یورپ اور امریکا نے اس لائسنس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور وہاں ڈرائیونگ کے لیے مقامی لائسنس حاصل کرنا پڑتا تھا جس کا حصول بہت مشکل تھا۔

فریحہ کے ساتھ کافی دیر تک گپ شپ کرنے کی وجہ سے ہم لوگ خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ایک دوسرے ملک میں ہم ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ فریحہ نے کہا۔ ''آپ لوگ بہت چالاک ہیں۔''

''ہم نے کیا چالاکی کی ہے؟''

''آپ نے میرے بارے میں تو سب کچھ معلوم کر لیا مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

ہم نے خان صاحب سے کہا۔ ''یہ قرض آپ ادا کر دیجیے مگر ایسا نہ ہو کہ اپنی تعریف کر دیں اور ہم سب کو سیکنڈ کلاس میں جگہ دیں۔''

خان صاحب سنجیدہ ہو گئے۔ ''خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جو کچھ بتاؤں گا سچ بتاؤں گا۔ کسی کے بارے میں ڈنڈی نہیں ماروں گا۔''

خان صاحب نے کھنکھار کر گلا صاف کیا تو بٹ صاحب خاموش نہ رہ سکے۔ ''خان صاحب، آپ سے تعارف کرانے کے لیے کہا ہے آپ تو یوں گلا صاف کر رہے ہیں جیسے دادرا یا ٹھمری سنائیں۔''

خان صاحب ان کو گھور کر رہ گئے۔

سب سے پہلے انہوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میں ساؤنڈ انجینئر ہوں۔ لاہور میں رہتا ہوں۔ شادی شدہ ہوں، دو بچے ہیں۔ تیسرا چند مہینے بعد آ جائے گا۔''

فریحہ نے تالی بجا کر کہا۔ ''خوش آمدید۔''

اس کے بعد بٹ صاحب کی باری آئی۔ ''یہ فرخ بٹ صاحب ہیں۔''

''یہ کیا کرتے ہیں؟'' فریحہ نے پوچھا۔

''یہ کچھ نہیں کرتے۔ بس عیش کرتے ہیں۔''

''کوئی کام کیے بغیر؟''

''یہ دراصل زمیندار ہیں۔''

"آپ کا مطلب ہے کسی جگہ کے نواب ہیں؟"
"چھوٹے موٹے نواب کہہ لیجیے۔ ان کی بہت سی زرعی زمینیں ہیں جن سے انہیں خوب آمدنی ہوتی ہے اور ٹھاٹ سے رہتے ہیں۔"

"مگر ٹھاٹ سے کیسے رہتے ہیں۔"

"اپنی زمینیں یہ ٹھیکے پر دے دیتے ہیں۔ کسان محنت کرتے ہیں۔ کاشت کرتے ہیں۔ جو منافع ملتا ہے اس میں سے ایک بڑا حصہ یہ وصول کر لیتے ہیں۔ باقی رقم میں سے اپنا حصہ ٹھیکے دار وصول کرتا ہے اور تھوڑا بہت ان غریب کسانوں کو ملتا ہے جو سارے سال محنت کر کے فصلیں اگاتے ہیں۔"

فریحہ مرعوب ہو گئی۔ دوبارہ بٹ صاحب کو غور سے دیکھا۔ وہ سرمئی سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ قیمتی ٹائی لگائے کلائی میں ایک قیمتی گھڑی پہنے ہوئے تھے۔ دیکھنے میں وہ بہت خوبصورت اور شاندار نظر آتے تھے۔ اور کیوں نہ ہوں، کشمیری تھے اس لیے سرخ و سفید رنگت تھی۔ جسم بھی متناسب سے کچھ ہی زیادہ تھا۔ فریحہ کے ساتھ ان کا ہم لوگوں نے بھی تنقیدی جائزہ لیا تو خاصے مرعوب ہو گئے۔

فریحہ نے کہا۔ "واقعی یہ تو کوئی لارڈ ہی لگتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب آج سے آپ کا نام لارڈ بٹ ہو گیا۔"

اتنی دیر میں دو اسمارٹ نوجوان پتلون قمیص اور سوئٹر پہنے ہوئے نمودار ہوئے اور "السلام علیکم" کہنے کے بعد ہمارا جواب سننے سے پہلے ہی انہوں نے ساز بجانے شروع کر دیے۔ ترکی موسیقی کے بارے میں ہم آج تک فیصلہ نہیں کر سکے کہ یہ کس ملک کی موسیقی سے ملتی ہے۔ ہمیں تو اس میں عربی موسیقی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہماری بیگم کہتی ہیں کہ ترکی موسیقی ہمارے قبائلی علاقوں کی موسیقی سے ملتی جلتی ہے۔ نادیہ کا خیال ہے کہ اس میں پنجابی اور سندھی موسیقی کا انداز ہے۔ آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ترکی موسیقی بہت سادہ اور دلکش ہوتی ہے۔ ہمارے پکے گانوں کی طرح اس میں تانیں اور پلٹے نہیں ہوتے۔ عام طور پر بہت کم سازوں کے ساتھ بجائی جاتی ہے۔

"لیجیے، مراثی بھی آ گئے" بٹ صاحب نے اردو میں کہا۔

"ایسا تو نہ کہو۔" ہم نے کہا۔ "یہ سازندے ہیں اور ساز بجا کر پیسا کماتے ہیں۔ کوئی کچھ دے دے تو شکریہ، کچھ نہ دے تو بھی شکریہ۔"

فریحہ نے بتایا کہ ترکی میں بھی عام لوگ موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ عرب بھی موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتے یہاں تک کہ ٹیکسیوں میں بھی نغمے بجتے رہتے ہیں۔ اٹلی میں بھی ریستورانوں میں ساز بجانے والے آ جاتے ہیں۔ لوگ فرمائش کر کے اپنی پسند کی میوزک سنتے ہیں ورنہ ہر انہیں کچھ نہ کچھ ضرور پیش کرتا ہے۔ وہ دینے والوں کا اور نہ دینے والوں کا بھی شکریہ ادا کر کے کسی اور ریستوران میں جا کر ساز بجانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے دوست رشید جاوید نے روم میں جب یہ منظر دیکھا تو کہا کہ "یار ہم نے اور تم نے تو آج تک جھک ہی ماری ہے اگر گٹار یا کوئی اور ساز بجانا سیکھ لیتے تو چلتے پھرتے کافی کما لیتے ہیں۔"

فریحہ بٹ صاحب کے بارے میں سن کر بہت مرعوب ہوئی اور اس کے بعد بٹ صاحب کو لارڈ بٹ صاحب ہی کہتی رہی۔ اتنی دیر تک ہم لوگوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ نام کے ساتھ صاحب ضرور لگاتی تھی کیونکہ ہم اس کے نام کے ساتھ صاحبہ کہتے تھے۔

اس کے بعد ہمارا مختصر تعارف کرایا گیا کہ رائٹر ڈائریکٹر ہیں اور فلمیں بھی بناتے ہیں۔ فریحہ یہ سن کر خوش ہوئی اور ہمارے کوٹ کے کالر کو چھو کر کہنے لگی "میں نے آج تک کوئی فلم رائٹر اور ڈائریکٹر اتنے قریب سے نہیں دیکھا۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی بہت زیادہ عزت کی جاتی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے تو انہیں چھو بھی لیا۔ آج کا دن کتنا اچھا ہے۔"

ہمارے ساتھیوں نے ہمیں رشک آمیز نظروں سے دیکھا کیونکہ ان کے لیے تو ہم گھر کی مرغی دال برابر تھے بلکہ اس سے بھی گئے گزرے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ امریکا اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں فلم سازوں، فلمی اداکاروں اور لکھنے والوں کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ وہاں کا میڈیا ان لوگوں کو بہت اہمیت دیتا ہے اور انہیں ایک غیر مرئی حیثیت دیتا ہے۔ ہم جب پہلی مرتبہ امریکا گئے تو ہماری بیگم اور دونوں بچیاں بھی ساتھ تھیں۔ ہم لندن سے نیویارک اور پھر وہاں سے واشنگٹن پہنچے تھے جس جس کو معلوم ہوا کہ میرا تعلق لکھنے لکھانے، فلمی دنیا سے ہے وہ سب نہایت عزت دینے لگے

تھے۔ خیر، آج کا زمانہ تو بالکل ہی مختلف ہے۔ مغربی ممالک میں مسلمانوں، خاص طور پر پاکستانیوں کو بہت زیادہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو بہت دکھ ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ہم لوگوں کے کارنامے اس انداز سے میڈیا میں پیش کیے جاتے ہیں کہ واقعی شرم آتی ہے کہ ہر بری چیز اور برے کاموں کے حوالے سے ہی ہم پاکستانیوں کی خبریں کیوں سامنے آتی ہیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا کہ پاکستان اور کسی پاکستانی کے بارے میں کوئی ایسی خبر دیکھنے اور پڑھنے کو آنکھیں ترس گئیں جسے دیکھ کر خوشی اور فخر کا احساس ہو....

کیا زمانہ تھا جب ہماری ہاکی اور کرکٹ ٹیموں کے کارنامے ساری دنیا میں مشہور تھے۔ ہمارے کھلاڑی، پہلوان اور ایتھلیٹ اپنی کامیابیوں سے سب کو حیران کر دیا کرتے تھے۔ فضل محمود، حفیظ کاردار، عمران خان، وسیم اکرم، وقار یونس، جاوید میاں داد، ظہیر عباس کس کس کا نام گنوائیں۔ ہاکی میں ساری دنیا میں پاکستانی کھلاڑیوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جہانگیر خان کو اسکواش میں وہی مقام حاصل تھا جو محمد علی کو باکسنگ میں حاصل تھا۔ پاکستانی کھلاڑیوں کی وڈیو فلمیں بنا کر یورپ اور امریکا کے کھلاڑیوں کو دکھائی جاتی تھیں تاکہ وہ ان سے تکنیک اور مہارت سیکھ سکیں۔

اس کے بعد زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب کچھ الٹ گیا۔ اب پاکستانی ہونا دنیا بھر میں ایک "جرم" سمجھا جاتا ہے۔

ہم یہ بتا رہے تھے کہ واشنگٹن میں جب ہم نے اپنے سبز پاسپورٹ امیگریشن افسر کے سامنے رکھے تو اس نے سب سے پہلے ہمارے پاسپورٹ کو کھول کر دیکھا۔ اس پاسپورٹ کے ساتھ پانچ پاسپورٹ اور بھی تھے جن میں دنیا کے مختلف ممالک کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ پاسپورٹ دیکھ کر وہ حیران ہوا یا اس کو یقین ہی نہیں آیا۔ اس نے تازہ ترین پاسپورٹ کھولا اور پہلے صفحے پر نظر پڑی۔ اس نے امریکی تلفظ میں ہمارا نام پڑھا پھر نیچے پیشہ دیکھا جس پر لکھا ہوا تھا "فلم پروڈیوسر" اس نے جب نظر اٹھا کر ہمیں دیکھا تو اس کے چہرے کے تاثرات اور لب و لہجہ بدل چکا تھا۔

"سر، آپ کس زبان میں فلمیں بناتے ہیں۔ کیا میں نے آپ کی کوئی فلم دیکھی ہے؟"

"شاید نہیں۔" ہم نے کہا۔ "میں پاکستان میں فلمیں بناتا ہوں۔ میں نے دوسرے ملکوں میں بھی فلمیں بنائی ہیں۔ تھائی لینڈ، ہانگ کانگ، سری لنکا، فلپائن، انگلینڈ، فرانس

گرجدار چالیسیہ

(Roaring Forties)

وہ تند و تیز ہوائیں جو نصف کرۂ جنوبی میں 140 اور 50 درجہ عرض بلد کے درمیان چلتی ہیں۔ چونکہ یہ 140 عرض بلد سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں تندی و تیزی کے علاوہ مہیب گرج بھی ہوتی ہے اس لیے ان ہواؤں کو گرجدار چالیسیہ کہتے ہیں۔ یہ ہوائیں منقلب تجارتی ہواؤں کی ایک قسم ہیں۔ شمالی نصف کرے میں یہ ہوائیں چونکہ زمین اور پہاڑوں سے ہو کر آتی ہیں اس لیے ان کا زور رکاوٹ کے باعث کم ہو جاتا ہے اس کے برعکس جنوبی نصف کرے میں خشکی کا وجود کم ہے اور ہر جگہ سمندر ہی سمندر ہے ان ہواؤں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں اس لیے یہ ہوائیں یہاں بڑی تیزی سے چلتی ہیں اور ان میں ایک مہیب گرج بھی ہوتی ہے۔ ان ہواؤں کا رخ اگرچہ شمال سے جنوب کی طرف ہوتا ہے، لیکن زمین کی گردش کے باعث ان کا رخ مشرق کی طرف ہو جاتا ہے۔

گردباد (Cyclone)

وہ تند و تیز ہوائیں جو مدوّر اور گول خطوط متساوی الحرارت کے اندر چلتی ہیں۔ ان میں ہوا کا دباؤ مرکز میں کم ہوتا ہے اور چاروں طرف بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے۔ زمین کی محوری گردش کی وجہ سے یہ ہوائیں شمال نصف کرے میں اپنی دائیں جانب اور جنوبی نصف کرے میں بائیں جانب گھوم جاتی ہیں۔ ان ہواؤں کی حرکت شمالی کرے میں گھڑی کی سوئیوں کے مخالف اور جنوبی نصف کرے میں ان کے مطابق ہوتی ہے۔ اس میں دو قسم کے گردباد شامل ہوتے ہیں۔ ایک وسطی گردباد جو منطقہ معتدلہ میں پیدا ہوتے ہیں، دوسرے مداری گردباد جو منطقہ حارہ میں نمودار ہوتے ہیں۔

مرسلہ: نجمہ فصیح، لاڑکانہ

بہت سے ملکوں میں۔ میں اردو فلمیں بناتا ہوں۔"
وہ مزید حیران ہوگیا۔ "آپ کا مطلب ہے انڈین لینگویج؟"
"جی نہیں، انڈیا والوں کی زبان ہندی ہے۔ ہم اردو میں فلمیں بناتے ہیں۔"
"کیا آپ یہاں بھی فلم بنانے آئے ہیں؟"
"جی نہیں۔" ہم نے بہانہ بنایا۔ "دراصل ابھی ہم لوکیشنز دیکھنے آئے ہیں۔ مختلف شہروں اور مشہور مقامات پر جائیں گے۔ پھر فیصلہ کریں گے کہ کن جگہوں پر شوٹنگ کرنی ہے۔"
"گڈ لک۔" اس نے کہا اور ہم سب کے پاسپورٹوں پر سات مہینے کے ویزا کی مہر لگادی۔ یہ ہم نے پہلی بار دیکھا ورنہ انگلستان میں تو پوچھے بنا چھ مہینے کا ویزا لگادیا کرتے تھے جس کے لیے کبھی ویزا آفس جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ان دنوں ہیتھرو ائرپورٹ پر ہی انگلستان کا ویزا لگادیا جاتا تھا۔ یہ رعایت صرف ہمارے لیے ہی مخصوص نہ تھی بہت سے دوسرے پاکستانی بھی لندن میں ائرپورٹ پر پہنچ کر ہی ویزا لگواتے تھے۔ اکثر لوگوں کو ویزا مل جاتا تھا مگر ایک یا دو ماہ کے لیے۔ بعض حضرات کو چھ مہینے کا ویزا بھی مل جاتا تھا۔ لیکن یہ 9/11 سے پہلے کی باتیں ہیں اس کے بعد تو سبھی کچھ بدل گیا ہے۔ ویزا حاصل کرنے کا مسئلہ اس قدر مشکل اور طویل بنادیا گیا ہے کہ مہینوں گزر جانے پر بھی انٹرویو کے لیے اسلام آباد نہیں بلایا جاتا ہے (پہلے تو قونصل جنرل لاہور کے دفتر سے ویزا مل جاتا تھا) اس کے بعد مغربی ممالک کے ائرپورٹس پر جس توہین آمیز انداز میں تلاشی لی جاتی ہے وہ ہمیں وارا نہیں کھاتی۔ اس لیے یورپ، امریکا اور کینیڈا کے سفر کرنے کا ارادہ ہی ترک کردیا ہے۔ دنیا میں بہت سے خوبصورت اور قابلِ دید ملک ہیں۔ اگر سیر کرنا ہی مقصود ہے تو دنیا بہت بڑی ہے۔ البتہ مجبوریوں کے تحت جن لوگوں کے لیے جانا ضروری ہے ان کا معاملہ علیحدہ ہے۔ یہ تفصیل محض وضاحت کی غرض سے بیان کی گئی ہے۔
فریحہ کو جب یہ بتایا گیا کہ ہم غیر شادی شدہ ہیں تو وہ شرارت انگیز انداز میں مسکرائی، پھر پوچھا۔ "آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟" پھر خود ہی کہنے لگی "مگر آپ تو پاکستان میں رہتے ہیں۔ آپ کو شادی کرنے کی کیا جلدی ہے؟ مگر فلرٹ تو کرتے ہوں گے۔"
ہمارے بولنے سے پہلے ہی خان صاحب نے کہا "ایسی بات نہیں ہے۔ یہ بہت شریف آدمی ہیں۔ ... والوں کے بارے میں جو عام تاثر ہے وہ بھی صحیح نہیں ...
فریحہ مسکرائی۔ "چلیے۔ آپ کی گواہی مان لی۔ مگر ... بھی یہ تو بتایئے کہ آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں ... حالانکہ آپ تو زندگی میں سیٹ ہوچکے ہیں۔"
ہم نے کہا۔ "برا نہ مانیں تو ایک سوال پوچھ ... ہوں؟"
"ضرور پوچھیے۔"
"کیا آپ کی شادی ہوچکی ہے؟"
وہ ہنس پڑی۔ "میں نے تو ابھی اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی۔"
بٹ صاحب نے کہا۔ "ہمارے ملک میں لڑکیوں کی شادی تعلیم کے دوران میں بھی ہوجاتی ہے۔ ایسی لڑکیاں شادی کے بعد اپنی تعلیم مکمل کرلیتی ہیں۔"
فریحہ سوچ میں پڑ گئی، پھر کہا۔ "ہمارے ملک میں طریقہ مختلف ہے۔ لڑکی تو شادی کے بعد بھی تعلیم مکمل کرسکتی ہے مگر لڑکوں کے لیے زندگی میں سیٹ ہونا ضروری ہے۔"
"ظاہر ہے بے روزگار آدمی سے تو کوئی اپنی بیٹی نہیں بیاہے گا۔"
"یہ بات نہیں ہے۔" فریحہ نے کہا۔ "ہمارے ملک میں لڑکے اسی وقت شادی کرتے ہیں جب وہ اپنا گھر مکمل کرلیں۔"
خان صاحب نے کہا۔ "بھئی یہ تو بہت کڑی شرط ہے۔ گھر بنانا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ اس کے لیے تو بہت زیادہ دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔"
فریحہ بولی۔ "آپ سمجھے نہیں۔ گھر بنانے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے لڑکا اپنا ذاتی گھر بنائے۔"
"دیکھیے، آپ نے ہمارا سوال نظر انداز کردیا کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟ آپ کے لیے تو گھر بنانا ضروری نہیں ہے۔"
وہ خاموش رہی مگر زیرِلب مسکراتی رہی۔ پھر بولی۔ "میری منگنی ہوچکی ہے۔"
ہم سب نے خوش ہوکر پوچھا۔ "کس سے، کون ہے وہ۔ منگنی آپ نے خود کی ہے یا لو میرج ہوگی؟"
"ہمارے یہاں ماں باپ رائے تو ضرور دیتے ہیں مگر لڑکوں اور لڑکیوں کو آزادی ہے کہ وہ اپنی پسند سے شادی کرلیں۔"
"کیا آپ نے اپنی مرضی سے منگنی کی ہے؟"
"جی ہاں لیکن اس میں والدین کی رضامندی بھی شامل ہے۔"
"آپ کے منگیتر استنبول ہی میں رہتے ہیں؟"
"جی نہیں۔ نہ تو میں استنبول میں رہتی ہوں اور نہ عمر۔ میں تو ازمیر کے نزدیک ایک شہر کی رہنے والی ہوں۔ تعلیم ازمیر میں ہی مکمل کی ہے۔ عمر استنبول کے رہنے والے ہیں مگر آج کل وہ قاہرہ گئے ہوئے ہیں، اپنے کاروبار کے سلسلے میں۔ انہوں نے قالینوں کا بزنس شروع کیا ہے۔"
"تو کیا وہ قاہرہ ہی میں رہیں گے۔ میرا مطلب شادی کے بعد؟"
"ارے نہیں۔ انہوں نے استنبول میں کرائے پر فلیٹ لیا ہے۔ اس کو فرنش کرنے میں مصروف ہیں۔ فرنیچر، قالین پردے، کچن کا تمام سامان۔ جب تک یہ سب چیزیں گھر میں نہیں ہوں گی وہ مکمل گھر کیسے بنے گا؟"
بٹ صاحب چپ نہ رہ سکے "فرنیچر وغیرہ کی کیا ضرورت ہے۔ شادی میں آپ کے جہیز میں بھی تو سامان آئے گا۔"
"اوہ" وہ مسکرائی۔ "میں جانتی ہوں ہندوستان اور پاکستان میں شادی کے وقت لڑکی کے ماں باپ کو گھر کا فرنیچر اور دوسرا سامان بھی دینا پڑتا ہے۔"
"فرنیچر ہی نہیں۔ ائرکنڈیشنڈ، کپڑے دھونے کی مشین، سارے گھر کا اور کچن کا سامان، برتن، ٹی سیٹ، ڈنر سیٹ اور کبھی کبھی موٹر کار بھی۔"
فریحہ نے حیرت سے ہمیں دیکھا۔ "سارا سامان لڑکی کے والدین دیتے ہیں؟"
"دینا پڑتا ہے۔ کئی شادیوں میں تو لڑکے والے ایک فہرست بنا کر دے دیتے ہیں۔ اگر فہرست کے مطابق سامان نہ ہو تو شادی نہیں ہوسکتی۔"
فریحہ اور زیادہ حیران اور پریشان ہوگئی۔ "غریب لوگ یہ سب کیسے دے سکتے ہیں؟"
"جو نہیں دے سکتے ان کی بیٹیاں گھروں میں بیٹھے بیٹھے ہی بوڑھی ہوجاتی ہیں۔"
فریحہ کی حیرت بالکل بجا تھی چونکہ ہم بعد میں بھی جب ترکی گئے تو معلوم ہوا کہ جب تک کوئی لڑکا اپنے گھر کی سب چیزیں فراہم نہ کرلے، شادی نہیں ہوسکتی۔ وہ منگنی کرلیتے ہیں اور پھر گھر بسانے کے لیے سامان اکٹھا کرنے میں

مصروف ہوجاتے ہیں۔ ترکی میں عموماً خواتین بھی کام کرتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکا کسی جگہ کام کرتا ہے اور منگیتر کسی اور شہر میں برسرِ روزگار ہے۔

فریحہ نے ایک بار پھر اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"تیسکر اندرم"۔

ہم سب حیران ہوکر اس کو دیکھنے لگے۔ "میں ترکی زبان میں آپ کا شکریہ ادا کررہی ہوں۔"

"مگر کس بات کا۔"

"آپ سب نے مجھے اتنا وقت دیا۔ مجھے بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ پاکستان سے اب مجھے اور زیادہ محبت ہوگئی۔ میں اس خوبصورت ملک کے خوبصورت لوگوں سے ملنے ضرور آؤں گی جب بھی موقع ملا۔ میری فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔ مجھے ہوٹل سے اپنا سامان لے کر ائرپورٹ جانا ہے۔ سڑکوں پر رش زیادہ ہو تو بعض اوقات فلائٹ مس ہوجاتی ہے۔"

بٹ صاحب بولے۔ "بہت بہت شکریہ فریحہ۔ دراصل تم نے اپنا قیمتی وقت دے کر ہماری عزت افزائی کی ہے۔"

"اتنے موٹے موٹے الفاظ نہ بولیے۔ ہم سب کو بہت خوشی ملی ہے اور معلومات بھی۔ مجھے تو فلائٹ کے انتظار میں وقت گزارنا تھا۔ آپ لوگ نہ ملتے تو کسی پارک، شاپنگ سینٹر، یا سنیما میں جا کر بیٹھ جاتی۔ آپ کا مجھے وقت دینے کا شکریہ۔"

ہم سب نے بیک آواز کہا۔ "فریحہ خانم، آپ کے ملنے اور مل کر واپس جانے کا شکریہ۔" وہ ہنستی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہوگئی۔ ایک اجنبی ملک، ایک ایسی بے تکلف اور بے غرض خوبصورت لڑکی کا ہمارے ساتھ وقت گزارنا ایک پُرلطف اور تجربہ تھا۔ حیرت تو اس بات کی ہے کہ بٹ صاحب نے اس لڑکی پر عاشق ہونے کی بھی کوشش نہیں کی۔ فریحہ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس میں بناوٹ نہیں سادگی اور بے تکلفی کے جذبات تھے۔ وہ اپنے مغربی لباس کے باوجود ایک مشرقی لڑکی تھی۔ جاتے ہوئے اس نے بلند آواز میں کہا "گولے گولے" بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ترکی زبان میں ہمیں خدا حافظ، الوداع کہہ رہی تھی۔

بٹ صاحب نے کہا۔ "بھئی یہ تو جاتے جاتے گولہ باری کرگئی۔"

یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ ترک موسیقی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اندرونِ شہر کے گھروں میں دکانوں میں ہر جگہ بلند آواز سے موسیقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بعض اوقات تو ایک شور کی کیفیت اختیار کرلیتا ہے مگر ترک اس شوروغل پر ناراضی کا اظہار نہیں کرتے اور کبھی آواز کم کرنے کا کہتے ہیں نہ موسیقی بند کرنے کو کہتے ہیں۔ بس ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اونچی آواز میں موسیقی بجانے پر ہمارے ہاں لڑائی جھگڑے اور فساد بھی ہوجاتے ہیں۔ خدا جانے ترکوں کی موسیقی سے محبت کا سبب ہے یا ان کی خوش مزاجی ہے۔ ہوسکتا ہے ترکوں میں برداشت کی قوت ہم سے کہیں زیادہ ہو۔

ہم لوگ چائے کافی وغیرہ پیتے رہے تھے اس لیے بھوک لگ رہی تھی۔

ساحل پر کچھ دور جا کر ایک ریستوران تھا جس کی فریحہ نے بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ استنبول آ کر مجھے آجیہ کا کھانا کھایا تو سمجھے استنبول میں کچھ بھی نہیں کھایا۔ استنبول کے ہر شخص نے اس ریستوران کے کھانے کی بہت تعریف کی۔ ایک صاحب تو کہنے لگے کہ اگر آپ نے آجیہ میں کھانا نہیں کھایا تو سمجھیے کہ آپ استنبول آئے ہی نہیں۔ بٹ صاحب بولے "پھر تو وہاں چلنا ضروری ہے ورنہ استنبول آنا بے کار جائے گا۔"

آجیہ یا عاجیہ ریستوران کی عمارت ہم نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے دیکھی تھی۔ کسی زمانے میں یہ موسم گرما میں چھٹیاں گزارنے کے کام آتی تھی۔ خوبصورت اور شاندار عمارت۔ سامنے باسفورس، جس طرف دیکھیے خوبصورت مناظر، سمندر میں گزرتے ہوئے بحری جہاز۔ سمندر کے پانی پر تیرتے اور اُڑتے ہوئے سفید پرندے۔ واقعی یہ آرام کرنے کے لیے بہت اچھی جگہ ہوگی۔ اب اس عمارت کو ایک پُرتکلف اور شاندار ریستوران میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ اگر ریستوران میں ٹیرس یا بالکونی میں آپ کی نشست ہو تو استنبول کے دونوں حصوں کو ملانے والا خوبصورت پل اور وہاں سے گزرتے ہوئے ٹریفک کی قطاریں بھی نظر آتی ہیں۔

خان صاحب نے بالکونی میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر جھانکا اور پھر کہنے لگے۔ "آفاقی صاحب اس جگہ بیٹھ کر تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ریستوران میں کھانے کے پیسے وصول ہوگئے۔"

مرزا صاحب مسکرائے۔ "خان صاحب یہ تو آپ کو اس وقت پتا چلے گا جب بل آئے گا۔" پھر کہا۔ "استنبول کے کھانوں کی کیا بات ہے، دنیا میں ایسے لذیذ کھانے کہیں اور نہیں ملتے۔"

بٹ صاحب فوراً چوکنا ہوگئے۔ بولے۔ "مرزا صاحب کبھی لاہور آئیں گے تو ہم آپ کو بتائیں گے کہ کھانے کس قدر مزیدار اور سیکڑوں قسم کے ہوتے ہیں۔ اس لیے تو لاہور کے لوگ اتنے تنومند ہوتے ہیں۔"

بٹ صاحب اور خان صاحب تو اس تعریف پر پورے اترتے لیکن ہم جیسا دھان پان آدمی اس بات کا ثبوت تھا کہ لاہور والے کتنے تندرست ہوتے ہیں۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایک قدآور ترک ہمارے پاس آ کر کھڑا ہوگیا، یہ ریستوران کا اسٹیورٹ یا ویٹر تھا۔ دیکھنے میں بہت بارعب اور بااثر آدمی نظر آتا تھا۔ سیاہ سوٹ، سفید قمیص، کالی بوٹائی، کالے جوتے۔ آتے ہی اس نے کہا۔ "السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام" ہم نے کورس میں جواب دیا۔

"آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟" وہ اچھی خاصی انگریزی بول رہا تھا۔

بٹ صاحب نے چپکے سے کہا۔ "یہ ویٹر سے زیادہ ڈپلومیٹ لگتا ہے۔ کتنا شاندار ویٹر ہے۔"

ہم نے ان کی کانا پھوسی کو نظر انداز کرتے ہوئے سب ساتھیوں سے پوچھا۔ "بتائیے کیا آرڈر ہوگا۔"

خان صاحب بولے۔ "آفاقی صاحب پہلے اس سے مینو تو منگائیے۔ پتا تو چلے کہ یہاں کیا کیا ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قیمتیں کتنی ہیں۔ مجھے تو یہ بہت مہنگا اور رئیسانہ ہوٹل لگتا ہے۔"

ویٹر اس دوران میں خاموش کھڑا رہا مگر ایک زیرِلب مسکراہٹ اس کے چہرے پر نظر آرہی تھی۔

ہم نے کہا۔ "مہربانی سے ہمیں مینو لا دیں۔"

"تھینک یو سر۔" وہ جانے کے لیے مڑا مگر پھر پلٹ کر ہم سے مخاطب ہوا۔ "معاف کیجیے سر، کیا آپ پاکستانی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

اس نے بڑے خلوص سے ہم سب سے ہاتھ ملایا پھر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ خوبصورت مینو کے ساتھ نمودار ہوا تو بہت خوش نظر آرہا تھا۔ شاید ہم پاکستانیوں سے ملاقات کے

فتن

فتنہ کی جمع۔ مراد فتنہ وفساد۔ باغیانہ شورشیں۔ جنگ وجدل ہنگامے، بلوے۔

اس سے جنگ وجدل کے وہ واقعات مراد ہوتے ہیں جن کے متعلق آنحضرتؐ نے اپنے بعد واقع ہونے کی پیش گوئیاں کی ہیں۔ کتب احادیث میں باب الفتن کے نام سے ایک خاص باب درج ہے جس میں ان واقعات کے متعلق آنحضرتؐ کی پیش گوئیاں جمع کی گئی ہیں۔

الفتن۔ جس میں سے چند احادیث ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میری اُمّت کی ہلاکت قریش کے چند لڑکوں کے ہاتھ پر ہوگی۔

سفینہؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہؐ نے خلافت تیس سال رہے گی پھر بادشاہی ہوجائے گی۔ سفینہؓ کہتے ہیں۔ گن لو۔ ابوبکرؓ کی خلافت دو سال، عمرؓ کی خلافت دس سال۔ عثمانؓ کی خلافت 12 سال اور علیؓ کی خلافت چھ سال۔ ثوبان سے روایت ہے کہ فرمایا آنحضرتؐ نے جب میری اُمّت میں تلوار رکھی جائے گی تو قیامت تک اس سے نہ اٹھائی جائے گی اور قیامت نہ آئے گی تاوقتیکہ میری اُمّت کے قبائل بت پرستی نہ کرنے لگ جائیں۔ اور میری امت میں.... تیس کذاب پیدا ہوں گے جن میں سے ہر ایک اپنے نبی اللہ ہونے کا گمان کرے گا۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اور برابر ایک جماعت میری اُمّت میں سے برملا حق پر قائم رہے گی۔ کوئی مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آئے۔

مرسلہ: نواب احمد، پشاور

اقتباس: اسلامی انسائیکلو پیڈیا

بعد وہ خوش ہو گیا تھا۔

مینو ترکی میں تھا جسے پڑھنے کی ذمے داری مرزا صاحب کے سپرد کی گئی۔ وہ بھی ترکی زبان کے ماہر تو نہیں تھے اس لیے ہجے کر کر کے انہوں نے بڑی مشکل سے مینو پڑھا۔ جس جگہ وہ تلفظ میں غلطی کرتے تھے ترک ویٹر بڑے ادب سے اس کی تصحیح کر دیتا تھا۔ سارا مینو سن لینے کے بعد ہم سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ سو کے قریب کھانے پینے کی چیزوں میں سے کیا منگوایا جائے۔ آخر ہم نے یہ حل نکالا کہ ''ڈونر کباب'' منگا لیتے ہیں۔ ڈونر کباب ہم لندن میں کھاتے رہے تھے اور اسی کے اشتیاق میں پکاڈلی کے پچھواڑے اس زمانے کے واحد ترک ہوٹل میں جاتے تھے۔ بعد میں شیورما اور ڈونر کباب اور جگہوں پر بھی دستیاب ہونے لگے تھے۔ مگر اس خیال سے شرم بھی آ رہی تھی کہ انیسویں صدی پرانے تاریخی محل نما ریستوران میں اگر ہم صرف ڈونر کباب ہی کھائیں گے تو ریستوران والے کیا سوچیں گے۔

بٹ صاحب نے ہمارا فقرہ دہرا دیا۔ ''آفاقی صاحب، یہ چاہے کچھ سوچیں ہمیں کیا۔ نہ یہ ہمارا نام جانتے ہیں نہ پتا۔ اور پھر ہم کون سے دوبارہ اس ریستوران میں آئیں گے۔''

بہرحال ہم نے ڈونر کباب لانے کا آرڈر دے دیا۔
جتنی دیر میں کباب آئے ہم لوگ اس بالکونی میں بیٹھ کر استنبول کے خوبصورت مناظر اور مشرق و مغرب کو ملانے والے پل کے ساتھ ساتھ باسفورس کو دیکھتے رہے۔ مرزا مشرف نے ہمیں بتایا کہ اس ریستوران میں ترکی کے مخصوص کھانے پیش کیے جاتے ہیں جو عام ریستورانوں میں نہیں ملتے۔ سیاح اور ترک رئیس ان ہی کھانوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس ریستوران میں آتے ہیں۔ عموماً سمندری مخلوق کے کھانے یہاں آنے والے پسند کرتے ہیں مثلاً مختلف اقسام اور نسلوں کی بھنی ہوئی، تلی ہوئی اور ابلی ہوئی مچھلی۔ جھینگے، مچھلی کا قیمہ نما بھنا ہوا گوشت۔ سمندر میں پائی جانے والی ہر مخلوق کی ڈش آپ کو یہاں مل جائے گی۔ مشکل یہ تھی کہ ہم میں سے کسی کو مچھلی کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں تھی اور مچھلی کسی بھی قسم کی ہو بے حد مہنگی تھی۔

خان صاحب نے مطلع کیا۔ ''یہ قیمت مچھلی کی نہیں دراصل اس ریستوران میں بیٹھنے کا جرمانہ ہے۔'' مٹھاس کی بھی کئی قسمیں تھیں جن میں سے اکثر میں شہد استع[illegible] کیا گیا تھا۔

اس ریستوران کی سب سے انوکھی خصوصیت اس[illegible] جائے وقوع ہے۔ واقعی یہاں بیٹھ کر رات یا دن کے وق[illegible] استنبول کے حسن کو دیکھ سکتے ہیں۔

ہم لوگوں نے ڈونر کباب سے لطف اٹھایا۔ وی[illegible] ہمیں مشروب پینے کی بھی دعوت دے رہا تھا اور چائے، ک[illegible] جوس سمیت دو درجن مشروب کے نام بھی بتا کر کہہ رہا [illegible] کہ کچھ نہ کچھ تو آپ ضرور لیں مگر ہم نے بہت معذرت کی۔

ایک سنہری چھوٹی سی طشتری میں بل آیا۔ بہ[illegible] خوبصورت چھپا ہوا تھا۔ طشتری بھی بڑی خوبصورت تھی۔ [illegible] کی رقم دیکھ کر دل کانپنے لگا۔ لندن کے ریستوران میں ا[illegible] ایک درجن مہمان ڈونر کباب کھاتے اور مشروب بھی پیتے [illegible] شاید اس سے کم ہی بل بنتا۔

خان صاحب نے بل ادا کیا۔ ویٹر باقی رقم لے کر آ[illegible] تو خان صاحب نے ہم سب کے کہنے پر بخشش بھی طشتر[illegible] میں رکھ دی۔ بٹوے میں سے رقم نکالتے ہوئے چند پاکستانی نوٹ بھی نکل آئے۔ ویٹر نے بڑی دلچسپی سے پاکستانی نوٹ دیکھے تو کہنے لگا۔ ''پاکستانی کرنسی؟ کیا میں دیکھ سکتا ہوں۔''

خان صاحب نے سو روپے کا ایک نوٹ ویٹر کو دیا۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ قائداعظم کی تصویر کو بڑی محبت سے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔

''مسٹر جناح!!''

''ہاں۔ یہ ہمارے قائد اعظم ہیں جنہوں نے پاکستان بنایا تھا۔''

''پاکستان کے اتاترک۔''

ہم نے اس کی والہانہ کیفیت دیکھ کر خان صاحب ک[illegible] مشورہ دیا کہ یہ نوٹ یادگار کے طور پر ویٹر ہی کو دے د[illegible] جائے۔ یہ تحفہ لے کر وہ بہت خوش ہوا اور ترکی زبان میں لطفین لطفین، کہتا رہا۔ بعد میں تھینک یو بھی کہا۔ اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوئے تو وہ گُولے گُولے کہتا ہوا ہمیں بیرونی دروازے تک لے گیا۔ گولے کے ذکر سے ڈرنے کی بات نہیں ہے دراصل یہ ترکی میں ''خدا حافظ'' کا متبادل ہے۔ ریستوران سے باہر نکل کر ہم کھڑے کچھ دیر اس شاندار ریستوران کو دیکھتے رہے اور ترک ویٹر کی پاکستان سے محبت کو یاد کرتے رہے۔

(جاری ہے)

سامی

مختار آزاد

ڈار سے بچھڑی کونج کی طرح وہ بھی الگ الگ زندگی گزارنے کی کوشش میں ہیں اور اپنی پہچان کھوتے جارہے ہیں۔ کبھی ان کی زندگی آزاد تھی۔ وہ رنڈیئر کے ریوڑ چرایا کرتے تھے اور خوش رہتے تھے مگر جب شہری زندگی کی چکاچوند نے آنکھوں کو خیرہ کیا تو وہ خواب آلودہ زندگی خواب ہونے لگی اور اب ان کے بڑے بوڑھے پریشان ہیں کہ آنے والا وقت کیسا ہوگا۔

ایک مٹتی ہوئی قوم کی رودادِ پُراثر

سترہ سالہ ایلالی اسپانگ سویڈن کے دور دراز شمالی علاقے جوک موک میں رہتی ہے۔ یہ چھوٹا سا شہر اسکینڈے نیویا کے معروف علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہ خانہ بدوش سامیوں کی ٹھہری ہوئی شہری زندگی کا مستقل پڑاؤ ہے۔

سنہرے بالوں، سرخ و سپید مگر گول چہرے اور نیلی آنکھوں والی یہ میانہ قامت دوشیزہ رینڈیئر پالنے والے نیم خانہ بدوشوں کی نئی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اسکینڈے نیویا کے لاکھوں مربع میل پر مشتمل خطے میں رینڈیئر پالنے والے خانہ

بدوشوں کی تعداد کبھی لاکھوں میں تھی مگر اب یہ صرف ہزاروں کی تعداد میں باقی بچے ہیں۔ جو رہ گئے ہیں، اُن میں سے زیادہ تر غیر سامی تعلیم و تہذیب میں تیزی سے گم ہو کر اپنی روایتی شناخت کھو رہے ہیں۔ ایلا بھی اپنی ہم عمر نسل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح جدید تعلیم اور طرزِ رہائش کی دلدادہ ہے۔ وہ اسکول کی تعلیم مکمل کر کے کالج جانا چاہتی ہے جہاں اسے غیر سامی زبان کی ضرورت پڑے گی۔ ویسے بھی وہ اپنی مادری زبان کے مقابلے میں سوئیڈش کی سرکاری زبان زیادہ روانی سے بولتی ہے۔ اس نے مادری زبان کے بجائے سرکاری زبان میں اسکول کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت غیر سامی بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے گزرا تھا اور اب وہ کالج جارہی تھی جہاں اس کے تقریباً تمام نئے ساتھی غیر سامی نسل سے تعلق رکھنے والے ہوں گے۔ روانگی کے لیے اُس کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔

''میں تعلیم حاصل کر کے دنیا کو دریافت کرنا چاہتی ہوں۔'' اُس چمکتی صبح میں روانگی سے قبل ناشتا کرتے ہوئے ایلا نے یہ کہا تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ ''مگر......'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کچھ سوچتے ہوئے مزید کہا۔ ''اس کے باوجود یہ میری خواہش ہوگی کہ رینڈیئرز بھی ہمیشہ میری زندگی کا حصہ رہیں۔'' یہ سن کر ایلا کے والدین مسکرانے لگے تھے۔

ایلا کے والدین جہاں دیدہ اور قدامت پسند تھے۔ معلوم نہیں اُن کے چہرے پہ مسکراہٹ بیٹی کے جذبات اور رینڈیئرز سے اس کی جذباتی وابستگی کا اظہار سن کر آئی تھی یا اس جیسے دوسرے نوجوان سامیوں کو یاد کر کے جو جدید تعلیم اور اسکینڈے نیوین زبان و تہذیب کے اتنے دلدادہ نکلے کہ اب یہ بات اُن کے لیے شرمندگی کا باعث ہے کہ وہ سامی ہیں۔

ایلا نسلاً سامی ہے۔ وہ سامی جو رینڈیئرز کے بغیر مکمل زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ ہوا، سرد ترین موسم میں زندہ رہنے کے لیے آگ کی طرح رینڈیئرز بھی برفیلے بیابانوں کے ان باسیوں کے زندہ رہنے کا لازمی عنصر ہے مگر وقت کی دھول میں بہت کچھ بدل رہا ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دو تین دہائیوں میں تو تبدیلی کا یہ عمل اور بھی تیز ہوا تھا۔ اب یہ اکیسویں صدی ہے۔ جدت اور تیز رفتاری کی صدی۔

☆☆☆

سامی منطقہ شمالی کے قدیم ترین indigenous باشندے ہیں، جو صدیوں سے اس سرزمین پر خانہ بدوش زندگی بسر کرتے چلے آئے ہیں۔ آج سب سے زیادہ سامی ناروے میں بستے ہیں۔ سوئیڈن، فن لینڈ اور روس کے جزیرہ نما کولا میں بسنے والے سامیوں کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی ہے، کہیں کہیں تو یہ صرف سیکڑوں کی تعداد میں ہی باقی بچے ہیں۔

ماہرینِ بشریات کا اتفاق ہے سامی یورپ کے انتہائی شمال میں واقع اسکینڈے نیویا میں گزشتہ پانچ ہزار سال یا اس سے بھی پہلے کے زمانے سے آباد ہیں۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے سامی باشندوں کے خطے میں چٹانوں پہ کندہ ایسی تصویریں اور نقوش بھی دریافت کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دس ہزار سال قبلِ مسیح بھی یہاں لوگ بستے تھے۔ خیال یہی ہے کہ وہ لوگ سامیوں کے اجداد ہوں گے۔

سامی اس خطے کی واحد نسل ہے جنھیں سرکاری سطح پر 'زمین کے قدیم ترین اصل باشندے' تسلیم کیا گیا ہے۔ خطے کا ڈیڑھ لاکھ مربع میل سے زائد رقبہ تاریخ میں 'سرزمینِ سامی' رہا ہے۔ ماہی گیری، فر بانی، بھیڑیں پالنا بھی سامیوں کا روایتی پیشہ ہے تاہم ان کی پہچان سرد ترین خطے کا باسی اور ہرن کی نسل سے تعلق رکھنے والا پالتو جانور 'رینڈیئر' ہے جس سے کل سامیوں کی دس فیصد تعداد یا اٹھائیس ہزار سے زائد نفوس کا براہِ راست معاش وابستہ ہے۔ اُن کی مجموعی آبادی ستر ہزار کے اریب قریب ہے۔ رینڈیئرز کی گلہ بانی کئی صدیوں سے سامیوں کا روایتی پیشہ رہا ہے۔

اسکینڈے نیویا کے قدیم مخطوطات میں تحریر ہے ''سامی دو نسلی گروہوں میں تقسیم ہیں۔ ایک سمندر میں ماہی گیری کرتا ہے، دوسرا گروہ پہاڑوں میں رہتا ہے اور گلہ بانی کرتا ہے۔''

اب سمندر میں ماہی گیری کرنے والے سامیوں کی تعداد نہایت ہی کم ہو چکی ہے۔ پہاڑی سامیوں کی پہچان رینڈیئرز برقرار تو ہے مگر خطرات میں گھری ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پہاڑوں میں بسنے والے سامیوں نے 1500ء میں جنگلی رینڈیئر کو پالتو بنا کر اس کی گلہ بانی شروع کی تھی جو رفتہ رفتہ برف زاروں کے ان خانہ بدوشوں کی پہچان اور معاشی انحصار بن گیا۔ آج دنیا بھر میں سامی رینڈیئرز اور رینڈیئرز سامیوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

اسکینڈے نیویا میں سامیوں کو صدیوں سے غیر سامی نسلی گروہوں کے ظلم و ستم کا سامنا رہا ہے۔ انہیں ہمیشہ اچھوت سمجھا گیا اور کچلنے کی کوششیں کئی صدیوں تک جاری

رہی ہیں۔ یہاں یہ بتانا نہایت دلچسپ ہوگا کہ بیسویں صدی کے اوائل میں جب نو آبادیاتی نظام دنیا کے بڑے حصے پر راج کر رہا تھا، تب سامی باشندوں کو جبراً پکڑ کر یورپ کے مختلف ملکوں میں ان کی نمائش کی گئی جسے دیکھنے کے لیے ٹکٹ خریدنا پڑتا تھا۔ چڑیا گھروں میں بڑے بڑے پنجرے بنا کر سامی مردوں اور عورتوں، ان کے خیموں اور رینڈیئر سمیت ایسا ماحول تیار کیا گیا تھا، جسے دیکھنے والے سامیوں کو دیکھ کر محظوظ ہو سکیں۔ سامیوں کی نمائش جدید تہذیب کے دلدادہ شائقین کے لیے تفریح اور اُن کے لیے تذلیل تھی۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سامیوں کی تذلیل کبھی تہذیب کے نام پر ہوئی تو کبھی تحقیق کے نام پر۔

بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں ناروے کے ماہرینِ بشریات نے پولیس اور فوج کی قوت کے بل پر سامی مردوں اور عورتوں کے علاقوں میں دراندازی کی۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو تحویل میں لے کر بندوق کی نوک پر برہنہ کیا گیا مختلف زاویوں سے ان کی تصاویر اتاری گئیں تاکہ سامی نسل پر بشریاتی تحقیق میں مدد مل سکے۔ یہ واقعہ آج کے ادھیڑ عمر سامیوں کو بھی یاد ہے۔ وہ نفرت سے اور بہ حالتِ مجبوری اُس واقعے کا ذکر کرتے ہیں۔ کئی نسلیں گزر جانے کے باوجود بھی اُس بے عزتی کا احساس ان کی باتوں سے عیاں ہوتا ہے۔

''وہ ہماری تاریخ کے بدترین واقعات میں سے ایک ہے جسے شرمناک باب بھی کہہ سکتے ہیں۔'' اُس دن باتوں باتوں میں یہ تذکرہ نکلا تو بلو پیڈرگاپ نے دکھ اور نفرت کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

بلو کے لہجے میں یہ تلخی کیوں نہ ہو...... چڑیا گھر میں سجائے اور جبراً برہنہ کیے گئے اُن سامی مردوں اور عورتوں میں، آج کے ان ادھیڑ عمر سامیوں کے دادا، دادی یا نانا، نانی بھی کھڑے ہوئے تھے۔

اسکینڈے نیویا اور روس میں سامیوں کی نسل کشی کے لیے جبر و تشدد کے تمام بدنام زمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ یہ سب کچھ تفصیل سے تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ ظلم کی تحصیل کو جاننے کے لیے ہم تاریخ میں بہت دور تک نہیں جاتے۔

یہ ابھی کل کی ہی بات ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جرمن افواج نے ان علاقوں پر شدید بمباری کی جہاں سامی بستے تھے۔ یہی نہیں، خود ان علاقوں کی حکومتوں نے بھی سامیوں پر ظلم کی انتہا کر دی ان کے بود و باش، رسم و رواج اور طور طریقوں کو تبدیل کرنے کے لیے جبر سے کام لیا۔ ہر طریقہ آزمایا...... غرضیکہ بارھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے درمیانی عرصے میں منطقہ شمالی کے ان قدیم ترین باشندوں کو مٹانے کے لیے نسلی منافرت پر مبنی سیکڑوں مذموم کوششیں انسانی تاریخ کا طویل ترین سیاہ باب ہیں۔

اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل میں سامی یہ سمجھ چکے تھے کہ بقا کے لیے ان کا اتحاد اور سیاسی عمل میں شرکت ضروری ہے تاہم اس کے باوجود سیاست میں ان کی شرکت سرد مہری کا شکار رہی مگر بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں صورتِ حال بدل گئی۔

1979ء میں، ناروے میں سامی سرزمین پر ایک ہائیڈرو پاور پلانٹ کی تعمیر شروع ہوئی جس پر حقِ ملکیت کا تنازع اٹھا۔ اس معاملے پر سامی پُرجوش تھے۔ بس اسی مسئلے نے سامیوں کو اسکینڈے نیویا کے سیاسی ایجنڈے میں شامل کر دیا۔ یہ تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا کہ سامیوں نے اپنے حق کے لیے سیاست کا سہارا لیا۔

اگست 1986ء میں سامیوں نے اپنا قومی ترانہ اور قومی پرچم بنا لیا۔ ان کے قومی ترانے کے ٹیپ کے بند کا مطلب ہے۔

''سامی مرد اور عورت سورج کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔''

سامیوں کا قومی پرچم سرخ، سبز، زرد اور نیلے رنگوں پہ مشتمل ہے، جس پر زرد دائرے سورج اور چاند کا استعارہ ہیں۔ ان کا قومی ترانا سامی شاعر آئزک سبا کی ایک نظم ہے جو پہلی بار یکم اپریل 1906ء کو ناروے کے ایک اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ ہر سال چھ فروری کو سامی قومی دن' منایا جاتا ہے۔ یہ دن 1917ء میں، ناروے میں منعقدہ 'پہلی سامی کانگریس' کی مناسبت سے منایا جاتا ہے۔

اگرچہ گزشتہ دو تین دہائیوں کے دوران سیاسی جدوجہد کے باعث انہیں بہت سی مراعات ملی ہیں، ظلم و جبر کا دور تقریباً ختم ہو چکا ہے مگر اب جب سازگار ماحول میسر آیا تو سامی اور سامی تہذیب، دونوں خطرے کی زد پر ہیں۔ سامی باشندے گزشتہ دو تین دہائیوں سے، صدیوں کے بعد سکھ کا سانس لے رہے ہیں مگر معدومی کے کنارے پر پہنچ کر۔

سرکاری جائزوں اور ماہرینِ بشریات کی مختلف تحقیقات کے مطابق سامی، اُن کی تہذیب اور زبان......

تینوں بڑی تیزی سے معدومی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جو کام حکمرانوں کا جبر نہ کرسکا، وہ نئی نسل کی غیر سامی زبان میں تعلیم اور غیر سامی تہذیب سے قربت نے کر دکھایا ہے۔ ادھیڑ عمر اور بزرگ سامیوں سے مل کر، اُن سے گفتگو کر کے مجھے تو یہی سمجھ آیا تھا۔

☆☆☆

دائرہ منطقہ شمالی Arctic Circle کی برف سے ڈھکی پہاڑی چوٹیوں والی وادیوں سے دو سو میل دور شمال کے بعد تاج سوئیڈن کی سلطنت شروع ہوتی ہے جہاں گرمیوں میں سورج مہینوں نہیں ڈوبتا۔ رات میں بھی چمکتے سورج کی گرمی برف زاروں کو پگھلاتی رہتی ہے۔ گرمیوں کے وسط میں چمکتے سورج تلے آنے والی ان روشن راتوں میں سوئیڈن کے نیم خانہ بدوش 'سامی' گلہ بانوں کے گاؤں دیہاتوں میں خاصی رونق رہتی ہے۔ چھ چھ مہینے تک چمکنے والا سورج ہزاروں بار ان علاقوں پر طلوع اور غروب ہوا مگر سامی کہتے ہیں کہ وسط گرمیوں میں نظر آنے والی یہ رونق صدیوں سے جاری وساری ہے۔ اوائلِ بہار سے گرمیوں کے وسط تک، سامی باشندوں کے شب و روز صرف رینڈیئرز کے لیے مخصوص ہو کر رہ جاتے ہیں۔

''سال کا یہ وقت ہم رینڈیئرز کے بچھڑوں پر اپنا امتیازی نشان گودنے اور اُن کی نقل مکانی کی نگرانی میں صرف کرتے ہیں۔'' ہلو کی سوئیڈش سامی بیوی اِنگرڈ گاپ نے بتایا۔ انگرڈ کا کہنا تھا کہ ''بہار کے آغاز پر سامی اپنے رینڈیئرز گلّے میں شامل نئے بچھڑوں کے کانوں پر اپنا امتیازی نشان گودتے ہیں جس میں کافی وقت لگتا ہے۔ ہر قبیلے اور ہر خاندان کا اپنا ایک علیحدہ امتیازی نشان ہے جو دوسرے سامیوں کے نشان سے مماثل نہیں۔ یہ نشان رینڈیئرز بچھڑے کے کان پر کندہ کیا جاتا ہے۔ یہ سامیوں کی صدیوں پرانی رسم ہے اور اب تک زندہ ہے۔'' بہار کے آغاز پر شروع ہونے والی یہ قدیم رسم سامیوں میں تہوار کی صورت منائی جاتی ہے۔

سامی باشندے صدیوں سے برف زاروں کے باشندے ہیں۔ دنیا کے کئی دوسری خانہ بدوش نسلوں کی طرح وہ بھی گلّہ بانی کرتے ہیں۔ رینڈیئرز صدیوں سے ان کا پالتو جانور اور سامی زندگی کا لازمی جزو ہے۔

رینڈیئرز، قطب شمالی کے زیریں علاقے میں پایا جانے والا ہرن کی نسل کا جنگلی جانور ہے۔ اس کے شاخ دار اور بڑے بڑے سینگ ہوتے ہیں۔ یوریشیا کے خطے میں آباد یہ سامی کبھی برف پر چلنے والی بے پہیا برف گاڑی کھینچنے کے لیے انہیں گھوڑوں کی طرح آگے جوتتے تھے۔ سامی لوگ صدیوں سے کھال، گوشت اور دودھ کے لیے ان پر انحصار کرتے ہیں۔ برف زاروں میں موسم گرما کے چند مہینوں میں ان کے لیے چارے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا البتہ موسم سرما میں جب برف کی سفید دبیز چادر ہر شے پر تن جاتی ہے تب 'رینڈیئرز کائی' reindeer moss اس جانور کی مرغوب غذا بن جاتی ہے۔ یہ دراصل نباتات کی ایک قسم ہے جو قطب شمالی میں پائی جاتی ہے۔

سامی خانہ بدوش گلّہ بان صدیوں سے اسکینڈے نیویا کے خطے میں اپنے پالتو رینڈیئرز کے گلّوں کے ساتھ سرسبز چراگاہوں کے لیے ایک سے دوسرے علاقے تک سفر کرتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے مگر اب ان سامیوں کی زندگیوں میں بھی بہت کچھ بدل چکا ہے۔ بیسویں صدی دنیا میں ترقی کے انقلابات کی صدی تھی۔ اب ہم اکیسویں صدی کی جدید دنیا میں رہ رہے ہیں۔ سامی باشندوں کی زندگی بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئی ہے۔ بہت تھوڑے سامی باشندے اب بھی اپنے روایتی طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایلا کی طرح نئی نسل جدید دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رینڈیئرز سے ان کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ بہت تھوڑے لوگ اور شاید اُن سے تھوڑے زیادہ رینڈیئرز باقی رہ گئے ہیں، جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ گئے وقتوں کی نشانی ہیں۔ ہلو پیڈر گاپ، ان کی بیوی انگرڈ اور ان کا ریوڑ بھی انہی نشانیوں میں شامل ہیں۔

مہینوں نہ ڈوبنے والا سورج غروب ہوتا ہے تو آسمان پر انڈے کی بہت بڑی زردی جیسی شکل کا زرد چاند نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ بہار کا آغاز اور رینڈیئرز کی ہجرت کا زمانہ ہوتا ہے۔ ''اگر کان پہ گودا ہوا ہمارا نشان نہ ہو تو ہم پہچان ہی نہ سکیں کہ غول کے غول کی صورت، گرمیوں سے گرمائی ٹھکانے کی طرف جانے والے رینڈیئرز میں سے کون کس کا ہے۔'' میرے ایک سوال کے جواب میں انگرڈ گاپ نے ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ وہ ایک بچھڑے کے کان پہ اپنے خاندان کا امتیازی نشان گود رہی تھیں۔ ''یہ نشان ہمارے اجداد کی نشانی ہے اور اب بھی ہم انہی کی مدد سے اپنے ایک رینڈیئرز کو ہزاروں کے غول میں شناخت کر کے اپنے اصطبل تک لے آتے ہیں۔ سردیوں کے اختتام پر جنم لینے والے یہ بچھڑے اب چند ہفتوں کے بعد پہلی بار موسم گرما کے ٹھکانے کی طرف ہجرت کریں گے۔ یہ نشان سب کو بتا دے گا کہ میں کس کا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور ایک نئے بچھڑے کو قابو کرنے میں جٹ گئی۔

سامی گلّہ بانوں کو ان کی بولی میں 'بو آز و وازی' کہتے ہیں جس کا مطلب ہے 'رینڈیئرز کے ساتھ گھومنے والے۔' یہ تعریف سامیوں پر پورا اترتی ہے۔ ایک یہی کام ہے جو وہ اپنی پوری زندگی میں کرتے ہیں۔ اس کے سوا روایتی سامی باشندوں کی زندگی میں 'کام' کی کوئی اور تعریف نہیں۔ خانہ بدوشوں کی دنیا کا رواج ہے کہ جہاں جہاں وہ جاتے ہیں، اُن کے پالتو مویشیوں کا گلّہ بھی پیچھے پیچھے چلتا ہے مگر سامیوں کی دنیا میں جہاں جہاں رینڈیئرز جاتا ہے، وہ اُن کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ اب تو ایسا نہیں ہے مگر چند دہائی پہلے تک یہ سو فیصد سچ تھا کہ دنیا میں پہلی بار آنکھیں کھولنے والا سامی بچہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک رینڈیئرز کے ساتھ ہی زندگی بسر کرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں مگر اب لگتا ہے کہ ان کا رشتہ کمزور پڑ رہا ہے۔ رینڈیئرز اور سامی، دونوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ سامی دنیا کے چکا چوند میں کہیں گم ہو رہے ہیں اور یہی حالات رہے تو رینڈیئرز برف زاروں میں کھو جائے گا۔

☆☆☆

برف زاروں اور جنگلوں میں اپنی پتلی پتلی لمبی ٹانگوں سے تیز رفتاری سے قلانچیں بھرتا رینڈیئرز اور ان کا چرواہا سامی، اسکینڈے نیویا میں صدیوں سے خانہ بدوش زندگی گزار رہے ہیں۔ گرمیوں میں سرسبز چراگاہیں اور سردیوں کے آغاز پر مسکن۔ واپسی رینڈیئرز اور سامی باشندوں کی زندگی کا سیکڑوں سال پرانا چلن ہے مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ زندگی کی چکا چوند جن سامیوں کی آنکھیں چندھیاتی ہے وہ ترقی یافتہ دنیا کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ سب شروع شروع میں ایلا کی طرح یہی کہتے ہیں کہ رینڈیئرز کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتے مگر اب بہت سارے سامی اپنی روایت اور رینڈیئرز، دونوں کو چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسا چکے ہیں۔ وہ سامی دنیا، جس میں گھر کے ساتھ رینڈیئرز کا گلّہ نہیں، صرف اس کی تصویریں ہی رہ گئی ہیں۔ خود اسکینڈے نیویا کے کئی ملکوں میں سامی باشندوں کے بدلتے طرزِ حیات نے رینڈیئرز کو سووینیر کا درجہ دے دیا ہے۔ سوئیڈن اور ناروے میں اب اکثر تاجر غیر ملکی سیاحوں کو اپنی روایات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے بُھس بھرے رینڈیئرز سجا رکھتے ہیں۔

اُنیسویں صدی تک سامی، بیابان، رینڈیئرز اور خانہ بدوش زندگی کا نہایت مضبوط باہمی رشتہ قائم تھا۔ بیسویں صدی میں جہاں بہت کچھ بدلا، وہیں آہستہ آہستہ سامی خانہ بدوش کی اکثریت بھی تھک کر رُکنے لگی۔ آج سامیوں کی غالب اکثریت پُر آسائش جدید گھروں میں رہتی ہے، جس کے پچھواڑے زمانہ رفتہ کی یادگار انہیں یہ احساس دلانے کے لیے کافی ہے کہ اُن کے اجداد خانہ بدوش تھے اور خیموں میں رہتے تھے۔ آج بھی گھر کے پچھواڑے شہری سامیوں کے خیمے نصب ہیں مگر اب یہ صرف رینڈیئرز کا گوشت محفوظ کرنے کے لیے اُسے دھوئیں کا دم دینے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

منطقہ شمالی کے خانہ بدوش سامیوں کا گھر صدیوں سے خیمہ رہا ہے، جسے اُن کی بولی میں 'لاوت' کہتے ہیں۔

زمین پر گول دائرے کی شکل میں لکڑی کی پتلی پتلی بلیاں گاڑ کر، اوپر سے اُن کے سروں کو گٹھے کی صورت باندھ کر، اُن پر رینڈیئرز کی کھال چڑھا کر لاوت بنایا جاتا ہے۔ نیچے سے دائرہ نما اور اوپر سے لمبوترا 'لاوت' صدیوں سے خانہ بدوش سامیوں کا ہم سفر ہے۔ اب ذرا دورِ جدید ہے۔ اس لیے شہری سامیوں کے لاوت پر رینڈیئرز کی کھال کے علاوہ موم چڑھا ترپال اور اونی نمدے بھی منڈھے جاتے ہیں۔

لاوت اندر سے قدِ آدم سے ذرا سا نکلتا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک عام قد کا انسان ہاتھ اوپر کر کے کھڑا ہو، تب بھی خیمے کی چھت ایک آدھ بالشت اونچی ہی رہتی ہے۔ لاوت کے اوپر گڑی بلیوں کو جہاں باندھا جاتا ہے، وہاں چمنی جیسا سوراخ رہ جاتا ہے۔ یہ قدرتی روشنی کے لیے خیمے کا روشندان، دھواں باہر نکالنے کے لیے چمنی اور تازہ آکسیجن اندر پہنچانے کے لیے چھوٹی کھڑکی کا کام دیتا ہے۔ خیمے کے اندر زمین پر گھاس پھوس پھیلا کر اس پر رینڈیر کی کھال بچھا کر بستر لگا دیتے ہیں۔ خیمے کے درمیان... چولہا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے لاوت شدید سردی میں بھی اندر سے خاصا گرم رہتا ہے۔ بہ آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والا ایک بڑا لاوت پندرہ سے بیس منٹ میں نصب کر لیا جاتا ہے۔ منطقہ شمالی میں اکثر برف کے طوفان اور تیز ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہتے ہیں۔ لاوت پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلنے والی طوفانی ہوا کے تھپیڑے

برداشت کرنے کی.... صلاحیت رکھتا ہے اور گرنے سے بھی محفوظ رہتا ہے مگر اب لاوت عام نہیں رہا۔ رینڈیئر کی دیکھ بھال کے لیے عارضی ٹھکانے کی کٹی اور سیلیں نکل آئی ہیں۔ ممکن ہے کہ دو چار دہائیوں کے بعد 'لاوت' عجائب گھروں میں ہی دیکھنے کو ملیں۔

☆☆☆

سوین اسکالجی کا تعلق سوئیڈن سے ہے اور وہ پانچ افراد پر مشتمل خاندان کے ساتھ گالیور شہر کے مضافات میں رہتے ہیں۔ وہ روایت پسند سامی ہیں اور رینڈیئر گلہ بانی سے منسلک ہیں۔ یہی ایک کام ہے جو اٹھاون سال کے سوین نے اپنی پوری زندگی میں کیا ہے۔ اُن دنوں میں سامیوں پر اپنی تحقیق کے سلسلے میں سوئیڈن میں تھا اور سوین کے گھر پر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ میرا پہلا ناشتا تھا۔ میں ناشتے کی میز پر کہنی ٹکائے کافی پی رہا تھا اور اُس کی بیوی اہتمام میں مصروف تھی۔

"ہمارا ناشتا گھر میں بنائی گئی گول موٹی روٹی، رینڈیئر کے خشک گوشت کے پارچے اور کافی پر مشتمل ہوتا ہے۔" وہ سامیوں کے روایتی ناشتے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ "ہمارا ناشتا سادہ مگر پُر غذائیت ہوتا ہے۔ یہ سوئیڈن کی سرد ترین سردی میں بھی ہمارے جسم کو حرارت پہنچاتا ہے۔"

ناشتا لگ چکا تھا۔ جیسا سوین نے بتایا، وہی سب کچھ اب سامنے میز پر رکھا تھا۔

سوین اسکالجی نے اپنے وقت کو دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ دن کا آدھا حصہ وہ اپنے گاؤں 'ہررا' میں گزارتے ہیں اور دوپہر کے بعد کا وقت قصبے کے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ۔

"اگر میں اپنے رینڈیئرز کے پاس نہ جاؤں تو خود کو ادھورا محسوس کرتا ہوں۔ گاؤں میں میرے رینڈیئرز کا فارم ہے۔ میں وہاں جا کر اُن کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ جس دن نہ جاؤں، اُس دن بہت اُداس ہوتا ہوں۔" ناشتے کے بعد گاؤں جاتے ہوئے سوین نے گاڑی چلانے کے دوران مجھ سے کہا۔

سامی اسکینڈے نیویا کے کسی بھی ملک میں ہوں، روایتی طور پر اُن کی خوراک اور آمدنی کا بڑا حصہ رینڈیئرز کے گوشت پر مشتمل ہے۔ وہ رینڈیئرز کو اپنے کھانے کے لیے بھی ذبح کرتے ہیں اور تجارتی پیمانے پر بیچنے کے لیے بھی۔ ناشتے سے لے کر دوپہر اور رات کے کھانے تک، اُن کی روزانہ خوراک کا بڑا حصہ رینڈیئرز کے گوشت پر مشتمل ہے

یہ سوین سے ملنے کے کئی ہفتوں کے بعد کا ہے۔ اُن دنوں میں ناروے میں تھا۔ شہر کے مضافات واقع بِلو پیڈرگاپ کا گھر میرا ٹھکانا تھا۔ صبح دس بجے کا ہوگا۔ میں کچن میں تھا اور اِنگرڈ میرے لیے کافی بنا رہی تھی۔ اُس کا کچن کافی بڑا اور ہر طرح کی شہری سہولیات آراستہ تھا۔ ابھی میں نے کافی کا کپ تھاما ہی تھا کہ بازوؤں پہ ذبح کیا ہوا رینڈیئر کا سالم بچھڑا اٹھائے اندر آ میں زندگی میں پہلی بار یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ رینڈیئر کی کھال نہایت صفائی سے اُتاری گئی تھی۔ تمام آلائشیں بھی نکالی تھیں البتہ بچھڑے کی گردن سے چہرے تک کا اوپری حصہ جوں کا توں تھا۔ اُس کے دو چھوٹے چھوٹے سینگ بھی ویسے ہی تھے۔ میں ڈائننگ ٹیبل پہ رکھے ذبح شدہ بچھڑے کو انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ جسے کچھ دیر پہلے ہی بِلو نے گھر کے پچھواڑے میں ذبح کیا تھا۔

"گوشت کے پارچے اور بوٹیاں بنانا عورتوں کی ذمہ داری ہے۔" بِلو نے بیوی کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"مگر یہ گردن اور اُس کی کھال......" میں نے اُس ذبح شدہ بچھڑے کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ہماری روایت ہے۔" اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا پوچھنا چاہ رہا تھا۔ "گردن، گوشت کے پارچے اور بوٹیاں بناتے وقت بھی الگ کرتے ہیں۔ اب اِنگرڈ یہ کام کرے گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم ذبح کیے گئے رینڈیئر کے جسم کا کوئی حصہ ضائع نہیں کرتے۔" اس بار اِنگرڈ نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

"بالکل...... یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" بِلو نے اُس کے ہاتھ سے کافی کا مگ تھامتے ہوئے تائید کی۔

سامی رینڈیئر کے گوشت کو بڑی بڑی بوٹیوں میں کاٹ کر فریزر میں رکھ لیتے ہیں۔ کچھ لوگ پرانے طریقوں کے مطابق دھوئیں کا دم دے کر اسے کھانے کے لیے محفوظ کرتے ہیں اور کچھ سامی اسے خشک کر کے کھاتے ہیں۔ ڈیپ فریزر کے سوا گوشت محفوظ کرنے کے لیے باقی دونوں طریقے صدیوں پرانے ہیں۔ خشک گوشت کا پارچہ اُن کے ناشتے کا لازمی جزو ہے۔ یہ بات تو مجھے سوین نے سوئیڈن میں سمجھا دی تھی، بِلو مجھے اُس سے آگے کی کہانی سنا رہا تھا۔

"ہم صرف گوشت ہی استعمال نہیں کرتے۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "رینڈیئر کے تمام اعضاء، انتڑیاں، نسیں، چربی، کھال، ہڈیاں، سینگ حتیٰ کہ خون تک کو استعمال میں لاتے ہیں۔ یہ ہمارے سو طرح کے کام انجام دیتا ہے۔" اس نے انگلی سے ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا جہاں اب تک تازہ تازہ ذبح ہوئے رینڈیئر بچھڑے کے جسم سے خون ٹپک رہا تھا۔

سامی رینڈیئر کی کھال کو روایتی انداز سے سُکھاتے ہیں جس میں کافی عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس کھال کو صاف کر کے چمڑا بنایا جاتا ہے۔ اس چمڑے سے خواتین اور مردوں کے بیگ، کوٹ اور جوتے بنائے جاتے ہیں۔ سامی یہ سارا کام اپنے ہاتھ سے سرانجام دیتے ہیں۔ ہڈیوں سے کئی روایتی اوزار، کھلونے اور نقش و نگار والی آرائشی اشیا تیار کی جاتی ہیں۔ انتڑیوں کو خشک کر کے موٹے رسّے بٹے جاتے ہیں۔ پتلی آنتوں سے وہ خاص قسم کا نہایت مضبوط دھاگا تیار کرتے ہیں۔

اگرچہ بِلو جیسے کئی اور رینڈیئر گلہ بان اپنے گھروں کے پچھواڑے یا فارموں پر ذاتی استعمال کے لیے رینڈیئرز ذبح کرنے کا کام خود سرانجام دیتے ہیں لیکن تجارتی پیمانے پر بھی رینڈیئر کے گوشت کی بڑی مانگ ہے۔ تجارتی بنیادوں پر سرکاری ذبح خانوں میں رینڈیئرز ذبح کرنے کے بعد کھال اور سینگوں کے سوا تمام آلائشیں تلف کر دی جاتی ہیں۔ اسی لیے نجی طور پر ذبح کیے گئے رینڈیئر کے اعضا کی بدولت روایتی سامی دست کاری کا وجود اب تک برقرار ہے۔

ثقافت کی بات چلی ہے تو کچھ اور بھی ذکر کرتے چلیں۔ سامی ثقافت کا بنیادی محور رینڈیئر گلہ بانی ہے۔ ان کی ہر شے اسی سے جڑی ہے۔ پچھلی چند دہائیوں پہلے جب اُنہیں زبردستی نارویجین یا سویڈش باشندے بنانے کی تحریک زوروں پر تھی، تب دور دراز علاقوں کے رینڈیئر فارم ہی وہ شے تھی جس نے سامیوں کی بولی اور ثقافت کو زندہ رکھا۔ اب حالات قدرے مختلف ہیں۔ اب ناروے اور سوئیڈن میں رینڈیئر پروری کا حق قانونی طور پر صرف سامیوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں رینڈیئر پالنے کا حق صرف اُسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو قانونی طور پر اپنا نسلی رشتہ سامی نسل سے ثابت کر سکے۔ اس وقت ناروے میں اٹھائیس ہزار کے قریب سامی رینڈیئر گلہ بانی سے منسلک ہیں۔ البتہ فن لینڈ میں صورت حال کچھ مختلف ہے۔ یہاں غیر سامی بھی رینڈیئر پروری سے وابستہ ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

سامی عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں تاہم اب ان میں تعلیم کا رجحان بہت ہے۔ زیادہ تر عورتیں غیر سامی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکی ہیں۔ جس کے بعد اُن کی روایتی سامی زندگی بھی تقریباً شہری زندگی میں بدل چکی ہے۔

ناروے اور سوئیڈن میں غیر سامی نسلوں نے اپنے کاروبار اور سیاحت کو چمکانے کے لیے رینڈیئر اور سامی ثقافت کا سہارا لیا ہے۔ ان ملکوں میں یہ رجحان تیزی سے زور پکڑ رہا ہے۔ بِلو کی بیوی اِنگرڈ کا تعلق سوئیڈن سے ہے اور اس کا تعلق بھی سامی نسل سے ہے۔ بِلو سے شادی کے بعد وہ ناروے چلی گئی تھی اور اب وہیں روایتی سامی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اُن دنوں میں سوئیڈن میں تھا اور وہ سوین سے ملنے اُس کے گھر آئی تھی۔ واپسی پر میں بھی اُس کے ساتھ کچھ سامان خریدنے کے لیے جوک موک کی مقامی سُپر مارکیٹ کی طرف نکل گیا۔ شیشے کے داخلی دروازے پر ایک بھس بھرا رینڈیئر ایستادہ تھا۔ مجھے اس بھس بھرے رینڈیئر میں دلچسپی لیتے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ "یہ کسی عورت نے ہی تیار کیا ہوگا۔"

"کیا......" میں نے حیرت سے کہا۔

"سامی عورتیں ہنر و فن میں یکتا ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر ذرا ٹھہر کر اضافہ کیا۔ "میں بھی انہی سامی عورتوں میں سے ایک ہوں۔" رینڈیئر، سامی دستکاری کا بھی بنیادی عنصر ہے۔ رینڈیئر کی کھال سے لباس، سینگوں سے نہایت قیمتی ہینڈل اور جسم کی دیگر ہڈیوں سے آرائشی اشیا بنائی جاتی ہیں۔ سامی عورتیں سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے سامی فنون کی دستکاری میں ماہر تصور ہوتی ہیں۔

واپسی پر اِنگرڈ نے انکشاف کیا کہ وہ دریا کے دلدلی کناروں پر اُگی مخصوص خودرو گھاس کو کاٹ کر جوتے کے اندرونی تلے پر رکھنے کے لیے ایسے پتاوے تیار کرنے کی ماہر ہے جن کی وجہ سے شدید سردی اور برف باری میں پاؤں نمی، سردی اور بُو سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ بھی سامیوں کا وہ صدیوں پرانا ہُنر ہے جو فطرت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے سبب اُنہوں نے سیکھا۔

میرے لیے یہ خوش گوار حیرت کا باعث تھا کہ سامی ہُنر مند خاتون میرے ساتھ تھی۔ "مگر وہ سپر مارکیٹ کے دروازے والا رینڈیئر......"

"یہ مارکیٹنگ کا ذریعہ ہے۔" تعلیم یافتہ اِنگرڈ نے میری بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "ناروے اور سوئیڈن میں سیاحت کے فروغ کے لیے حکومتی ادارے ہماری ثقافت کا سہارا لے رہے ہیں۔" اس نے فخر سے جواب دیا۔ "مگر فن لینڈ والے سیاحت کے فروغ کے نام پر ہماری تہذیب و ثقافت کی تذلیل کررہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے انگرڈ کی آنکھوں میں ہلکی سی نفرت اور لہجے میں شکایت صاف محسوس ہورہی تھی۔

اِنگرڈ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ناروے اور سوئیڈن کے برعکس فن لینڈ میں صورت حال کچھ مختلف ہے۔ وہاں بھی کئی سامیوں کا کہنا تھا سامی ثقافت کے نام پر یہاں عجیب و غریب لباس بیچے جارہے ہیں۔ سامی دستکاری کی بھونڈی نقل غیر سامی تیار کرتے ہیں اور انہیں سیاحوں کو 'سامی ہنرمندی' کے نام پر بھاری داموں فروخت کردیتے ہیں۔ سامی میلہ کے نام پر غیر سامی جو کچھ کرتے ہیں وہ ہماری تذلیل کے مترادف ہے۔

"فن لینڈ کی حکومت بھی اسکینڈے نیویا کے دیگر ممالک کی طرح ہماری ثقافت کے فروغ کی کوشش کررہی ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ ہماری تہذیب و ثقافت اور روایات کو فروغِ سیاحت کے نام پر شدید نقصان پہنچارہے ہیں۔" انگرڈ نے میرا تجربہ سننے کے بعد کہا۔

میں نے بھی اثبات میں سر ہلادیا۔

سامیوں کی زندگی تفریح کے لیے روایتی میلے ٹھیلوں اور تہواروں سے خالی نہیں۔ اگرچہ اسکینڈے نیویا کے مختلف سامی نسلی گروہ مختلف تہوار مناتے ہیں مگر موسمِ بہار کے آغاز سے ذرا پہلے منعقد ہونے والا 'بہار میلہ' کی روایت سب میں یکساں ہے۔ یہ وہ موقع ہے کہ جب سردیوں کے فارم سے رینڈیئر کی گرمائی چراگاہوں کی طرف نقل مکانی شروع ہوتی ہے۔ یہ میلہ قدیم روایات اور جدید تہذیب کا امتزاج ہے، جہاں سامی باشندوں کے لوک آلاتِ موسیقی بالخصوص 'بانسری' کی دھن پر گیت گائے اور رقص کیے جاتے ہیں، وہیں برف پر دوڑنے والی گاڑیوں کی ریس بھی ہوتی ہے۔ کبھی برف گاڑی کے آگے رینڈیئر جتے ہوتے تھے، اب گاڑیوں کے انجنوں نے اُن کی جگہ لے لی ہے مگر اس کے باوجود سامیوں کے لیے رینڈیئر کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔

میلوں میں سامی موسیقی سُننے کی چیز ہے۔ ان کے لوک گیتوں کی سب سے معروف صنف yoik ہے۔ اس گیت کو بانسری کی ہلکی دھن پر گاتے ہیں۔ جس میں سے نکلتی آواز کو دھیمی تو کبھی اونچے سُروں میں، کورس میں گاتے ہیں۔ لوک گیت کی یہ صنف جانوروں بالخصوص رینڈیئر، پرندوں اور مناظرِ فطرت کی تعریف بیان کرتی ہے۔ سامی ثقافت کے لوک آلات موسیقی میں صرف بانسری اور ڈھول شامل ہے۔ بانسری کو وہ 'فیڈ تو' کہتے ہیں جو سرکنڈے کی ایک جھاڑی سے تیار ہوتی ہے اور رینڈیئر کی کھال منڈھے ڈھول کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ کے صرف ایک طرف کھال منڈھی ہوتی ہے تو کچھ کے دونوں جانب۔ دونوں ہوتے ہیں ڈھول کی طرح اور ان کی آواز بھی اس سے ہوتی ہے۔ گزشتہ دو تین دہائیوں سے سامی تہواروں میں منعقدہ محفلِ موسیقی میں جدید ساز بھی روایتی سازوں کی سنگت کرتے ہیں۔

اِنگرڈ کے پاس کئی طرح کے سامی ملبوسات تھے۔ ناروے میں اُس نے وہ ملبوسات مجھے دکھائے اور ان کے بارے میں بہت ہی مفید معلومات فراہم کیں۔ اِنگرڈ بتارہی تھی "سامیوں کا روایتی لباس 'گاکتی' کہلاتا ہے۔ یہ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ آرائشی لباس جو شادی بیاہ، تہواروں اور خاص مواقع پر زیبِ تن کیے جاتے ہیں، عام پہناوے جنہیں روزمرہ استعمال کے لیے بُنا اور سیا جاتا ہے، اور رینڈیئر گلہ بانی کے دوران پہننے والا لباس جو نہایت سادہ مگر بے حد مضبوط اور گرم ہوتا ہے۔"

روایتی طور پر گاکتی رینڈیئر کے ریشوں اور کھال کے ذریعے تیار ہوتا تھا مگر اب یہ انداز بدل چکا ہے۔ آج گاکتی کی تیاری میں سُوت، اون اور ریشم کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر گاکتی کی بُنائی سامی خود کرتے ہیں۔ اس میں اُن کی ہنرمند عورتوں کی مشاقی بے مثل ہے۔ سامی مردوں اور عورتوں کا لباس تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے جس میں شوخ بالخصوص نیلے، سبز اور سُرخ رنگ کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ روایتی طور پر ان کے لباس میں ان تین رنگوں کے سوا سفید، آف وائٹ، بھورا اور اسی جیسے دو تین رنگوں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے لباس میں معمولی سا فرق ہے۔ مرد کی گھیردار فراک نما قمیص لمبائی میں کم اور عورتوں کی قمیص ذرا زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ کمر پر تقریباً ڈھائی انچ چوڑی بیلٹ بھی باندھتے ہیں۔ بیلٹ بٹوا، ماچس اور اسی طرح کی کئی دوسری اشیاء رکھنے کے استعمال ہوتی ہے۔ یہ بیلٹ بھی مختلف رنگ دار دھاگوں سے بُنی جاتی ہے۔ بیلٹ کسنے کے بعد عموماً رینڈیئر کے سینگ سے بنے بٹن یا بکل کے ذریعے باندھی جاتی ہے۔

عورتیں سر پہ سرخ رنگ کی ٹوپی بھی اوڑھتی ہیں۔ خواتین کے لباس میں اضافی شے ایک کم عرض کی تکون شال ہے، جسے وہ شانوں پہ ڈال کر، گردن کے قریب دونوں پلو ملا کر انہیں چاندی سے بنے بروچ کے ذریعے باندھ لیتی ہیں۔ شال کے نچلے حصے پہ سرخ، سفید اور دیگر رنگوں کی جھالر لگی ہوتی ہے۔ سامی مردوں اور عورتوں کے روایتی جوتے رینڈیئر کی کھال کے بنے ہوتے ہیں، جن کے پنجے گول اور اوپر کی طرف مڑے ہوتے ہیں بالکل رینڈیئر کے پاؤں کی طرح۔ جوتے کے مڑے پنجوں پر رینڈیئر فر منڈھتے ہیں۔ فر لگانے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو جوتے اندر سے اور زیادہ گرم رہتے ہیں، دوسرے اُن کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ مردوں کے جوتے سفید جبکہ عورتوں کے جوتوں کے باہر سرخ رنگ سے آرائش کی جاتی ہے۔ مرد اور عورت، دونوں تقریباً ایک جیسے جینز نما تنگ پاجامہ پہنتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں آباد سامی لباس کی تیاری میں تھوڑا بہت فرق ہے۔ کہیں ربن کا استعمال ہے، کہیں لیس لگائی جاتی ہے، کہیں پر کڑھائی ہوتی ہے۔ کہیں پہ بنا کالر کی قمیص استعمال ہوتی ہے۔ کالر اور آستینوں کی کٹائی میں اقلیدس (جیومیٹری) کا انداز نظر آتا ہے۔ ہیٹ کا استعمال مردوں کے لباس کا اہم جزو ہے مگر یہ موسم اور علاقے پر بھی انحصار کرتا ہے۔ روایتی مردانہ اور زنانہ ہیٹ، رینڈیئر کی کھال، فر یا اون سے بنائے جاتے ہیں۔

"گاکتی، سامیوں کا صرف روایتی لباس نہیں ہے۔" جب لباس کی بات بہت آگے بڑھی تو اِنگرڈ نے بتایا۔ "سامی لباس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے پہننے والے مرد یا عورت کو دیکھتے ہی فوراً پتا چل جاتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ "بعض سامی بزرگ تو لباس سے یہ بھی بھانپ جاتے ہیں کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ "گاکتی ہمارا روایتی لباس ہی نہیں، یہ بنا ایک لفظ کہے مکمل تعارف کرانے کا ذریعہ بھی ہے۔"

میرے لیے بھی یہ دلچسپ انکشاف تھا۔

☆☆☆

سامی دنیا کا انداز بدل رہا ہے!

رینڈیئر کے ساتھ چلنے والے جو سامی اب تک اُن سے جڑے ہوئے ہیں، انہوں نے بھی اجداد کے روایتی طور طریقوں میں تبدیلیاں کرلی ہیں۔ اب کہیں کہیں پر تو رینڈیئر پہلے کی طرح موسمی ہجرت نہیں کرتے۔ سامیوں نے اپنے گھروں کے ساتھ بڑے بڑے اصطبل بنالیے ہیں۔ اب کہیں کہیں تو رینڈیئر موسمِ سرما کی چراگاہوں میں نہیں لے جائے جاتے، طویلوں میں ہی اُن کے لیے موسمِ سرما گزارنے کے لیے چارا ذخیرہ کرلیا جاتا ہے۔ خشک چارا چوکور شکل کے بڑے بڑے گٹھوں میں بندھا ہوتا ہے۔ ہر سامی اپنے رینڈیئر کی تعداد کے مطابق چارا ذخیرہ کرتا ہے۔ گرمیوں میں تو چراگاہوں میں وافر چارا دستیاب ہوتا ہے مگر سردیوں اور برف باری میں جہاں انسان کا باہر نکلنا مشکل ہوتا ہے، وہاں چارا لینے کون جائے گا۔ بس! یہی سوچ کر بہت سارے سامی گلہ بانوں نے طویلے کے ساتھ ہی گودام بنا کر چارے کا مسئلہ بھی حل کرلیا ہے۔ صرف ضرورت ہی نہیں، سہل پسندی بھی ایجاد کی ماں ہے۔

سامیوں کے پاس ایسی قیمتی اور بھاری گاڑیاں ہیں، جو خاص طور پر برف پر دوڑنے کے لیے ڈیزائن کی گئی ہیں۔ ان گاڑیوں میں بیٹھ کر وہ میلوں دور تک پھیلے اپنے ہزاروں کی تعداد میں رینڈیئر کی دیکھ بھال بہ آسانی کرسکتے ہیں۔ زمین کے استعمال سے متعلق ملکی قوانین کے باعث لمبی لمبی خاردار تاروں کی باڑیں باندھ لی گئی ہیں کہ رینڈیئر اپنی حدود سے تجاوز نہ کریں اور ایک دوسرے کی حدود میں گھس جانے کے باعث کوئی زمینی تنازع جنم نہ لے۔

نلز ہیڈر گاپ کا کہنا ہے "رینڈیئر جانور ہیں۔ وہ اپنی آنکھ سے دیکھ کر نہیں سونگھ کر سمت متعین کرتے ہیں۔ ان کی قوتِ شامہ ہی ان کی رہنما ہے۔ وہ ہوا کے رُخ پر رہ گزر متعین کرتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ ہم انہیں انسانوں کی طرح دیکھ کر اور سوچ سمجھ کر چلنے پر مجبور کریں مگر قانون ایسے ہیں کہ ہمیں مجبوراً باڑ باندھنا پڑی ہیں۔"

حکومتِ سوئیڈن نے سامیوں کے لیے زمین کے استعمال سے متعلق قوانین بنادیے ہیں۔ کل جو راستے رینڈیئر کی گزرگاہ تھے، اب ان کے بیچوں بیچ سے ہائی وے اور دوسری سڑکیں گزرتی ہیں۔ غیر سامیوں کو شکایت ہے کہ ہمارے رینڈیئر اچانک سڑک پر آجاتے ہیں اور حادثات کی وجہ بن جاتے ہیں، جس سے اُن کے بقول وہ سخت جسمانی اور مالی نقصان اٹھاتے ہیں اسی لیے حکومت نے رینڈیئر کو

قابو میں رکھنے کے لیے قوانین بنائے ہیں مگر بِلو کا کہنا ہے:

''افسوس کہ یہ قوانین رینڈیئرز کو بھی ذی شعور انسان سمجھ کر بنائے گئے ہیں۔ ہمارے آزاد اور رینڈیئرز کی آزادانہ نقل و حرکت کو ایک طرف قوانین نے اپنا پابند بنایا ہے، دوسری طرف کچھ ہمارا بھی قصور ہے۔ سامی سہل پسند ہو گئے ہیں۔ اب ہم اپنے اجداد کی طرح رینڈیئرز کے غولوں کے پیچھے، برف پہ پھسلتی گاڑیوں میں بیٹھ کر ان کی نگرانی نہیں کرتے بلکہ جدید جیپوں میں سوار ہو کر ان کی نگرانی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ اب ہمارے رینڈیئرز کو بھی سردیوں میں خوراک کے لیے برف زاروں میں مارے مارے نہیں پھرنا پڑتا۔ بڑے طویلوں میں رکھے گئے رینڈیئرز کی خوراک کا مسئلہ چارے کے بڑے بڑے گوداموں نے حل کر دیا ہے۔ زمانہ بدل رہا اور شاید ہم سامی بھی...... مجھے لگتا ہے کہ یہی حال رہا تو بہت جلد سامی 'بو آزوواژی' کے معنی ہی بھول جائیں گے۔''

نلز پیڈر گاپ درمیانی عمر کے سامی ہیں۔ وہ دو نسلوں کے درمیان معلق ہیں۔ ان کے والد نے روایتی انداز میں رینڈیئر گلّہ کے ساتھ زندگی بسر کی تھی۔ انہوں نے بھی باپ کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے عملی زندگی شروع کی مگر اب ان کی اولاد اور بدلتا زمانہ سامنے ہے۔ وہ اس سے بھی سمجھوتا کیے ہوئے ہیں اور اجداد سے روایت کا تعلق بھی نبھانا چاہتے ہیں۔ روایت سے تعلق کا رشتہ جذبات کا محتاج ہے مگر آج...... یہ حال کی اٹل حقیقت ہے۔ وہ اس کے ساتھ بھی قدم ملا کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بِلو اُن سامیوں میں شامل ہیں جو لازمی تعلیم کے باعث اسکول گئے اور ناروے کے تعلیمی نصاب کے مطابق لازمی تعلیم حاصل کی۔ ناروے کی سرکاری پالیسی کے تحت اسکول میں وہ اپنی ماں بولی نہیں بول سکتے تھے۔ ناروے حکومت کی پالیسی کے مطابق انہیں دیگر نارویجین کی طرح وہی زبان بولنا اور لکھنا تھی جو ملک کے دوسرے غیر سامیوں کی اکثریت بولتی اور لکھتی ہے۔ پہلے سامیوں کے لیے رسمی بنیادی تعلیم حاصل کرنا لازم نہیں تھا لیکن دو تین عشرے پہلے اُن پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ بنیادی رسمی تعلیم حاصل کرنا اُن پہ لازم ہے۔

''کیا یہ اسی تعلیم کا اثر تو نہیں کہ سامی اپنی صدیوں پرانی روایتی تہذیب و ثقافت سے دُور ہوتے چلے گئے؟''

''ہاں...... ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔'' میرا سوال سن کر بِلو نے اعتراف کیا اور سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ''یہ تعلیم سامیوں کو دوسرے نارویجین باشندوں کی طرح بنا رہی ہے۔ میں تو نہیں مگر میرے بعد اور آج کی نسل اس تعلیم کے باعث بہت کچھ نیا سیکھ چکی ہے۔ یہ وہ کچھ ہے جو ہمارے ... جانتے تھے۔ پہلے ہمارا رینڈیئرز ہی سب کچھ تھا۔ اب ہمارے بچے اپنے کیریئر کو اہم جانتے ہیں۔ یہ بہت بڑی تبدیلی ہے جو آہستہ آہستہ ہماری تہذیب و ثقافت کو بدل رہی ہے۔'' مجھے اس کی آنکھوں میں گہری سوچ نظر آ رہی تھی۔

''حکومتی پالیسیوں سے کیا کھویا اور کیا پایا؟''

بِلو یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ ''ہمیں بہت زیادہ خود مختاری ملی ہے۔'' اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''اب ہم پہلے سے زیادہ خود مختار ہیں مگر ہم نے کھویا بھی بہت کچھ ہے۔ سب سے زیادہ اور ناقابلِ تلافی نقصان سامی بولی کو پہنچا ہے۔ اب ہماری مادری زبان بولنے والے بہت چھوٹی اقلیت بن کر رہ گئے ہیں۔ ہماری زبان مر رہی ہے۔ مجھے اس زبان پر دسترس ہے۔ میرے جیسے تھوڑے لوگ ہیں جو اپنی مادری بولی پہ قدرت رکھتے ہیں۔ میرے بچوں کو یہ اتنی عمدہ نہیں آتی۔ وہ بہت ٹوٹی پھوٹی بولتے ہیں۔ اب ان کی زبان نارویجین زبان ہے۔ ... خدشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ میرے بچوں کی اولادوں تک پہنچتے پہنچتے میری مادری زبان دم توڑ چکی ہوگی۔ ... مادری بولی کی موت، صرف ایک زبان کی نہیں بلکہ ہزاروں سال پر مشتمل پوری سامی تہذیب کی موت ہوگی۔''

سامیوں کی کوئی ایک بولی نہیں ہے۔ دس مختلف ... میں سامی زبان بولی جاتی ہے، جن میں سے چھ زبانیں ہیں جن کے حروف تہجی اور تحریر بھی ہے۔ تمام سامی بولیاں اور زبانیں ایک دوسرے سے گہرا ربط رکھتی ہیں لیکن ... بات یہ ہے کہ اُن کا ربط مبہم ہے۔ مثال کے طور پر ... علاقے کا سامی شمالی سامیوں کی زبان نہیں سمجھ سکتا۔ پہلے تصور تھا کہ لہجے میں فرق کے باعث ایسا ہے مگر لسانی ... نے ثابت کیا کہ تمام بولیاں اور زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہیں البتہ ان کا بنیادی ماخذ ایک ہی ہے۔

متعدد سامی بولیاں اسکینڈے نیویا کے کئی ملکوں میں آباد سامیوں کی قدر مشترک ہیں۔ اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ کوئی ایک سامی بولی صرف ناروے کے سامیوں کی یا سویڈن یا فن لینڈ والوں کی۔ ملکوں کی سرحد ہوتی ہے ... سامی اس کے پابند بھی مگر اُن کی بولیاں اور زبانیں سرحد سے ماورا ہیں۔

لسانی طور پر سامی بولیوں اور زبانوں کا ...

یورال Uralic پہاڑی سلسلوں کے ممالک فن لینڈ، اسٹونیا اور ہنگری کی زبانوں سے جوڑا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ان کی زبانوں میں چند ایسے الفاظ بھی ہیں جو جرمن زبان سے مستعار لیے گئے ہیں۔ تاہم یہ وہ الفاظ ہیں جو ایشیا کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ شہری تہذیب سے تعارف کے نتیجے میں یہ الفاظ اُن کی زبان میں شامل ہوئے ہوں گے۔

اگرچہ اس وقت ناروے، فن لینڈ اور سویڈن میں سرکاری ٹیلی وژن پر روزانہ مختصر دورانیے کا خبروں کا بلیٹن سامی زبان میں نشر ہوتا ہے۔ ان کی زبان کی ترویج کے لیے ریڈیو اسٹیشن بھی ہے۔ چھوٹے پیمانے پر کئی اخبارات نکلتے ہیں۔ سویڈن میں سامی بولی کا ایک روزانہ اور کئی ہفتے وار اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ بچوں کے لیے ٹی وی پر سامی بولی کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ سامی زبان میں ٹی وی ڈرامے بنتے اور نشر ہوتے ہیں۔ فلمیں بھی بنتی ہیں اور موسیقی کا رواج بھی ہے۔

اگرچہ آج سامی گیتوں کو گانے پر پابندی نہیں مگر کبھی یہ بھی معتوب تھے۔ نثری بات کو غنائیت سے بیان کرنے کی سامی لوک گیت روایت yoik کہلاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ناروے میں 1773ء سے 1958ء تک اس پر پابندی تھی۔ 1988ء میں ان پر پہلی بار تعلیم کے دروازے کھلے، جس میں وہ اپنی زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل سے نصف بعد تک روسی حکام سامیوں کے ایک سے دو سال کے بچوں کو سرکاری تحویل میں لے کر، ماں باپ اور خاندان سے علیحدہ رکھ کر ان کی تربیت کرتے تھے۔ انہیں کمیونسٹ معاشرے کا فرد بنانے کی یہ کوشش سامی زبان کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوئی۔ جب ان بچوں کی عمریں پندرہ سے سترہ سال کی ہوتی تھیں، تب انہیں آزاد کیا جاتا تھا۔ جس کے بعد وہ مکمل طور پر اپنی ماں بولی اور رسم و روایت سے دور ہو کر خود کو صرف 'سوویت کمیونسٹ شہری' سمجھتے اور روسی زبان بولتے تھے۔ آج روسی حدود میں واقع سامی بولی لگ بھگ ختم ہو چکی ہے۔

سامی زبانوں اور بولیوں کی تعداد دس ہے جس میں اس وقت سب سے زیادہ بولی اور پڑھی جانے والی زبان 'شمالی سامی' ہے۔ یہ زبان بولنے والوں کی کل تعداد پندرہ ہزار سے کچھ زیادہ ہے جبکہ 'تر سامی' بولی بولنے والے صرف دو سامی زندہ بچے ہیں۔ اسی طرح 'اُم سامی' اور 'پٹ سامی' بولیاں بولنے والوں کی کل تعداد بالترتیب بیس، بیس نفوس پر مشتمل ہے۔

ناروے میں، سامی زبان میں ہر سال کئی ادبی کتابیں شائع ہوتی ہیں مگر اس کے باوجود زبان کی بقا کو لاحق خطرات سنگین ہیں اور بِلو جیسے لوگوں کے خدشات سو فیصد درست ہیں۔ لسانی ماہرین نے سامی بولیوں اور زبانوں کو خطرات سے دوچار قرار دیا ہے اسی لیے جن ملکوں میں سامیوں کی بولی لکھی اور پڑھی جاتی ہے، وہاں سرکاری طور پر اسے 'بقا کو لاحق خطرات سے دوچار' endangered قرار دیا جا چکا ہے۔ معدومی کے خطرے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ سامی صرف اُن زبانوں میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جو وہاں کی سرکاری زبان ہے۔ دوسرا یہ کہ سامیوں کی نئی نسل، نئی تہذیب و زبان کی دلدادہ ہے اور وہ جس زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اُسی کو اپنا چکے ہیں۔ سامی بولیوں اور زبانوں کا جو حال ہے، وہ اقوامِ متحدہ کے ادارے یونیسکو کی مادری زبانوں سے متعلق 'بقا کو درپیش خطرات' اور 'معدومی' کی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں داغستانی عورتوں کی بددعا ان سامیوں کو نہ لگ جائے۔

بِلو ناروے کے ان چند ہزار سامیوں میں شامل ہیں جو اب تک رینڈیئرز پالتے ہیں اور پرانے طرز کی روایتی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنی رسمیں اور تہوار بھی پرانے انداز سے مناتے ہیں۔ ان کی زندگی رینڈیئرز سے جڑی ہے۔ انہیں یقین ہے کہ رینڈیئرز اور اُن کا ساتھ مرتے دم تک قائم رہے گا مگر اُن کے بعد...... یہ بِلو جیسے قدامت پسند سامیوں کے سامنے کھڑا وہ سوال ہے جس کا جواب انہیں معلوم ہے یعنی...... معدومی۔ کبھی سامیوں کی تعداد لاکھوں میں تھی مگر اب یہ صرف ستر ہزار کے قریب بچے ہیں۔ ''یہ ستر ہزار سامی کب تک اپنی بقا کی جنگ لڑ سکیں گے؟'' میں نے بِلو سے سوال کیا۔

''شاید اپنی آخری سانس تک......'' بِلو نے افسردگی سے جواب دیا۔ ''ان کے بعد تو صرف نارویجین ہوں گے، سامی اور رینڈیئرز کا رشتہ تو کہانی کی صورت صرف کتابوں میں رہ جائے گا۔ جسے لوگ سردیوں کی راتوں میں آتشدان کے سامنے بیٹھ کر پڑھیں گے ویسے ہی جیسے ہم آج فرعون، رومن اور انکا تہذیبوں کی داستانیں پڑھتے ہیں۔ کسے پتا

کہ کب وہ وقت آجائے کہ جب ہماری مادری بولی بھی دنیا کی اُن زبانوں میں شامل ہو جسے بولنے اور سمجھنے والا دنیا میں کوئی باقی نہ بچے۔ مجھے نئی نسل سے امید نہیں کہ وہ اپنی بولی کی بقا کے لیے کچھ کریں گے۔ یہی رجحان رہا تو بہت جلد ہماری بولی......" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی اور دیوار پہ لگی رینڈیئرز، اپنی ماں اور اپنے بچپن کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگے۔ اُس تصویر میں بلو کی عمر اتنی ہو گی کہ جس میں بچہ ماں بولی سیکھنا شروع کرتا ہے۔ میں نے پہلے تصویر اور پھر اُن کے چہرے پہ نظر ڈالی۔ ماں بولی تو وہ جانتے تھے مگر اس کے مستقبل پر خود انہی جیسے سامیوں کی اولادوں نے سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔

"یہ بہت تشویش کی بات کہی ہے تم نے۔" میں نے بلو کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ "چلو میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں۔ وہ کچھ کچھ تمہاری بات سے ملتا جلتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے قصہ کہنا شروع کیا۔

"روس میں شامل ایک پہاڑی ریاست ہے داغستان، وہاں کے قدیم باشندوں کی زبان آوار کہلاتی ہے۔ یہ ریاست کبھی سوویت یونین کا حصہ تھی، آج بھی روس میں شامل ہے۔ داغستان کی آوار بولی بولنے والوں کی تعداد رسول حمزہ توف کے مطابق کُل پندرہ ہزار تھی۔ رسول حمزہ توف داغستان کے وہ مشہور ادیب ہیں جنہیں صرف روسی فیڈریشن میں ہی نہیں، دنیا کے بڑے ادیبوں کی صف میں شامل کیا جاتا ہے۔ جب انہوں نے اپنی یادداشتوں پہ مشتمل کتاب 'میرا داغستان' لکھی تو لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ اسے روسی زبان میں لکھیں تاکہ لوگوں کی بڑی تعداد پڑھ سکے مگر انہوں نے منظور نہ کیا اور آوار زبان میں سوانح لکھی۔ ماں بولی میں لکھی یہ کتاب سورج کی طرح ادب کے آسمان پر چمکی اور کم و بیش چالیس برس سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ کتاب مصنف کی موت کے بعد بھی زندہ ہے اور دنیا بھر کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ رسول حمزہ توف نے لکھا ہے "بولی کا چھن جانا یا چھین لیے جانا عذابِ الٰہی ہے اور بددعا بھی۔ میں نے یہ بددعا دو عورتوں کو، ایک دوسرے کو دیتے ہوئے سنا تھا۔ ایک عورت دوسری کو کہہ رہی تھی خدا تیرے بچوں کو اس انسان سے محروم کردے جو انہیں، اُن کی بولی سکھاتا ہے۔ یہ سن کر دوسری عورت نے بھی بددعا دیتے ہوئے کہا خدا کرے تمہارے ہاں ایک بھی ایسا انسان باقی نہ بچے جو تمہارے بچوں کو، تمہاری مادری بولی سکھا سکے۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ بلو بڑے غور سے سُن رہا تھا۔

"آج حمزہ بہت یاد آئے۔ آوار میں لکھی 'میرا داغستان' کا ترجمہ میں نے بھی پڑھا تھا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد یہ کہتے ہوئے میں نے ایک بار پھر قصہ شروع کیا۔

"رسول حمزہ توف ماں بولی کے حوالے سے اپنی کتاب میں ایک واقعہ کچھ یوں بیان کر گئے ہیں کہ پیرس میں میری ملاقات ایک مصور سے ہوئی۔ یہ میرے آبائی وطن داغستان کا رہنے والا تھا۔ مصور انقلابِ روس کے بعد تعلیم کے لیے اٹلی گیا تھا اور وہیں ایک اطالوی خاتون سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ وہ پہاڑی مزاج کا انسان تھا اس لیے اسے نئے ماحول میں سمونے میں کچھ وقت تو ضرور ہوئی لیکن آخر وہ نئے ملک کے ماحول میں رچ بس گیا۔ اس نے خود کو اس نئے جہان میں بسانے کے لیے سیاحت کا سہارا لیا مگر وہ جہاں بھی گیا بے وطنی کا احساس اسے ستاتا رہا۔ میں نے اس سے تصویریں دکھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میرا مقصد یہ دیکھنا تھا کہ اس نے اپنے من کے خیالات اور جذبات کو کس طرح رنگوں کے سہارے کینوس پر منتقل کیا ہے۔ اس کی تصویروں میں ایک تصویر کا عنوان تھا 'وطن کی غمگین کر دینے والی یاد' اس تصویر میں ایک اطالوی عورت (جو مصور کی بیوی تھی) داغستانی لباس میں ملبوس ایک پہاڑی جھیل کے کنارے بیٹھی دکھائی گئی تھی۔ اس عورت کے ہاتھوں میں ایک صراحی تھی جس پر نقوش کندہ تھے۔ پس منظر میں پہاڑی علاقہ تھا جس کے دامن میں ایک چھوٹا سا آوار گاؤں دکھایا گیا تھا۔ مکانات پتھر سے بنے ہوئے تھے۔ اونچے اونچے پہاڑ جو گاؤں سے بھی زیادہ ویران اور تنہا دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑیوں کی چوٹیاں دھند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"دھند پہاڑوں کے آنسو ہیں" مصور نے وضاحت کی اور کہا "یہ دھند جب چھٹتی ہے تو قطرہ قطرہ بن کر جھیل میں آگرتی ہے اور یہ جھیل میں خود ہوں۔"

رسول حمزہ توف آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"ایک دوسری تصویر میں ایک چڑیا دکھائی گئی تھی جو ویران وادی میں ایک کانٹے دار جھاڑی کی ایک چھوٹی سی شاخ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسی عکاسی کی گئی تھی کہ جیسے چڑیا گا رہی ہے۔ برابر میں ایک گھر کے دروازے پر پہاڑی دوشیزہ نظر آرہی تھی جس کے چہرے سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ تصویر بہت دلکش لگی۔ تصویر میں میری دلچسپی دیکھ کر مصور نے کہا "یہ آوار کی ایک قدیم لوک کہانی پر مبنی تصویر ہے۔" یہ سن کر میں نے سوال کیا "کون سی لوک کہانی؟"

مصور نے کہا "یہ لوک کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک آدمی نے ایک پرندے کو پکڑ کر پنجرے میں قید کرلیا۔ یہ پرندہ دن رات وطن، وطن پکارتا رہتا تھا، ایسے ہی جیسے میں (مصور) پوری عمر وطن وطن کی صدائیں لگاتا رہا ہوں۔ ایک دن پرندے کو قید کرنے والے شخص کو خیال آیا کہ یقیناً پرندے کا وطن کوئی بہت حسین باغ یا کوئی خوبصورت وادی ہوگی، جہاں سرسبز و شاداب پہاڑ ہوں گے۔ یقیناً وہاں ایسے پرندے ہوں گے جو صرف بہشت میں ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ کیوں نہ اس پرندے کو آزاد کر کے اس کے پیچھے پیچھے جاؤں اور اس کے حسین وطن کا نظارہ کر آؤں۔ یہ سوچ کر اس نے پنجرہ کھول کر اسے اڑا دیا۔ پرندہ آزاد ہو کر ذرا سا اُڑا اور چند قدم دور جاکر ایک درخت کے سوکھے تنے پر بیٹھ گیا۔ یہ سوکھا درخت ایک بنجر اور ویران پہاڑی پر تھا، جس کی ایک خشک ٹہنی پر اس کا بسیرا تھا۔ میں (مصور) بھی اپنے پنجرے کی سلاخوں کے پیچھے سے اپنے وطن کو دیکھتا رہتا ہوں۔"

"تم اپنے وطن کیوں نہیں چلے جاتے؟"

یہ سن کر مصور کہنے لگا "اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں اپنی بوڑھی ہڈیوں کو لے کر کس منہ سے وطن کو جاؤں؟"

آگے کی بات رسول حمزہ توف کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"پیرس سے واپسی کے بعد میں نے داغستان میں مصور کے ورثا کی تلاش شروع کردی۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کے رشتے دار حیات تھے۔ میرے آنے پر مصور کے تمام رشتے دار گاؤں کے ایک گھر میں جمع ہوئے تاکہ میں انہیں گمشدہ عزیز کا احوال سنا سکوں۔ رشتے داروں نے مصور کا ترکِ وطن کا جرم معاف کردیا تھا۔ انہیں خوشی تھی کہ وہ زندہ و سلامت ہے۔ اچانک باتیں کرتے ہوئے مصور کی ماں نے مجھ سے پوچھا "تم نے تو اس سے آوار بولی میں ہی بات چیت کی ہوگی؟"

میں نے جواباً کہا "نہیں ہم نے مترجم کی مدد سے گفتگو کی کوشش کی، میں بات چیت کر رہا تھا اور وہ فرنچ میں۔"

یہ سنتے ہی اس عورت نے اپنے چہرے پر اس طرح سیاہ نقاب ڈال لی جیسے کہ مقامی عورتیں جوان بیٹوں کی موت کی خبر سن کر کیا کرتی ہیں۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور میں گھر کی چھت پر گرتی ہوئی بوندوں کی آواز تک سن رہا تھا۔ ہم آوار میں تھے اور وہاں، دنیا کے دوسرے کنارے پر پیرس میں اس ماں کا مصور بیٹا اپنے جرم پر پشیمان ہو رہا تھا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے" کافی دیر کی خاموشی کے بعد مصور کی ماں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "میرے بیٹے کو مرے ہوئے کئی سال بیت چکے ہیں۔ جس سے تم ملے ہو، وہ میرا بیٹا ہی نہیں ہے، میرا بیٹا تو اس زبان کو کبھی بھلا ہی نہیں سکتا، جو میں نے اسے سکھائی تھی۔"

میں نے قصہ ختم کیا اور بلو کی طرف دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ خاموش تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی اُس وقت مصور کی ماں کی طرح سوچ رہا ہوگا...... فیصلہ کرنے کی گھڑی تو سر پر آچکی تھی...... بولی یا پھر معدومی کی بددعا۔

☆☆☆

وہ موسم بہار کی خوشگوار صبح تھی!

چند روز پہلے ہی ہم طویل سفر کر کے بلو کے رینڈیئر فارم پہ پہنچے تھے، جہاں پر بچھڑوں کے کان پہ نشان گودنے کے بعد انہیں سرسبز گرمائی چراگاہوں تک پہنچاتا تھا۔ صبح سویرے کا وقت تھا۔ بلو رینڈیئرز کے درمیان گھوم رہا تھا۔ میں بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اچانک رینڈیئرز زور زور سے چلانے لگے۔ بلو بڑے سکون سے گھٹنوں کے بل اُن کے درمیان بیٹھ گیا اور چلانے والے ایک بچھڑے کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کر کے خود بھی زور زور سے کچھ گانے لگا۔ اُس کے حلق سے نکلنے والی آوازیں ایسی تھیں کہ جیسے وہ اونچی لے اور سُر میں سامی بولی کا کوئی لوک گیت گا رہا تھا۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ بعد میں بلو نے بتایا "یہ ہمارا وہ گیت ہے جو گرمائی چراگاہوں پر رینڈیئرز کو لے جاتے وقت ہانکا کرنے سے پہلے گاتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ میرے بیوی بچوں جاگ جاؤ، روانگی کا وقت آگیا ہے۔"

خیر...... اس گیت سے بلو کے بیوی بچے کیا جاگتے، انہیں جگانے کے لیے حلق پھاڑ کر چلانے کی نہیں، گاڑی کے ہارن یا موبائل فون کی ایک کال ہی کافی تھی مگر پھر بھی بلو ٹھہرا قدامت پسند اور روایتوں کا امین، اسے یہ گیت اچھا لگتا تھا۔

"اس گیت کو کیا کہتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"شیطانی گیت......" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

"کیا......!" میں یہ سن کر ششدر رہ گیا۔

''گھبراؤ مت، یہ میں نہیں؛ وہ کہتے ہیں جو لوتھر کے عیسائی عقیدے کو مانتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ رُکا اور پھر پورا قصہ تفصیل سے سنانے لگا۔ بلو بتا رہا تھا۔ ''یہ انیسویں صدی کے آخر کی بات ہوگی جب امریکی مشنری کے باعث یہاں لوتھر کا مذہبی عیسائی نظریات کا پرچار ہوا۔ بڑی تعداد میں سامیوں نے اسے قبول کیا۔ جو اس نظریے کے پیروکار ہیں، وہ اس گیت کو 'شیطانی موسیقی' قرار دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں یہ گیت گانے اور یاد کرنے کی پابندی ہے۔ میری ماں بھی اسی نظریے پر کاربند تھی۔'' بلو کے مطابق ''میری ماں نے مجھے یہ گیت سکھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ میں کسی اور سے یہ گیت سیکھنے کی کوشش نہ کروں مگر میں مجبور تھا۔ مجھے سامی ثقافت و تہذیب، ہر مذہب، عقیدے اور قانون سے زیادہ پسند ہے۔ میں نے ماں سے چوری چھپے اپنے دادا دادی سے یہ گیت سیکھا۔ وہ خالص سامی تھے۔ وہ مرتے دم تک اپنے روایتی طریقۂ حیات اور رسم و رواج پہ کاربند رہے۔'' یہ کہہ کر بلو کچھ دیر کے لیے رُکا اور پھر کہنے لگا۔ ''مجھے ہر وہ سامی رسم و رواج یاد ہے جو میں نے دادا، دادی سے سیکھا یا اُن سے اس کے بارے میں سُنا تھا۔ میں ان کی سکھائی ہوئی باتوں پر عمل بھی کرتا ہوں۔ اسی کے باعث میرا یہ احساس زندہ ہے کہ میں تنہا نہیں۔ اب جو چاہے میرے گیت کو شیطانی کہے یا کچھ اور مگر مجھے پروا نہیں۔ میں نے اپنے بچوں کو بھی یہ گیت سکھا دیا ہے......''

''شیطانی گیت۔'' میں نے لقمہ دیا اور پھر ہم دونوں ہنس پڑے۔

اگرچہ آج اسکینڈے نیوین ممالک میں آباد سامیوں کی اکثریت عیسائیت پر کاربند ہے، تاہم اٹھارویں صدی عیسوی تک اُن کے مذہبی عقائد ماورائیت پر مبنی تھی، جسے 'شمان ازم' کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ عقیدہ شمالی امریکا میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ اس کے پیروکاروں کے لیے ماورائی قوتوں کا دعویدار کاہن عبادت کا مرکز ہوتا تھا۔

گزشتہ صدیوں، میں سامی اسکینڈے نیویا کے بہت وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے جس کے باعث ان کے مذہبی عقائد یکساں نہیں، اُن میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ قدیم سامی مذہبی عقائد میں جانور، ماورائی طاقتیں، زمین اور اشجار، سب عقیدے سے جُڑے ہوئے تھے۔ سامی مذہبی عقائد کے تاریخی تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ اُن کا مذہبی نظریہ 'وحدت الوجود' pantheism پر مبنی تھا جس پر بیک وقت مظاہر فطرت کے کئی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی۔ اُن کے ہاں ڈھول کی تاپ، منتر، جاپ اور دیگر اشیا کے ذریعے روحوں یا ماورائی قوتوں سے ہم کلام ہونے کا سلسلہ عام تھا۔

ناروے، سوئیڈن اور کئی دیگر مقامات پر چٹانوں پر ایسی کندہ کاریاں ملی ہیں جن کے نقوش سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہزاروں سال قبل بھی سامیوں کے مذہبی عقائد مظاہر فطرت اور ماورائیت کے گرد گھومتے تھے۔ تاریخی اعتبار سے سامیوں کو جنوب، شمال اور مشرق سے تشبیہ دے کر ان کی نسلی، لسانی اور مذہبی تقسیم کی جاتی ہے۔ سامیوں پر تحقیق کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ ماورائیت پر مبنی عقائد تینوں خطوں کے سامیوں کی یکساں قدر ہے۔ اگر کہیں تھوڑا بہت فرق ہے تو وہ بھی بہت معمولی جس کی وجہ لسانی یا پھر اُن کی جغرافیائی تقسیم ہے۔

اگرچہ سامی اٹھارویں صدی عیسوی تک اپنے قدیم مذہبی عقائد پر کاربند تھے جنہیں آج ماہرین بشریات Sami's Religion کہتے ہیں مگر تیرھویں صدی عیسوی میں ہی رومن کیتھولک مبلغین سامیوں کے دیس میں پہنچ کر عیسائیت کے پرچار میں مصروف ہوگئے تھے مگر اس کے باوجود انہیں اگلی کئی صدیوں تک اپنے مشن میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ میں رواج تھا کہ جادوگروں پر مقدمہ چلا کر انہیں موت کی سزائیں دی جاتی تھیں، جن پر عبرت ناک انداز میں عمل ہوتا تھا۔ سامیوں کے پُراسرار مذہبی عقائد کی بنا پر مبلغین نے انہیں بھی جادوگر قرار دیا۔ جس سے خوف زدہ ہوکر سامی اپنے گھروں میں چھپ چھپ کر عبادت کرنے پر مجبور ہوئے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں بے شمار سامیوں پر، باہر سے آنے والے مبلغین کے حکم پر چرچ کے تحت مقدمہ چلا اور انہیں جادوگر قرار دے کر زندہ جلا دیا گیا تھا۔

ناروے کے سامیوں کو عیسائی بنانے کی راہ 1720 میں عیسائی مبلغ تھامس وون ویسٹن کے ہاتھوں ہموار ہوئی۔ وہ اپنے دور میں سامی خانہ بدوشوں کا بہت بڑا طرف دار سمجھا جاتا تھا۔ سامی بھی اس پر بھروسا کرتے تھے۔ اس کے سمجھانے پر انہوں نے ہزار ہا سال پرانی اپنی مقدس عبادت گاہوں کو منہدم کیا اور معبدوں میں استعمال ہونے والے ہزاروں کی تعداد میں ڈھولوں کو تلف کیا۔ اب بھی ایسے ستر ڈھول موجود ہیں جو اس دور کے سامی معبدوں میں بجائے جاتے تھے۔ یہ تلف کیے گئے اُن ہزاروں میں سے صرف...... چند ہیں جو اب یورپ کے مختلف عجائب گھروں میں موجود ہیں۔

''میں عیسائی ہوں مگر مجھے لگتا ہے کہ ہمارا قدیم شمان ازم نیا روپ بدل کر لوٹ رہا ہے۔'' بلو کے شیطانی گیت گانے کے بعد ہماری گفتگو کا رُخ مذہب کی طرف مڑ گیا تھا۔ ''ہمارے قدیم مذہبی عقائد میں روحانی قوتوں اور ماورائی طاقت کے حامل کاہن کا بڑا کردار تھا۔'' بلو نے کہنا شروع کیا۔ ''سامی زبان میں شائع ہونے والے ناروے کے اتوار کے اخبار میں اب پھر سے ایسے عاملوں کے اشتہار شائع ہونے لگے ہیں جو روحانی قوتوں کے ذریعے شفایابی کے لیے خدمات پیش کرتے ہیں۔ سامی آبادیوں میں اب ایسے کئی عامل اکثر مل جاتے ہیں جو روحانی قوت کے بل بوتے پر مریضوں کا روحانی علاج کر کے انہیں ایسے امراض سے شفا بخشتے ہیں، جس کا علاج سائنس اور طب میں نہیں ہے۔ یہی ہمارا قدیم مذہب بھی تھا۔ رجعت پسند سامی ان کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ ان روحانی عاملین میں مرد اور عورت، دونوں شامل ہیں۔ عامل کو 'دانا مرد' اور عاملہ کو 'دانا عورت' کہا جاتا ہے۔ بس ایک فرق ہے......''

''وہ کیا۔'' میں نے تڑپ کر سوال کیا۔

''پہلے کے روحانی عامل نہ جانے کیا جنتر منتر پڑھتے تھے مگر آج کے یہ عامل بائبل کے مقدس الفاظ بدبداتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اب عیسائی معاشرے میں بائبل سے علاج کی کوئی سزا تو نہیں دی جاسکتی۔'' یہ کہہ کر وہ رُکا اور چند لمحوں کے بعد ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہ ہے قدیم سامی عقیدے کا جدید روپ میں احیا۔''

''چلو ایک بار پھر شیطانی گیت سنا دو۔'' میرے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ وہ ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگا۔ میں بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ دوسری طرف رینڈیئر بھی زور زور سے چلا رہے تھے۔ شاید انہیں بھی وجہ سمجھ آگئی ہو۔ آخر تھے تو وہ بھی سامیوں کے صدیوں کے ساتھی۔

☆☆☆

بلو گھپ ہر سال اپنی جیپ پہ سوار ہو کر پہاڑی ڈھلوانوں، گھاٹیوں اور برف زاروں کا طویل سفر طے کر کے رینڈیئر والے بیابانوں میں اپنے سیکڑوں کی تعداد

فتاویٰ عالمگیری

شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر نے علمائے دہلی کے علاوہ سلطنت کے اطراف و اکناف سے ایسے علما جمع کیے جنہیں علم فقہ میں کامل دستگاہ تھی اور انہیں حکم دیا کہ مختلف کتابوں کی مدد سے ایک ایسی مستند اور جامع کتاب تیار کریں جس میں نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ تمام فقہی مسائل جمع کیے جائیں تاکہ قاضی اور مفتی، نیز دیگر تمام مسلمان علم فقہ کی بہت سی کتابیں جمع کرنے اور ان کی ورق گردانی کرنے سے بے نیاز ہوجائیں۔ اس جماعت میں شیخ نظام، قاضی محمد حسین جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپاموی، مُلا حامد جونپوری، مُلا محمد اکرم لاہوری، جلال الدین محمد، سید محمد قنوجی، شیخ رضی الدین بھاگل پوری، محمد جمیل صدیقی، قاضی غلام محمد لاہور، شاہ عبدالرحیم دہلوی، مولانا محمد شفیع سرہندی، قاضی محمد غوث اور دیگر علمائے کبار شامل تھے۔ ان لوگوں نے کم و بیش آٹھ سال کی مدت میں فتاویٰ کی ایک ضخیم کتاب تیار کی جسے شہنشاہ کے نام پر ''فتاویٰ عالمگیری'' کہا گیا۔ اس کتاب کی تالیف، علما و فقہا کے وظائف، نیز دیگر اخراجات پر عالمگیری سکے کے دو لاکھ روپے صرف ہوئے۔ کتاب کی تالیف پورے انضباط کے ساتھ عمل میں آئی۔ کام کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا، جن میں سے ہر حصہ ایک عالم کے سپرد ہوا اور عالم کی امداد اور اعانت کے لیے دس اور علما مقرر کیے گئے۔ صدارت کے فرائض شیخ نظام برہان پوری کے سپرد تھے۔ اورنگزیب عالمگیر خود بھی تالیف کے کام میں دلچسپی لیتے تھے اور ایک زمانے میں تو شیخ نظام دو چار صفحے لے کر شہنشاہ کو سنایا کرتے تھے، جو موقع بموقع تنقید کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ فروگزاشتوں اور خامیوں کو دور کرنے کے لیے کتاب کی تکمیل کے بعد پورے مسودے پر نظر ثانی بھی کی گئی۔ انہی احتیاطوں کا نتیجہ ہے کہ ''فتاویٰ عالمگیری'' ایسی ضخیم کتاب اغلاط اور نقائص سے بڑی حد تک پاک ہے۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ دستیاب ہے۔

مرسلہ: احمد شاہ کوہاٹ

محمد احمد مہدی سوڈانی

(1809-1885ء)

محمد احمد مہدی سوڈانی کے والد کا نام عبداللہ، والدہ کا نام آمنہ تھا۔ وطن، شمالی سوڈان کا شہر دنقولا تھا۔ مہدی نے [illegible] برس کی عمر میں اپنی والدہ سے قرآن حفظ کیا۔ اور پھر خرطوم کے مدرسہ خوجلی میں اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے بعد [illegible] ہدایت پر فرقہ سمانیہ کے بزرگ حضرت علی قاس کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ ایک عرصہ کے بعد مہدی کو اپنے مرشد [illegible] اس بنا پر اختلاف ہو گیا کہ سوڈان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور انگریزوں نے دینی مدارس بند کرا دیے تھے۔ ان حالات [illegible] مہدی سوڈانی نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو صرف محراب و منبر کی زینت نہیں بننا چاہیے، میدان میں نکل کر انگریز کے خلاف [illegible] کرنا چاہیے۔ مگر ان کے مرشد خانقاہ سے باہر نکلنے کے مخالف تھے۔ یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ مہدی نے مرشد سے قطع [illegible] کرلیا۔ عرصہ ایک غار میں قیام کیا۔ ہمنواؤں کی جماعت پیدا کرلی بیعت لیتے وقت انگریز کے خلاف جہاد کی شرط منوا [illegible] چنانچہ پچاس ہزار مریدوں کو مہدی نے مسلح کیا اور علم بغاوت لہرایا۔ مختلف محاذوں پر مہدی نے انگریز کے خلاف تیرہ جنگ [illegible] لڑیں اور ہر لڑائی میں انگریز... فوج کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ 1880ء میں مہدی سوڈانی بلاشرکت غیر سوڈان کا حکمران [illegible]

گیا اور 22 جون 1885ء کو یہ عظیم انسان دنیا سے رخصت ہو گیا۔ چالیس ہزار مسلمان اس کے جنازہ میں شریک ہوئے۔ مہدی کی وفات کے بعد انگریزوں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے سوڈان پر پھر فوج کشی کی اس حملے کا کمانڈر مشہور لارڈ کچنر تھا۔ خلیفہ عبداللہ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر مسلمان اندرونی خلفشار اور جامعہ ازہر کے علماء کے فتوئ کفر کی وجہ سے پسپا ہو گئے۔ جامعہ ازہر کے علماء نے مہدی سوڈانی کی تحریک آزادی کو خلاف اسلام اور مہدی کو کافر قرار دے دیا انگریزوں نے اس فتوئ کو گھر گھر پہنچایا اور زر خرید لوگوں کے ذریعے مہدی کی تحریک کو ناکام بنا دیا۔ 1890ء میں لارڈ کچنر سوڈان پر دوبارہ قابض ہوا تو اس نے مہدی کی قبر کھدوا کر اس کی لاش نکالی، سر کاٹا، اور سر کی نمائش کرائی۔ پھر اس کے مقبرے کو توپوں کی گولہ باری سے تباہ کر دیا۔ مہدی کا سر جنرل گورڈن کے بھتیجے کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ مزید انتقام لے سکے۔ مہدی نے اپنے دور حکومت میں اسلامی شعائر کی تعمیل کو اولیت دی تھی۔ باجماعت نماز ادا نہ کرنے والوں کو کوڑے مارے جاتے، بلا شرعی عذر کے روزہ نہ رکھنے والوں کو قید کر دیا جاتا تھا۔ عورتوں کا بازاروں میں پھرنا ممنوع تھا۔ شادی بیاہ کی رسمیں سادہ ترین ہو گئی تھیں۔ تین سو سوڈانی سکہ سے زائد جہیز دینا حکماً بند کر دیا تھا اور حق مہر کی شرح تیس سوڈانی سکہ مقرر کر دی تھی۔ قرآن مجید حفظ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری تھا۔ بڑی بڑی جاگیریں ضبط کرلی تھیں۔ غربا کو بیت المال سے وظائف ملتے تھے۔

مرسلہ: امتیاز احمد، پھالیہ

میں پالتو رینڈیئر کے ریوڑ تک پہنچتے ہیں۔ یہاں بلزو اور ان کی بیوی اور بچے مل جل کر نئے بچھڑوں کے کان پہ اپنا خاندانی نشان گودتے ہیں تاکہ ان کا ریوڑ کسی اور کے ریوڑ میں شامل نہ ہو جائے۔ جس کے بعد سیکڑوں نہیں، ہزاروں کی تعداد میں رینڈیئر کی سرسبز گرمائی چراگاہوں کی طرف ہجرت شروع ہوتی ہے۔

رینڈیئروں کی ہجرت کا عمل بھی بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ باڑ والے علاقوں کے گیٹ کھول دیے جاتے ہیں اور پھر اُس کے بعد ہانکا ہوتا ہے۔ اُن کے آگے آگے کتے دوڑتے ہیں اور پیچھے جیپ سوار سامی...... کچھ سامی جیپوں پر سوار ہو کر، اُن کے دونوں طرف چلتے ہیں کہ کہیں ریوڑ بھٹک نہ جائے۔ کھڑے کانوں والے شکاری کتے راہ میں انہیں درندوں کا شکار بن جانے یا شوقین شکاریوں کا نشانہ بن جانے سے بچاتے ہیں۔ میدانوں، پہاڑی ڈھلوانوں، ندی نالوں اور جنگلوں سے یہ ہزاروں رینڈیئر قلانچیں بھرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اُن کے پاؤں کی تھاپ دور سے ہی سنائی دیتی ہے۔

رینڈیئر کی کھال سے بنے گرم کوٹ پہنے سامی بچے اس نظارے کو بہت حیرت سے دیکھتے ہیں۔ بلزو کہتے ہیں کہ کبھی یہ نظارہ ہمیں بتاتا تھا کہ ہمارا رینڈیئر سے کیا رشتہ ہے۔ ہم بڑے ہو کر یہ رشتہ نبھاتے تھے مگر نئی نسل کے بچوں کے۔ یہ نظارہ جذباتی سے زیادہ ایڈونچر ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر رکے اور سرد سانس بھر کے کہنے لگے۔ ''روایت سے جذبات نکال دو تو وہ واقعی ایڈونچر بن جاتا ہے۔ وقت بدل رہا ہے۔ نئی نسل کو شاید ہی یہ بات سمجھ آئے کہ رینڈیئر اور سامی کے درمیان جذبات کا کتنا اہم رشتہ ہے۔''

بلزو قدامت پسند ہیں اسی لیے اپنی روایت کے مستقبل کو لاحق خطرات کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں۔ ''مجھے خدشات لاحق ہیں اسی لیے میں نے اپنے بچوں کو وہ سب کچھ سکھایا ہے جو میں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ یہ ہمارا روایتی علم تھا جو میرے سامی بزرگوں سے سینہ بہ سینہ ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا۔ برف گاڑی سے لے کر رینڈیئر پالنے اور ان کی نگہداشت تک، میں سب کچھ اپنے بچوں کو باریک بینی سے سکھا رہا ہوں۔ انہیں اپنے تجربات بتاتا ہوں۔'' جس وقت بلزو یہ بات کہی، اُس وقت وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو سکھا رہے تھے کہ رینڈیئر بچھڑے کے کان پر کس طرح ان کا خاص امتیازی نشان گودا جاتا ہے۔ جب بلزو یہ کہہ رہے تھے

اُس وقت اس کا بڑا بیٹا نہایت انہماک سے اپنے تیز دھار نوکیلے چاقو کی مدد سے بچھڑوں کے کانوں پہ نشان گودنے میں مصروف تھا۔ بچھڑوں کے کان خون آلود تھے۔ یہ زخم تو جلد ٹھیک ہو جائیں گے مگر نشان کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کہ مرنے کے بعد رینڈیئر کی کھال پہ گودا ہوا یہ نشان، اس کی کھال سے بنے کسی کوٹ کی اوپری جیب پر نظر آ رہا ہو۔ دنیا کے سرد ترین خطے میں رینڈیئر کی کھال صدیوں سے انسانوں کے جسم کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے۔ جدید دور میں اس کی کھال سے بنا قیمتی کوٹ پہننا مہنگا فیشن ہے۔ سامیوں کے علاوہ بہت کم لوگ رینڈیئر کی کھال کا کوٹ پہننے کی سکت رکھتے ہیں۔ خیر سامیوں کی بات کیا، اُن کے لیے تو رینڈیئر 'گھر کی مرغی دال برابر' والا معاملہ ہے۔ خوراک ہو یا سردی سے بچاؤ...... سامی تو صدیوں سے رینڈیئر پہ انحصار کرتے آئے ہیں۔

''بچے ہی ثقافت کو آگے لے کر چلتے ہیں، میں اپنی سامی ثقافت اپنے بچوں کو نہایت ایمانداری سے منتقل کر رہا ہوں۔'' بلزو نے چائے کے وقفے کے دوران کہا۔ ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت ہمارے بچوں پر غیر سامی ثقافت و تہذیب کا گہرا دباؤ ہے۔ وہ انہیں قبول کر رہے ہیں مگر میری پوری کوشش ہے کہ کم از کم اپنا ورثہ اپنی اولاد تک منتقل کر دوں تاکہ مجھ پر کوئی بوجھ نہ رہے۔ اس کے بعد وہ جانیں اور اُن کا کام، مجھے تو تسلی رہے گی کہ میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔''

بلزو اور انگرڈ کے خاندان کی طرح رینڈیئر کی گلہ بانی سے وابستہ سامیوں کی بڑی تعداد اب شہری علاقوں کے ادریب قریب بستی ہے۔ اُن کے گھر ناروے کے دیگر غیر سامی باشندوں کی طرح پُر آسائش اور جدید سہولیات سے آراستہ ہیں۔ گھروں میں انٹرنیٹ اور ٹیلی وژن ہیں۔ سٹیلائٹ ٹی وی چینلوں کی نشریات دیکھنے کے لیے ریسیور موجود ہیں۔ اب ایسے میں غیر سامی تہذیبی اثرات سے بلزو جیسے لوگ کب تک اپنی نئی نسل کو بچا کر رکھ سکتے ہیں۔

''مجھے یقین تو نہیں مگر امید ہے کہ میرے بچے اپنی سامی تہذیب، ثقافت اور رینڈیئر گلہ بانی کی روایت کو زندہ رکھیں گے۔'' چائے پینے کے دوران بلزو نے اپنے پانچ بچوں میں سے تیسرے نمبر کی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ایک بچھڑے کو قابو کر کے اس کے کان پہ نشان گود رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چاقو تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ موبائل فون کان پہ لگائے کسی سے باتیں بھی کیے

جارہی تھی۔
"سچ کہتے ہو بلو...... سامی تہذیب و ثقافت پر جدید دنیا کے اثرات کا دباؤ بہت زیادہ ہے۔"

اُس نے یہ سن کر غور سے مجھے دیکھا اور پھر بیٹی کی جانب نظریں گھمائیں اور سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ تہذیبوں کے مابین کشمکش اور روایات و ثقافت کی جنگِ بقا میں اکثر قدامت پسند آخر میں سر جھکا ہی دیتے ہیں معدومیت کے سامنے۔ یہی اصولِ ارتقا اور تہذیبی تاریخ کا بیان کردہ تجربہ ہے۔

سامی باشندے اور اُن کی دم توڑتی قدیم تہذیب اس وقت متعدد سنگین خطرات کا سامنا کر رہی ہے۔ اب ایک نوجوان رینڈیئر گلہ بان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا کوئی سامی لڑکی اپنی قوم کے اُس لڑکے کو جیون ساتھی بنانا پسند کرے گی جو رینڈیئر سنبھالنے کے سوا کوئی کام نہیں جانتا۔

"نہیں......" اِنگرڈ نے میری بات سن کر دوٹوک انداز میں جواب دیا تھا۔ "سامی لڑکیاں اب پڑھ لکھ کر اپنا مقام بنانا چاہتی ہیں، نارویجین لڑکیوں کی طرح۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کچھ کرنا چاہتی ہیں۔ وہ یہ پسند نہیں کرتیں کہ ایسی زندگی بسر کریں جو اُن کی سامی ماں نے گلہ بان سامی شوہر کے ساتھ بسر کی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں خواب ہیں۔ یہ خواب انہیں جدید نارویجین تعلیم، ٹی وی، انٹرنیٹ اور شہری ماحول نے دکھائے ہیں۔"

"اس چکر میں نوجوان لڑکے بھی گلہ بانی سے دور بھاگ رہے ہیں۔" بلو نے بیوی کی بات آگے بڑھائی۔ "ہماری زبان تو مر ہی رہی ہے۔ اب ایک بات یاد رکھیں اگر رینڈیئر کی گلہ بانی ختم ہوئی تو پھر سامی تہذیب بھی مکمل طور پر معدوم ہو جائے گی۔"

☆☆☆

موسمِ سرما کا اختتام اور بہار کا آغاز ہونے والا تھا۔ اُس سال میں سویڈن میں تھا۔ ایک روز صبح سویرے میں اور سوین اسکاجی برف پہ چلنے والی موٹر گاڑی لے کر رینڈیئر کے سرمائی میدانوں کی طرف جارہے تھے۔ سویڈن کے انتہائی شمال کی شدید سردی تھی اور ہم برف زار پر اپنی گاڑی دوڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ "اب ہم تھوڑی دور رہ گئے ہیں۔" سوین نے ایک جگہ مجھ سے کہا۔

تاحدِ نظر برف کا بیاباں تھا۔ اچانک اس نے گاڑی روکی اور دائیں طرف دیکھنے لگا اور پھر گاڑی سے باہر نکل کر مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم آگے بڑھے ... پر دو مردہ رینڈیئر پڑے تھے۔ برف سے ان کے ... سفید ہو چکے تھے۔ ٹھنڈ نے انہیں جما دیا تھا۔ مرنے ... برف زار کے کسی درندے نے انہیں کھانے کی بھی کوشش ... تھی، جس کے نشانات اُن کے مُردہ جسموں پر صاف ... رہے تھے۔ سوین بہت افسردہ تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھ ... اور ایک کا سر اٹھا کر کان دیکھنے لگا۔

"یہ تو میرا ہے؟" وہ چلّایا۔ پھر اس نے دوسرے ... گردن اٹھائی۔ "یہ میرے کزن کا ہے۔" سوین نے کان ... گودے نشانوں کی مدد سے انہیں پہچان لیا تھا۔

کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد ہم آگے چل پڑے۔
"ہم لاکھ کوشش کرتے ہیں مگر کیا کریں، سردیوں میں خوراک کی قلت ہو ہی جاتی ہے۔" اس نے کافی دیر ... خاموشی کے بعد مجھ سے بات کرنا شروع کی۔ "ایک رینڈیئر خوراک کے بغیر تین چار دن زندہ رہ سکتا ہے۔ میرا بہت ... ریوڑ ہے جس کی دیکھ بھال کے لیے کئی نوجوان سامی چرواہے ہیں مگر......" وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ بات شروع کی۔ "میں نئی نسل کے گلہ بانوں کو سب کچھ سکھانا چاہتا ہوں جو سامیوں کا اصل علم ہے۔ ہمارے اجداد کا علم ہے جو سینہ بہ سینہ چلتا ہوا مجھ تک پہنچا۔ میں انہیں یہ سب کچھ منتقل کرنا چاہتا ہوں مگر ان دو رینڈیئرز ... موت سے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یا تو میں اب تک ان ... درست رہنمائی میں ناکام ہوا ہوں یا پھر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ دنیا میں رومن اور اس جیسی کئی عظیم الشان تہذیبیں تھیں مگر ... گئیں کہیں ہم بھی......" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ پایا ... رکا، گہری سانس لی اور پھر افسردہ مسکراہٹ لبوں پہ سجا کر کہنے لگا۔ "یہی زندگی ہے۔"

رینڈیئر اور سامی ...... دونوں ایک دوسرے میں گندھے ہوئے ہیں۔ سامی بولی میں رینڈیئر گلہ بان کو ... کہا جاتا ہے اور زندگی کو 'ایلِن'۔ "ایلو کے بغیر ایلِن کی کوئی حیثیت نہیں۔"

"سچ کہہ رہے ہو سوین......" میں نے سرد آہ بھر کر ... شروع کیا۔ "یہی زندگی ہے۔" اُس روز یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔

17 جولائی 1889ء کو میاچوسس، امریکا میں پیدا ہونے والے ارل اسٹینلے گارڈنر نے ہزارہا کردار تخلیق کیے اور اس کا ذہنی سوتا کبھی خشک نہیں ہوا۔ ایک زمانے میں جب عدالتوں کے وکیل اور جج کسی مقدمے کے دوران کسی مرحلے پر دشواری محسوس کرتے تو اس سے درخواست کرتے کہ وہ عدالت میں آئے اور قانونی پیچیدگیوں کو اپنے ناخنِ تدبیر سے سلجھائے۔ فیصلہ کرے کہ مجرم کون ہے اور بے جرم کون۔ مصنف کی حیثیت سے اس نے نو مختلف ناموں سے اپنے رشحاتِ قلم قارئین کو پیش کیے، جن میں کائل کورنل، اے اے فیئر، چارلس ایم۔ گرین، کارلٹن کینڈریک، چارلس جے کینی، رابرٹ پار، لیس ٹلرے شامل ہیں۔ اس کے کردار پیری میسن، برتھا کول اور ڈونلڈ لیمب نے عرصے تک دھوم مچائے رکھی۔ جاسوسی ناولوں کے مشہور مصنف ابن صفی کا کہنا تھا کہ گارڈنر انگریزی فکشن کا بہت بڑا مصنف تھا، اس لیے ...... سر آرتھر کانن ڈائل نے جاسوسی ناول کی جو حد بندی کر دی تھی اور جس حد بندی سے وہاں کے رائٹر برسوں تک باہر نہیں نکل

ہر دل عزیز

شکیل ادریس

اس کا نام محتاج تعارف نہیں کیونکہ اس نے سرّی ادب کی تعمیرِ نو میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسرار و تجسّس سے بھرپور، سراغ رسانی کی تہ در تہ کہانیاں لکھ کر وہ عوام کا پسندیدہ مصنف بن گیا تھا۔ اس کے ناول "ہاٹ کیک" کی طرح بکتے تھے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کے ناول ترجمہ ہو کر عوامی پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

ایک ہر دل عزیز مصنف کا تذکرۂ خاص

سکے، اسے ارل اسٹینلے گارڈنر نے توڑ ڈالا۔ اس کا وکیل محدب عدسہ لے کر بال کی کھال نہیں نکالا کرتا تھا، عدالت میں مجرم پر ایسی جرح کرتا تھا کہ وہ چوکڑیاں بھول جایا کرتے تھے۔

اس کے والد چونکہ کان کن تھے، لہٰذا وہ اپنے خاندان کو ہمیشہ سفر کی حالت میں رکھتے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ رہنے سے گارڈنر کے مشاہدات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ کان کنی کو اس نے نہایت خوب صورتی سے اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ اس کا باپ اسے کولنڈائک جیسے دور دراز علاقے میں بھی لے گیا۔ جہاں کوئی جانا پسند نہیں کرتا۔ 1909ء میں اس نے پالو آلٹو ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد تقریباً ایک سال تک والپا یونی ورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کی اور پھر جب اس کے اساتذہ نے یہ دیکھا کہ وہ تعلیم کی بجائے باکسنگ کے ایسے مقابلوں میں حصہ لے رہا ہے جو غیر قانونی ہوتے ہیں تو انہوں نے اسے یونی ورسٹی سے نکال دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ طالب علموں کو پڑھائی کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ اس کے پسِ پردہ یہ بات تھی کہ اس نے غصے میں آکر ایک پروفیسر کے منہ پر مکے مارے تھے۔ وہ بہر حال باکسنگ کا شوقین تھا، اس لیے پروفیسر کے چہرے پر بھی اپنا شوق پورا کیا۔ اس بات کو یونی ورسٹی نے چھپالیا۔ تاہم خود گارڈنر نے اس کا انکشاف کر دیا۔ کچھ دن آوارہ گردی کرنے کے بعد اسے ہوش آگیا کہ اگر زندگی میں کچھ بننا ہے تو پھر اسے تعلیم حاصل کرنا ہوگی، اس لیے کہ امریکی معاشرے میں جاہلوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے طور پر قانون کی تعلیم حاصل کی اور پھر 1911ء میں اسٹیٹ بار لاء کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کیلی فورنیا میں اپنا لاء آفس کھولا۔ ممکن ہے اس کے نزدیک کوئی نہ پھٹکتا، لیکن چونکہ وہ روانی سے چینی بولتا تھا، اس لیے چینی اسے بہت بڑا وکیل کہتے اور سیدھے اس کے پاس آجاتے۔ اس دوران اس نے زیادہ تر چینیوں کے مقدمات لیے اور ان کا دفاع کیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف 21 برس تھی۔ پھر اس کے بعد ایک سیلز ایجنسی میں پانچ برس تک کام کیا۔ اس کے تجربات میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ تاہم اس کا دل اس کام میں نہیں لگا۔ قدرت نے شاید ایک مخصوص کام کے لیے اس کا انتخاب کرلیا تھا۔ 1912ء میں اس نے پھر اپنا آفس کھولا اور کیلی فورنیا میں قانون کی پریکٹس کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ قانون کی سربلندی اور سرفرازی اس کے خمیر میں رچ بس گئی ہے۔ وہ اس کے دائرے سے نکل نہیں سکتا۔

1920ء میں اس نے نتالی فرانسیس ٹالبرٹ سے شادی کرلی، جس سے اس کی ایک لڑکی ہوئی۔ اس لڑکی کا نام انہوں نے گریس رکھا۔ اس کی بیوی واقف تھی کہ گارڈنر کو چینیوں سے محبت ہے اور وہ انقلاب چین اور ماؤزے تنگ کا مداح ہے، لہٰذا اس نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ چین کی سیر کریں۔ گارڈنر نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ یوں انہوں نے چھ ماہ تک چین کی سیر کی۔ اس سیر و تفریح سے اس کے ذہن کو زرخیزی حاصل ہوئی اور اس نے ایک چینی کردار میجر کو بلے تخلیق کر ڈالا، جس کے ناول 'انٹرنیشنل ایڈونچر' سیریز کے تحت شائع ہوئے۔ اپنی بیوی نتالی سے جب اس کی ناچاقی ہوئی تو وہ علیحدہ ہوگئے۔ گارڈنر نے اسے طلاق نہیں دی اور ایک مکان لے کر دے دیا۔ اس کی موت تک وہ اسے ایک معقول رقم گزارے کے لیے دیتا رہا۔ البتہ اس کی موت کے بعد 1938ء میں اس نے اینگس جین بیتھل سے شادی کرلی جو 1930ء سے اس کی سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ 1933ء تک اس نے قانون داں کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے فوراً بعد ایک ناول 'دی کیس آف دی ویلوٹ کلاز' لکھا۔ اس ناول کے سارے واقعات اس کے آفس کے قریب ہی ہوئے تھے جس کا اس نے عمیق نظروں سے مشاہدہ کیا تھا۔ یوں اس کے دماغ میں ناول کا خاکہ بن گیا تو اس نے یہ سب سپردِ قلم کر دیا۔ اس ناول کا ہیرو پیری میسن تھا۔ ناول اچھی تعداد میں فروخت ہوا تو اس نے ناول نگاری کو جز وقتی کے بجائے کل وقتی مشغلہ بنالیا۔ وہ ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھتا نہیں تھا اور نہ ہی ناول ٹائپ نہیں کرتا تھا، بلکہ اپنی سیکریٹری کو ڈکٹیشن دیا کرتا تھا۔ اس کی سیکریٹری بعد میں ٹیپ کو سن کر ٹائپ کیا کرتی تھی۔ لکھنے سے پہلے وہ پوری طرح تیاری کرتا تھا اور کمرے میں ڈائری میں نوٹس لکھا کرتا تھا۔ جب اس کے ذہن میں مکمل پلاٹ بن جاتا تھا تب ہی وہ ڈکٹیشن دینا شروع کرتا تھا۔

وہ یکسانیت پسند نہیں تھا، اس لیے کولھو کے بیل کی مانند وہ ایک کام کو مسلسل نہیں کرتا تھا اور اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی لاتا رہتا تھا۔ ناول لکھنے سے اس طبیعت اکتا گئی تو اس نے فکشن پرچوں کے لیے کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ اس زمانے میں ڈیشل ہیمٹ اور ریمنڈ چینڈلر کا طوطی بول رہا تھا۔ گارڈنر نے ان کی پیروی کی۔ چنانچہ اس کی پہلی کہانی 1923ء میں ایک فکشن پرچے میں شائع ہوئی۔ فکشن پرچے پلپ کہلاتے تھے، جو بہت سستے ہوتے تھے اور بے حد خراب کاغذ پر شائع ہوتے تھے۔ اس کی زیادہ تر کہانیاں 'آرگوسی' اور 'بلیک ماسک' جیسے میگزینوں میں شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں اس نے ایک کردار 'لیسٹر لیتھ' تخلیق کیا، جو ایک چور تھا، لیکن بے حد اول جلول اور سمجھ میں نہ آنے والی حرکات کیا کرتا تھا۔ اس کا ملازم پولیس کا مخبر تھا اور اپنے مالک کی ساری رپورٹیں پولیس تک پہنچاتا رہتا تھا۔ یہ کردار بے حد دلچسپ اور عجیب تھا۔

چونکہ وہ ایک طبع زاد ناول نگار تھا، اس لیے نت نئے تجربات کیا کرتا تھا۔ اس نے ویسٹرن کہانیاں بھی تحریر کیں۔ پلپ میگزینوں میں طبع آزمائی کرنے کے دوران اس نے 144 کہانیاں اور 301 ناولٹ لکھے۔

اس کے بعد اس نے پیری میسن کے ناول لکھنا شروع کر دیے، جو ایک وکیل تھا اور اپنی سراغرساں ایجنسی کے ذریعے کیس لے کر مجرموں کو عدالت میں لاکر انہیں سزا دلواتا تھا۔ ڈیلا اسٹریٹ اس کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ وکیل پیری میسن کو کسی کے متعلق سراغ لگانا ہوتا تھا تو وہ اپنی ایجنسی کے سراغرساں پال ڈریک کی خدمات حاصل کرتا تھا۔ گارڈنر نے پیری میسن کے تقریباً 80 ناول لکھے۔ (دلچسپ بات یہ کہ اس کے ناول قسط وار سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ میں شائع ہوا کرتے تھے۔ وہ کتابی صورت میں بعد میں مارکیٹ میں آئے) اسی اثنا میں اس نے پلپ میگزینوں کے لیے لکھنا چھوڑ دیا، کیونکہ اس کے ناول خاص و عام میں پسند کیے جانے لگے تھے اور وہ بیسٹ سیلر کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ کسی نے ایک بار اس سے پوچھا کہ وہ پلپ میگزینوں میں کہانیاں کیوں لکھتا تھا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے ان میں بہت سے تجربات کیے ہیں جو خود آپ نے دیکھ لیے ہوں گے۔ میں نے اپنے اندازِ تحریر کو نہ معلوم کتنی بار تبدیل کیا ہے۔ آپ کسی دو تحریروں کو ملا کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک جیسی ہیں۔ پیری میسن کے ناول اگر سست رفتار عقل کی گتھیوں کو سلجھاتے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف پلپ میں لکھی گئی کہانیوں میں ایکشن اور دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ آپ کو یقیناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں نے پلپ کہانیوں میں تقریباً 35 کردار تخلیق کیے ہیں۔ ذرا کسی ایسے مصنف کا نام بتا دیجیے جس نے اتنے کردار تخلیق کیے ہوں۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ میں نے کبھی پیری میسن کے ناول پلپ میگزینوں میں پیش نہیں کیے۔ اس کے علاوہ میرے پیشِ نظر پیسا کمانا بھی تھا، میں اپنی تحریروں سے مال دار ہونا چاہتا تھا۔ یہ جو میرا فارم آپ دیکھ رہے ہیں یہ اسی پیسے سے خریدا گیا ہے۔

اس کے کردار پیری میسن کو 1930ء سے 1940ء تک کی کئی فلموں میں استعمال کیا گیا۔ پھر 1943ء سے 1955ء تک پیری میسن کو ریڈیو کے ڈراموں میں پیش کیا گیا، جو جرم و سزا پر مشتمل ہوتے تھے۔ لوگوں کے بے حد اصرار پر پیری میسن کو ٹی وی کے اوپیرا سیریل ڈراموں میں پیش کیا گیا (اوپیرا دوپہر کے وقت پیش کیا جاتا ہے چنانچہ اسے زیادہ افراد نہیں دیکھ پاتے) اس میں پیری میسن کا کردار ٹیلی وژن کے مشہور اداکار جان لارکن نے ادا کیا۔ پیری میسن کے اوپیرا سے لوگ مطمئن نہیں تھے اور اسے شام کے وقت سیریز میں دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے لوگوں کی خواہش کے احترام میں ریمنڈ بر نے پیری میسن کا کردار ادا کیا اور مقبولیت کی انتہا کو چھولیا۔ (ایک زمانے میں ابن صفی کے قارئین نے ان سے پوچھا کہ اگر ان کے ناولوں پر فلم بنانے کا سوچا گیا تو آپ کس اداکار کو فریدی کے کردار کے لیے پسند کریں گے تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ریمنڈ بر میرے کردار فریدی پر پورا اترتا ہے)۔۔۔۔۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ خود گارڈنر نے اپنے ناول پر بنائے جانے والے آخری ڈرامے میں جج کا کردار ادا کیا تھا۔ ریمنڈ بر کا جسم بے حد متوازن تھا اور وہ وکیل کی بجائے رومانی فلموں کا ہیرو لگتا تھا۔ اس کی آواز خواب ناک تھی۔ شانے چوڑے اور چہرے کے عضلات میں سختی تھی۔ اس کی آنکھیں تیزی سے اپنے حلقوں میں گھومتی اور گرد و پیش کا جائزہ لیتی رہتی تھیں لیکن چہرہ سپاٹ رہتا تھا۔

ایک طرف تو اس کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا دوسری طرف تنقید نگار یہ کہتے تھے کہ گارڈنر کو ناول لکھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ پیری میسن کے ناول، ناول نگاری کے اصولوں پر پورے نہیں اترتے۔ ریکس اسٹاؤٹ جیسے کہنہ مشق ناول نویس کا کہنا ہے کہ یہ سب عدالتی شاخسانہ ہے اس میں روایتی ناولوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ چنانچہ ان ناولوں کا ایک مخصوص حلقہ ہے جسے پڑھ کر اس کی تشفی ہوتی ہے۔

گارڈنر کو خالص سراغرسانی ناول لکھنے کا شوق ہوا تو اس نے 1938ء میں برتھا کول اور ڈونالڈ لیمب کے کردار تخلیق کیے اور انہیں اے۔ اے فیئر کے نام سے لکھا۔ اس لیے کہ وہ پبلشر سے معاہدہ کر چکا تھا کہ جو کچھ بھی لکھے گا اسی

کے ادارے سے شائع ہوگا، تاہم نام تبدیل کرنے سے صورتِ حال مختلف ہوگئی۔ اے۔ اے فیئر کے نام سے اس نے تقریباً 25 ناول لکھے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک سیریز اٹارنی جنرل ڈوگلس سیلبائی کے کردار پر لکھی جسے زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ جرم کیا ہے اور اسرار و سراغ کے لیے کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کا جواب تھا کہ قتل کسی بند اور خالی ڈبے میں نہیں کیا جاتا ہے۔ قتل کرنے کا محرک دشمنی، لالچ، نفرت یا بدلہ ہوتا ہے۔ یہ کبھی کبھار خوف کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ اس کا سراغ لگانے کے لیے دریا کی لہروں کا حساب کتاب رکھنا پڑتا ہے۔ جب آپ دریا میں پتھر پھینکتے ہیں تو لہریں بننا شروع ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح سے ایک سراغ رساں کو مقتول کے نزدیک و دور رہنے والوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ اس کے کن کن افراد سے تعلقات ہیں اس کا پتا کرنا چاہیے۔ ان افراد سے سوالات کرنا چاہئیں۔ کوئی نہ کوئی گتھی اسے ایسا کلیو مہیا کردے گی جو اسے قاتل تک پہنچا دے گی۔

ہیری رینسم ریسرچ سینٹر نے حال ہی میں اس کے مسودات کو ریکارڈ میں رکھا ہے اور اس کی لائبریری کو محفوظ کر لیا ہے، تاکہ آنے والی نسلیں اس سے فیضیاب ہوسکیں اور اس کے افکار و خیالات سے انہیں آگاہی ہوسکے۔ اس کے ناول وکلاء اور ججوں میں بے حد مقبول تھے اور وہ انہیں پابندی سے پڑھتے اور ان سے قانونی نکتے حاصل کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایری زونا میں ایک قتل کو ثابت کرنے کے لیے اٹارنی جنرل نے اس کے ناول 'دی کیس آف دی کیوریس برائڈ' کا حوالہ دیا اور اسی کی مدد سے مجرمہ سے سوالات کیے۔ گارڈنر کا کہنا ہے کہ اٹارنی جنرل کے لیے وہ کیس لوہے کا چنا ثابت ہو رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ملزمہ مجرم ہے اور اپنے جرم کو چھپانے کے لیے سوالات کے گمراہ کن جوابات دے رہی ہے، تاکہ سب لوگوں کی توجہ اصل معاملے کی طرف سے ہٹ جائے۔ اسی اثنا میں اٹارنی جنرل نے وہ ناول پڑھ لیا۔ دوسرے دن اس نے ملزمہ کو عدالت کے کٹہرے میں بلایا اور اس سے نئے انداز سے سوالات کرنا شروع کردیے۔ جب جج صاحب نے اعتراض کیا کہ وہ مقدمے سے ہٹ کر بے تکے سوالات کیوں کر رہا ہے تو اٹارنی نے گارڈنر کا ناول اس کی خدمت میں پیش کیا اور بتایا کہ پیری میسن نے اس میں ایسے ہی سوالات کیے ہیں۔ جج نے مقدمے کی کارروائی تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دی اور اپنے چیمبر میں جا کر اس ناول کو جستہ جستہ پڑھا۔ پھر عدالت میں آکر اٹارنی کو اجازت دی کہ وہ ملزمہ سے سوالات کرسکتا ہے۔ ان سوالات سے ملزمہ نرغے میں آگئی اور مقدمے کا رخ بدل گیا۔ ملزمہ نے تھوڑی ہی دیر میں اقرارِ جرم کرلیا اور اٹارنی نے اطمینان کا سانس لیا۔

1937ء میں گارڈنر کیلی فورنیا کے علاقے تیموکولا میں چلا گیا جہاں اس نے اپنی ساری زندگی بسر کی۔ اسے مویشیوں سے بھی محبت تھی، اس لیے اس نے ایک طویل و عریض مویشی خانے میں رہائش اختیار کی۔ وہ ایک اچھا فوٹوگرافر تھا اور گھومنے پھرنے کا شوقین۔ وہ چینی زبان بہت روانی سے بولتا تھا اور چینی کلچر سے بہت متاثر تھا۔ حیرت انگیز بات ہے کہ سیکس روہمر جیسے مشہور و معروف ناول نویس نے اعتراف کیا کہ اس کی کہانیوں سے متاثر ہوکر ہی اس نے خوف ناک مجرم ڈاکٹر فومانچو کو تخلیق کیا تھا۔ جسے لوگ اب بھی یاد کرتے ہیں۔

اس کے سارے ناول دس کروڑ کی تعداد میں فروخت ہوئے۔ اسے 'سراغرسانی ناولوں کا ہنری فورڈ' کا خطاب دیا گیا۔ 1952ء میں مسٹری رائٹرز آف امریکا نے اسے ایڈگر ایلن پو ایوارڈ سے نوازا (دلچسپ بات یہ ہے ایوارڈ ایک ایسی کتاب پر دیا گیا تھا جو فکشن نہیں تھی)۔ 11 مارچ 1970ء کو وہ اپنے خالق سے جا ملا۔ مرنے کے بعد اس کو جلا کر اس کی راکھ سارے کیلی فورنیا میں چھڑک دی گئی۔ 1973ء میں اس کا آخری ناول 'دی کیس آف دی پوسٹپونڈ مرڈر' شائع ہوا۔ 1989ء میں اس کے ایک دوست ٹامس چسٹین نے اس کی سیریز کو جاری رکھنے کے لیے ایک ناول 'دی کیس آف ٹومنی مرڈر' شائع کیا، لیکن قارئین نے اسے زیادہ پسند نہیں کیا، اس لیے یہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس کے زیادہ تر ناولوں کا ترجمہ فن لینڈ کی زبان میں ہوا اس لیے کہ وہاں کے لوگ اس کے ناول ذوق شوق سے پڑھتے تھے۔ 2003ء کیلی فورنیا کے ایک اسکول کا نام اس کے نام پر گارڈنر رکھا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق وہ امریکا کا ایسا فکشن مصنف تھا، جس نے سب سے زیادہ لکھا۔ اس کی سیکریٹری ایک ہفتے میں اس کے بولے ہوئے 66،000 الفاظ ٹائپ کیا کرتی تھی۔ وہ پیری میسن کے ناول دو ماہ میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ متعدد کہانیاں اخبارات و رسائل کی زینت بنتی تھیں۔

❊

قلم کہانی

محمد ایاز راہی

قلم جو ایک انتہائی ضروری شے ہے اور اس کے بغیر تحریر کرنا دشوار ہے مگر ڈیجیٹل دور میں اس کی افادیت کم ہوتی جارہی ہے۔ اس آلہ کی تاریخ سے آپ واقف ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ آلہ کس طرح وجود میں آیا۔ کن کن ادوار میں کیسی کیسی تبدیلی آئی۔

ایک علمی تحریر صاحبِ ذوق کے لیے

ہزاروں سال پہلے کا ذکر ہے بحیرۂ روم کے جنوب مشرقی ساحل کے قدیم باشندوں نے ایک بہت ہی اہم، بنیادی اور مقدس ایجاد کا سہرا اپنے سر باندھا۔ یہ لبنان کے شہر ببلوس کا واقعہ ہے جہاں فونیقی (PHONETICIAN) قوم آباد تھی۔ ان لوگوں نے ایک زبردست انقلابی قدم اٹھایا اور انسانی اظہار کے تیسرے ذریعے فنِ تحریر کا تخلیقی دریا روشن کیا۔ یوں بالآخر انسانی اظہار کی بنیادی تکون (تقریر، تحریر، اور اشارہ) تکمیل سے ہم کنار ہوئی اور اس

ایجاد کو لوگوں نے فونونگ کا نام دیا۔

فنِ تحریر اپنے آلۂ تحریر (قلم) کی رہینِ منت بلکہ محتاج ہے۔ قلم کہ جس سے لکھنے کا کام لیا جاتا ہے عربی زبان کا اسم مذکر ہے اس کی جمع اقلام ہے۔ فارسی میں اسے خامہ (جمع خامہ ہا) اور کلک کہتے ہیں۔ سنسکرت، ہندی اور پنجابی میں لکھنی یا لکھنی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح پرندے کا پر بھی قلم کہلاتا ہے۔ قلم اور تحریر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ کہتے ہیں آج سے تقریباً چار ہزار برس قبل ہندوستان آنے سے پہلے قدیم پراچین آریا قوم قلم اور تحریر سے نا آشنا تھی چنانچہ بقول ڈاکٹر محمد انصار اللہ، خانہ بدوش آریا اپنے ہادیوں کی ہدایتوں کو سنتے اور سن کر اپنے حافظہ میں محفوظ کرتے رہتے تھے بعض وقت وہ یادداشت کے لیے دھاگے میں گانٹھ وغیرہ بھی لگا لیتے تھے۔ سوان کے مذہبی اصول وضوابط اور کلام کے لیے شُرتی (سنا ہوا) اور سوتر (دھاگا) کی اصطلاحیں مروج ہوئیں۔ (برہمن آج بھی ایک دھاگا شانے سے کمر تک اس طرح پھیلاتے ہیں کہ آدھا سینے پر اور آدھا پیٹھ پر پھیلا رہتا ہے۔ وہ اسے "جینو" کہتے ہیں۔ آج بھی پنڈت ہون (پوجا) کے وقت اس میں گانٹھ لگاتے جاتے ہیں تاکہ اسے اگلے ہون (بڑی پوجا) سے ملا سکیں) دوسری اقوام جو پڑھنا لکھنا جانتی تھیں ان ہدایات کو آریاؤں کی زبان سے سن کر اپنے اپنے رسم الخط میں قلم بند کرلیا۔ چنانچہ آریاؤں کی تقریباً سبھی مذہبی کتابیں تمل، ملایالم، تیلگو اور ہندی ناگری خطوں میں محفوظ کرلی گئیں۔ سنسکرت میں جتنی کتابیں ہیں وہ بعد میں ترتیب دی گئیں۔ تمام کی تمام "پُران" ابتدا میں زبانی رائج تھیں۔ گرو پُران اور حس پُران" کی تعلیم دی جاتی تھی اور احتیاط برتی جاتی تھی کہ یہ کسی بھی طرح برہموں کے علاوہ کسی اور تک نہ پہنچے لیکن ایک بڑے گروجی جب پروچن (لیکچر) دیتے تھے تو ان کے "پراگن" میں ایک "داس" بھی بیٹھا رہتا تھا جو ذات کا "دراوڑ" تھا اس نے "بھگتوں" کو یاد کرائے جارہے پران کے اشلوک یاد کرلیے۔ یہ بات آریا گرو کو ناگوار گزری اور تب یہ حکم رائج ہوگیا کہ وید یا پُران کے اشلوک شُدر یعنی دراوڑ سن لے تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔

خانہ بدوش آریاؤں نے بہت بعد میں ہندوستان کی مہذب اقوام کی صحبت میں رہ کر لکھنے پڑھنے کی طرف توجہ کی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ جدید تحقیق ہے۔ اسی طرح عربوں نے بھی قلم اور تحریر کا فن بہت بعد میں اپنایا اس کی وجہ ان کا اپنے حافظے پر بے پناہ ناز تھا جو بالکل بجا تھا۔ تقریباً ہر ذہین عرب کو اپنے شجرۂ نسب کے علاوہ سیکڑوں اشعار وواقعات ازبر ہوتے تھے۔ قلم وتحریر کے ہنر کو وہ حافظے کی کمزوری سمجھ کر عیب جانتے تھے لیکن قلم سے بے گانہ اسی عرب معاشرے میں جب قرآن پاک کا نزول ہوا تو قلم نہ صرف جزیرہ نمائے عرب بلکہ پوری دنیا میں تقدیس وتحریم کا استعارہ بن گیا۔ پہلی وحی میں ہی قلم کو ذریعہ علم قرار دیا گیا۔ پہلی وحی 18 رمضان المبارک سن 01 نبوت بمطابق 14 اگست 610 عیسوی کو غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ آگے چل کر سورۂ والقلم (پارہ 29) میں اللہ تعالیٰ نے قلم کی قسم بھی کھائی، یوں قلم کی عظمت اپنے عروج پر پہنچ کر مسلّم ومتحقق ہوگئی۔ روایت میں آتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا۔ علما نے فرمایا ہے کہ عالم میں قلم تین ہیں۔ ایک سب سے پہلا وہ قلم جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور تقدیرِ کائنات لکھنے کا حکم دیا۔ دوسرے فرشتوں کے قلم جس سے وہ تمام ہونے والے واقعات ان کے اندازے اور انسانوں کے اعمال لکھتے ہیں۔ تیسرے عام انسانوں کے قلم جن سے وہ اپنے کلام لکھتے اور اپنے مقاصد میں کام لیتے ہیں۔ کتابت (لکھنا۔ فنِ تحریر) درحقیقت بیان کی ایک قسم ہے اور بیان انسان کی مخصوص صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلم کی قسم اس لیے کھائی کہ دنیا میں بڑے بڑے کام سب قلم ہی سے ہوتے ہیں۔ ملکوں کی فتوحات میں تلوار سے زیادہ قلم کا موثر ہونا کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ابوحاتم بستی نے کیا خوب کہا ہے۔

- اذا اقسم الابطال یوم بسیفهم
(جب کہ قسم کھائیں بہادر لوگ کسی دن اپنی تلوار کی)

وعدّد ممایکسب المجدوالکرم
(اور اس کو شمار کریں ان چیزوں میں جو انسان کو عزت بخشتی ہیں)

کفیٰ قلم الکتاب عزّاورفعة
(تو کافی ہے لکھنے والوں کا قلم ان کی عزت وبرتری کے لیے)

هدی الدّهر انّ اللّٰه اقسم بالقلم
(ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے۔ کیوں کہ اللہ نے قسم کھائی ہے قلم کی)

امام تفسیر مجاہد نے ابوعمرو سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دستِ قدرت سے خود بنائیں اور وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ قلم، عرش، جنتِ عدن اور آدم علیہ السلام۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے فنِ کتابت ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا اور سب سے پہلے انہوں نے لکھنا شروع کیا مگر کچھ لوگوں کے مطابق سب سے پہلے یہ فن حضرت ادریس علیہ السلام کو ملا ہے اور دنیا میں سب سے پہلے کاتب وحی ہیں۔ پہلی وحی کی ابتدا لفظ اقرا میں اگرچہ زبانی تعلیم ہی کی شروعات ہے مگر اس آیت میں جہاں تعلیم دینے کا ذکر آیا ہے وہاں قلمی تعلیم کو اولیت دے کر بیان فرمایا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتے تھے اور ان کو جہل کے اندھیرے سے نورِ علم کی طرف نکالا اور علمِ کتابت (قلم) کی ترغیب دی کیونکہ اس میں بے شمار اور بڑے منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ تمام علوم وحکمت کی تدوین اور اولین وآخرین کی تاریخ، ان کے حالات ومقالات اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں سب قلم ہی کے ذریعے لکھی گئیں اور رہتی دنیا تک باقی رہیں گی۔ اگر قلم نہ ہو تو دنیا ودین کے سارے ہی کام مختل ہوجائیں۔ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جو اس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے، اگر یہ قلم نہ ہوتا تو کوئی دین قائم رہتا نہ دنیا کا کاروبار۔ شیر میسور ٹیپو سلطان شہید کے پوتے شہزادہ بشیر الدین میسوری (تخلص توفیق) جو شہزادہ شکر اللہ کے فرزند تھے بڑے عجیب اور دلکش پیرائے میں قلم کو سراہتے ہیں۔

نہ دیدہ است کسی اُز شاخِ خشک میوۂ تر
بجز قلم کہ دہد میوۂ تروشیریں

ترجمہ: خشک ٹہنی سے میوۂ تر کس نے پایا ہے سوائے قلم کے جو خشک ہوکر بھی تازہ ومیٹھا پھل (تحریر ومضامین) دیتا ہے۔ (توفیق۔ وفات 1885ء)

آج سے چند دہائیاں پہلے قلم اور دولت لازم وملزوم تھے۔ دیکھیے۔ منشی الٰہی بخش رفیق کس خوبصورت وغمگین انداز میں قلم اور دوات کا ذکر کرتے ہیں۔

جاڑے کے خوف سے ہے قلم تھرتھرا رہا
کاغذ کی چادروں میں ہے چہرہ چھپا رہا
سردی بہت جو کھائی ہے سرما کی رات میں
سب روشنائی رہ گئی جم کر دوات میں

شاعرِ شمشاد قداں فیض احمد فیض خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر بھی حدیثِ دل کا اظہار کرتے ہیں مگر ان کی اصل متاع لوح وقلم ہی ہے، قلم کی تخلیقی بہار دیکھ کر شاعر بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ "کم عندلیبِ مست سے اپنا قلم نہیں۔"

فخرالدین رازی

(1149-1209ء)

ابوعبداللہ محمد بن عمر بن الحسین۔ اسلام کے مشہور ترین علمائے دین ومفسرین میں سے ایک سربرآوردہ عالم۔ بمقام رے پیدا ہوئے۔ ان کے والد ضیاء الدین ابوالقاسم اپنے شہر کے خطیب تھے، اسی لیے بیٹے کا لقب ابن الخطیب ہوگیا۔ ادب اور دینیات کی تحصیل سے فراغت کے بعد فخرالدین خوارزم چلے گئے جہاں وہ معتزلہ کے خلاف مناظروں میں مسلسل مشغول رہے، جنھوں نے انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ ماوراالنہر پہنچے تو وہاں بھی ایسی ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ رے واپس آکر انہوں نے شہاب الدین غوری سے تعلقات استوار کیے، جس نے ان پر اعزازات اور دولت کی بارش کردی۔ 1184ء میں جب وہ بخارا کے ارادے سے ماوراالنہر جاتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے سرخس میں ٹھہرے تو وہاں کے ایک طبیب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ اظہارِ تشکر کے طور پر انہوں نے بوعلی سینا کی "کلیات" کی شرح لکھی۔ بخارا میں انہیں حسبِ توقع سرپرستی نہ ملی تو وہ ہرات چلے گئے، جہاں غزنہ کے غوری غیاث الدین نے انہیں شاہی محل ہی میں عوام کے لیے ایک مدرسہ کھولنے کی اجازت دے دی۔ سمرقند اور ہندوستان اور دیگر مقامات کی سیاحت کے بعد وہ ہرات میں اقامت گزیں ہوگئے۔ اور عمر کا بڑا حصہ وہیں گزارا۔ ہرات میں وہ شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اس زمانے میں ان کی شان وشوکت عروج پر تھی چنانچہ تین سو سے زائد شاگرد ان کے ہمرکاب رہتے تھے۔ آغازِ زندگی میں تنگ دست اور آخر عمر میں خوشحال تھے۔ رازی کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے، جن کا تعلق زیادہ تر کلام، فلسفہ، فقہ اور تفسیر سے ہے۔ اہم تصنیفات یہ ہیں: 1۔ اساس التقدیس فی علم الکلام۔ 2۔ لوامع البینات فی الاسماء والصفات (3) شرح الاشارات (4) المعالم فی اصول الدین۔ 5 مفاتیح الغیب (6) المناظرات (7) المباحث المشرقیہ۔

مرسلہ نعیم الدین، حاصل پور

اصغر گونڈوی کا قلم سے اپنے تعلق کا اظہار:

اصغر نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

مصطفیٰ زیدی کا نام اور کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعۂ قبائے ساز، کے نام سے ہے جس میں ایک طویل نظم زخم سفر، کے عنوان سے صفحہ نمبر 13 پر ہے۔ صنف مسدس میں لکھی گئی یہ نظم ایک سو دو اشعار کی ہے پوری نظم قلم کی مدح و عظمت میں ہے اس نظم کے چند چنیدہ اشعار۔

زمانہ یوں تو ہر اک پر نظر نہیں کرتا
قلم کی بے ادبی در گزر نہیں کرتا
قلم میں لرزشِ مژگاں قلم میں رشتۂ جاں
قلم میں زمزمہ درم قلم میں شور و فغاں
قلم میں جشنِ عروسی قلم میں بیوگیاں
قلم میں کوہ وبیاباں قلم میں کاہکشاں
قلم میں حلم بھی ہے ناز اور وقار بھی ہے
اذانِ صبح بھی ہے شامِ بادہ خوار بھی ہے
قلم کی راہ جو آئے دل کو مار کے آئے
شبِ دراز غم بے کراں گزار کے آئے
جہاں بھی مطلعِ حق پر سحاب اٹھے گا
کسی قلم سے کوئی آفتاب اٹھے گا

استاد ابراہیم خانِ ذوق کے بقول۔ ”رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوق، اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت۔“ غالب فرماتے ہیں۔ ”غالب مدیر خامہ نوائے سروش ہے۔“

شاعر مشرق علامہ اقبال قلم کی عظمت و توقیر کا اعتراف اپنے منفرد انداز میں کرتے ہیں، جواب شکوہ کا آخری شعر ہے کہ

کی محمد سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یعنی اللہ تعالیٰ مسلمان قوم سے مخاطب ہے، فرماتا ہے کہ اے میرے بندے! اگر تو نے میرے پیغمبر محمد ﷺ سے وفا کی اور ان کی تعلیمات کو اپنا شعار بنایا تو جان لے کہ ہم تیرے ہیں اور یہ دنیا تو الگ رہی لوح و قلم بھی تیرے ہیں اور رہیں گے۔

اللہ اللہ! علامہ اقبال اس پوری کائنات پر لوح و قلم کو ترجیح دیتے ہیں۔ قلم کہ جس سے تقدیریں لکھی جاتی ہیں۔

روح بالا شعر میں لفظ قلم صرف قافیہ ردیف یا لفاظی کا مظہر نہیں ہے بلکہ لاریب کہ قلم کی عظمت اس جہانِ رنگ و بو پر مقدم ہے۔ مزید یہ کہ قلم کا لکھا (اچھی یا بری تقدیر) آخرت یا اخروی زندگی کا فیصلہ بھی کرتا ہے یا کم از کم اس جہان پر اندازہ ہوتا ہے کہ یہی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یادش بہ خیر عرب لوگوں کو اپنے بے پناہ حافظہ کا مان تھا۔ سو لکھنا ان کے نزدیک عیب تھا۔ اسلام کا زمانہ آیا تو اپنے ساتھ جہاد کا دور بھی لایا۔ ایک جہاد کے دوران بہت سے حافظ قرآن صحابہ شہید ہوئے تو قرآن پاک کو قلم کے ذریعے درختوں کی چھالوں اور حلال جانوروں کی کھالوں پر لکھ کر محفوظ کیا گیا۔ بعد میں کاغذ پر کلام پاک کو کتابی شکل دی گئی اور قلم ہی کے ذریعے یہ سب کچھ ممکن ہوا۔

بڑے بڑے جیّد علما، ادباء اور شعرائے کرام نے اپنے اپنے رنگ میں قلم کی عظمت بیان کی ہے اسے بہت سے معانی میں برتا چنانچہ لفظ قلم لکھنے لکھانے کے علاوہ کئی اور معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ عربی میں قلم بالفتح کاٹنا، تراشنا، ناخن تراشنا اور بفتح لکھنے کا آلہ، کلک استعمال ہوا ہے مگر فارسی میں لکھنے کا آلہ، خامہ (اس معنی میں بالاتفاق مذکر مگر بیشتر مونث باندھتے ہیں)

عجب احوال ہے میرا کہ جب خط اس کو لکھتا ہوں
تو دل کچھ اور کہتا ہے قلم کچھ اور کہتی ہے۔ (بہادر شاہ ظفر)

اس کے علاوہ قلم کئی اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً لکھنے کا آلہ۔

سرخ ہیں تابِ مضامیں سے جو نقطے تھے سیاہ
شعلۂ فکر سے ایسا ہے قلم گل افشاں۔ (نسیم دہلوی)

تصوف میں عقلِ اول یعنی نبی کریم ﷺ کا نور، عرشِ اعظم، جبرائیل، پہلا فرشتہ۔

مسلمانوں کے اعتقاد میں جس سے تقدیریں لکھی جاتی ہیں۔

جنت بھی گوارا ہے مگر میرے لیے
اے کاتبِ تقدیر مدینہ لکھ دے
(حبیب حزیں)

تراشا ہوا، کاٹا ہوا، بھی ہوتا ہے مثلاً وہ شاخ یا ٹہنی جو ہری کاٹ کر زمین میں لگاتے ہیں جیسے گلاب کے درخت کی قلم یا گیندے کی قلم، فارسی میں اسے شاخچہ، قلمچہ کہتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے تراشے ہوئے بال جو کنپٹیوں کے اوپر خوب صورتی کے لیے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اسے بھی قلم کہتے ہیں۔

جس نے یہ اس بُتِ کافر کی تراشی قلمیں
ہاتھ ہوجائے خدایا قلم اس نائی کا
(رشک)

قلم کچھ اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً:

ہیرے کی ہیں ہتھیلیاں تیری
انگلیاں ہیں بلور کی قلمیں
(رشک)

بالوں کا برش یا وہ باریک کوچی جس سے مصور لوگ تصویر بناتے ہیں یا اس میں رنگ بھرتے ہیں جیسے مُو قلم۔ ایک قسم کی آتش بازی، پھلجھڑی، مہتابی چھچھوندر وغیرہ۔ جھاڑ کی وہ بلوریں شاخیں جو اس میں لٹکتی رہتی ہیں، اسے بھی قلم کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی شفاف چیز کا لمبا ٹکڑا، شیشے کا تراشا ہوا لمبا ٹکڑا، کو بھی قلم کہتے ہیں۔

رخِ رنگیں تک آ گئیں زلفیں
خوب پھولیں گلاب کی قلمیں
(عاشق)

سلاخ جیسے نوشادر کی قلم، قلمی شورے کی قلم وغیرہ۔ سینگ شاخِ حیوانات، حیوانات کا عضو تناسل، چوپائے کی اندری جیسے سانڈ، گھوڑے، بکرے وغیرہ کی، شراب کی پتلی اور لمبی بوتل جسے قلم برانڈی بھی کہتے ہیں۔ اس میں عطر بھی رکھتے ہیں۔

یہ جام مے کہ پھول کھلا ہے گلاب کا
نرگس کی شاخ ہے کہ قلم ہے شراب کی
(جلال)

حکم، حکومت، فرماں روائی جیسے حکم رواں مدعی فنا۔ گائے بکری کی پنڈلی کی ہڈی۔ پیوند درخت۔ شاخ جو دوسرے درخت کی شاخ میں لگائیں۔ اسے بھی قلم کہا جاتا ہے۔

اردو ادب میں قلم کے حوالے سے محاورات اور کہاوتوں کی کوئی کمی نہیں جن میں سے چند ایک پیشِ خدمت ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

1۔ قلم اٹھا کر یا قلم برداشتہ لکھنا: بے سوچے سمجھے جلدی جلدی لکھنا۔ فی البدیہہ بے ساختہ اور بے تکلف لکھنا۔ چلتا ہوا لکھنا۔ گھسیٹنا۔

خط انہیں جلدی میں لکھتا ہوں قلم برداشتہ
جائیو اے نامہ بر تو بھی قدم برداشتہ
(ظفر)

2۔ قلم انداز کرنا: لکھتے میں چھوڑ جانا۔ نہ لکھنا۔ لکھنے

ثمود

حضرت صالحؑ کی قوم کا نام۔ یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو قومِ عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ اس قوم کے قصے نزولِ قرآن کے وقت زبان زدِ عام تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بھی اس قوم کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ اسکندریہ اور روم کے قدیم مورخین اور جغرافیہ نگاروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ بقول مولانا مودودی ”مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے۔“ رومی مورخین کے مطابق ”یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور قبطیوں کے خلاف لڑے جو اُن کے دشمن تھے۔“ قوم ثمود کا وطن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحجر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جو مدائن صالح کے نام سے موسوم ہے۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور زمانہ قدیم میں الحجر کہلاتا تھا۔ اب بھی وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا۔ اس علاقے کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ آنحضورؐ جب غزوۂ تبوک کے موقع پر اس علاقے سے گزرے تو آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثارِ عبرت دکھائے۔ ایک جگہ آپؐ نے ایک کنویں کی نشاندہی کی اور فرمایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا۔ دوسرے کنوؤں کا پانی نہ پینا۔

مرسلہ: عارف سلطان، مظفر گڑھ

میں فروگزاشت (غفلت) کرنا۔ پوری توجہ سے نہ لکھنا۔

3۔ قلم بنانا: قلم کو تراش کر لکھنے کے قابل کرنا۔ کنپٹی کے اوپر کے بالوں کو استرے سے درست کرنا۔ خاص قسم کی سلائی۔

4۔ قلم بند: مُوقلم (برش) بنانے والا۔ لکھا ہوا۔ بیاضِ حساب میں اتارا ہوا۔ ٹھیک گنے اور لکھے ہوئے جیسے قلم بند سو جوتے مارے۔ قلم بند سیکڑوں گالیاں سنائے وغیرہ۔ بعض اوقات بلاحساب، ان گنت اور بے شمار کے موقع پر بھی بولتے ہیں یعنی لکھا ہوا ہے زبانی یاد نہیں رہ سکتا۔

5۔ قلم بند کرنا: درج کرنا۔ یادداشت میں لکھنا۔ ٹانکنا، ٹیپنا، فارسی کے قلم بند کردن کا ترجمہ ہے۔

6۔ قلم بند لگانا: گن گن کر لگانا۔ تحریری شمار کے موافق لگانا۔ گنے ہوئے جوتے بھی کرنا۔ خوب جوتیاں مارنا وغیرہ۔

7۔ قلم بند سنانا: لکھی اور شمار کی ہوئی گالیاں دینا جن میں کچھ شبہ نہ ہو سکے، مجازاً انگنت اور بلاحساب گالیاں دینا۔ خوب گالیاں دینا۔

8۔ قلم بند ہونا: لکھا جانا۔ تحریر ہونا۔ نوشت میں آنا۔

9۔ قلم پاک: قلم پونچھنے اور صاف کرنے کا کپڑا۔

10۔ قلم پھر جانا: حکم ہو جانا۔

ابھی ہو خطِ پیشانی کا میری کچھ سے کچھ نقشہ
جو پھر جائے قلم تیرا علیؑ ابن ابی طالب
(قدر)

11۔ قلم تراش: قلم بنانے کا چاقو، پتلے پھل کا چاقو۔ لکھنؤ والے مونث بولتے ہیں چنانچہ رشک لکھنوی کا شعر ہے کہ

میرے لیے تراش رہی ہے سر قلم
کرتی ہے ہاتھ صاف تمہاری قلم تراش
(رشک)

12۔ قلم توڑ دینا: (کنایتہً) بے نظیر نظم یا نثر لکھنا کہ مقابل میں کوئی قلم نہ اٹھا سکے۔ کوئی ایسا کام قلم سے کرنا جس کے مثل کوئی نہ کر سکے۔

صفحۂ دہر پہ صورت گر قدرت نے امیر
اس کی تصویر وہ کھینچی کہ قلم توڑ دیا
(امیر مینائی)

13۔ قلم کرنا: کاٹنا، تراشنا، قطع کرنا، چھانٹنا درخت یا شاخ وغیرہ کو کاٹنا، الگ کرنا، اتارنا، صاف کاٹ دینا۔

14۔ قلم روشن رہے: فقیروں کی دعا یعنی حکومت بنی رہے، حکم جاری رہے، قلم چلتا رہے۔

15۔ قلم قصائی یا قلم قسائی: محرر عدالت، منشی، رشوت خور اور ظالم محرر جو لکھنے میں غلط لکھ کر غریبوں پر ظلم کرتا اور گلا کاٹتا ہے۔

16۔ قلم کار: منشی، محرر، بابو، لکھاری، نقاش، مصور، رنگساز، رنگ بھرنے والا، کندہ کار، ایک قسم کا بافتہ جس پر نقش نگار ہوتے ہیں۔

17۔ قلم کا یاری دینا: علم و فضل کا مدد دینا، لکھنا پڑھنا کام آنا، منشی گری کا کام دینا، نوشتہ سے کام لینا، تحریر کا کارآمد ہونا۔

18۔ قلم کان پر رکھنا: بیشتر منشی لوگ قلم کان پر رکھتے ہیں۔ کان کے اوپر اور سر کے درمیان قلم پھنسا کر رکھنا، اڑسنا۔

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
(غالب)

19۔ قلم رو، قلمرو: راج، حکومت، ملک، مملکت، ریاست، علاقہ، عمل داری، بادشاہی، سلطنت، اہل لکھنؤ مذکر مونث دونوں طرح سے باندھا ہے مثلاً آتش کے دو اشعار

اللہ نے کرم سے مجنوں کو کیا مطیع
زیرِ نگیں قلم رو ہندوستاں رہا
(آتش)

چند پریاں بھی کروں مثلِ سلیماں تسخیر
یہ قلم رو بھی رہے زیرِ نگیں تھوڑی سی
(آتش)

20۔ قلم دان: قلم دوات رکھنے کا چھوٹا سا خانہ، لکھنے کے سامان کا لمبا سا صندوقچہ یا نلوا۔ وزارت، عہدہ، سکریٹری میں قلم کو کلم لکھا پڑھا جاتا ہے۔

لیکن جب ہم معلوم تاریخ میں جھانکتے ہیں تو قلم کی تاریخ کچھ اس طرح سامنے آتی ہے۔

غاروں میں بود و باش رکھنے والے (Cave men) افراد نے شکار کے لیے نوکیلے پتھروں کا استعمال شروع کیا اور ایسے ہی پتھر بعد میں پہلے آلۂ تحریر کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ وہ شکار سے بچ جانے والے فالتو وقت میں انہی پتھروں سے غاروں کی دیواروں پر نقش و نگار کرتے۔ اپنی مہم، فتح کی نقاشی دیواروں پر کر کے یادگار لمحوں کو منعکس کرنے کی کوشش کرتے۔ ابتدا میں یہ

تصاویر الفاظ کا کام دیتیں، ایسی تصاویر جن کو آثاریات کے طور پر دریافت کیا گیا ہے وہ 8500 سال قبل مسیح کی ہیں۔ تصاویر کے ذریعہ معنی و مفہوم کی ترسیل دشوار گزار ثابت ہوتی، انہیں روانی دینے کے لیے آسان اور اشاراتی تصاویر کا استعمال شروع ہوگیا۔ یہ متبادل تصاویر جنہیں Alphabatic Pictographs کا نام دیا گیا یہ 1700 اور 1500 قبل مسیح شروع ہوئیں۔ عبرانی ابجد 600 قبل مسیح میں متعارف ہوئیں جبکہ یونانی رسم الخط 400 قبل مسیح میں متعارف ہوا۔ یونانی ابتدا میں بائیں سے دائیں لکھتے تھے لیکن جب بزنطائن اور رومیوں کا اثر غالب آیا تو وہ بھی انہی کے انداز میں لکھنے لگے۔ وہ بھی دیواروں پر ہی لکھا کرتے تھے پھر وہ ترسیل کی آسانی کی خاطر دھات کے بڑے ٹکڑے، ہاتھی کے دانت اور پتھروں کے چوڑے ٹکڑوں پر لکھنے لگے۔ مزید آسانی کے لیے مٹی کی تختی بھی استعمال کرنے لگے۔ لیکن جب پاپرس والوں نے کاغذ بنالیا تو یونانی فلاسفر Cadmus نے پہلی بار پاپرس سے کاغذ منگوا کر اپنی تحریر منتقل کی۔

روشنائی کو بہتر کرنے کا سہرا چینیوں کے سر جاتا ہے مگر ایجاد کے بارے میں برصغیر کا نام لیا جاتا ہے۔ ہندو والے چراغ کی کالک کو چراغ کے جلے ہوئے تیل میں ملا کر لعاب تیار کرتے، اسے مزید استحکام دینے کے لیے اس میں گدھے کی کھال کی جلیٹن اور مشک ملاتے۔ اس لعاب کو مزید بہتر کیا چینی فلسفی ٹین لیچیو نے (2697 سال قبل مسیح) مگر یہ روشنائی عام استعمال میں 1200 سال قبل مسیح میں آئی۔ پاپرس والوں کے تیار کردہ کاغذ جو دریافت ہوئے ہیں وہ 2000 سال قبل مسیح کے ہیں۔

روی بانس کی قمچیوں کو نوکیلا بنا کر بطور قلم استعمال کرتے تھے۔

جنگلی درختوں کی چھال سے 105 عیسوی میں چینیوں نے کاغذ بنانا شروع کیا اور جاپان نے 700 عیسوی میں۔ وہ لوگ اسے 711 عیسوی میں ہسپانیہ کے عربوں کو بڑی قیمت میں فروخت کرتے تھے۔ ہسپانیہ اس وقت کاغذ کی سب سے بڑی عالمی منڈی بنی ہوئی تھی۔ 700 عیسوی میں "پر" سے بنے قلم مقبولِ عام تھے، ہسپانیہ میں بھی وہی استعمال ہوتے تھے۔ اس کام کے لیے عام طور سے پرندے گھروں میں پالے جاتے تھے اور موسم بہار میں بائیں طرف کے پروں میں سے چار پر کھینچ کر نکال لیے جاتے تھے۔ یہی پر لکھائی کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ دائیں ہاتھ سے لکھنے والوں کے لیے بایاں پر پسندیدہ ثابت ہوتا تھا۔ بڑی بطخوں کا پر زیادہ استعمال ہوتا یا پھر سیہ کا کانٹا جو نسبتاً سستا ہوتا۔ پروں کا قلم صرف ایک ہفتہ چلتا پھر اس کی نوک موٹی ہو جاتی جس کی وجہ سے اسے متروک قرار دے دیا جاتا۔ پروں سے بنے قلم نے لکڑی کے قلم کی اہمیت کم کر دی تھی۔ اسٹیون اوگر فیشر اپنی کتاب A History of Writing میں لکھتے ہیں نرکل (پھونس) کے قلم 3000 سال قبل مسیح سے رائج تھے جو ساتویں صدی تک پسند کیے جاتے رہے۔ قمران، جدہ اور بحر مردار کے علاقوں میں 100 سال قبل مسیح میں بھی یہی قلم رائج تھے۔ عبرانی صرف نرکل کے قلم سے ہی لکھی جاتی تھی۔ پر کے قلم سے لکھا نمونہ 18 صدی عیسوی کا 1787ء میں تیار کردہ قوانین امریکا کا مسودہ ہے۔ پر کا قلم تقریباً 2000 سال قبل مسیح میں بھی رائج تھا۔

دھات سے بنا قلم کب ایجاد ہوا اس بارے میں تاریخ میں یہی کہا گیا ہے کہ پر کے بعد دھات کے قلم سامنے آئے مگر مزیدار بات یہ ہے کہ "پومپائی تہذیب" کے دور کے آثاریات میں بھی دھات سے بنی نب دریافت ہوئی ہے جسے مکمل قلم کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ تقریباً چھ سینٹی میٹر سے تھوڑا بڑا ہے۔ ایک اور مثال 1663 میں لکھی جانے والی سموئل پیپی کی ڈائری ہے۔ جو چاندی کے قلم سے لکھی گئی ہے۔ 1792 میں جدید ایجاد کے نام سے قلم کا ایک اشتہار نظر آتا ہے اور 1803 میں اسے پیٹنٹ کرایا گیا۔ لیکن یہ تجارتی مقصد سے پیٹنٹ نہیں کرایا گیا تھا۔ برین ڈونکن نے 1811 میں اسے تجارتی مقاصد کے تحت پیٹنٹ کرایا۔ برمنگھم میچل نے 1822ء میں بڑے پیمانے پر نب بنانے کے لیے اسے پیٹنٹ کرایا تب سے دھات کے نب والا قلم عام استعمال میں آنے لگا۔ ایم کلین اور ہنری ڈبلیو وائن نے امریکا میں رجسٹرڈ نمبر 68445 کے تحت 1867 میں سیاہی والا قلم پیٹنٹ کرایا۔ اسی دوران لوئیس واٹر مین۔۔۔ 1884 میں ایک ایسا قلم بازار میں لایا جس کے اندر روشنائی بھر کر لکھا جاتا تھا۔۔۔ یہ ایجاد واٹر مین کے نام سے منسوب تو ہے لیکن کئی صدی قبل 1220ء میں قرطبہ کے ایک لوہار نے عجیب انداز کا قلم بنایا جس کے سر پر ایک چھوٹی سی دوات تھی جس میں سیاہی بھر دی جاتی تو اندر ہی اندر باریک نالی سے گزر کر نوک تک آتی اور قلم کو بار بار روشنائی میں

ڈبونے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایک تو وہ دور ہسپانیہ پر بہت بھاری تھا۔ اندرونِ خانہ سازشیں جاری تھیں۔ عیسائی افواج حملے پر حملے کر رہی تھی اس لیے اس ایجاد کو اہمیت نہ دی گئی پھر اس دور میں کالک کو پانی میں ملا کر، چاول کو جلا کر سیاہ کر کے پیس کر استعمال کیا جاتا تھا جو سیاہی کی روانی پر اثر ڈالتا۔ لکھتے لکھتے نلی میں گاد جمع ہو کر سیاہی رک جاتی۔ اسی خامی کو 1884ء میں لوئس واٹرمین نے دور کیا اور اس آلے کو فاؤنٹین پین کا نام دیا۔ مگر اس (واٹرمین) سے قبل فرانس کے ایم بیون نے 1702ء، پیریگرین ولیم سن (بالٹی مور کا ایک موچی) نے 1809ء میں برطانیہ کے جون شیفر نے، 1819ء میں آدھا پر اور آدھا دھاتی نب کا قلم رجسٹرڈ کرایا تھا لیکن جب 1831ء میں جیکب پارکر نے سیلف فیلنگ فاؤنٹین پین پیٹنٹ کرا کر بازار میں لایا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ فاؤنٹین پین کے اقسام:

دی بٹن فیلر: 1905ء میں پارکر پین کمپنی نے پیٹنٹ کرایا اور 1913ء میں مقبولِ عام بنا۔

لیور فیلر: والٹر شیفر نے 1908ء میں پیٹنٹ کرایا۔ فورٹ میڈسن کی ڈبلیو اے شیفر پین کمپنی نے اسے 1912ء میں مقبولیت کی معراج پر پہنچا دیا۔

کلک فیلر: پہلے اسے کریسنٹ فیلر کا نام دیا گیا تھا۔ روئے کونکلین (ٹولیڈو) نے تجارتی مقصد کے لیے بازار میں لایا۔

میچ اسٹیک فیلر: 1910ء میں اسے ویرلیچ کمپنی نے مقبول بنایا۔

کوجین فیلر: لوئیس واٹرمین نے شیفر کے لیو فیلر کو بہتر بنایا۔

تاریخ میں ایک اور واقعہ ملتا ہے۔ 953ء میں عباسی خلیفہ محمد المعز نے مصر میں اپنے علما (اس دور میں سائنسدان علما ہوا کرتے تھے) سے کہا کہ مجھے ایسا قلم بنا کر دیا جائے جس سے میرے ہاتھ اور کپڑے گندے ہونے سے محفوظ رہیں۔ ان کی خواہش پر ایک ایسا قلم بنا کر دیا گیا تھا مگر اس قلم کے بارے میں کہیں کوئی خاص تذکرہ نہیں ملتا۔ وکی پیڈیا پر بھی صرف ذکر ہے تفصیل نہیں۔

دورِ حاضر کے مارکر پین:

کروشیا، سلوانیا آسٹریا، ہنگری کے سلولجب ایڈورڈ پین کالا نے 1906ء میں ایک مکینیکل پینسل بنائی تھی۔ اسے اس نے آٹومیٹک پینسل کا نام دیا تھا۔ 1907ء میں اسے سولیڈ انک فاؤنٹین پین کا نام دیا گیا کیونکہ اس نے ایڈمونڈ موسٹر کے اشتراک سے پین کالا موسٹر کمپنی کی بنیاد رکھی تھی جو آج بھی TOZ پینکالا کے نام سے موجود ہے۔

1960ء میں فلیٹ ٹپ فائبر (پلاسٹک) ٹپڈ پین جاپان کے یوکو یوہوری نے بنایا اور اسے ٹوکیو اسٹیشنری کمپنی نے بازار میں لایا۔ مارکر پین اور ہائی لائٹر پین فلیٹ ٹپڈ پین کی قسم ہے۔

رولر پین: 1970ء میں رولر پین کو متعارف کرایا گیا۔ اس میں گردش کرنے والے ننھے سے بال (Ball) اور سیاہی کا استعمال ہوا تھا۔ اس کی قیمت 150 سینٹ تھی کرچین نے اسی تکنیک پر دھات کے خول کی جگہ پلاسٹک استعمال کر کے صرف پانچ سینٹ کا پین بازار میں لا دیا۔ پاکستان میں چار آنے میں ملنے لگا۔ یہ رولر پین بھی نئی ایجاد نہیں ہے۔ ہنگری کے صحافی لاسزلو بیرو نے 1938ء میں اسے ایجاد کیا تھا۔ اس نے غور کیا کہ اخبار کی چھپائی میں جو روشنائی استعمال ہوتی ہے وہ فوراً سوکھ جاتی ہے۔ اس نے سوچا کہ اس روشنائی کو استعمال کیا جائے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ چھپائی میں استعمال ہونے والی روشنائی گاڑھی ہوتی ہے جو نب سے بہ آسانی کاغذ پر منتقل نہیں ہوتی اس کے لیے اس نے بال بیرنگ کے ایک ننھے بال کو قلم کی نوک میں اس طرح پھنسایا کہ وہ گردش کرتا رہے مگر باہر نہ آسکے اور اس کا یہ تجربہ کامیاب رہا۔ یسرو بیرو نے اسے 1938ء میں پیٹنٹ کرایا۔ پھر وہ اپنے بھائی جارج بیرو کے ساتھ ارجنٹینا منتقل ہوا اور اس نے وہاں 10 جون 1943 کو اسے دوبارہ پیٹنٹ کرایا۔ برطانوی حکومت نے ایامِ جنگ میں فوجی سازوسامان کی فہرست میں اس کا قلم بھی شامل کر لیا کیونکہ رائل ائیر فورس نے فونٹین پین کو مسترد کر دیا تھا کیونکہ فضا میں ہوا کے دباؤ کی وجہ سے فونٹین پین کی کارکردگی متاثر ہوتی تھی اس لیے بال پین کو فوقیت دی جانے لگی۔ اس طرح بال پین مقبولِ عام ہونے لگا۔ گویا نرکل سے پر اور پر سے نب والا قلم پھر فاؤنٹین پین اور فاؤنٹین پین سے رولر پین یعنی بال پین کا سفر طے کیا ہے جسے قلم کی آخری حد تصور کیا جا رہا ہے کیونکہ قلم کی جگہ اب ڈیجیٹل نوٹ بک، کی بورڈ لینے کی کوشش میں ہے۔ شاید آنے والی دو نسلوں کے بعد کوئی قلم کو پہچاننے والا بھی نہ ملے۔ بچے انسائیکلوپیڈیا میں قلم کی تصویر دیکھ کر خوش ہونے لگیں کہ ایک صدی قبل ایسا آلہ بھی ہوتا تھا جس سے لوگ لکھا کرتے تھے۔ حرف حرف جوڑ کر جملے بناتے تھے۔

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یاداشتیں

قسط: 219

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادرِ روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرمِ عمل ہیں اور اپنے روزِ اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہنِ رسا کی رفتار میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابلِ ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابلِ رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

خودکشی ایک ایسا عمل ہے جس کے بارے میں آج تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ جو لوگ خودکشی کرتے ہیں وہ بہادر ہوتے ہیں یا بزدل؟ انسان کو دنیا میں زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ بچہ ہو یا بڑا کوئی بھی اس دنیائے فانی سے بخوشی جانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ بوڑھے ہیں، غریب ہیں، صحت خراب ہے، بے شمار مسائل اور پریشانیاں ہیں لیکن مرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی تمام خوشیاں اور رنگینیاں دیکھ چکا ہے اور اب زندگی اس کے لیے بوجھ

بن کر رہ گئی ہے لیکن وہ پھر بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ بڑے بوڑھوں اور بیماروں کو چھوڑیں جوان اور خوشحال لوگ بھی خودکشی کرلیتے ہیں۔ ہمارے مذہب نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے لیکن ہم مسلمان مذہب کے کتنے اصولوں اور ہدایات پر عمل کرتے ہیں؟ آج کل تو ہمارے ملک کے مسلمانوں کی اکثریت کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کہنے کو تو مسلمان ہیں چونکہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، عقیدتاً بھی مسلمان ہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے ان کے پاس عقیدہ ہی رہ گیا ہے۔ ایمان کا ان کے دل دماغ میں شائبہ تک نہیں ہے۔ قرآن اور اللہ کا رسولؐ کہتا ہے کہ ہر انسان کو اس کی بھلائی کا ثمر اور برائیوں کی کڑی سزا روزِ محشر ملے گی لیکن ذرا سوچیے کہ اگر قرآن شریف کی ہدایات پر ہمارا یقین اور ایمان ہوتا تو کیا ہم جانتے بوجھتے ان تمام ہدایات کو فراموش کرکے خودغرضی، لالچ، ناانصافی کی دلدل میں دھنستے؟ انسانوں کے ساتھ ظلم وتشدد کرتے؟ ہم نے تو بارہا ایسے اور کئی بار حج کرنے والوں کو بھی قرآن کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے دیکھا ہے۔ پانچوں وقت پابندی سے نماز پڑھتے ہیں۔ رمضان شریف میں پورے روزے رکھتے ہیں۔ باقاعدگی سے تراویح کی نمازوں میں شرکت کرتے ہیں۔ حج اور عمرے بھی کرچکے ہیں لیکن ان کے دلوں کی سیاہی ختم نہیں ہوئی بلکہ عمر کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو آپ کیا کہیں گے جو اٹھتے بیٹھتے اللہ اللہ کرتے ہیں۔ بظاہر اللہ سے ڈرتے بھی ہیں اور دوسروں کو بھی ڈراتے رہتے ہیں لیکن ان کے اعمال اور کرتوت دیکھیے تو ان کی اس ریاکاری، منافقت کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے صرف ان کی زبان اللہ اور رسولؐ کا تذکرہ کرتی ہے لیکن اعمال بالکل برعکس ہیں۔ شاید ایسے لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

لیکن کیا وہ درحقیقت عاقبت پر یقین رکھتے ہیں؟ یا پھر ان کا یہ اصول ہے کہ نمازیں، روزے اور حج ان کو روزِ قیامت بخشوادیں گے۔ حالانکہ ان کا نامہ اعمال گم ہوچکا ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے ہمارے دونوں شانوں پر بٹھادیے ہیں جو ہر عمل کی ایف آئی آر لکھتے رہتے ہیں۔ اسے ہم امتِ مسلمہ کی بے حسی اور خدا کے احکام سے سرکشی کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

ہمارے ملک میں لوگ عموماً غربت، بیماری اور بے چارگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خودکشی ... ہیں۔ گھریلو جھگڑے بھی خودکشی کا سبب بن جاتے ... عشق ومحبت میں ناکامی بھی ہماری نوجوان نسل کا الیہ ... ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ خودکشی ایک وقتی جوش ... اگر اس سے مغلوب ہوکر آپ اپنی جان دے دیں تو ... دین اور دنیا دونوں سے گئے۔ لیکن اگر آپ اس وقتی ... یا اشتعال پر قابو پالیں تو کچھ دیر بعد آپ کو اپنی حماقت کا احساس ہوجائے گا کہ ہم کیا کرنے جارہے تھے۔

دنیا میں سب سے زیادہ خودکشی کرنے والی ... جاپانیوں کی ہے۔ انہیں تو بس خودکشی کرنے کے لیے ... چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں پر خودکشی کرلیتے ہیں ... کسی بات پر غصہ آیا تو خودکشی، کوئی بات ناگوار گزری ... خودکشی۔ محبت اور عشق کے جاپانی زیادہ قائل نہیں ہوتے ... اس معاملے میں ہماری آپ کی طرح جذباتی نہیں ہو... یہ تو عام لوگوں کی کہانی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ... معروف، دولت مند، مقبول اداکار جنہیں دنیا کی ہر ... حاصل ہے وہ خودکشی کیوں کرتے ہیں؟ آیئے ایک ... مثالوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

دنیا کی سب سے حسین اور ہر نعمت سے مالا مال ... ہالی وڈ کی اداکارہ مارلین مونرو کی زندگی ایک مثالی زندگی ... جس پر دنیا کے اربوں افراد رشک کرتے تھے۔ ہالی وڈ ... مارلین مونرو کی خودکشی پر دنیا حیران رہ گئی۔ وہ دنیا کی ... ترین اداکارہ اور فلموں کی ''سیکس سمبل'' مشہور تھی۔ اس ... شخصیت بھی عجیب تھی۔ جسم انتہائی پُرکشش اور گمراہ کر... والا لیکن چہرہ بہت معصوم۔ اگر مارلین مونرو کے جسم ... چہرے کو الگ الگ دیکھیے تو یقین ہی نہیں آئے گا کہ یہ ... ہی عورت ہے۔

مونرو نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا۔ ... کی عمر کو پہنچی تو گھر چھوڑ کر چلی گئی اور ادھر اُدھر دھکے ... رہی۔ نیویارک میں چھوٹی چھوٹی نوکریاں کیں۔ ... پرستوں کی ہوس کا نشانہ بنی جیسا کہ مغرب میں دستور ... وہاں عورت کو محض دل بہلانے کا کھلونا سمجھا جاتا ہے ... مغربی عورت اسی پر بہت خوش اور مطمئن ہے۔ مونرو ... نوعمری میں ایک شادی بھی کی تھی جو بہت کم عرصے قائم رہی ... مارلین مونرو کا اصلی نام لورما جین تھا۔ مارلین ... اس کا فلمی نام تھا۔ نیویارک کے فوٹوگرافروں نے ... خوب جھانسے دے کر عیش کیے کہ وہ اس کی تصویریں ...

مارلن مونرو کی ایک یادگار تصویر

مارلن مونرو کی ڈیڈ باڈی

خودکشی کے بعد مارلن مونرو کے بیڈروم کا منظر

سازوں کو دکھا کر اس کو اداکارہ بنادیں گے۔ اس طرح اس کے فوٹوگراف چھوٹے موٹے پرچوں میں شائع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ فلم سازوں کی نظروں میں آگئی اور نہ صرف اداکارہ بلکہ ہیروئن بن گئی۔ مارلین نے کبھی ایکسٹرا لڑکیوں کی حیثیت سے کام نہیں کیا۔ اس کی بے مثال چمکتی ہوئی بے داغ جلد، مسکراتی ہوئی معصوم آنکھیں، پلاٹینم رنگ کے بال اور انتہائی متناسب خوبصورت جسم اور قدوقامت دیر تک فلم سازوں کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بہت جلد ایک انتہائی مقبول اور معروف اداکارہ بن گئی۔ اس میں اداکاری کی صلاحیت بہت کم تھیں مگر اس کے حسن وجمال نے اس کمی کو پورا کردیا تھا۔ جب وہ بھولا سا منہ بناتی تھی، مسکراتی تھی تو اس کے خوش ادا انداز پر دیکھنے والے دیوانے ہوجاتے تھے۔

ایک دن مارلین مونرو اپنے بیڈ روم میں مردہ پائی گئی۔ اس کے سرہانے خواب آور گولیوں کی خالی شیشی پڑی ہوئی تھی جس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ اس نے زیادہ تعداد میں خواب آور گولیاں کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔

اس وقت مارلین مونرو اپنی کامیابیوں کے عروج پر تھی۔ وہ صرف 35 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگئی۔

1962ء میں پیش آنے والے اس واقعے نے ہالی وڈ ہی کو نہیں ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چلا اس کی موت زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس سے عام لوگوں نے یہ اندازہ لگایا کہ مارلین مونرو نے خودکشی کی ہے۔ اس کی موت کو پچاس سال سے اوپر کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج تک یہ راز فاش نہیں ہوسکا کہ مونرو کی ہلاکت کس طرح ہوئی اور اگر اس نے خودکشی کی تو ایک دنیا کی معروف ترین ہستی کی خودکشی کا سبب کیا تھا؟ اسے حسن کی دیوی کہا جاتا تھا۔ انگریزی میں اسے ''دیوا'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بھرپور جوانی میں اس کو خودکشی کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

مارلین مونرو نے اپنی وصیت میں اپنی 80 لاکھ ڈالر کی جائیداد اپنی خادمہ کے نام چھوڑی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے زیورات، ملبوسات اور دوسری جائیدادیں بھی تھیں۔ لیکن دراصل اس کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی تصاویر ہیں۔ اس کی تصویروں کو مختلف کمپنیوں نے اشتہارات میں استعمال کرنا شروع کردیا۔ مختلف خوشبوؤں، فیشن کے ملبوسات اور بالوں کے اسٹائل کے اشتہارات اور کمرشل فلموں میں اس کو استعمال کرنا شروع کردیا جس سے

وہ کروڑوں ڈالر کماتے تھے۔

مارلین مونرو کی سب سے مشہور اور مقبول تصویر اس کی فلم ''سیون ایئر اچ'' (Seven year Itch) سے تعلق رکھتی ہے۔ سڑک پر شوٹنگ کے دوران میں وہ فٹ پاتھ پر ایک گٹر پر کھڑی تھی کہ اندر سے تیزی سے آنے والی ہوا نے اس کے لباس اور بالوں کو اس طرح بے ترتیب کردیا کہ یہ دنیا کی سب سے خوبصورت تصویر تسلیم کرلی گئی جسے ہزار بار مختلف انداز میں استعمال کیا گیا ہے اور لوگوں نے اپنی تجوریاں بھرلیں۔

جس فوٹو گرافر نے یہ تصویر بنائی تھی اس نے عدالت میں دعویٰ کردیا کہ اس تصویر کے حقوق اس کو حاصل ہیں چونکہ یہ اس کا خیال تھا اور اسی نے اس کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ ادھر فلم ساز کمپنی کا دعویٰ تھا کہ یہ تصویر اس کی ملکیت ہے۔ اس طرح تصویر کے مختلف دعویدار پیدا ہوگئے۔ جن دنوں فائٹر اداکار شیوزنیگر کیلی فورنیا کے گورنر تھے تو انہوں نے ایک قانون بنوایا جس کی رُو سے جس کی ملکیت ثابت ہوجائے اس کی اجازت کے بغیر اس کو اشتہار میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ صرف مارلین مونرو ہی نہیں اس کی طرح دوسرے نامور اور دنیا سے رخصت ہوجانے والے فن کاروں کی تصاویر پبلسٹی کے لیے استعمال نہیں کی جاسکیں۔

مونرو کو آج بھی پہلے کی طرح مقبولیت حاصل ہے بلکہ اس میں اضافہ ہوچکا ہے۔ اس کی استعمال شدہ چھوٹی چھوٹی چیزیں اور ملبوسات بھی اس کے پرستار لاکھوں ڈالر میں خرید کر یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھتے ہیں۔

مارلین مونرو کی موت کے بعد اس کے بارے میں دو درجن کے قریب کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں اس کی خودکشی یا موت کے بارے میں رائے زنی کی گئی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں اس کی موت کا کھوج کیوں نہیں لگایا جاسکا۔

اس بارے میں زیادہ لکھنے والوں نے جو خیال آرائی کی ہے ان میں اکثریت کا خیال ہے کہ مونرو کی موت کے پیچھے امریکا کے سابق صدر جان کینیڈی کی شخصیت تھی۔

جان کینیڈی ایک رنگین مزاج اور حسن پرست انسان تھے۔ صدر کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے سے ان کے اور مارلین مونرو کے گہرے مراسم تھے۔ مونرو کا خیال تھا کہ کینیڈی کے ساتھ اس کے مراسم ہمیشہ قائم رہیں گے۔ وہ ایک بہت بڑے اور دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور سب جانتے تھے کہ وہ امریکا کے صدارتی انتخاب میں امیدوار ہوگا اور اس کی کامیابی یقینی تھی کیونکہ اس کے دولت مند باپ نے بیٹے کو کامیاب کرانے کے لیے خزانے کے منہ کھول دیے تھے۔

اور وہی ہوا۔ جان کینیڈی امریکا کا صدر منتخب ہوگیا۔ میڈیا نے اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کردیا اور امریکیوں کو یقین دلایا کہ کینیڈی سے زیادہ قابل، ذہین اور صوبر صدر آج تک امریکا کو نصیب نہیں ہوا۔ اس پروپیگنڈے کے پیچھے کینیڈی کے والد جوزف کینیڈی کا روپیا بول رہا تھا۔

مونرو کو اپنی محبت کا مزید یقین دلانے کے لیے جان کینیڈی کی صدارت سنبھالنے کی جو افتتاحی تقریب منعقد ہوئی اس میں مارلین مونرو کو گلوکارہ کے طور پر منتخب کیا گیا۔ اس روز مونرو کی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے اس تقریب کے لیے بہت خوبصورت سرخ رنگ کا لباس تیار کرایا تھا اور اس تقریب میں وہ ایک سرخ رنگین تتلی کی طرح چاروں طرف گھومتی پھر رہی تھی۔ وہ اس تقریب کی جان تھی۔

لیکن چند روز بعد ہی کینیڈی کو احساس ہوگیا کہ مارلین مونرو اور ان کے مراسم ایک اسکینڈل کی صورت اختیار کرنے لگے ہیں تو انہوں نے مارلین مونرو سے دامن چھڑالیا۔ مونرو کو اس کا بہت صدمہ تھا لیکن فلمی سچویشن کی طرح ان کے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی نے مونرو کے آنسو پونچھے اور اپنے بھائی کی جگہ اپنی محبت پیش کردی۔ اس طرح مونرو کی محبت نے بڑے بھائی کی جگہ چھوٹے بھائی کو اپنا محبوب بنالیا۔

رابرٹ کینیڈی اس وقت امریکا کے اٹارنی جنرل تھے جو کہ انتہائی اہم عہدہ ہوتا ہے۔ مونرو نے سوچا کہ بڑا بھائی نہ سہی چھوٹا بھائی سہی۔ لیکن رابرٹ کینیڈی کی محبت کا وقفہ بھی زیادہ نہیں رہا اور انہوں نے بھی اسکینڈل سے دامن بچانے کے لیے مونرو کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مارلین مونرو کو دونوں بھائیوں نے مایوس کردیا تو وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہوگئی۔ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ جس رات مونرو نے خودکشی کی اسی رات اس نے رابرٹ کینیڈی سے فون پر طویل بات چیت کی تھی اور اس کی طرف سے صاف جواب سن کر مزید مایوسی کا شکار ہوگئی۔ رابرٹ کینیڈی نے اس سے کہا کہ وہ ماضی کی باتوں کو بھول جائے۔ اس کے بعد مارلین مونرو نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور بہت زیادہ

تعداد میں [illegible] خواب آور گولیاں کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ یہ کتابیں رابرٹ کینیڈی اور جان کینیڈی کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی اس کی تردید نہیں کی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کہانی میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور تھی۔ مونرو نے کینیڈی کی تقریب میں ''مسٹر پریذیڈنٹ، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' گایا تھا۔

قدرت کا اپنا نظام بھی ہے وہ سب کے ساتھ انصاف کرتی ہے۔ صدر کینیڈی کے قافلے پر گولی چلا کر انہیں ہلاک کردیا گیا۔ ان کے بعد رابرٹ کینیڈی صدارت کے امیدوار بنے لیکن انتخاب سے پہلے ہی انہیں بھی قتل کردیا گیا۔ ان کے تیسرے بھائی کی جب باری آئی تو وہ ایک خطرناک اسکینڈل میں گرفتار ہوگئے جس کی وجہ سے ان کی صدارت کے امکانات ختم ہوگئے اور انہوں نے غم غلط کرنے کے لیے خود کو شراب کے نشے میں غرق کرلیا۔ اس

اداکارہ ''وائین ہاؤس''

طرح مارلین مونرو کی خودکشی کے بعد جان کینیڈی کا خاندان امریکی سیاست سے ہمیشہ کے لیے غائب ہوگیا لیکن مارلین مونرو کا نام آج بھی زندہ ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

داستان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جان کینیڈی اور مارلین مونرو کا ماضی کے ایک سربراہ سے بھی تعلق رہا تھا۔ یہ تعلق بالآخر مونرو کے ساتھ ساتھ جان کینیڈی کی موت کا بھی سبب بن گیا۔ مارلین مونرو کی موت یا خودکشی کے بارے

فلمساز وہدایت کار
گرودت

میں اور بھی بہت سی وجوہات لکھی گئی ہیں۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی تھی مارلین مونرو ایک موم بتی کی طرح آج بھی روشنی پھیلا رہی ہے جبکہ کینیڈی اور ان کے خاندان کو لوگوں نے بھلادیا ہے۔

حال ہی میں ایک نوخیز اور کامیاب اداکارہ ''وائین ہاؤس'' نے بھی اچانک خودکشی کرلی۔ آج تک یہ راز نہیں کھل سکا کہ اس نوجوان اور کامیاب اداکارہ کی خودکشی کا سبب کیا تھا؟

کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی پر اس کے نام کا بھی اثر پڑتا ہے۔ ''وائین ہاؤس'' ایک عجیب غریب نام ہے جس کو اردو میں ''میکدہ'' بھی کہہ سکتے ہیں یعنی شراب خانہ۔ شاید نام کا اثر تھا کہ وائین ہاؤس نے شراب نوشی کو اپنی عادت اور پھر کمزوری بنالیا۔ مغربی دنیا میں شراب پینے کو برا نہیں سمجھا جاتا حالانکہ ان کے مذہب میں بھی شراب نوشی ممنوع ہے لیکن جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مغرب نے بھی ..... اپنے مذہب میں ترمیم کرلی ہے۔ آج وہ ہر کام مغرب میں ہو رہا ہے جس پر خود ان کے مذہب نے پابندی لگائی ہے۔ بغیر شادی کے مرد اور عورت کا رہنا اور بچے پیدا کرلینا ایک معمول بن چکا ہے۔ ضروری نہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد ہی ماں باپ آپس میں شادی کرلیں۔ ایسے رشتے کبھی بھی ٹوٹ سکتے ہیں اور اس بات کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ ہم جنس پرستی پہلے خلافِ قانون تھی۔ مگر اب بیشتر مغربی ملکوں میں قانون اور معاشرے نے اجازت دے رکھی ہے۔ بعض شہروں میں اس قانون کے خلاف مظاہرے بھی ہو رہے ہیں

لیکن مغربی ممالک کیونکہ جمہوریت کے قائل ہیں جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ وائین ہاؤس نے ایک مادر پدر آزاد معاشرے میں ہوش سنبھالا تھا اس لیے لڑکپن ہی سے وہ گمراہ ہوچکی تھی۔ کثرتِ شراب نوشی، منشیات کا بے تحاشا استعمال اور آزاد معاشرے کے اثرات اس پر ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی پڑ چکے تھے۔ وہ شراب کے نشے میں دھت ہوکر عجیب عجیب حرکتیں کرتی تھی، منشیات کے استعمال نے اسے مزید خرابیوں کی دلدل میں پھنسادیا۔ دیکھنے کو اس کے پاس کیا نہیں تھا۔ 23-24 سال کی عمر میں ہی وہ مشہور اور دولت مند ہوگئی تھی۔ مغربی ممالک کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ انسانوں کا انسانوں سے رابطہ نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ خونی رشتے بھی کچھ عرصے بعد رسمی طور پر ہی رہ جاتے ہیں۔ ہمدردی، خلوص اور بے لوث محبت کا وہاں کوئی تصور نہیں ہے اس لیے ہر شخص تنہائی کا شکار ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر کا ہلا گلا اور سیر و تفریح اور اس کے بعد پھر تنہائی۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے لوگ نارمل نہیں رہتے۔ عارضی رشتوں، ناچ گانوں اور سیر و تفریح کے بعد پھر وہی تنہائی۔ نہ کوئی ہمدم نہ ہم نوا۔

وائین ہاؤس کو کئی بار اصلاحی کلینک میں داخل کیا گیا لیکن وہاں سے آنے کے بعد ماحول نے اسے پھر ان ہی عادات میں مبتلا کردیا۔ آخر ایک دن اس نے خودکشی کرلی۔ جب وہ زندہ تھی تب بھی تنہا تھی اور جب خودکشی کی تو اس وقت بھی تنہا تھی۔ مغربی معاشرے کے یہ ثمرات ہیں۔ ہماری مغرب زدہ خواتین بھی جس کی دلدادہ ہیں اور انہی راہوں پر چل رہی ہیں۔ اس طرح چوبیس پچیس سال کی عمر میں وائین ہاؤس دنیا کی تمام آسائشیں اور عیش و آرام چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب اس کے والدین اس کے لیے یادگار بنوار ہے ہیں۔

ہالی وڈ اور امریکا میں فن کار پرستی بہت زیادہ ہے۔ زندہ یا مرجانے والی شخصیات کے استعمال کی چیزیں لاکھوں کروڑوں ڈالر میں فروخت ہوتی ہیں۔ مشہور مصور پکاسو کی تصاویر تو ایک بے بہا خزانہ ہے۔ کچھ دن قبل ان کا بنایا ہوا ایک نامکمل خاکہ دو کروڑ ڈالر میں فروخت ہوا تھا۔ (ہمارے ایک دوست کہنے لگے کہ یہ احمق امریکی لاکھوں کروڑوں میں جو فنکاروں کی استعمال شدہ اشیا خریدتے ہیں دیکھنے والوں کو کیسے یقین دلاتے ہیں کہ یہ بہت نادر اشیا ہیں کیونکہ دیکھنے میں تو وہ عام سی معمولی چیزیں نظر آتی ہیں) ہم نے کہا کہ بھائی امریکیوں کو آپ کیا سمجھتے ہیں یہ بہت سیدھی سادی بلکہ احمق قوم ہے جو ہر ایک بات پر یقین کرلیتی ہے صرف ان کے سیاستداں، لیڈر اور فوجی چالاک ہوتے ہیں جو دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کو بھی بیوقوف بناتے رہتے ہیں۔“

انہیں فوراً ہماری بات پر یقین آگیا۔ دراصل امریکا کی ساکھ دنیا میں اتنی خراب ہوچکی ہے کہ اس کے بارے میں ہر خبر پر لوگوں کو یقین آجاتا ہے اور یہی امریکی سیاستدانوں کی کامیابی کا راز ہے۔

ہندوستانی فلمی صنعت کے ایک کامیاب ذہین اور معروف فلم ساز و ہدایت کار گرودت نے بھی خودکشی کے ذریعے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ گرودت کی ہنرمندی اور ذہانت کے سبھی معترف تھے۔ اس نے بہت کم عمری میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ دراصل گرودت ایک ہدایت کار کے معاون تھے۔ اداکار دیو آنند کو بھی اب تک کامیابی نہیں ملی تھی۔ جب دوستی پکی ہوگئی تو ان دونوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ جس کسی کو بھی فلم سازی یا ہدایت کاری کا موقع ملا وہ اپنی فلم میں اپنے دوست کو چانس دے گا۔ گرودت کو جب فلم ”بازی“ کی ہدایت کاری کا موقع ملا تو اس نے اپنا وعدہ نبھایا اور دیو آنند کو اس فلم میں ہیرو منتخب کیا۔ ”بازی“ ایک ایسی فلم تھی جس نے فلمی دنیا میں اپنے مختلف انداز کی وجہ سے ہلچل مچادی۔ گرودت نے ہدایت کاری کا بہت اعلیٰ معیار پیش کیا تھا۔ دیو آنند کے لیے بھی ہیرو کا کردار بہت موزوں تھا۔ گرودت اپنی پہلی فلم سے ہی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اس کی ہدایت کاری کا انداز دوسروں سے مختلف تھا خصوصاً گانے فلمانے کے لیے اس نے انوکھے انداز پیش کیے۔ اس نے ایسے موضوعات ایسے انوکھے انداز میں فلمائے جن کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ کاغذ کے پھول، پیاسا، صاحب بی بی اور غلام جیسی فلمیں بنا کر اس نے ایک منفرد حیثیت حاصل کرلی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اتنا ذہین اور زرخیز ذہن کا مالک فلمی دنیا میں کوئی اور نہ تھا۔ وہ اپنے انداز کا بالکل مختلف ہدایت کار اور فلم ساز تھا۔ اس کی فلمیں ایسے موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں جو اس زمانے سے بہت آگے کی تھیں ان فلموں کو آج دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ اسی زمانے میں بنائی گئی ہیں۔ اس کا کام وقت کی پابندیوں سے آزاد تھا۔ اس کی اکثر فلمیں بے حد کامیاب تھیں یا شاہکار تھیں۔ چودھویں کا چاند سب سے مختلف تھی۔ یہ اس کے معتمد نے ڈائریکٹ کی تھی۔ لوگ اس کی کامیابیوں اور شکل وصورت پر رشک کرتے تھے۔ اس کی چند فلمیں کلاسیکی فلموں میں شمار کی جاتی ہیں جنہیں بہت احتیاط سے رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ٹائم میگزین نے بھی اس کی فلموں کو دنیا کی ایک سو بہترین فلموں میں شمار کیا ہے۔

گرودت نے گلوکارہ گیتا دت سے شادی کی تھی جو کامیاب نہ ہوسکی حالانکہ یہ محبت کی شادی تھی۔ گھریلو سکون سے محروم ہونے کی وجہ سے وہ دوسرے سہارے تلاش کرتا رہتا تھا۔ اس کی موت کا معما آج تک حل نہ ہوسکا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اداکارہ وحیدہ رحمٰن سے اس کی محبت کی داستان ہے۔ وحیدہ رحمٰن سے اس کی محبت۔۔۔ دیوانگی کی حد تک پہنچ گئی تھی، اسی زمانے میں اس کی فلم ”کاغذ کے پھول“ بھی کاروباری لحاظ سے ناکام ہوگئی۔ وہ اپنی بیوی سے علیحدہ رہتا تھا جہاں دوستوں کے علاوہ اس کا کوئی اور سہارا نہ تھا۔

ایک صبح وہ اپنے بیڈروم میں مردہ پایا گیا۔ اس نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کرلی تھی۔ اس طرح انڈیا کی صنعت ایک بے مثال ہدایت کار سے محروم ہوگئی۔ اس نے بہت کثرت سے شراب نوشی کی اور پھر بہت زیادہ تعداد میں خواب آور گولیاں کھا کر اپنی زندگی ختم کرلی تھی۔ اس طرح ایک مثالی، خوبصورت شخصیت کے مالک اور کامیاب فلم ساز ہدایت کار نے محبت کی خاطر اپنی قیمتی جان نچھاور کردی۔ وحیدہ رحمٰن کی زبان پر کبھی گرودت کا ذکر نہیں آیا۔ ایسا لگا جیسے اتنے عظیم المیے، اتنے بڑے المیے کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ گرودت کو وحیدہ رحمٰن سے کہیں زیادہ حسین لڑکیاں مل سکتی تھیں مگر دل آنے کے ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں لیکن دراصل اس کی خودکشی کا سبب کیا تھا یہ آج تک ایک سربستہ راز ہے جو شاید ہمیشہ راز ہی رہے گا۔

بالی وڈ ہی کی ایک مشہور و معروف اسٹار دیویا بھارتی بھی ان نامور اور کامیاب شخصیات میں شامل ہے جو صرف

معروف اداکارہ دیویا بھارتی کی یادگار تصویر اور وہ فلیٹ جس کی بالکونی سے گر کر اس کی موت واقع ہوئی

19 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اس کی موت بھی آج تک ایک پُراسرار معما ہی بنا ہوا ہے۔ دیویا بھارتی نے بہت نوعمری میں اداکاری شروع کی تھی۔ شاہ رخ خان کی پہلی سپرہٹ فلم ”دیوانہ“ نے اس کو کامیابی کی بلندیوں پر پہنچادیا تھا۔ اس سے پہلے اس کی پہلی فلم ”وشواتما“ نے بھی کامیابی حاصل کی تھی۔ فلم شعلہ اور شبنم، کو بھی بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یکے بعد دیگرے تین فلموں کی کامیابی نے اس کو ان اداکاراؤں کی فہرست میں شامل کردیا تھا جن کے بارے میں فلمی پنڈتوں کا کہنا تھا کہ وہ فلمی صنعت میں بہت نام پیدا کریں گی۔ اس کا نام ہر گھر میں پہنچ گیا اور وہ ان ایکٹریسوں میں شامل ہوگئی جنہیں انگریزی میں ”ڈریم گرل“ کہا جاتا ہے۔ وہ ایک معصوم صورت لیکن بھرپور متناسب جسم کی مالک تھی۔ صورت شکل اور کشش کی حیثیت سے اس کو بہت جلد مقبولیت حاصل ہوگئی۔

لیکن سب امیدیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ ایک دن خبر آئی کہ وہ اپنی بلڈنگ کی پانچویں منزل سے گر کر ہلاک ہوگئی۔ یہ سب کے لیے ایک اچانک صدمہ تھا جس نے ساری فلمی صنعت کے علاوہ فلم بینوں کو بھی غمگین کردیا۔ اس وقت ودیا بھارتی کی عمر صرف 19 سال تھی۔ شاید شاعر

نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا ہے کہ

حسرت اُن غنچوں پہ ہے
جو بن کھلے مرجھا گئے

یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک سمجھدار نوجوان لڑکی بقائمی ہوش وحواس اپنے فلیٹ کی بالکونی سے گر کر جان دے دے؟ اس کی اچانک موت کے بارے میں بہت قیاس آرائیاں کی گئیں۔ سب سے پہلے تو اس کے شوہر نامور ہدایت کار ساجد ناڈیاڈ والا پر شبہ ظاہر کیا گیا۔ اس سے بارہا تفتیش کی گئی لیکن وہ مجرم ثابت نہ ہوسکا۔ ان کے قریبی جاننے والوں کا کہنا تھا کہ وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کررہے تھے۔ کبھی بھی ان میں کوئی بڑا جھگڑا نہیں ہوا۔ ساجد ہر جگہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جاتا تھا اور بظاہر وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کررہے تھے۔ ساجد اس کو وقتاً فوقتاً قیمتی تحائف بھی دیتا رہتا تھا اور محفل میں بیٹھ کر اپنی نوعمر بیوی کی کامیابیوں پر خوشی اور فخر کا اظہار کیا کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی دیویا کی حادثاتی موت کا اسی کو ذمے دار ٹھہرایا گیا لیکن کوشش کے باوجود اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہ ہوسکا۔ تو پھر اگر اس نے خودکشی کی تو اس کا سبب کیا تھا۔ وہ کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہم کنار تھی۔ اس کے فلمی قدوقامت میں ہر فلم کے ساتھ اضافہ ہورہا تھا اور ایک روشن مستقبل اس کا منتظر تھا۔ اسے عشق میں ناکامی سے بھی دوچار نہیں ہونا پڑا تھا۔ اس نے جسے پسند کیا جسے چاہا اس سے شادی کرلی۔ فلمی دنیا میں اسے مسلسل اور پے درپے کامیابیاں حاصل ہورہی تھیں۔ اس کی مقبولیت ملک سے باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ افغانستان میں تو اس کو "بیوٹی کوئین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان سے باہر جن ملکوں میں بالی وڈ کی فلموں کی نمائش ہوتی ہے وہاں بھی اس کے پرستاروں کی تعداد کم نہیں تھی۔ افغانستان میں اکثر دکانوں میں سری دیوی اور امیتابھ بچن کی تصویروں کے ساتھ اس کی تصویریں بھی آویزاں کی جاتی ہیں۔ یہ وہ اعزاز ہے جو بہت کم فنکاروں کو حاصل ہوتا ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ دیویا بھارتی نشے کے عالم میں بالکونی میں گئی اور توازن قائم نہ رکھنے کی وجہ سے گر گئی۔ مگر اس بات کا بھی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شراب نوشی اس کی کمزوری نہیں تھی اور نہ ہی کبھی محفلوں اور تقریبات میں اسے کثرت شراب نوشی کی وجہ سے بہکتے یا لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا گیا۔ تو پھر نوخیز اور ابھرتی ہوئی سپر اسٹار کی موت کا سبب کیا تھا؟ اس کو کسی نے دھکا دیا تھا؟ لیکن حادثے کے وقت وہ میں تنہا تھی جو اندر سے مقفل تھا۔ تو پھر کیا کسی روح یا قوت نے اسے موت کی وادی میں پہنچا دیا؟

مگر یہ سب قیاس آرائیاں اور اندازے ہیں۔ سبب آج تک کوئی نہ جان سکا اور نہ ہی شاید جان سکے۔ اس کی موت یا خودکشی ہمیشہ پُراسرار ہی رہے گی۔

لیجیے، بالی وڈ کی ایک اور نوعمر اداکارہ کی کہانی بھی لیجیے۔ اس کا نام جیا خان تھا۔ نام سے تو مسلمان یا مسلمان کی بیٹی معلوم ہوتی ہے لیکن بالی وڈ میں اب مذاہب کے مردوں اور عورتوں کی شادیاں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ جن اداکاروں کے ناموں کے ساتھ خان ہوا ہے ان کی بیگمات بھی ہندو ہیں۔ اسی طرح مسلم اداکارائیں بھی ہندوؤں کے ساتھ شادی کرنا یا مراسم قائم کرنا برا نہیں سمجھتیں۔ سلمان خان کے دو بھائیوں کی بیگمات ہندو ہیں اور بخوشی گزارہ ہورہا ہے۔ سلمان خان نے بھی جن فنکاراؤں سے مراسم رکھے شادی تک نوبت پہنچ کر رہ گئی وہ سب کی سب ہندو ہیں۔ سلمان خان ایک طویل ساتھ کے دوران میں ایشوریہ رائے کے ساتھ بدمزاجی اور بدتمیزی نہ کرتے تو شاید آج دونوں میاں بیوی ہوتے، سلمان خان ایک مغلوب الغضب انسان ہیں۔ انہیں جب اور جہاں غصہ آتا ہے وہ آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔ ایشوریہ رائے نے ان کی ہر قسم کی بدمزاجیاں اور جھڑکیاں برداشت کیں اور پھر بھی ان کے ساتھ نباہ کرتی رہیں لیکن جب ایک فلمی تقریب میں کسی بات پر ناراض ہوکر سلمان خان نے ایشوریہ رائے کو تھپڑ رسید کردیا تو اس کی گونج سارے ہال نے سنی۔ ایشوریہ رائے روتی ہوئی تقریب سے چلی گئیں مگر اس کے بعد پھر دونوں کا ملاپ نہ ہوسکا۔ ایشوریہ رائے نے چھوٹے موٹے عشق چند اور ایکٹروں کے ساتھ بھی کیے، کئی ایک سے محبت کی پینگیں بڑھائیں اور اس کی حیثیت ایک پتنگ جیسی ہوگئی۔ آخر اس پتنگ کی ڈور ابھیشک بچن کے ہاتھ آگئی۔ ابھیشک اور اس کے خاندان کو تو ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا کی ایک بہت بڑی ہستی ان کے گھر میں دیوی بن کر آگئی ہے۔ امیتابھ بچن اور ان کی بیگم جیا بھادری نے بڑی خوشیاں منائیں۔ جب نجومیوں نے بتایا کہ ایشوریہ رائے منگلی ہے (ایسی لڑکی جس کا شوہر زندہ نہیں رہتا) تو یہ سارا خاندان بڑے بڑے تمغے لگا کر سارے ملک کے مندروں پر جا کر پوجا کرتا... اور گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ ابھیشک نے تمام خطرات کے باوجود ایشوریہ سے شادی کرلی۔

لیکن یہ شادی دونوں کو راس نہیں آئی۔ ان دونوں نے جن فلموں میں کام کیا وہ کامیاب نہ ہوئیں۔ ابھیشک

معروف اداکارہ جیا خان کی یادگار تصویر
اور آخری آرام گاہ کی طرف روانگی

ناکام اداکار ہیں۔ ایشوریہ کی دوسرے اداکاروں کے ساتھ فلمیں... زیادہ کامیاب ہوئیں۔ پھر وہ ماں بننے کے باعث اداکاری چھوڑ بیٹھیں۔ اب وہ جب نظر آتی ہیں تو ایک موٹی بھدی خاتون نظر آتی ہیں۔ فلموں میں ابھیشک اور ایشوریہ رائے ناکام اداکاروں کی فہرست میں شامل ہوگئے۔ اگر ابھیشک امیتابھ کا بیٹا نہ ہوتا تو شاید آج ایک ناکام اور گمنام اداکار ہوتا۔

امیتابھ نے شادی بہت دھوم سے کی تھی لیکن خاص طور پر کسی خان کو مدعو نہیں کیا نہ ہی ان اداکار کو بلایا جن سے ایشوریہ رائے کی محبت کی کہانیاں مشہور ہوئی تھیں۔

کچھ عرصہ قبل طویل مراسم کے بعد بالآخر سیف خان اور کرینہ کپور کی شادی ہوگئی۔ کرینہ کا تعلق راج کپور کے خاندان سے ہے۔ سیف علی خان نواب پٹودی اور شرمیلا ٹیگور کے بیٹے ہیں۔ یہ بھی مخلوط شادی ہے۔ جس طرح شرمیلا ٹیگور اور نواب پٹودی کی مخلوط شادی تھی۔ کرینہ کپور اس وقت ہندوستان کی سب سے خوبصورت اور کامیاب ہیروئن، سیف خان کی ایک حالیہ فلم بھی بہت کامیاب رہی جس کے بعد انہیں ایک خوش نصیب جوڑی کہا جاتا ہے۔ سیف خان کی بیٹی سوہا علی خان بھی ایک ہندو کی محبت میں گرفتار ہیں اور عنقریب ان کی شادی ہورہی ہے۔

شاہ رخ خان پچھلے دنوں (جولائی 2013) میں تیسرے بچے کے باپ بن گئے ہیں۔ ان کی بیگم بھی ہندو ہیں۔ عامر خان کو بھی کوئی مسلمان لڑکی سارے ہندوستان میں نظر نہ آئی۔ تو یہ صورتِ حال ہے ہندوستان میں، خصوصاً فلمی دنیا میں ملی جلی شادیاں معمول بن چکی ہیں۔ کترینہ کیف بھی سلمان خان کی محبت میں گرفتار رہیں مگر ان کی جھڑکیاں

کرٹ کوبین

اور بدمزاجیاں دیکھ کر دل برداشتہ ہوگئیں مگر اب پھر ان کا نام سلمان خان کے ساتھ لیا جارہا ہے اور دونوں........

ایک بار پھر فلموں میں ایک ساتھ کام کر رہے ہیں...اور کترینہ دوبارہ سلمان خان کی طرف مائل نظر آرہی ہیں۔ وہ ایک مسلمان باپ اور انگریز ماں کی صاحب زادی ہیں۔ اسی لیے بہت زیادہ آزاد خیال بھی ہیں۔ ان کے اور کرینہ کپور کے درمیان آج کل مقابلہ چل رہا ہے کہ کون زیادہ حسین اور بہتر اداکارہ ہے۔

دیکھیے جیا خان کے تذکرے سے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جیا خان کی حالیہ ریلیز ہونے والی فلمیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ ان کی موت یا خودکشی کا طریقہ بھی بہت خطرناک تھا۔ ایک صبح اپنے کمرے میں انہوں نے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کرلی۔ ان کی خودکشی کوئی زیادہ پُراسرار بھی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اپنے بوائے فرینڈ کے نام آخری خط چھوڑا ہے۔ اس میں شکوہ کیا ہے کہ اس کی بے وفائی سے تنگ آکر وہ خودکشی کر رہی ہیں۔ لیکن اگر خودکشی کرنی ہی تھی تو اس کے بہت سے آسان طریقے تھے۔ پھانسی کا پھندا ڈال کر مرجانا تو کوئی بات نہیں ہے۔

جیا خان نے بھی اپنی اداکاری کا آغاز عامر خان کی فلم ''گجنی'' سے کیا تھا جو 2008 میں سب سے زیادہ منافع کمانے والی فلم تھی۔ اس فلم میں انہوں نے معاون اداکارہ کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ ان کے بوائے فرینڈ کا نام سورج پنچولی ہے جو اداکار ادیتیا پنچولی کے صاحب زادے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے جیا خان سے کبھی محبت اور وفا کے وعدے نہیں کیے تھے۔ ہلکی پھلکی رومانی ملاقاتوں کو محبت سمجھ لینا لڑکیوں کی فطرت ہے خواہ وہ کامیاب اداکارہ ہی کیوں نہ ہوں۔ محبت میں ناکام ہوکر زیادہ لڑکیاں ہی خودکشی کرتی ہیں۔ مرد بہت ہوشیار ہوتے ہیں ہر کام حساب کتاب سے ناپ تول کر کرتے ہیں۔ جیا خان نے اپنے خودکشی ... لکھا ہے کہ سورج کے باپ ادیتیا پنچولی نے بہت ... تھا جس کا دکھ وہ برداشت نہ کرسکیں لیکن خودکشی ... کرلینی چاہیے تھی وہ ایک سال تک کیا سوچتی رہیں؟ ... خیال آتا ہے کہ اگر دنیا میں بوائے فرینڈ نہ ہوتے ... لڑکیاں ہی نہ ہوتیں تو کتنے بہت سے لوگ خودکشی ...

خودکشی سے چند روز پہلے تک وہ اپنی سہیلی... ساتھ ہنسی خوشی، گھومتی پھرتی نظر آتی تھیں جس کا ... پارٹیوں کی تصاویر ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ معصو... میں اپنے دکھ اور مایوسی کو چھپاتی رہی ہوں۔

اب یہ بتایئے کہ ان کی خودکشی کا سبب سورج ... ہے یا اس کا باپ ادیتیا پنچولی؟ اور سزا کس کو ملنی چاہیے... بہت اچھی اداکارہ اپنی جان سے گئی اور دنیا والوں... تک نہ ہوئی۔ یہ ہم کس دور میں زندہ ہیں۔

اب ذرا ہالی وڈ کے ایک کامیاب گلوکار کے ... میں سن لیجیے۔ اس کا نام تھا کرٹ کوبین' اس گلوکار ... 1990ء میں ایک ہندو جوگی کی شاگردی اختیار کر... ہندو تہذیب سے متاثر ہونے والے ...کرٹ ... ''نروان'' کے نام سے ایک تنظیم بھی بنائی تھی۔ اس ... واشنگٹن کے نزدیک ابرڈین نامی مقام پر واقع تھا۔

1985ء میں اس گروپ کو اکٹھا کرنے کے ... نے اپنا ایک میوزک البم بھی جاری کیا تھا جس... بلیچ Bleach تھا۔ یہ البم 1990ء میں بازار ... ہی... سپرہٹ ہوگیا تھا۔ یوں سمجھیے کہ اس پر صرف ... کے بعد ہی سونے چاندی کی بارش ہوگئی تھی۔ یہ گا... نسل کا پسندیدہ نغمہ قرار دیا گیا تھا۔ لیکن دولت اپ... بہت سے مسائل بھی لے کر آئی۔ وہ چند ذاتی مسائل ... گیا۔ اس کی ایک وجہ اپنی بیوی کے ساتھ اس کے اخ... بھی تھے۔ اس کی بیوی بھی ایک میوزیشن ہے، جس... کورٹنی لو Courtney Love تھا۔ میاں ... اختلافات اور کرٹ کوبین کے مسائل کا مسئلہ کافی ... جاری تھا۔ یہ دونوں بلاوجہ بات بات پر جھگڑتے تھے... وجہ سے دونوں کی زندگی عذاب بن چکی تھی۔

ان جھگڑوں اور گھریلو تنازعات کی وجہ... کوبین فرار حاصل کرنے کے لیے ہیروئن کا عادی ... بیمار ہوا اور ڈپریشن میں مبتلا ہوگیا۔ اس کے ... دوست اس کے ان حالات پر بہت پریشان تھے۔

نے دونوں میاں بیوی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے ہی بیزار تھے تو انہوں نے علیحدگی کیوں نہیں اختیار کرلی جو ان مسائل کا آسان حل تھا؟

8 اپریل 1994ء کو کرٹ کوبین اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ پولیس نے اس کو خودکشی قرار دیا کیونکہ اس کے سر میں گولی لگی تھی جو اس کی موت کا سبب بنی۔ خودکشی کرتے وقت اس کی عمر صرف 27 سال تھی اور اسے ابھی دنیا میں بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔

اس کی خودکشی یا موت کافی عرصے تک ہالی وڈ اور میڈیا میں زیر بحث رہی۔ پوسٹ مارٹم سے پتا چلا کہ اس نے اپنے منہ کے اندر پستول رکھ کر گولی چلائی تھی۔ مرنے سے پہلے کرٹ کوبین نے اپنے خیالی دوست ''بدھا'' کے نام ایک خط چھوڑا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اب نہ تو گلوکاری کرسکتا ہے نہ گیت لکھ سکتا ہے اور نہ ہی موسیقی سننا اس کو پسند ہے تو پھر زندہ رہنے کا فائدہ کیا ہے، جب زندگی میں کوئی لطف ہی نہ ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو دراصل غم یہ تھا کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتیں کھو بیٹھا تھا۔ نقادوں کا خیال ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا اور اپنے مشاغل میں مصروف رہتا تو ان تمام جھگڑوں اور غم و آلام کو بھول جاتا جو بالآخر اس کے ڈپریشن اور موت کا سبب بنے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کی بیوی نے اس کی جواں مرگی پر دنیا دکھاوے کے لیے بھی کسی غم اور افسوس کا اظہار نہ کیا۔ حالانکہ وہی جھگڑالو عورت اس کی موت کا سبب بنی تھی۔

☆☆☆

خودکشی کرنے والوں میں ایک نام پاکستان کے نامور اداکار، مزاحیہ فنکار رفیع خاور کا بھی شامل ہے جنہیں دنیا ننھا کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ننھا کو دراصل شہرت پی ٹی وی کے مزاحیہ پروگرام ''الف نون'' سے ملی تھی۔ کمال احمد رضوی اس کے مصنف بھی تھے اور الف کا کردار بھی ادا کرتے تھے۔ یہ ایک بہت خوبصورت مزاحیہ پروگرام تھا جسے ہر عمر کے لوگ شوق سے دیکھتے تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ پی ٹی وی کے پاس پرانے یادگار ڈراموں اور پروگراموں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے جسے اس نے الماریوں میں بند کر رکھا ہے یا پھر نااہلی اور بے پروائی کی وجہ سے یہ سب ضائع ہوچکا ہے۔ آج بھی اگر کوئی پرانا ٹی وی ڈراما یا

پروگرام غلطی سے پیش کردیا جاتا ہے تو دیکھنے والے بہت خوش اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

الف نون بھی ٹی وی کے ان ہی یادگار دنوں کا ایک پروگرام تھا اور بے حد مقبول تھا۔ اس میں مرکزی کردار ننھا اور کمال احمد نے کیے تھے اور بہت خوب کیے تھے۔ کمال احمد نے ایک ہوشیار، چالاک بلکہ فریبی کا کردار ادا کیا تھا۔ ننھا ان کا دوست اور ساتھی تھا جس کا مزاج کمال احمد کے برعکس تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا، معصوم اور صاف گو نوجوان تھا۔ کمال احمد کے دبلے پن کے برعکس وہ موٹا تازہ اور نہایت صحت مند تھا۔

ننھا نے بعد میں فلموں میں مزاحیہ، المیہ اور ہیرو کے کردار بھی کیے اور بہت خوبی سے کیے۔ دراصل وہ ایسا اداکار تھا جو ہر قسم کے کرداروں کے ساتھ انصاف کرتا تھا۔ اس کو کیریکٹر ایکٹر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ننھا کو پاکستان کے لاجواب اداکاروں اور کامیڈینز کی صف میں شمار کیا جاتا تھا۔ جن دنوں ننھا کا عروج تھا اس زمانے میں پاکستان کی فلمی صنعت میں مزاحیہ اداکاروں کا مجمع تھا۔ منور ظریف، لہری، آصف جان، خالد موٹا، نرالا، رنگیلا اور ننھا جیسے ستارے اکٹھے ہوگئے تھے لیکن ان سب کا انداز مختلف تھا۔ جہاں تک حاضر جوابی اور جگت بازی کا تعلق ہے یہ سب اس میں طاق تھے۔ البتہ لہری صاحب نے کبھی جگت بازی یا معیار سے گرا ہوا فقرہ نہیں بولا۔ ان اداکاروں کو اللہ نے ایسی صلاحیت دی تھی کہ لکھے ہوئے منظر سے ہٹ کر بھی یہ مزاحیہ فقرے بول دیتے تھے جن میں ایسے فقرے بھی ہوتے تھے جو منظر کو سجا دیتے تھے۔ ان کی تکنیک یہ تھی کہ سین کی ریہرسل میں لکھے ہوئے مکالمے ادا کرتے تھے مگر سین ٹیک کرتے ہوئے ان میں اضافہ کردیتے تھے۔

ہم جب بھی ننھا، لہری اور منور ظریف سے اپنی فلموں

میں کام لیتے تو انہیں پیشگی بتا دیا کرتے تھے کہ جو مکالمے میں اضافہ کرنا ہے وہ ریہرسل میں کہہ دیا کرو۔ اگر مناسب ہوا تو رکھیں گے ورنہ منع کر دیں گے لیکن لہری صاحب اور ننھا مکالمے کے آخر میں کوئی ایسا فقرہ بول جاتے تھے جس کی وجہ سے منظر بج جاتا تھا۔

ننھا کی شکل و صورت بھی بہت معصومانہ اور بچوں جیسی تھی۔ ہم نے ایک دن کہا کہ آپ تو بالکل بے بی لگتے ہیں تو ہنس کر جواب دیا۔ ”آفاقی صاحب ہر موٹا آدمی بے بی ہی لگتا ہے۔ اب آپ آغا طالش کو دیکھ لیجیے۔“

ننھا کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ وہ مسکراتے یا ہنستے تو ان کی آنکھیں بھی مسکراتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ بہت مخلص اور وضعدار انسان تھے۔ ہر ایک کے مرتبے اور حیثیت کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔

ننھا کے بارے میں بارہا تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ یوں تو وہ بہت شریف آدمی تھے۔ کبھی ان کا کوئی اسکینڈل سننے میں نہیں آیا لیکن ڈانسر نازلی نے خدا جانے کیا جادو کیا کہ وہ سرتاپا اس کی محبت میں غرق ہو گئے۔ نازلی کا تعلق بازار سے تھا۔ نہایت معمولی شکل و صورت کی مالک تھی، بات چیت کا سلیقہ بھی نہیں تھا۔ البتہ کھانے خصوصاً مرغ بہت مزیدار پکاتی تھی۔ ننھا خوش خوراک تھے۔ اچھا کھانا پسند کرتے تھے۔ جب انہیں ٹوکو کہ بسیار خوری نقصان پہنچائے گی تو جواب میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے۔ ”آفاقی صاحب اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس نے خوش خوراکی عطا کی ہے تو ہضم بھی وہی کرائے گا۔“

ننھا ہر محفل کی جان تھے۔ جب پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کے ہیرو بننے کا وقت آیا تو ننھا کی فلم ”دبئی چلو“ ایسی سپرہٹ ہوئی کہ ہر ایک کی زبان پہ اس فلم کا نام تھا۔ انہوں نے بے شمار کامیاب فلموں میں مختلف قسم کے کردار کیے اور داد حاصل کی۔

ننھا نے نازلی کے ساتھ پہلے تو حسب معمول چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اس کے بعد معاملہ رفتہ رفتہ سنجیدہ ہو گیا اور وہ سچ مچ اس کی محبت میں ایسے گرفتار ہوئے کہ جب شوٹنگ پر گئے تو نازلی کو اپنے ساتھ لندن لے گئے اور ساری دنیا کو بھول گئے یہاں تک کہ اپنے بیوی بچوں تک کو فراموش کر دیا۔

ننھا نے جب اقبال ٹاؤن میں نیا گھر بنایا تو بہت شوق سے فرمائش کر کے ہمیں اپنا گھر دکھانے لے گئے۔ یہ کوٹھی نما گھر دراصل وحدت روڈ پر تھا اور سروس روڈ سے گزر کر ننھا کا سفید رنگ کا خوبصورت گھر تھا۔ انہوں نے گھر کی ایک ایک چیز بڑے فخر سے دکھائی۔ فرنیچر بھی خوبصورت اور قیمتی تھا۔ خوش رنگ قالین۔ رنگ برنگ پردے۔ مختصر یہ کہ ہر چیز سے نفاست ٹپکتی نظر آئی۔ اس روز ہم دونوں ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ ہمیں رخصت کرنے باہر کار تک آئے۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ نہ تو ان کے گھر میں بیوی بچوں سے اور نہ ہی ملازم کے سوا کسی سے ملاقات ہوئی اور نہ ہی گھر میں کوئی دوسرا ذی روح نظر آیا۔

چند روز کے بعد اچانک خبر آئی کہ ننھا نے خود کو اپنی بندوق سے گولی مار کر خودکشی کر لی۔ ننھا ان دنوں گھر کے بالائی حصے کے ایک کمرے میں تنہا رہتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ جیسے گھر والوں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔

ہم فوراً ان کے گھر پہنچے تو بہت سے پولیس والے اور فلم والے وہاں موجود تھے۔ گھر والوں کا بیان تھا کہ ننھا ان دنوں زیادہ چڑچڑے اور بدمزاج ہو گئے تھے اور زندگی سے بیزار تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان کی ذہنی کیفیت اتنی خراب تھی تو گھر والوں نے ان کو بندوق رکھنے کی اجازت کیوں دی تھی۔ صبح ان کی خودکشی کا گھر والوں کو علم ہوا۔ انہوں نے بندوق کے فائر کی آواز کیوں نہیں سنی؟ اس کا جواب یہ تھا کہ رمضان کا مہینا تھا۔ گھر والے سحری کے انتظامات میں مصروف تھے۔

ہم کوئی سراغرساں تو نہیں ہیں مگر یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ مرنے کے بعد وہ ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لباس پر یا چہرے پر خون کا کوئی دھبا تک نہ تھا۔ تو پھر کیا وہ کسی اور جگہ خودکشی کرنے کے بعد اپنے پیروں سے چل کر اور خون صاف کر کے دوسرے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے تھے؟ غرضیکہ بے شمار جواب طلب سوال تھے جن کا آج تک جواب نہ مل سکا اور یہ خودکشی بھی اب تک پُراسرار ہی ہے۔

بعد میں اس بارے میں فلمی دنیا میں اور ننھا کے دوستوں میں یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا۔ معلوم ہوا کہ نازلی کی وجہ سے ننھا کے گھر والوں سے تعلقات بہت زیادہ کشیدہ تھے۔ کسی نے یہ بھی بتایا کہ ننھا اپنا نیا گھر نازلی کے نام کرنا چاہتے تھے جو گھر والوں کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ یہ تو پولیس جانتی ہے یا پھر اللہ جانتا ہے۔ اللہ تو کسی کو بتانے سے رہا اور

بولی وڈ کے مشہور شاعر گلزار کی کراچی آمد۔ ساتھ میں پاکستانی صحافی مرزا افتخار بیگ اور فلم ہوٹل کی مرکزی ننھی اداکارہ نیہا انیلی

پولیس والے اپنی مصلحتوں کی بنا پر کیوں بتائیں گے؟

☆☆☆

ہم پہلے بھی بارہا بتا چکے ہیں کہ پاکستان کی صنعت فلم سازی نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑیاں مار کر اپنی صنعت کو کیسے تباہ کیا اس کی ایک اور مثال پیش کی جا رہی ہے۔

جن دنوں پاکستان کی فلمی صنعت عروج پر تھی اور بے شمار فلمیں بنائی جا رہی تھیں اس زمانے میں ہمارے فلم سازوں کو اپنی نئی فلموں کے لیے نام تلاش کرنے پڑتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ اگر ایک فلم ساز کسی فلم یا موضوع کو بنانے کا ارادہ کرتا تھا تو دوسرا فلم ساز بھی اسی موضوع پر فلم بنانے کا اعلان کر دیتا تھا۔ بعض اوقات تو فلموں کے نام بھی معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ایک ہی جیسے رکھ لیے جاتے تھے۔ آج جس قدیم یا یادگار فلم کا تذکرہ کیا جا رہا ہے اس کا شمار بھی ایسی فلموں میں کیا جاتا ہے۔ جب دو فلمیں ایک ہی موضوع پلاٹ سے بنائی جاتیں تو ہر فلم ساز کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کی فلم پہلے مکمل ہو کر نمائش پذیر ہو۔ اس مقصد کے لیے دونوں فلم ساز شب و روز فلموں کی شوٹنگ کرتے تھے۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ فلموں کے ہیرو اور ہیروئن بھی اسٹوڈیوز میں ڈیرے ڈال لیتے تھے اور جب تک فلم مکمل نہ ہو جائے وہ اپنے گھروں کو نہیں جاتے تھے۔ اس طرح جلد بازی اور مقابلہ بازی میں فلموں کا معیار بھی گر جاتا تھا اور بعض اوقات بیک وقت ریلیز ہونے کی وجہ سے کاروباری اعتبار سے بھی دونوں فلم ساز نقصان اٹھاتے تھے۔ سمجھ دار فلم ساز اس کے برعکس اپنی مختلف موضوعات اور مختلف ناموں کی فلمیں بھی بیک وقت ریلیز نہیں کرتے تھے اور ان کی ریلیز میں ایک دو ہفتے کا وقفہ ڈال دیتے تھے۔ اس طرح دونوں فائدے میں رہتے تھے۔

فلم ”عشق لیلیٰ“ ایک یادگار فلم ہے جس نے کامیابیوں کے ریکارڈ قائم کر دیے تھے۔ اس کے فلم ساز معروف ڈسٹری بیوٹر جے سی آنند تھے۔ وہ ایک بہت ہی سمجھدار، محبِ وطن اور کامیاب فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ ان کے دفاتر لاہور کے علاوہ کراچی اور ڈھاکا میں بھی تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ پاکستان کے سب سے بڑے فلم تقسیم کار تھے جن کے پاس سیکڑوں بلکہ ایک ہزار سے زائد فلموں کے حقوقِ تقسیم تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے ستیش چند آنند ان کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں۔ آج کل کیونکہ پاکستان میں فلمیں بہت کم بن رہی ہیں اس لیے ستیش صاحب اپنی زیادہ توجہ ٹی وی ڈراموں اور پروگراموں کی طرف مبذول کیے ہوئے ہیں۔

انور کمال پاشا اس زمانے میں پاکستان کے ایک بہت کامیاب معروف اور مقبول ہدایت کار اور فلم ساز تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ ایورریڈی پکچرز والے فلم عشق لیلیٰ بنا رہے ہیں تو انہیں بھی اچانک ہوش آ گیا اور انہوں نے ”لیلیٰ مجنوں“ کے نام سے وہی موضوع فلمانے کا اعلان کر دیا۔ ”عشق لیلیٰ“ میں مقبول ترین فلمی جوڑی سنتوش کمار اور صبیحہ خانم کو پہلے ہی کاسٹ کیا جا چکا تھا اس لیے انور کمال پاشا نے مرکزی کرداروں کے لیے بہار اور اسلم پرویز کو منتخب کیا۔ ”لیلیٰ مجنوں“ ہمیشہ سے ایک پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ تھیٹر کے زمانے میں بھی یہ کئی بار اسٹیج کیا گیا اور اس موضوع پر کئی فلمیں بھی بنائی گئیں مگر کامیابی ہر ایک کے حصے میں نہ آ سکی۔ ”عشق لیلیٰ“ ایک سپرہٹ تھی جبکہ انور کمال پاشا کی فلم ”لیلیٰ مجنوں“ ناکام ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد فلم ساز و ہدایت کار حسن طارق نے بھی ”لیلیٰ مجنوں“ کے نام سے ایک فلم بنائی تھی جس میں وحید مراد اور رانی نے مرکزی

کردار کیے تھے۔ یہ فلم بھی کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکی۔ اس کے برعکس ”عشقِ لیلیٰ“ نے بہت زبردست کامیابی حاصل کی، اس کے ہدایت کار منشی دل تھے۔ منشی دل تھیٹر اور اسٹیج کے زمانے میں بھی یہ موضوع پیش کر چکے تھے۔ غالباً اسی لیے ان کی فلم کو زیادہ کامیابی حاصل ہوئی کیونکہ وہ اس کی کہانی کے تمام گر جانتے تھے، اس فلم کے مصنف اور شاعر بھی منشی دل ہی تھے۔ وہ ایک پرانے اور تجربہ کار کہانی نویس تھے۔ اسکرین پلے لکھنے پر بھی عبور رکھتے تھے اس لیے ان کی بنائی ہوئی اکثر فلمیں کامیابی سے ہم کنار ہوتی تھیں ان میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی چونکہ وہ بہت سے کٹھن مراحل سے گزر چکے تھے۔ ان کی فلموں میں پروڈکشن پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ ایک بار تو ایک فلم کے منظر میں بجلی کے تار بھی نظر آ رہے تھے۔

جب منشی صاحب کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو وہ حسبِ معمول مسکرائے اور بولے۔ ”یہ سب غیر ضروری چیزیں ہیں۔ سیٹ اچھا لگا ہو یا برا دراصل منشی دل کا ڈراما چلتا ہے۔“ اور یہ بھی سچ ہے کہ ”عشقِ لیلیٰ“ میں منشی دل کا ڈراما چلا اور خوب چلا۔

”لیلیٰ مجنوں“ کی کہانی سے تو سب ہی واقف ہیں لیکن مختصر طور پر یہ فلم کی کہانی کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ دراصل عرب کے دو قبیلوں کی داستان ہے۔ اس قبیلے کے دو کمسن بچے ”لیلیٰ اور مجنوں“ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی محبت میں اور پھر عشق میں تبدیل ہو گئی۔ ان دونوں کی محبت کی داستان سارے قبیلے بلکہ علاقے میں عام ہو گئی۔ مجنوں لیلیٰ پر دیوانہ وار فدا تھا۔ اپنی کتابوں تختی، رومال غرضیکہ ہر چیز پر وہ ”لیلیٰ“ کا نام لکھتا رہتا تھا۔ ان دونوں کی محبت اس وقت ضرب المثل بن گئی کہ ایک بار جب مولوی صاحب نے مجنوں (اس کا اصلی نام قیس تھا) کو سزا دی اور اس کے ہاتھ پر بید رسید کیے تو اس کے نیل لیلیٰ کے ہاتھوں پر بھی نظر آنے لگے۔ لیلیٰ کی ماں نے مولوی صاحب سے شکایت کی کہ انہوں نے بچی کو اتنی سخت سزا کیوں دی؟ مولوی صاحب حیران ہو کر بولے میں نے تو لیلیٰ کو ہاتھ نہیں لگایا البتہ قیس (مجنوں) کو سزا دی تھی۔ جب ماں نے یہ واقعہ اپنے شوہر کو سنایا تو اس نے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ لیلیٰ کو مدرسے کی بجائے گھر پر ہی پڑھا دیا کریں۔ چونکہ اس عجیب و غریب واقعے کے بعد لیلیٰ کا باپ فکر مند ہو گیا تھا۔

دراصل اس بہانے وہ لیلیٰ اور مجنوں کو ایک دوسرے [illegible] کرنا چاہتا تھا لیکن محبت اپنے راستے خود ہی [illegible] ہے۔ لیلیٰ جب چشمے پر پانی بھرنے جاتی ہے تو قیس [illegible] پہنچ جاتا ہے اور اس طرح دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ [illegible] رہتا ہے۔ لیلیٰ کے باپ کو کسی نے یہ خبر دے دی۔ [illegible] ان دونوں کی ملاقاتوں کو روکنے کے لیے لیلیٰ کو خیمے [illegible] کر دیا اور اس کی سخت نگرانی شروع کر دی۔ اس طرح [illegible] عرصے تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے اور [illegible] قاصر رہے۔ قیس لیلیٰ کی جدائی کے غم میں دیوانہ ہو جاتا [illegible] اور لوگ اسے مجنوں کہہ کر پکارتے ہیں (یہی وجہ [illegible] دیوانہ وار محبت کرنے والوں کو لیلیٰ اور مجنوں کہا جاتا ہے)

قیس لیلیٰ کی محبت میں ہوش و حواس کھو چکا [illegible] پاگل ہو جاتا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے سر میں [illegible] ڈالے وہ ریگستانوں اور قصبوں میں لیلیٰ لیلیٰ پکارتا پھرتا [illegible] بچے اسے پتھر مارتے ہیں۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے مگر اسے [illegible] ہوش ہی نہیں ہے۔ وہ ہر طرف مارا مارا پھرتا ہے اور [illegible] کی طرف نکل جاتا ہے اس کا حلیہ بگڑ چکا ہے، جسم زخمی [illegible] لباس چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اسی آوارہ گردی [illegible] ایک بار وہ لیلیٰ کے خیمے کی طرف نکل جاتا ہے۔ جہاں [illegible] فقیروں کو خیرات بانٹ رہی ہے۔ مجنوں بھی بھوکا [illegible] لیے فقیروں کی قطار میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ لیلیٰ جب [illegible] اس حال میں دیکھتی ہے تو وہ غم اور صدمے سے [illegible] ہو جاتی ہے۔

مجنوں اب لیلیٰ سے ملاقات کے بہانے ڈھونڈنے [illegible] لگتا ہے اور ایک روز اندھا فقیر بن کر لیلیٰ کے خیمے پر پہنچ [illegible] ہے۔ دونوں کی ملاقات تو ہو جاتی ہے مگر لیلیٰ کا باپ [illegible] پہچان لیتا ہے۔ اس کے حکم پر قبیلے کے بچے اور [illegible] لوگ اس کو پتھر مارتے ہیں جس سے وہ زخمی اور [illegible] ہو جاتا ہے۔

اس دوران میں ایک قبیلے کا نوجوان سردار [illegible] گزرتا ہے۔ اس کی لیلیٰ پر نظر پڑی تو وہ اس کے [illegible] و جمال سے متاثر ہو کر اس کو پسند کر لیتا ہے۔ سردار [illegible] باپ سے کہتا ہے کہ میرے حرم میں بے شمار خوبصورت عورتیں ہیں۔ آپ ان میں سے جتنی بھی پسند کریں [illegible] مگر لیلیٰ کو مجھے دے دیں۔ میں اس کو ملکہ بنا کر رکھوں [illegible] لیلیٰ کا باپ صاف انکار کر دیتا ہے اور سردار [illegible] واپس چلا جاتا ہے۔

دوسری طرف قیس کے ماں باپ اپنے بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر بہت پریشان ہیں۔ وہ لیلیٰ کے باپ کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ قیس ہی کا ہوگا۔ اس میں کیا برائی ہے جو آپ اپنی بیٹی کی شادی اس سے نہیں کرنا چاہتے؟ وہ دلائل دے کر لیلیٰ کے باپ کو نیم رضامند تو کر لیتے ہیں مگر وہ کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا تو پاگل اور دیوانہ ہے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ دیوانہ نہیں اور ہوش مند ہے تو وہ اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دیں گے مگر سردار ابھی تک لیلیٰ کو بھولا نہیں ہے۔ وہ بے شمار قیمتی تحائف دے کر اپنے ملازموں کو لیلیٰ کے باپ کے پاس بھیجتا ہے اور اس کی بیٹی کا رشتہ مانگتا ہے۔ لیلیٰ کا باپ دولت اور تحائف کے لالچ میں ہاں کر دیتا ہے۔ قیس کی حالت یہ خبر سن کر مزید بگڑ جاتی ہے اور وہ بالکل ہی پاگل ہو جاتا ہے۔

لیلیٰ کی شادی سردار سے ہو جاتی ہے اور وہ خوشی خوشی لیلیٰ کو اپنے شاندار محل میں لے کر آ جاتا ہے مگر لیلیٰ اس سے کہتی ہے کہ دنیاوی رشتے اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ قیس کی ہے اور ہمیشہ اسی کی رہے گی۔ میں قیس کے سوا کسی کو اپنا شوہر تسلیم نہیں کر سکتی۔

سردار یہ سن کر متاثر ہو جاتا ہے اور لیلیٰ کو بہن بنا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم میرے پاس قیس کی امانت ہو۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔

لیلیٰ آزادی حاصل کرنے کے بعد قیس کی تلاش میں ریگستان کی طرف نکل جاتی ہے۔ ریگستان میں اچانک شدید طوفان آ جاتا ہے اور آندھی کی وجہ سے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ طوفان میں لیلیٰ قیس کو پکارتی ہے جس کے جواب میں وہ لیلیٰ کو پکارتا رہتا ہے بالآخر دونوں ایک دوسرے کو مل جاتے ہیں لیکن طوفان اتنا شدید ہے کہ دونوں جاں بر نہیں ہو سکے اور اکٹھے مر جاتے ہیں۔

کہانی میں منشی دل نے اور بہت سی دلچسپیاں بھی پیدا کر دی تھیں۔ مثلاً سردار (شہزادے) کے محل میں حسین کنیزوں کی چھیڑ چھاڑ، رقاصہ (آشا پوسلے) کی سردار میں دلچسپی۔ وہ سردار کی بیوی بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ کہانی میں مزاحیہ کردار بھی نظر آتے ہیں۔ منشی دل نے پرانی کہانی میں تبدیلیاں کر کے اس کو جدید طور پر مزید دلچسپ بنا دیا تھا۔

دراصل اس فلم کی کامیابی کا ایک سبب اس کی موسیقی بھی تھی۔ صفدر حسین نے گانوں کی بہت اچھی دھنیں بنائی تھیں اور پس منظر موسیقی بھی دلکش تھی۔ قتیل شفائی نے فلم کے نغمات لکھے تھے۔ اس فلم میں کل چودہ گانے تھے لیکن سبھی بہت اچھے تھے۔ فلم کے گانوں کی تفصیل یہ ہے۔

1۔ کس کو سناؤں غم کی کہانی، ہائے میری مجبور جوانی، (گلوکارہ: زبیدہ خانم)

2۔ پریشاں رات ساری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ، گلوکارہ اقبال بانو، یہ گانا آج بھی لوگوں کی زبانوں پر ہے۔

3۔ چاند تکے چھپ چھپ کے اونچی کھجور سے۔ گلوکارہ زبیدہ خانم، سلیم رضا

4۔ لیلیٰ او لیلیٰ مرے خوباں لیلیٰ۔ گلوکارہ زبیدہ خانم

5۔ اداس ہے دل نظر پریشان، بہار بن کے چلے بھی آؤ۔ گلوکار سلیم رضا

6۔ بادِ صبا اے صبا اک درد بھرا پیام لے جا۔ (گلوکارہ زبیدہ خانم)

7۔ کون کہتا ہے کہ دل...... (گلوکار عنایت حسین بھٹی، سائیں اختر)

8۔ سخی کچھ دیدے راہِ خدا۔ (گلوکار، عنایت حسین بھٹی)

9۔ دل سے جو دل ٹکرائے نظر شرمائے، کمر بل کھائے۔ (گلوکارہ زبیدہ خانم)

10۔ نکل کر تیری محفل سے یہ دیوانے کہاں جائیں۔ (گلوکار عنایت حسین بھٹی)

11۔ جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔ محبت کا جنازہ جا رہا ہے (گلوکار ماسٹر عنایت حسین)

12۔ بتا اے آسماں والے میرے نالوں پہ کیا گزری۔ (گلوکار عنایت حسین بھٹی۔ زبیدہ خانم)

13۔ چاند ان کی جبیں تاروں سے یہ حسیں (گلوکارہ زبیدہ خانم)

ان میں سے بیشتر گانے بے حد مقبول ہوئے تھے اور ہر ایک کی زبان پر تھے۔ کئی نغمات آج بھی مقبول ہیں۔ قتیل شفائی اور موسیقار صفدر حسین نے مل کر بہت ہی اچھی موسیقی بنائی تھی۔

سنتوش کمار اگرچہ صحت مند اور بھاری بھر کم تھے لیکن میک اپ کی مدد سے انہیں کمزور اور لاغر دکھایا جاتا تھا۔ انہوں نے بہترین اداکاری کی تھی۔ صبیحہ خانم کی اداکاری

سے تو کسی کو انکار ہی نہیں۔ انہوں نے لیلیٰ کے کردار کو بہت خوبصورتی سے نبھایا تھا۔ آشا پوسلے، ایم اسماعیل، ایم اجمل نے بھی اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف کیا تھا۔ زینت نے بھی اچھی اداکاری کی تھی۔ لیلیٰ کی ماں کا کردار مایا دیوی نے بہت خوبصورتی سے نبھایا تھا۔ سردار (شہزادے) کے کردار میں علاؤ الدین نے اپنے کردار کے ساتھ حسب معمول انصاف کیا تھا۔ یہ فلم اپریل 1957 میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی اور آج تک بھلائی نہیں جاسکی ہے۔ جب کسی فلم میں بہت سی خوبیاں پیدا ہو جائیں تو وہ ایک کامیاب فلم کہلاتی ہے۔ جس وقت یہ فلم مکمل ہوئی اس وقت تک صبیحہ خانم اور سنتوش کمار کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

بہت کم لوگوں کو یہ علم ہوگا کہ برصغیر میں فلموں کا پہلا مرکز لاہور تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے بھی لاہور کی فلمی صنعت ایک بڑی صنعت تھی۔ یہاں پنجابی اور اردو کی بہترین فلمیں بنائی گئیں۔ برصغیر میں دو باتیں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ جب لاہور کی کوئی فلم ہندوستان میں نمائش کے لیے پیش کی جاتی تھی تو بمبئی اور کلکتہ کے فلم ساز اپنی فلموں کی نمائش ملتوی کر دیا کرتے تھے۔ لاہور میں بہت یادگار پنجابی فلمیں بھی بنائی گئیں اور اردو فلموں میں بھی اسے ہمیشہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں پنجابی فلمیں مار دھاڑ اور بیہودہ گانوں پر مشتمل نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ ایسا زمانہ تھا جب پنجابی فلموں میں رومان اور بہت اچھی موسیقی کے علاوہ مزاح کا عنصر بھی بہت زیادہ تھا۔ فلمیں بمبئی میں بھی بنائی جاتی تھیں اور لاہور میں بھی۔ سارا خاندان پنجابی فلمیں بہت شوق سے دیکھتا تھا اور ان سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں ابتدائی زمانے میں جو فلمیں بنائی گئیں وہ بھی رومانی، مزاحیہ اور میوزیکل ہوتی تھیں۔ مثلاً نذیر صاحب نے لاہور میں جو بے حد کامیاب پنجابی فلمیں بنائیں ان میں لارے، پھیرے جیسی فلمیں شامل تھیں۔ لقمان صاحب کی فلم "پتن" بھی ایک ایسی فلم تھی جس میں مسرت نذیر کو پہلی بار ہیروئن کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا اور یہ بے حد کامیاب فلم تھی۔ عالم سیاہ پوش نے اس کا اسکرپٹ لکھا تھا۔ بابا چشتی کی موسیقی انتہائی دلکش تھی۔ مسرت نذیر کے ساتھ سنتوش کمار ہیرو تھے۔ ابتدائی رومانی مناظر میں مسرت نذیر اتنی شرمیلی تھیں کہ سنتوش کمار کا ہاتھ تھامتے ہوئے ہچکچاتی تھیں۔ سید شوکت حسین رضوی کی "چن وے" یہ بھی ایسی کامیاب پنجابی فلم تھی جس نے ہندوستان میں بھی بہت مقبولیت حاصل کی تھی۔ یکے والی اور ... بھی ایسی ہی فلمیں تھیں۔ ان فلموں کو ہر طبقے کے لوگ ... اور ان سے لطف اندوز ہوتے تھے، یہاں تک کہ ... یافتہ لوگ جو محض انگریزی یا اعلیٰ معیاری فلمیں دیکھتے تھے، بھی پنجابی فلموں کو دیکھ کر مزہ لیتے تھے۔ شباب کیرانوی کی فلم "ٹھیس مار خان" اور حسن طارق کی فلم "بھنے خان" ایسی ہی صاف ستھری لیکن موسیقی اور رقص سے آراستہ فلمیں تھیں۔ مزاح پنجابی فلموں کا ایک لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ مزاحیہ اداکاروں کے بغیر پنجابی فلموں کو مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان فلموں میں مقصدیت بھی ہوتی تھی۔ فلم یکے والی میں مجبوری کے عالم میں ہیروئن مسرت نذیر مردانہ بھیس میں یکہ چلاتی تھی۔ جب پتا چلا کہ دراصل وہ ایک نوجوان لڑکی ہے تو اس کا چالان کر دیا گیا۔ اس نے یکہ چلانے کے لیے لائسنس کی درخواست دی تو وہ مسترد کر دی گئی کیونکہ قانون کے مطابق کسی عورت کو یکہ یا تانگا چلانے کا لائسنس نہیں مل سکتا تھا۔ اس پر مسرت نذیر کہتی ہے کہ یہ کیسا قانون ہے جو عورت کو طوائف اور جسم فروشی کا لائسنس تو دے دیتا ہے لیکن یکہ چلانے کا لائسنس نہیں جاری کرتا۔ یہ خیال دراصل سعادت حسن منٹو کے ایک افسانے سے لیا گیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں پنجابی فلمیں بھی بامقصد اور اصلاحی ہوتی تھیں۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ گزشتہ سالوں میں پنجابی فلموں سے شرفا کو جو نفرت ہوگئی اس لیے کہ ان پڑھ جاہل، بدمعاش، جواری اور جرائم پیشہ افراد اپنی پسند کی فلمیں بنانے لگے۔ انہوں نے اپنے خاندانی بدمعاشوں کی زندگی کے بارے میں فلمیں بنائیں جن میں مار دھاڑ، خون خرابہ اور قتل و غارت کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اس طرح خاندانی لوگ اور خواتین پنجابی فلمیں دیکھنے سے پرہیز کرنے لگے یہاں تک کہ موضوعات کی یکسانیت کی وجہ سے مردوں نے بھی پنجابی فلمیں دیکھنا چھوڑ دیں۔ اردو فلمیں پہلے ہی بہت کم بن رہی تھیں۔ جب پنجابی فلموں کی تیاری بھی ختم ہوگئی تو سینما ویران ہوگئے اور لوگوں نے سینما گھروں کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔

بدمعاش اور ان پڑھ فلم ساز اپنے ساتھ ان پڑھ اسٹاف بھی لے کر آئے تھے۔ کیونکہ ہدایت کار جاہل تھے اس لیے وہ اپنے اردگرد بھی اپنے ہی جیسے لوگ اکٹھے کرلیا کرتے تھے۔ اس طرح پاکستان میں ہنرمند بھی پیدا ہونے بند ہوگئے اور فلمی صنعت مرحوم ہوگئی۔ اب اس میں دوبارہ

کب جان پڑے گی اور کیسے پڑے گی یہ کوئی نہیں جانتا۔

تذکرہ تھا لاہور کے فلمی مرکز ہونے کا۔ لاہور میں پہلی فلم، جو خاموش تھی، 1920 میں بنائی گئی تھی۔ گوپال کرشن مہتا اس کے ہدایت کار تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستانی فلمی صنعت کی عمر بھی ایک سو سال سے زائد ہو چکی ہے۔ پچھلے دنوں انڈیا میں فلمی صنعت کی 100ویں سالگرہ منائی گئی۔ پاکستان میں بھی فلمی صنعت ایک سو سال سے زیادہ پرانی ہو چکی ہے مگر یہاں کسی نے اس کا جشن منانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بھارتی فلمی صنعت کو وہاں کے فلم سازوں اور حکومت نے مشترکہ طور پر ساری دنیا میں متعارف کرایا ہے لیکن بدقسمتی سے پاکستانی فلموں کے بیرونی دنیا میں اب کوئی نام تک نہیں جانتا۔

برصغیر کی پہلی خاموش فلم تھی جو 1913 میں بنائی گئی تھی۔ فلم کا نام راجہ ہریش چندر تھا جس کے فلم ساز دادا بھائی پھالکے تھے۔ آج بھارت کی فلم صنعت دنیا کی سب سے بڑی فلمی صنعت قرار دی جاتی ہے جس نے ہالی وڈ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

پاکستان کی پہلی فلم "تیری یاد" تھی۔ دراصل اس فلم کا آغاز قیام پاکستان سے پہلے ہوا تھا لیکن یہ پاکستان میں ریلیز ہونے والی پہلی فلم تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں جس فلم کا سب سے پہلے آغاز ہوا وہ ہدایت کار لقمان کی فلم "شاہدہ" تھی مگر یہ دیر سے ریلیز ہوئی۔ "ہچکولے" بھی یہاں نمائش پذیر ہونے والی ابتدائی فلموں میں شامل ہے۔ تیری یاد اور ہچکولے 1947 میں ریلیز ہوئی تھیں۔ اسی لیے یہ تنازعہ آج تک طے نہیں ہوسکا ہے کہ پاکستان کی پہلی فلم قیام پاکستان کے بعد ریلیز ہونے والی... کون سی تھی۔ قیام پاکستان کے چند سال بعد مشرقی پاکستان میں بنگالی اور اردو فلمیں بھی بنائی گئیں مگر قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد اب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا ہے گویا مشرقی پاکستان میں 1970 تک فلمیں بنتی رہیں۔ بعد میں بننے والی فلمیں بنگلہ دیشی فلمیں کہلاتی ہیں۔ آج کل بنگلہ دیش میں کوئی اردو فلم نہیں بنائی جاتی لیکن وہاں انڈین فلموں کی درآمد پر بھی پابندی ہے۔ کبھی کبھی کوئی بنگلہ فلم کلکتہ سے آجاتی ہے لیکن انڈین فلمیں بڑے پیمانے پر نہیں درآمد کی جاتی ہیں جیسے کہ پاکستان میں ہو رہا ہے۔

لاہور میں بنائی جانے والی فلم کی تیاری میں روپ کے شوری اے آر کاردار، ایم اسماعیل کا بھی دخل تھا کیونکہ گوپال مہتا کے پاس سرمایہ نہ تھا صرف فلم سازی کا شوق تھا۔ وہ ریلوے میں ملازم تھے اس لیے فلم کے لیے سرمایہ نہیں لگا سکتے تھے۔ اس کمپنی کا نام پریمیئر فلم کمپنی رکھا گیا تھا۔ اس کمپنی نے اس کے بعد ایک فلم ڈاکٹر بھی بنائی تھی جو بہت کامیاب ہوئی اور اس طرح لاہور بھی فلم سازی کا مرکز بن گیا۔ یہ خاموش فلموں کا دور تھا۔ پہلی بولتی فلم عالم آرا، 1931 میں بنائی گئی تھی۔ اس زمانے میں ٹورنگ کمپنیاں شہر شہر گھومتی رہتی تھیں۔ لاہور میں پہلا سینما کب بنایا گیا؟ اس بارے میں بھی تنازعہ ہے لیکن لاہور کا پہلا سینما رائل ٹاکیز تھا۔

لاہور میں اداکاروں ہدایت کاروں، موسیقاروں اور ہنرمندوں کا جمگھٹا تھا۔ یہ سب اعلیٰ درجے کی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ پاکستان بننے کے بعد غیر مسلم لاہور سے رخصت ہوگئے۔ کچھ مسلمان بمبئی سے لاہور آگئے جن میں نور جہاں، شوکت حسین رضوی، سبطین فضلی، نذیر صاحب، ڈبلیو زیڈ احمد، مسعود پرویز اور بہت سے ہنرمند اور تخلیق کار پاکستان آئے۔ شوکت صاحب نے اپنی ساری توجہ شاہ نور اسٹوڈیو کی تعمیر پر لگا دی تاکہ فلم سازی کی بہتر سہولتیں فراہم کی جاسکیں۔ انہوں نے ایک پنجابی فلم "چن وے" بھی بنائی۔ سبطین رضوی نے بہت اعلیٰ معیاری فلم "دوپٹہ" بنائی جس نے ہندوستانیوں کو بھی چونکا دیا اور اس کی کامیابی سے خائف ہوکر سینما گھر جلا دیا گیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں پاکستانی فلموں کے لیے دروازے بند ہوگئے البتہ بھارتی فلمیں زور شور سے پاکستان آتی رہیں یہاں تک کہ ایوب خان کے زمانے میں ان کی درآمد پر پابندی لگا دی گئی لیکن گزشتہ چند سال سے بڑی بڑی کامیاب بھارتی فلمیں غیر قانونی اور ناجائز طور پر پاکستان آ رہی ہیں اور ان کی کھلم کھلا نمائش جاری ہے جس کی حکومت کو کوئی پروا نہیں ہے۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔

لاہور قیام پاکستان سے پہلے بھی تھیٹروں کا شہر تھا۔ بمبئی کے فلم ساز اپنی فلمیں سب سے پہلے لاہور میں ریلیز کرتے تھے اور لاہور میں کامیاب ہونے والی فلم سارے برصغیر میں کامیاب ہوتی تھی۔ گویا لاہور فلموں کو جانچنے کا پیمانہ تھا۔ لاہور ہی بمبئی اور کلکتہ کو فن کار، موسیقار، گلوکار اور ہنرمند فراہم کرتا تھا۔ لاہور ہمیشہ سے فن اور تخلیق کا مرکز رہا ہے۔

جب فلموں کا آغاز ہوا تو جو اس شعبے میں کامیاب نہ

ہو سکے وہ میدان چھوڑ گئے مگر جو قائم رہے انہوں نے بہت ترقی کی۔ برصغیر کے دور دراز علاقوں سے تخلیق کار لاہور آتے تھے اور اسی پیمانے پر لاہور دوسرے فلمی مراکز کو تخلیق کار فراہم کیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں لاہور کی فلمی صنعت ہر قوم، ہر زبان اور ہر علاقے کے لوگوں کا مرکز بن گئی تھی۔
لیکن بعد میں فیصلہ کیا گیا کہ جو زبان یعنی اردو، شمالی ہندوستان میں بولی جاتی ہے اسی کو فلموں کے لیے اپنا لیا جائے۔ اس طرح سارے ہندوستان میں اردو میں فلمیں بنتی تھیں بلکہ آج بھی چند ہندی الفاظ کے علاوہ انڈین فلموں کی زبان اردو ہی ہے جسے اب وہ "ہندی" کہتے ہیں لیکن ہندوستان کے ہر صوبے اور علاقے کے لیے اردو ہی میں فلمیں بنائی جاتی تھیں اور وہ کامیاب بھی ہوتی تھیں۔ خصوصاً فلمی نغمات تو آج بھی اردو ہی میں لکھے جاتے ہیں اور بے حد مقبول ہوتے ہیں۔ برصغیر میں اردو سے واقفیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب اردو کے عظیم ترین شاعر مرزا غالب کے نام سے فلم بنائی گئی تو غالب جیسے شاعر کے کلام کو بھی سارے ہندوستان میں شوق سے سنا گیا اور پسند کیا گیا۔ اس طرح اردو نے فلموں کے ذریعے تمام صوبوں اور علاقوں میں تفریق ختم کرکے انہیں یکجا کر دیا تھا۔ تمام علاقوں کی لوک موسیقی کے اشتراک سے بہت اچھی موسیقی ترتیب دی گئی۔ یوپی سمیت پنجاب، بنگال، مراٹھی، مدارس غرضیکہ سارے ہندوستان کی موسیقی کی آمیزش نے بھارتی فلمی موسیقی کو بہت خوبصورتی اور رعنائی بخشی۔ اسی لیے بھارتی فلموں کی موسیقی میں پاکستانی موسیقی سے زیادہ ورائٹی ہے۔
اسی طرح ہر علاقے کے موسیقاروں اور گلوکاروں نے بھارتی فلموں کو ایک گلدستہ بنا دیا جس میں ہر ایک کی خوشبو اور رنگ شامل تھا۔ ہر علاقے کے گلوکاروں نے دونوں ملکوں کی موسیقی کو چار چاند لگا دیے۔ جس طرح لتا منگیشکر اور محمد رفیع پاکستان میں مقبول ہیں اس طرح مہدی حسن، نور جہاں، نصرت فتح علی خان، غلام علی وغیرہ انڈیا میں مقبول ہیں۔ پنجاب کے موسیقار ماسٹر غلام حیدر نے انڈیا میں موسیقی کا انداز ہی بدل دیا اور ان کے اندازِ موسیقی کو بے حد پسند کیا گیا۔
یہ حقیقت بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ برصغیر کے بہت عظیم فلم ساز ہمنشو رائے نے اپنی پہلی فلم "لائٹ آف ایشیا" لاہور ہی میں بنائی تھی جس کی ملک گیر کامیابی کے بعد انہوں نے بمبئی میں بمبئی ٹاکیز جیسے نامور اور تاریخ ساز ادارے کی بنیاد رکھی اور بہت کامیاب اور مختلف انداز کی فلمیں بنائیں۔ انہوں نے انڈیا کی معروف اداکارہ دیویکا رانی سے شادی کی تھی جو چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے اور بمبئی ٹاکیز کا بندوبست سنبھالا دیویکا رانی نے۔ دلیپ کمار جیسے اداکار کو دیویکا رانی ہی نے دریافت کیا تھا۔ اشوک کمار بھی اسی کی دریافت تھے۔
اس اعتبار سے دونوں ملکوں کو فلمی صنعت کی 100 ویں سالگرہ کا جشن منانا چاہیے۔

☆☆☆

کیا پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کا کوئی مستقبل ہے؟
اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہوگا کیونکہ رفتہ رفتہ نئی نسلوں میں کلاسیکی موسیقی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ آج کی نسل تیز ردھم اور تیز رفتاری پر یقین رکھتی ہے۔ جبکہ کلاسیکی موسیقی نسبتاً بہت دھیمے انداز میں گائی جاتی ہے۔ موسیقی اور گائیکی کے استاد گانا شروع کرنے سے پہلے کئی منٹ تو سُروں کو درست کرنے اور گلا صاف کرنے میں مصروف رہتے ہیں جسے انگریزی میں Worm up کہا جاتا ہے۔ پہلوان، کھلاڑی، سازندے، موسیقار، گلوکار سب کو وارم اپ ہونے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کرکٹ اور ہاکی کا میچ شروع ہونے سے پہلے کھلاڑی اپنے آپ کو وارم اپ کرتے ہیں۔ پہلوان اور باکسر بھی مقابلے سے پہلے اپنے آپ کو وارم اپ کرتے ہیں۔
کلاسیکی موسیقی میں دلچسپی کم ہونے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ جس معاشرے میں یہ فنون پروان چڑھتے تھے وہ اب نہیں رہا۔ راجا، مہاراجا، نواب، رئیس سبھی کلاسیکی موسیقی کے دلدادہ تھے اور اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کے اردگرد کے لوگ بھی اس کا ذوق پیدا کر لیتے تھے۔ یہ رجحان عام لوگوں تک پھیل جاتا تھا۔ پرانے بادشاہوں کے درباروں سے بھی کلاسیکی موسیقار اور گویّے وابستہ ہوتے تھے انہیں بہت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ تان سین ایک گویّا تھا جو شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا اور ایک اہم "رتن" شمار کیا جاتا تھا۔ وہ آرام اطمینان اور عیش و طرب کا دور تھا۔ بادشاہ، راجا اور نواب سے لے کر درباریوں اور دوسرے لوگوں کے پاس بھی فرصت کا وقت ہوتا تھا۔ وہ ذہنی اور روحانی سکون کے لیے موسیقی اور دوسرے فنون کا سہارا لیتے تھے۔ اس طرح تمام معاشرہ اسی

جمی میں رنگ جاتا تھا اور ایسی محفلوں میں شرکت کو باعثِ مسرت اور باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ جب فنون کے سرپرست ہی نہ رہے تو ان کی قدریں اور پسندیدگی بھی تبدیل ہوگئی۔ لوگ مسائل میں گرفتار ہوگئے تو ایسی محفلوں کے لیے وقت کہاں سے نکالیں۔
پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ زمانے کے ساتھ لوگوں کی قدریں اور پسند بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ایک زمانے میں پوپ میوزک کو ناپسند اور بدذوقی کہا جاتا تھا لیکن اب پوپ میوزک اور تیز میوزک ہی پسندیدہ چیز ہے۔ اس طرح لوگوں کے ذوق بھی تبدیل ہوگئے۔ کہاں تو یہ کہ آرکسٹرا اور پوپ میوزک سن کر لوگ ناک بھوں چڑھاتے مگر اب یہی قابلِ پسند ہے۔ پوپ میوزک میں بھی نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ اسٹیج پر اچھل کود اب کم ہوگئی ہے۔ پوپ میوزک میں اب بے معنی شاعری کی جگہ بامقصد اور اچھی شاعری بھی شامل ہوگئی ہے۔ اس طرح وقت کے ساتھ سب چیزیں تبدیل ہو رہی ہیں۔
کلاسیکی موسیقی اور گائیکی کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اس میں بھی موسیقاروں اور گلوکاروں نے تبدیلیاں کی ہیں۔ جیسے نصرت فتح علی خان نے قوالی کا انداز ہی بدل دیا یہاں تک کہ اس میں مغربی موسیقی کا پیوند بھی لگا دیا۔ ہم پاکستانیوں میں ایک کمزوری یا احساسِ کمتری یہ بھی ہے کہ جب تک دوسرے لوگ تعریف نہ کریں ہم اپنے فن کاروں کی قدر نہیں کرتے۔ غلام علی اور دوسرے کلاسیکی گویّوں کو ہندوستان میں شہرت ملی تو ہم پاکستانیوں کو بھی احساس ہوا کہ ہمارے پاس کیسے کیسے نگینے ہیں۔ راحت فتح علی خان نے جب ہندوستان میں مقبولیت حاصل کی تو ہمیں بھی ان کی قدر ہوگئی۔ یہ وہ گلوکار ہے جس نے بھارتی گلوکاروں کے چراغ گل کر دیے۔ عاطف اسلم اور علی ظفر نے انڈیا میں نام پیدا کیا تو ہمیں بھی وہ اچھے لگنے لگے۔ یہ ہم پاکستانیوں کی عجیب و غریب نفسیات ہے یا اس کو احساسِ کمتری یا فن کی ناقدری سمجھ لیجیے۔

استاد امانت علی

ہمارے ٹی وی اور ریڈیو نے بھی کلاسیکی موسیقی کو خیرباد کہہ دیا۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں صرف نصف یا ایک گھنٹا کلاسیکی موسیقی کو دیا جاتا ہے اور وہ بھی رات گئے تاکہ کم سے کم لوگ اس کو سن سکیں اس طرح حکومت اور میڈیا کی بے نیازی اور بے قدری نے بھی کلاسیکی موسیقی کو بہت نقصان پہنچایا۔ حد تو یہ ہے کہ مہدی حسن، نور جہاں، روشن آراء بیگم کی آوازیں بھی اب ہمارے چینلو پر سنائی اور دکھائی نہیں دیتیں۔ ان کی جگہ بھارتی گانے ہر جگہ اور ہر وقت یہاں تک کہ اشتہارات میں اور ہمارے ڈراموں میں بھی اب پاکستانی آوازوں کی جگہ بھارتی گانوں نے لے لی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے میڈیا کو خود اپنے قومی فن کاروں سے نفرت ہوگئی ہے اور یہ نفرت وہ عام لوگوں تک پھیلا رہے ہیں۔ یہ ہماری حب الوطنی ہے۔
کلاسیکی موسیقاروں اور گلوکاروں کا ذریعہ آمدنی ہی نہ رہا تو وہ کب تک اس سے چپٹے رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی نئی نسلوں کو پوپ میوزک اور سازندوں کے حوالے کر دیا لیکن کلاسیکی موسیقاروں نے بھی اب جدید ساز استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں تاکہ وقت کے ساتھ چل سکیں۔ اب طبلہ، ستار، ہارمونیم کی جگہ گٹار اور دوسرے جدید سازوں نے لے لی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جب کلاسیکی فن کاروں نے قدیم سازوں کے ساتھ جدید ساز استعمال کرنے شروع کیے تو ان پر اعتراض کیا گیا کہ یہ قدیم کلاسیکی موسیقی میں ملاوٹ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے کلاسیکی موسیقی اپنا فن کھو بیٹھی ہے۔ ان گلوکاروں اور موسیقاروں نے خیال، ٹھمری، دادرا جیسے راگ ترک کر دیے ہیں اور غزل سرائی کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ ان نقادوں کا اعتراض امانت علی خان پر تھا جنہوں نے غزل گانے کا آغاز کیا تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ دوسرے گلوکاروں نے بھی غزل کو اپنا لیا۔ ان نقادوں کو یہ علم

صابری برادران

نہیں کہ جب کوئی کلاسیکی گائیک غزل گاتا ہے تو اس میں بھی سُروں اور راگ راگنی کا خیال رکھتا ہے کیونکہ اس کے بغیر تو غزل میں دلکشی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد مہدی حسن نے غزل کو معراج تک پہنچا دیا۔ اب غزل سب سے پسندیدہ اور مقبول صنف ہے۔ جو لوگ غزل گاتے ہیں انہیں یہ الزام دیا گیا کہ انہوں نے اپنے گھرانوں کا نام بدنام کر دیا ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ کلاسیکی موسیقی سے ناواقف لوگ جب غزل گاتے ہیں تو اس میں مٹھاس، رس اور دلکشی نہیں ہوتی بہ مثال کے طور پر جگجیت سنگھ نے غزل گانے میں بہت شہرت حاصل کی لیکن ان کی غزلوں میں روکھا پن ہے۔ ذائقہ اور دلکشی نہیں ہے۔ اس کے برعکس سہگل، مہدی حسن، نور جہاں، روشن آراء بیگم اور غلام علی کی غزل سن کر لطف ہی اور آتا ہے۔ میرا مقصد جگجیت سنگھ کی خدمات کو نظر انداز کرنا نہیں ہے۔ انہوں نے غالب کی غزلوں کو بھارت میں مقبول کر دیا ہے۔ ان کی بیگم کی آواز میں اس سے زیادہ سُریلا پن اور مٹھاس تھی۔ جب وہ دونوں ایک ساتھ گاتے تھے تو یہ فرق نمایاں طور پر محسوس ہوتا تھا۔ اب تو وہ دونوں ہی اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی آوازیں زندہ رہیں گی۔

مہدی حسن کا تعلق کسی گائیک گھرانے سے نہیں تھا اور انہوں نے آغاز ہی غزل گانے سے کیا تھا۔ ان کی منفرد آواز نے انہیں بہت جلد مقبول بنا دیا تھا۔ امانت علی خان کا تعلق چونکہ گائیکی کے گھرانے سے تھا اور ان کے دادا علی بخش بہت بڑے کلاسیکی گائیک تھے اس لیے انہیں زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

اقبال بانو ایک مکمل گلوکارہ تھیں جنہیں کلاسیکی انداز پر بھی عبور حاصل تھا اس لیے انہوں نے غزل میں بھی نام پیدا کیا اور کلاسیکی گلوکاری میں بھی انہیں یکساں پسندیدگی حاصل ہوئی۔ یہی معاملہ فریدہ خانم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ کلاسیکی گائیکوں نے نئے نئے تجربات جاری رکھے۔ جنہوں نے یہ انداز اپنایا ان ہی کو شہرت، مقبولیت اور دولت حاصل ہوئی۔

قوالی کی دنیا میں بھی انقلاب رونما ہوا۔ صابری برادرز پہلے پاکستانی گلوکار تھے جنہوں نے قوالی کے انداز میں تبدیلیاں کر کے اسے یورپ میں مقبول کیا۔ قوالی کا ردھم کیونکہ تیز ہوتا ہے اس لیے یورپ والوں کو بہت بھایا۔ ان کے بعد نصرت فتح علی خان نے قوالی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مغربی موسیقی کو انہوں نے اس خوبی سے اپنایا کہ امریکا اور یورپ والے ان کے دیوانے ہو گئے۔ ان[...] ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ مشرق اور مغرب کا کون [...] تھا جہاں ان کی موسیقی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ یہاں تک [...] انہوں نے مغربی گلوکاروں کے ساتھ مل کر بھی دھنیں [...] اور دنیا بھر میں مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی۔ بچے بچے [...] لوگ ان کو جانتے تھے اور ان کے مداح تھے۔

کچھ اور پاکستانی گلوکاروں نے بھی بھارت [...] فلموں اور نجی محفلوں میں گانے کا مظاہرہ کیا اور جدت [...] کی وجہ سے بہت جلد بھارتیوں کو اپنا پرستار بنا لیا۔ یہ [...] 1970ء میں پیدا ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے مداح [...] بہت بڑا حلقہ پیدا کر لیا۔ یہ لوگ اتنے مقبول ہوئے [...] شرائط منوانے لگے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ تعلیم [...] شائستہ اور مہذب لوگ تھے۔ اس لیے انہیں زیادہ پذ[...] حاصل ہوئی۔

پاکستانیوں کو اپنے فنکاروں کی صلاحیتوں پر بھی [...] علم نہیں ہوا جب تک کہ غیر ملکیوں نے انہیں آگاہ نہیں [...] وہ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی قدروں کے بارے [...] بھی شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ اگر دوسرے ملکوں کے [...] انہیں آگاہ نہ کریں تو وہ کبھی اپنوں کی قدر نہ کریں۔ صا[...] برادرز نے امریکا یورپ اور خصوصاً فرانس والوں کے [...] جیت لیے جو خود بھی اپنے کلچر پر ناز کرتے ہیں۔ نصرت [...] علی خان ایک سیلاب کی طرح غیر ملکیوں کو اپنے ساتھ [...] لے گئے۔ بدقسمتی سے وہ کم عمری میں ہی وفات پا گئے [...] اور زیادہ نام پیدا کرتے۔

تمام حق تلفیوں اور ناانصافیوں کے باوجود [...] موسیقی آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ [...] کی بنیاد ہے۔ راگ راگنیوں اور سُروں کے بغیر کسی [...] کی موسیقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لوک موسیقی کی طرح [...] بھی ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ہمارے میڈیا اور سوشل حلقوں [...] بھی اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارے [...] تہذیب و تمدن کی نشانی ہے۔ اس کو سنبھال کر رکھنا آ[...] والی نسلوں کا بھی فرض ہے۔ کلاسیکی موسیقی میں وقت [...] تقاضوں کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ مگر یہ [...] عجیب اور انوکھی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور [...] رہے گا مگر اپنے کلچر اور فن کاروں کی قدر و منزلت کر[...] نہ بھولیں۔

جاری[...]

عرب اور خوشبو

اختر شہاب

خوشبو لگانا عربی ثقافت کا حصہ ہے۔ اس سے ماحول بھی خوشگوار محسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے احکامِ اسلامی میں بھی تاکید ہے۔ عرب خوشبو کو کس کس طرح استعمال کرتے ہیں اس کا مختصر سا جائزہ۔

ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے ایک معلوماتی تحریر

خوشبوئیں طرح طرح کی ہوتی ہیں اور اس کے شوقین بھی قسم ہا قسم کے ہوتے ہیں۔ خوشبو پھولوں اور فراری تیلوں سے بنائی جاتی ہیں ان پھولوں اور فراری تیلوں کی ہزاروں قسمیں ہیں۔ (فراری اس تیل کو کہتے ہیں جو ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں) کوئی بھی خوشبو بنانے کے لیے ان ہزاروں عناصر میں سے ہر بار دو تین موزوں عناصر کا انتخاب کیا جاتا ہے اور ان کی مناسب مقدار متعین کر دی جاتی ہے اور پھر ان منتخب شدہ عناصر کو ملایا جاتا ہے اور خوشبو تیار ہو جاتی ہے۔

تیاری کے اس تمام عمل میں موزوں عناصر کے انتخاب اور مناسب مقدار کے تعین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے لیے عطر ساز بڑی محنت کرتے ہیں کیونکہ اگر ان میں سے کسی چیز میں بھی کمی بیشی ہوگی تو خوشبو کا تاثر زائل ہو جائے گا۔ عطر ساز اس کام میں خاصے مشاق، بڑے ہنر مند اور خوب ماہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود تو خوشبوؤں کے پسِ پردہ گمنام ہی رہتے ہیں مگر ان کی بنائی ہوئی طرح طرح کی پائیدار یعنی دیرپا اور لازوال خوشبوئیں دنیا بھر میں دھوم مچا دیتی ہیں اور شہرتِ دوام حاصل کرتی ہیں۔

عرب، مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے ہاں جملہ خاطر مدارت کے علاوہ مہمان کو عطریات پیش کرنا، مہمان نوازی کی علامت شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عربوں کی اپنی بود و باش اور طرزِ معاشرت میں بھی خوشبوؤں کا بڑا عمل دخل ہے۔ عرب مہمان کی بڑی خاطر تواضع کرتے ہیں اور اس کی عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے۔ پھر مہمان جس روز ان سے رخصت چاہتا ہے اور رختِ سفر باندھ لیتا ہے تو مہمان کو الوداعی کھانا کھلانے کے بعد اسے دو تین خوشبوؤں سے خوب معطر روئی کا پھوہا، بلورین طشت میں رکھ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب مہمان رخصت ہونے لگتا ہے تو صاحبِ خانہ یا خاتونِ خانہ ایک بخوردان لے کر آتے ہیں جس میں بہترین قسم کی خوشبوئیں سلگ رہی ہوتی ہیں۔ نہایت خوشبودار دھواں نکل رہا ہوتا ہے۔ اسے مہمان کے اطراف و جوانب میں گھمایا جاتا ہے تو فضا خوشبو دار دھوئیں سے پُر ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ خوشبوئیں نہ صرف مہمان کے بلکہ میزبان کے لباس میں بھی رچ بس جاتی ہیں، ان کی سانسوں کو بھی معطر کر دیتی ہیں۔ اس اہتمام کے ساتھ میزبان، مہمان کو... فی امان اللہ کہتا ہے اور مہمان خوشبوؤں کے اس قافلے کے ساتھ خوشگوار یادیں لیے رخصت ہو جاتا ہے۔

عرب ہمیشہ سے خوشبوؤں کے شیدائی اور دیوانے ہیں۔ ان کے ہاں نہ صرف بخاراتی خوشبوؤں کا بے انتہا استعمال ہوتا ہے بلکہ یہ عطر بیزی بھی خوب کرتے ہیں۔ ان کے گھروں میں روزانہ کم و بیش چار پانچ بار بخوردان سلگا کر گھر کے ایک ایک کمرے کو خوب مہکایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کمرے کے لوازمات یعنی کپڑے، بستر، چادر، پلنگ پوش اور پردے جب بھی تبدیل کیے جاتے ہیں تب تب ان میں ہر مرتبہ خوشبوئیں بسائی جاتی ہیں۔ بخوردان میں جو خوشبوئیں ڈال کر سلگائی جاتی ہیں وہ عنبر، مشک، صندل کا مرکب ہے۔ اس کی تیاری کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ صندل سفوف اور زعفران کو عرقِ گلاب کے ساتھ ملا کر گوندھتے پھر اسے چھوٹی چھوٹی گولیوں کی شکل میں بنا لیتے ہیں۔ میں یہی گولیاں بخوردان میں سلگائی جاتی ہیں۔

چادر میں اچھی طرح خوشبو بسانے کے لیے ایک خاص قسم کا بخوردان استعمال ہوتا ہے جسے مبخر کہتے ہیں۔ بخوردان کے اوپر چادر کو تاننے کے لیے ایک خاص قسم کے اڈے کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اڈا پام کی ڈنڈیوں سے جالی دار ساخت کے ساتھ گنبد کی شکل کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس اڈے کے نیچے مبخر کو رکھ دیتے ہیں اور اڈے کے اوپر چادر پھیلا دیتے ہیں تو یہ چادر ایک خیمہ کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس کے نیچے سے مبخر کی بہترین خوشبوؤں کی دھونی چادر کے تانے بانے کی ایک ایک تار میں سما جاتی ہیں اور یوں یہ چادر ایسی غیر معمولی خوشبودار ہو جاتی ہے جیسے وہ صرف کپڑے کی چادر نہ ہو بلکہ بہترین خوشبودار پھولوں سے بنی چادر ہو۔

یہ طریقہ دبئی اور مشرقِ وسطیٰ میں بھی رائج ہے۔ اس کے علاوہ عطر کی قدیم چھوٹی دکانوں، جدید عالی شان دکانوں اور دلکش خوشبوؤں کے مراکز میں (جن کو دنیا میں شہرت اور ایک مقام حاصل ہے) اس طریقے پر عمل ہوتا ہے۔

سرزمینِ عرب میں، عنبر، چنبیلی، لونڈر اور لیمن گراس زمانہ قدیم سے عطر حاصل کرنے کا سب سے مقبول ذریعہ رہے ہیں مگر خود عربوں کی سب سے زیادہ پسندیدہ خوشبو مشک ہے۔ مشک کی خوشبو بڑی دلکش اور نہایت دیرپا ہوتی ہے۔ عطر سازوں نے مشک کی اپنی خصوصیات اور اس کے زیادہ پسند کیے جانے کی نفسیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کو کسی بھی عطر کی تیاری میں ایک لازمی جز کے طور پر شامل کر دیا ہے۔

خوشبو عربوں کی کمزوری ہے اس وجہ سے اصلی عطر کے ساتھ مصنوعی عطر بھی عربوں میں مقبول ہے جسے سینٹ کہتے ہیں۔ مردوں میں...... ڈنہل وارڈ سب سے زیادہ مقبول عام سینٹ ہے۔ یہ سینٹ ہزاروں چھوٹی بڑی دکانوں پر تقریباً روزانہ فروخت ہوتا ہے۔ تاہم سب سے زیادہ شہرت سعودی عرب میں طائف کے مقام سے برآمد ہونے والے سینٹ کو حاصل ہے۔ یہ طائف کے شہر سے بکثرت آتا ہے لہٰذا اس نسبت سے اس کا نام بھی ”طائفی“ پڑ گیا ہے۔ یہ خوشبو جس پودے کے پھولوں سے حاصل کی جاتی ہے اس کے پھولوں کی پتیاں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں عطر سازی کے

بے حد ہاتھوں سے چن کر ذخیرہ کی جاتی ہیں۔

سب سے زیادہ پسند کی جانے والی خوشبوؤں میں لوبان بھی ایک خوشبو ہے۔ لوبان کو زیادہ تر سلگا کر اور دھونی سے خوشبو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں یہ ایک پرفیوم ہے۔ پرفیوم (Perfume) لاطینی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہی دھوئیں کے ذریعے حاصل کردہ خوشبو۔

لوبان اصل میں ایک قسم کا گوند ہے۔ یہ گوند لوبان کے خاردار درخت کی چھال پر آنسوؤں کے قطرے جیسی شکل میں قطرہ قطرہ نمودار ہوتا ہے اور جمتا رہتا ہے۔ لوبان کے درخت ملک عمان کے صوبہ دھوفر میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ لوبان کو تین صدی قبل مسیح میں بھی ڈاکٹر اور خاص طور پر دانت کے ڈاکٹر بطور دوا استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پرفیوم کے خریداروں میں سب سے بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو لاشیں حنوط کرنے کا کام کرتے تھے۔ مصر کے مقام کرنک سے لے کر نینوا یا بابل تک کے تمام مندروں اور قربان گاہوں میں عملیات کے لیے ڈھیروں لوبان سلگایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ پیشوا بخوردان کے نہایت خوشبو دار دھوئیں سے سورج دیوتا کو بھی دھونی دیا کرتے تھے تاکہ سورج دیوتا راضی ہو جائے اور قدیم دارالسلطنت بابل سے بدکاری کا زور ختم کر دے۔

لوبان کے بیش قیمت ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک زمانے میں بغداد کے بازاروں میں بحرین کے سچے موتیوں کو لوبان کے برابر وزن کے بدلے میں فروخت کیا جاتا تھا۔ اسی طرح چین میں سلک کے بدلے لوبان کا سودا ہوتا تھا۔

وہ فراری تیل جو بخورانوں میں دھونی اور عطر بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں ان کے وزن کی قیمت ایک زمانے تک طویل دورِ تجارت میں سونے کی قیمت سے بھی زیادہ رہی ہے۔ عرب کے علاقوں میں فراری تیل پودے کے خالص جوہر سے کشید کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے عطر میں ادویاتی خصوصیات بھی موجود ہوتی ہیں اور اس کی خوشبو ایسی اصل ہوتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ پھول واقعی کہیں آس پاس مہک رہے ہیں۔ فراری تیل کو پودے کی جڑ کی خاص خاص گانٹھوں، چھال، پتوں اور پھولوں سے رطوبت کی طرح خارج کرا کر نکالتے ہیں اور اس مقصد کے لیے چھال، پتے اور جڑ وغیرہ موسم بے موسم آخر وقت تک چنے جاتے ہیں...... تمام پھولوں کے پودوں میں سے چنبیلی کے پودے میں سب سے زیادہ فراری تیل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غروب آفتاب کے وقت اس کے پھولوں کی خوشبو بھی دیگر سب پھولوں سے بہت زیادہ بلکہ اپنے عروج پر ہوتی ہے۔

گلاب کا عطر استنبول اور بلغاریہ سے آتا ہے اور مشرقی خوشبوؤں میں مزید مہنگا بکتا ہے۔ کیونکہ گلاب کی پتیوں سے بہت کم وزن میں فراری تیل نکلتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ گلاب کی سو کلو پتیوں سے زیادہ سے زیادہ نصف لیٹر فراری تیل نکلتا ہے۔ بعض اوقات فراری تیل کی کشید کی نسبت پھولوں کی پتیوں کے کل وزن کا 0.01 فیصد ہوتی ہے۔ ہاں چنبیلی کے علاوہ ایک اور پودا Myrtaceal جو شاہ بلوط کے پودے سے مشابہ ہوتا ہے وافر مقدار میں فراری تیل مہیا کرتا ہے اور یہ فراری تیل بڑی کامیابی سے عطر بنانے میں استعمال ہوتے ہیں فراری تیل کشید کرنے کے دو طریقے ہیں۔

نمبر 1۔ لکڑی کے پریس سے دبا کر تیل نکالنا۔

نمبر 2۔ بھبکے کے ذریعے تیل کشید کرنا۔

لکڑی کے پریس سے تیل نکالنے کی ترکیب یہ ہے کہ پھولوں کی پتیوں کو پریس کے شکنجے میں ڈال کر دبایا جاتا ہے تو تیل نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور تیل کی نکاسی کی جگہ یکے بعد دیگرے بوتلیں لگا کر تیل بھر لیا جاتا ہے۔

بھبکے کے ذریعے تیل نکالنے کا طریقہ سب سے زیادہ مقبولِ عام ہے اور یہ طریقہ بالکل وہی ہے جس سے کسی بھی جڑی بوٹی کا عرق نکالا جاتا ہے۔ اس کی ترکیب سے سب خاص و عام واقف ہیں۔ یہ طریقہ عرب کے ایک طبیب نے گیارہویں صدی عیسوی میں ایجاد کیا تھا۔ فراری تیل سے خوشبوئیں بنانے کے لیے انہیں تین بنیادی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر قسم میں چند مختلف فراری تیل شامل ہوتے ہیں۔

قسم اول میں گل نیلوفر، گارڈینیا اور نارنگی کے پھولوں کا جوہر استعمال ہوتا ہے۔ ان خوشبوؤں کو اول درجہ حاصل ہے اور یہ خوشبوئیں زمانہ قدیم سے روزمرہ زندگی میں بڑے شوق سے استعمال کی جاتی ہیں۔

قسم دوم میں لوبان، صندل، عنبر اور قدیم اور شاہی مصالحہ کی خوشبوؤں کے جو ہر دوسرے درجہ کے مرکب شمار ہوتے ہیں۔

قسم سوم میں گلنار، لونڈر اور صنوبر کے پھولوں کے

جو ہر لو تیسرے درجے کی خوشبوؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ان خوشبوؤں میں عمر خیام، بوئے حرم، عربین نائٹ، کوئن قلوپطرہ اور راز صحرا وغیرہ کے تجارتی یا کمرشل ناموں سے فروخت ہونے والی خوشبوئیں شامل ہیں۔

عطر کی تجارت بڑے پیمانے پر عربوں کے ایک مستول والے جہازوں سے ہوا کرتی تھی۔ یہ جہاز جنوبی عرب کی بندرگاہوں سے روانہ ہوتے تھے اور عطر کے بدلے مصالے لے کے ہندوستان سے ہوتے ہوئے جزائر مشرق الہند جا پہنچتے۔ وہاں سے درجنوں قسم کے مصالحے مثلاً لونگ، الائچی اور چائے، پھل وغیرہ جہازوں پر لادے جاتے اور وہاں سے یہ جہاز مملکت روم کی طرف روانہ ہو جاتے جہاں یہ مصالحے روم کے بازاروں میں فروخت کر دیے جاتے۔

زمانہ قدیم میں زندگی سے لے کر موت تک بلکہ قبر تک ہر راستے اور ہر موڑ پر تمام رسوم میں یعنی کمرے کو روزانہ بار بار معطر کرنے کے لیے، لباس بستر اور چادر میں پوری طرح خوشبو بسانے کے لیے، گھریلو تقریبات میں استعمال کے لیے اور اس کے علاوہ ہر موقع اور ہر رسم میں بخوردان خاص طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی عرب کے گھر میں بخوردان نہ ہو۔ ان بخورداتوں کی مسلسل اور مستقل طور پر بے انتہا مانگ تھی۔ عود اور لوبان سے مہکتے ہوئے منقش بخوردان بمبئی سے لے کر ٹمبکٹو تک فروخت ہوا کرتے تھے۔

عرب مانے ہوئے سوداگر تھے۔ انہوں نے... نقل وحمل کے ان راستوں پر، بہت بڑے پیمانے پر اپنے تجارتی قافلوں کا جال بچھا دیا تھا۔ یہ منصوبہ بندی آج بھی تجارتی قافلوں کے راستوں کی سب سے زیادہ قدیم اور سب سے بڑی تاریخی منصوبہ بندی شمار ہوتی ہے۔ مغربی تاجروں نے عربوں کی ہی تقلید کی اور اسی انداز میں تجارت کا اصول بنایا۔

تیسری صدی عیسوی کے دوران بخوردانوں کے تجارتی قافلوں کی بحری شاہراہ نباتین (Nabateans) کے دارالسلطنت پیڑا (موجودہ اردن) سے شروع ہوتی تھی جو نہایت تیزی سے قدیم دنیا کے سب سے زیادہ اہم سنگم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس شاہراہ سے مغرب کی طرف ایک بڑا راستہ شمالی مصر کو پار کر کے اسکندریہ کی دولت مند بندرگاہ سے جاملتا تھا۔ اسکندریہ کی بندرگاہ ایک زمانے میں فراری تیل، مصالحوں اور پرتعیش اشیا کی نکاسی کا سب سے بڑا مرکز تھی۔

پیڑا سے ایک زمینی راستہ شمال کی طرف جاتا تھا، دمشق اور الیپو (Allepo) کو پار کر کے چین کی سلک کے تجارتی راستے سے مل جاتا تھا اور آگے جا کر اناطولیہ سے بازنطین تک پہنچ جاتا تھا۔ پیڑا سے جنوب کی طرف جانے والا بخورداتوں کا تجارتی راستہ حجاز سے گزرتا ہوا جنوبی عرب جا پہنچتا تھا۔ جنوبی عرب میں لوبان کے درخت تھے اور لوبان حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔ وہاں سے نہ صرف لوبان کی مانگ پوری ہوتی تھی بلکہ فراری تیل بھی وافر مقدار میں اسی بری راستے سے برآمد کیے جاتے تھے۔

قدیم مصری بھی مشرقی عطریات ذخیرہ کرنے کے بہت شوقین تھے اور ان کو وافر مقدار میں استعمال کرنے کے عادی تھے۔ ان کی سنگھار میزیں طرح طرح کے مشرقی عطریات سے آراستہ ہوتی تھیں اور غم کے موقع پر تو ان خوشبوؤں کے استعمال میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا تھا۔ کفن، قبر، سنگ مرمر اور قربان گاہ کو معطر کرنے کے لیے عطر پانی کی طرح بہایا جاتا تھا۔ نہایت عمدہ، نفیس اور قیمتی سینٹ کی ہزاروں بوتلیں فراعین مصر کے اہراموں پر اور فراعینِ مصر سے دوسرے درجے کے متوفین کے مقبروں پر انڈیل دی جاتی تھیں۔

عرب کی خوشبوؤں کو دیگر تمام بیرونی ممالک کی خوشبوؤں پر فوقیت حاصل ہے۔ ان کی بہت سی اقسام ہیں۔ ان میں سائنسی اور طبی اثرات موجود ہیں۔ سب خواص و عوام ان خوشبوؤں کے والہانہ شیدائی ہیں۔ یہ خوشبوئیں بیش قیمت بھی ہیں لیکن قیمت کی زیادتی ان کی فروخت پر بالکل بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ خوشبوؤں کے چاہنے والے ان کو ہر قیمت پر خرید لیتے ہیں۔ یہ بہترین تحفہ شمار ہوتی ہیں۔

خوشبوؤں کو استعمال کرنے کے اثرات اور ان کے فائدوں کی تفصیلات کی ایک طویل اور لمبی تاریخ ہے۔ یہ خوشبوئیں ایسی مسحور کن ہیں کہ اپنے استعمال کرنے والوں کو سحر زدہ کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ایک عیاں حقیقت ہے کہ عطر یا خوشبوؤں میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ بدن میں جذب ہو کر رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہیں۔

خوشبوؤں کی یہ شفا بخش خصوصیات فراری تیل میں موجود ہوتی ہیں اور مصری معالجین کی تحقیق کے مطابق عطر ساز نہ صرف جوؤں سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ وہ طاعون اور ہیضہ کا بھی شکار نہیں ہوتے۔

سلیم فرخی

اس کا نام ہی ہونٹوں پر مسکراہٹ لا دینے کا باعث ہے۔ اس نے اداکاری کا ایک ایسا معیار بنایا جس نے اسے عالمی شہرت کا حامل کہلوایا۔ لوگ اس کا نام سنتے ہی سنیما ہالز کا رخ کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

ہالی وڈ کے ایک اداکار کا مختصر سا تعارف

اپنی ہٹلرانہ مونچھوں، سائز سے بڑے جوتوں اور تنگ سے کوٹ والے کسی اداکار کے بارے میں آپ سے پوچھا جائے تو آپ زیادہ دیر نہیں لگائیں گے اور چارلی چیپلن کا نام لے لیں گے۔ وہ خاموش فلموں کے زمانے کی پیداوار تھا اور اس نے روتوں کو ہنسانے میں ایک بڑا کردار ادا کیا تھا۔ لوگ اب بھی اس کی فلموں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ یقیناً چارلی چیپلن امر ہے اور اس کا نام سنہری حرفوں سے لکھا گیا ہے اور عرصے تک لکھا جائے گا۔

اس کے فلمی کردار اور روایات کی پاسداری یقیناً نارمن وزڈم نے کی تھی۔ چارلی نے ایک سے زائد موقعوں پر اس کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہ میرا دل پسند اداکار ہے۔ نارمن کے جسم پر ہمیشہ (فلم میں) تنگ سا کوٹ، کاٹن کی ٹوپی، چمکتے

جوتے اور چہرے پر حماقت کے ڈونگرے برستے رہتے تھے۔وہ جوں ہی پردۂ سیمیں پر دکھائی دیتا تھا اور کچھ نہ بھی کرے تو لوگ ہنسنے لگتے تھے۔

وہ ہنسانے والا اب اس دنیا میں نہیں رہا، لیکن اس کی یاد دلوں میں باقی ہے۔ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ دوم نے اسے سر کے خطاب سے نوازا تھا۔

نارمن وزڈم 4 فروری 1915ء میں میری لیبونی میں پیدا ہوا جو لندن شہر کے مضافات میں ہے۔اس کی ابتدائی زندگی عسرت، مفلسی اور درماندگی میں گزری اس لیے کہ ماں تھیٹر کے لیے کپڑے سیا کرتی تھی جس سے زیادہ آمدنی نہیں ہوتی تھی۔وہ فرین ہیڈ لندن میں ایک کمرے کے گھر میں رہتے تھے۔اس کی ماں کو جب زیادہ پریشانی اٹھانا پڑی تو اس نے گھر چھوڑ دیا۔اس کے گھر چھوڑنے کے بعد اس کے والد نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا۔اس کا باپ ایک بڑے شخص کا شوفر تھا اور بے حد سخت گیر۔نارمن کو وہ دن یاد تھا جب اس کے والد نے اسے غصے میں آکر چھت سے الٹا لٹکا دیا تھا۔وہ بات بات پر اس کی دھنائی کر دیتا تھا۔پھر جب والدین میں علیحدگی ہوگئی اور باپ نے دوسری شادی کرلی تو باپ کے پاس اس امید سے گیا کہ وہ سایہ فراہم کرے گا، لیکن باپ نے اسے دھتکار دیا اور ایک طمانچہ بھی لگا دیا۔نارمن جب اس کے مکان کے زینے اتر کر دنیائے سنگ وخشت کی طرف لوٹ رہا تھا تو اس نے عہد کرلیا تھا کہ اب وہ پلٹ کر پھر ان راہوں کی طرف نہیں آئے گا۔اس وقت اس کی عمر صرف نو برس تھی! اس کا صرف ایک ہی بھائی فریڈرک ٹامس تھا جو نہ جانے کہاں چلا گیا۔

ایسا لڑکا جس کے پاس سر چھپانے کی بھی جگہ نہ ہو اس دنیا میں جگہ بنانے کے لیے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے اسے سخت محنت کرنا پڑی۔وہ ٹکڑوں پر سوجاتا تھا اور جہاں بھی اور جو بھی کام مل جاتا کر ڈالتا۔چنانچہ اس نے ملوں میں مزدوری کی شراب خانوں میں ویٹر کی حیثیت سے خوش پوشاک افراد کو شراب پیش کی۔اس کے بعد ایک کان میں کان کنی کرنے لگا۔وہاں کوئلے کی خاک سے اسے کھانسی اور دمے کا اثر ہوگیا۔

پھر وہ ایک یتیم خانے میں رہنے لگا۔تعلیم چونکہ مفت تھی، اس لیے اس نے ایک اسکول میں داخلہ لیا اور چار برس کے بعد اکتا کر اسکول چھوڑ دیا۔اس کا کہنا ہے "اس زمانے میں جب میری عمر صرف پندرہ برس تھی (یہ 1929ء کا زمانہ تھا) میں نے میوزیکل بینڈ (گروپ) میں شمولیت اختیار کرنا چاہی تو بینڈ منیجر نے مجھے دیکھ کر کہا "تمہاری عمر تو بہت کم ہے، تم ابھی چھوٹے ہو۔یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

میں نے گلوگیر آواز میں کہا "میں اس بینڈ میں گانا چاہتا ہوں، اس لیے کہ میرا کوئی خاندان نہیں ہے اور میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔مجھے اچھی خوراک اور گرم بستر چاہیے۔" میں نے اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا۔بہرحال جب میں خاموش ہوا تو میں نے منیجر کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے دیکھے۔اس نے مجھے کم عمر ہونے کے باوجود بینڈ میں رکھ لیا۔"

اس کے بعد وہ فوج میں بینڈ ماسٹر کی حیثیت سے بھرتی ہوگیا۔اسی زمانے (1930ء میں) اس کی تعیناتی لکھنؤ شہر میں ہوگئی۔ہندوستان اس وقت انگریزوں کے قبضے میں تھا۔وہاں اس نے بینڈ ماسٹر کی حیثیت سے اپنی موسیقی اور گائیکی سے فوجیوں کا دل بہلایا۔اسی دوران اس نے باکسنگ کے مقابلوں میں بھی حصّہ لینا شروع کردیا۔وہ بہترین باکسر تو نہیں بن سکا لیکن اسے مکّے بازی کی سدھ بدھ ہوگئی اور وہ اس قابل ہوگیا کہ اگر کوئی اس کا مذاق اُڑائے تو وہ اس کی ناک توڑ کر اسے "ناک آؤٹ" کر سکے۔

کوئی زمانہ اسے یاد ہو نہ ہو لیکن وہ فوج کے دوستوں اور یادوں کو فراموش نہیں کرپاتا تھا۔جب جنگِ عظیم اول ختم ہوگئی تو اس نے فوج کو چھوڑ دیا۔لیکن اسی زمانے میں اس نے فوجیوں کا رقص کرکے اور گیت گا کر دل بہلایا تھا جو اس کے لیے آگے چل کر کیرئیر بن گیا۔اس کے اداکار بننے میں بے حد ممد ومعاون ثابت ہوا۔

فوج میں رہتے ہوئے، اس نے پرائیویٹ کار ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا۔اپنا لہجہ درست کرنے کے لیے اس نے ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔وہ اپنا لہجہ اس لیے درست کرنا چاہتا تھا کہ جب قدرت اسے اداکار کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع فراہم کرے تو وہ لہجے سے مار نہ کھائے۔

جب دوسری عالمی جنگ چھڑی تو اسے لندن کے مضافات میں ایک فوجی بنکر میں ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے متعین کردیا گیا۔وہ ساری کالیں وزیراعظم تک پہنچانے کا ذمّے دار تھا۔اس ضمن میں اس کی ملاقات کئی بار وزیراعظم ونسٹن چرچل سے بھی ہوئی۔اس کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر اس کی تعیناتی گلوشائر میں سگنل آپریٹر کی حیثیت سے رائل کور میں ہوگئی۔کام کی نوعیت فون آپریٹر جیسی ہی تھی۔

جنگ ختم ہوئی تو نارمن نے ایک شو میں اپنی پرفارمنس دی جو فوجیوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔اس کی پرفارمنس دیکھ کر مشہور و معروف اداکار ریک ہیریسن پردے کے پیچھے سے اس کے پاس آیا اور اس نے نارمن کی پرفارمنس کو سراہتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ وہ فلموں یا اسٹیج پر کام کرنے کی کوشش کرے۔وہاں اس کا تارا چمک سکتا ہے۔

اسی دوران یعنی 1941ء میں اس نے ڈورین برٹ سے شادی کرلی۔اس سے ایک لڑکا ہوا۔جس کا نام انہوں نے مائیکل رکھا۔یہ شادی 1946ء تک قائم رہی اس کے بعد طلاق ہوگئی۔

زندگی کا سفر طویل معلوم ہوا تو اس نے شاہراہِ زندگی کو کسی ہمسفر کے ساتھ طے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اس بار اس کی نگاہ فریڈا آئزا بیل سمپسن پر پڑی جو ایک کلب میں رقاصہ تھی، جس سے اس نے 1947ء میں شادی کرلی۔اس سے دو بچے ہوئے۔ان کے نام انہوں نے نک وزڈم اور جیکوئی وزڈم رکھا۔یہ رشتہ فریڈا نے 1968ء تک نبھایا۔اس کے بعد وزڈم سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔اس لیے کہ 22 سالہ رفاقت نبھانے کے بعد اسے کسی اور سے محبت ہوگئی تھی۔

نارمن اس کا تذکرہ بڑے دکھ سے کرتا تھا۔وہ کہتا کہ "وہ کسی دراز قامت، سیاہ رُو اور خوبرو شخص کے ساتھ فرار ہوگئی۔ظاہر ہے کہ میرا اس کا کیا مقابلہ؟ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں امریکا میں براڈوے پر کام کررہا تھا۔میں اس سے قطعی لاعلم تھا کہ میرے پیچھے گھر میں کیا کچھ ہورہا ہے؟ ممکن ہے اس کی وجہ تنہائی ہو۔مجھے نہیں چاہیے تھا کہ میں اسے تنہا چھوڑتا۔آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔

میرے بچوں نے اگر میرے ساتھ رہنے کو ترجیح نہ دی ہوتی تو میں اسی روز مرگیا ہوتا۔انہوں نے میرے کلیجے سے چمٹ کر مجھے زندہ کردیا۔وہ میری زندگی کا سب سے پُرمسرت دن تھا جب بچے میرے گھر چلے آئے اور انہوں نے ماں کو چھوڑ دیا۔جج نے انہیں یہ آزادی دی تھی کہ وہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں۔اب ان کے ساتھ وقت گزارنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ہم کھیلتے کودتے اور تفریح کرتے ہیں۔میں چاہتا تو امریکا کے براڈوے پر ڈرامے کرتا رہتا اور دنیائے فن کی بلندیوں پر پہنچ جاتا، لیکن میں نے اپنے بچوں کے پاس لندن جانا بہتر سمجھا۔

میں اب بھی اپنے بیٹے کو پیار کرلیتا ہوں۔وہ محجوب سا ہوجاتا ہے، اس لیے کہ اس کا خیال ہے کہ وہ "بڑا" ہوگیا

☆ برطانوی وزیراعظم جان میجر کو لوگ سیاست کا نارمن وزڈم کہتے تھے۔

☆ اس کی یاد میں نومبر ۲۰۰۲ء میں چھ ٹکٹوں کے ڈاک ٹکٹ کا ایک سیٹ نکالا گیا جس کی قیمت ڈیڑھ ڈالر تھی۔

☆ لارل اور ہارڈی مزاحیہ اداکاروں کی جوڑی نارمن وزڈم کو بہت پسند تھی، اس لیے اس نے بارہا ان سے ملاقات کی اور ان سے اپنی آٹوگراف بک پر دستخط لیے۔

☆ ایکسپریسو اس کی آخری فلم تھی جس کی آمدنی اس نے سرطان کے خلاف جہاد کرنے والے ایک اسپتال کو بطور عطیہ دے دی۔

☆ مارلن منرو اس کے مداحوں میں تھی۔ایک موقع پر جب اس کا آمنا سامنا نارمن سے ہوا تو اس نے نارمن کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔نارمن جب بھی اس واقعہ کو بیان کرتا تو اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل جاتیں۔

☆ اس نے اپنی زندگی میں 19 فلموں، 32 ڈراموں اور ایک میوزیکل ڈرامے میں کام کیا۔اس کے علاوہ ساری دنیا میں کارنیوال شو کیا تھا۔19 میں سے 12 فلموں میں وہ ایک کردار "مسٹر پٹکن" کی حیثیت سے رونما ہوا۔

☆ اپنے دورِ عروج میں وہ لوگوں کو اتنا محبوب تھا کہ لوگ شون کونری (جیمز بانڈ) کے بجائے اس کی تصویریں جیب میں رکھنا پسند کرتے تھے اور محفلوں میں اسی کا تذکرہ کرتے تھے۔وہ خود مزے لے کر کہتا ہے کہ جن دنوں شون کونری کی فلم "فرام رشیا ود لو" ریلیز ہونے والی تھی ٹھیک اسی موقع پر میری فلم "اے اسٹچ ان ٹائم" بھی ریلیز ہونے والی تھی۔شون کا ان دنوں تشویش اور پریشانی سے برا حال تھا۔اسے اندیشہ تھا کہ میری فلم اس کی فلم کو پیٹ نہ دے۔اس کا خوف زدہ ہونا بے جا نہیں تھا اس لیے کہ میری فلموں کا بزنس بانڈ کی فلموں سے زیادہ تھا۔"

☆ وہ ایک فٹ بال ٹیم برائٹن کا سرپرست بھی تھا اور اس ٹیم کی مالی مدد بھی کیا کرتا تھا۔اس کے علاوہ اسے گولف کھیلنے سے بھی بہت دلچسپی تھی۔وہ ونکل کلب کا اعزازی ممبر بھی تھا۔اسے قیمتی کاریں رکھنے کا بھی شوق تھا۔اس کے پاس 1987ء کے ماڈل کی ایک رولس رائس کار تھی۔بعد میں اس نے اٹلی کی معروف کار جیگوار خرید لی۔یہ کاریں موت تک اس کے پاس رہیں۔

2007ء میں اس نے ایک شراب خانہ کھولا تھا جس کے گیٹ پر اس کا کانسی کا مجسمہ لگایا گیا تھا۔شراب خانے کی دیواروں پر اس کی فلموں اور ٹی وی کے پوسٹر اور تصاویر لگائی گئی تھیں۔یہ شراب خانہ اب ایک میوزیم کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

ہے۔ مجھے اب ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے میں اسے پیار کرتا رہوں گا۔ آپ خود بتائیے کہ اس کے سوا زندگی میں اور کیا رہ جاتا ہے؟"

نارمن نے اس زمانے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ لوگ اس کی حرکات وسکنات سے محظوظ ہوتے اور اس کی پستہ قامتی پر ہنستے ہیں۔ چنانچہ 31 برس کی عمر میں اس نے دنیائے دل لگی میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ دنیا فلم اسٹوڈیو تھا۔ کافی دفعہ گیٹ سے باہر پھینکنے کے واقعات ہوئے۔ لیکن وہ باز نہ آیا اور اس نے تہیہ کر لیا، چاہے کچھ بھی ہوجائے، وہ فلم ایکٹر بن کر رہے گا۔

بالآخر قدرت کو رحم آگیا اور رینک آرگنائزیشن اسٹوڈیو کے ایک ڈائریکٹر نے اسے کیمرے کے سامنے لے جا کر کھڑا کردیا۔

روشنیوں سے اس کی آنکھیں چکا چوند ضرور ہوئیں، لیکن وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا، اس نے کر ڈالا۔ ہدایت کار کو اس کی اداکاری پسند آگئی۔ نارمن کو معقول سا کردار... مل گیا۔ فلم کو کامیاب کرنے کے لیے رینک آرگنائزیشن نے سارے حربے استعمال کر ڈالے مثال کے طور پر جیری ڈسمنڈ کو معاون اداکار کے طور پر رکھا جس کو پہلے سے لوگ پسند کرتے تھے۔ ایک خوبصورت سی جل پری روتھ ردرفورڈ جسے ناظرین خوابوں میں دیکھا کرتے تھے، اسے فلم کی ہیروئن بنا دیا۔ ان مسالا جات کے بعد جب فلم ریلیز ہوئی تو باکس آفس پر کامیاب ہوگئی۔ یہ ایک کم بجٹ والی فلم تھی، جس نے اسے ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ چند برس بعد یعنی 1954ء تک اس کی مقبولیت میں اتنا اضافہ ہوچکا تھا کہ اسے ایک ادارے نے دسویں بڑے اداکار کی حیثیت سے تسلیم کیا، جب کہ 1952ء میں وہ ملکہ کے محل میں جا کر اسٹیج پر اپنی اداکاری اور صداکاری کے جوہر دکھا چکا تھا۔

پھر یکے بعد دیگرے ایسے کرداروں کی بھرمار ہوگئی۔ وہ مصروف ہوگیا۔ جب چند برسوں میں اس کا نام مزاح کی دنیا میں معتبر ہوگیا تو ایک ہدایت کار نے اسے مرکزی کردار کی حیثیت سے فلم کے لیے منتخب کرلیا۔ اس فلم کا نام تھا "ٹروبل ان اسٹور"۔ یہ فلم 1953ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

فلم باکس آفس پر کامیاب کیا ہوئی کہ خوش قسمتی کا دروازہ کھل گیا اور دیوی اس پر مہربان ہوگئی۔ لوگوں نے جان لیا کہ وہ مزاح کی علامت ہے۔ اس کی فلم دیکھ کر وہ اپنے رنج و الم بھول جائیں گے۔ چنانچہ بعد میں جب اس کی فلمیں پردۂ سیمیں پر آئیں تو وہ اسے نظر انداز نہ کرسکے۔ فلم ٹروبل ان اسٹور کا ایک گیت بے حد مقبول ہوا تھا کہ مہربانی کر... مت ہنسو اس لیے کہ میں ایک احمق ہوں۔ دلچسپ... ہے کہ یہ گیت اس نے خود لکھا تھا۔

رینک آرگنائزیشن نے نارمن سے ایک معاہدہ... اب وہ آئندہ دس برس تک ان کی فلموں میں کام کرے... سال ایک فلم مکمل کرائے گا۔ نارمن نے معاہدے پر... دیے۔ فلم ٹروبل ان اسٹور میں نارمن وزڈم برتن فروخت... والا ہوتا ہے اور ایک اسٹور میں کام کرتا ہے۔ وہاں شوق... سے ایک چور حسینہ آنا شروع ہوجاتی ہے اور قیمتی اشیا چرا... شروع کردیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں نارمن کی شامت آ... ہے اور اسے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ جاتے ہیں۔ لیکن ا... میں وہ حسینہ اس میں دلچسپی لینا شروع کردیتی ہے اور یہ... ان کے یکجا ہونے پر ختم ہوتی ہے۔

فلم اپ ان دی ورلڈ میں نارمن کا کردار کھڑکی... کرنے والے ملازم کا تھا، جس کا ناطقہ مالک مکان کا بیٹا... دیتا ہے اور اس سے عملی مذاق کرتا ہے۔ مالک مکان ایک... گیر انسان تھا، اس لیے نارمن کے کسی کام سے متاثر نہیں... اور ہر موقع پر اس کے کام میں کیڑے نکالتا رہتا ہے۔

مین آف دی مومنٹ میں نارمن اپنے باپ کی... کرتے ہوئے محکمۂ پولیس میں بھرتی ہوجاتا ہے مگر چو... اس کا قد چھوٹا ہوتا ہے، اس لیے وہ لوگوں کے مذاق کا نشانہ... جاتا ہے۔ اس پر مستزاد ایک قد آور کتا ہر موقع پر اس کی راہ... حائل ہوجاتا اور اس کی زندگی حرام کردیتا ہے۔ یوں فلم... قہقہے ہی قہقہے گونجتے رہتے ہیں۔

پچاس کی دہائی سے لے کر ساٹھ تک نارمن... مصروف رہا۔ اس نے رینک آرگنائزیشن کے لیے 19 فلموں میں کام کیا۔ اس کا مسٹر پٹکن والا کردار لوگوں میں... حد مقبول ہوا۔

1960ء میں جب برطانیہ کا سکہ اسٹرلنگ قیمت... لحاظ سے کساد بازی کا شکار تھا اس نے بہت سے چاندی... سکے خرید لیے۔ محکمۂ انکم ٹیکس کو اس کی خبر ہوگئی تو اس نے ٹیکس... لگا دیا۔ نارمن نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کیں... عدالت میں یہ بیان دیا کہ اسٹرلنگ خریدنے کا مقصد یہ تھا... کچھ رقم سے کرنسی خرید لی جائے تاکہ اسے بعد میں فروخت... دیا جائے۔ اس پر ٹیکس کیسا؟ معزز جج نے جواب دیا کہ یہ کرنسی... کا کاروبار ہے اور بہت سے لوگوں نے اسے اپنا رکھا ہے... اس پر ٹیکس عائد کیا جائے گا۔ نارمن نے ایک اچھے شہری کی... طرح قانون کی پاسداری کی اور ٹیکس ادا کردیا۔

1966ء تک اس نے بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں کام کیا اس کے بعد اس کی رنگین فلمیں آنا شروع ہوگئیں۔ جب اس کی اداکاری یکسانیت کا شکار ہوگئی تو لوگوں نے اس کی فلموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ نتیجے کے طور پر اس نے فلموں میں کام کرنا بند کردیا۔

پھر امریکیوں کی اس پر نظر پڑ گئی اور انہوں نے اسٹیج کی دنیا کے سب سے بڑے تھیٹر براڈوے میں ایک ڈرامے میں کام کرنے کے لیے اسے بلا لیا۔ اس نے ایسا کام کیا کہ امریکی تالیاں پیٹنے پر مجبور ہوگئے۔ وہیں ایک فلم کی پیشکش بھی کی گئی جو اس نے منظور کرلی۔ فلم کامیاب ہوگئی لیکن وہ امریکا میں نہیں ٹکا۔ اس کا دل تو برطانیہ میں لگا ہوا تھا۔ وہ واپس اپنے وطن لوٹ آیا۔

ان دنوں جب کہ اس کی فلمیں کامیابی سے ہم کنار ہو رہی تھیں البانیا میں کمیونسٹ حکومت تھی۔ وہاں کے ڈکٹیٹر اینور ہوکسہا کے لیے سرمایہ دار دنیا کی کوئی چیز قابلِ قبول نہیں تھی، سوائے نارمن وزڈم کی فلموں کے۔ وہاں کے لوگ اسے اتنا پسند کرنے لگے تھے کہ ڈکٹیٹر کو مجبوراً یہ اجازت دینی پڑی کہ اس کی فلمیں البانیا میں چل سکتی ہیں۔ جب وہاں کمیونسٹ حکومت ختم ہوگئی تو نارمن نے وہاں کے مفلس اور نادار بچوں کے لیے رفاہی کام کیے۔ یتیم خانے اور اسکول کالج کھولے۔ لوگ اس سے اتنا خوش تھے کہ انہوں نے بہت سے چوراہوں پر اس کے مجسمے لگا دیے۔ ڈکٹیٹر کا خیال تھا کہ نارمن غریب مزدوروں جیسا کردار ادا کرتا ہے اور اس کی فلمیں سرمایہ داری کے خلاف پرچار کرتی ہیں۔

اپنی موت سے پانچ برس پہلے جب برطانیہ نے فٹ بال کے ورلڈ کپ کا ایک میچ تیرانہ (البانیا) میں کھیلا تھا تو اس نے ناظرین کی حیثیت سے اس میں شرکت کی اور میچ شروع ہونے سے پیشتر گراؤنڈ میں آکر ہاتھ ہلائے اور اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔ اس کے جسم پر دونوں ٹیموں کی شرٹ تھی۔ لوگوں نے جب اسے دیکھا تو وہ میچ کے کیپٹن کے بجائے اس کے گرد جمع ہوگئے اور انہوں نے اس کے آٹوگراف لینے کے لیے بکس اس کی طرف بڑھا دیں۔ فوٹو گرافر ایسے موقع پر کیوں پیچھے رہتے، انہوں نے اس کی بے شمار تصاویر بنا ڈالیں۔ یوں اگلے دن وہ اخبارات کے صفحۂ اول کی زینت بن گیا۔ میئر نے اسے اگلے دن تیرانہ کی شہریت پیش کی۔

جن مشہور فلموں اور ٹی وی سیریز میں اس نے اپنے فن کے جوہر دکھائے:

- Date with a Dream (1948)
- Wit and Wisdom (1948-50, TV)
- Trouble in Store (1953)
- One Good Turn (1954)
- As Long as They're Happy (1955) (cameo)
- Man of the Moment (1955)
- Up in the World (1956)
- Just My Luck (1957)
- The Square Peg (1958)
- Follow a Star (1959)
- There Was a Crooked Man (1960)
- The Bulldog Breed
- The Girl on the Boat (1961)
- On the Beat (1962)
- A Stitch in Time (1963)
- The Early Bird (1965)
- The Sandwich Man (1966)
- Press for Time (1966)
- Androcles and the Lion(1967, TV)
- The Night They Raided Minsky's (1968)
- What's Good for the Goose (1969)

وہاں رہتے ہوئے اس نے ایک معروف گلوکار کے ساتھ تیرانہ ریڈیو سے ایک گیت ریکارڈ کرایا، جو مقبولیت کے لحاظ سے اٹھارویں نمبر پر رہا۔

1996ء میں جب کہ اس کی عمر 81 برس ہوچکی تھی۔ اس نے ایک کا نوائے کے ساتھ دنیا کا دورہ کیا اور اسٹیج پر ون مین شو پیش کیے۔ یورپ اور امریکا نے ان شوز کو بے حد سراہا اور اخبارات نے اسے صفحۂ اول پر جگہ دی اور تصاویر شائع کیں۔

پھر اسے ٹیلی وژن اور اسٹیج پر کام کرنے کی پیشکش ہوئی جو اس نے قبول کرلی۔ جب کیلنڈر پر ۲۰۰۰ء برس کا اختتام ہونے والا تھا تو ملکۂ برطانیہ نے اسے سب سے بڑے خطاب

جامع قرطبہ

قرطبہ کی ایک بڑی جامع مسجد۔قرطبہ کی جامع مسجد اس شہر کے لیے مایہ ناز تھی۔اس کا شمار وسیع ترین مساجد میں ہوتا تھا اور وہ مسجد مغربی دنیائے اسلام کی مقدس ترین عبادت گاہ تھی۔دور دراز اور قرب وجوار کے مسلم زائرین اس شاہراہ سے ہوتے ہوئے جو اندلیسہ (عرب حکمرانوں کی زبان میں الاندلس) کے سرسبز شاداب دیہات سے گزرتی تھی، قرطبہ پہنچتے تھے۔ان تھکے ماندے زائرین کو جو دریا کے طویل رومی پُل پر سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آتے تھے مسجد کا بلند مینار روشنی کا مینار معلوم ہوتا تھا۔چھوٹی سی ڈھلوان سڑک پُل پر سے مسجد کی مغربی دیوار کے قریب تک جاتی تھی۔زائرین ایک محرابی دیوار سے گزر کر جب ایوانِ عبادت کے صحن میں پہنچتے تھے تو سفر کی تمام تھکن بھول جاتے۔ہر طرف خاموشی اور سکون کا سماں ہوتا تھا۔عمارت کے شمالی کنارے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بنی ہوئی کشادہ محرابوں میں سے ایوانِ عبادت کے اندر دور تک نظر آتا تھا۔نارنگی کے درختوں کی قطاریں صحن میں ٹھنڈا سایہ پھیلاتی تھیں اور درختوں کے پتلے تنوں کا سلسلہ ان مرمریں ستونوں سے جا کر مل جاتا تھا جو عمارت کے اندر دور تک چلے گئے تھے اور محراب کے قریب پہنچ کر آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے تھے۔دروازوں سے داخل ہوتے ہی ان ستونوں کے درمیانی راستوں سے گزرنا پڑتا ہے جو آٹھویں صدی میں عبدالرحمان اول نے بنوائے تھے۔عرب معماروں نے اونچائی میں اضافے کے لیے دوہری محرابوں کا ایک نیا طریقہ اخذ کیا تھا اور اپنے ذوقِ رنگ آمیزی کی مدد سے سرخ اینٹ اور ہلکے بادامی رنگ کے پتھر کی متبادل دھاریاں ڈال کر محرابیں تعمیر کیں۔جنوب کی طرف جانے کے لیے ان درمیانی راستوں سے گزرنا پڑتا ہے جو عبدالرحمان ثانی نے نمازیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے گنجائش نکالنے کی غرض سے تعمیر کرائے تھے۔اس کے بعد محرابوں کی تزئین زیادہ پُر رونق ہو جاتی ہے اور ان کے درمیان سے محراب نظر آنے لگتی ہے جو جنوبی دیوار کے اندر ایک گہرے طاق کی شکل میں ہے اور جس کے چاروں طرف طلائی پچی کاری کے نقوش تاباں و درخشاں ہیں۔محراب مصلّیٰ کے سامنے قوسی محرابیں کچھ عجیب طرح آپس میں گتھی ہوئی ہیں اور اوپر قوسی چھتوں نے جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ جانے والے راستے پر تین نہایت خوشنما چھوٹے چھوٹے برج بنا دیے ہیں۔

عمارت کا یہ خوبصورت جنوبی حصہ ان کاریگروں کا مرہونِ منت تھا جن کی خدمات الحکم ثانی نے حاصل کی تھیں۔ان فنکاروں نے محراب مصلّیٰ، قوسی چھتیں اور محرابوں کی آرائش اس طرح کی تھی کہ پلاستر اور سفید سنگ مرمر کے چوکوں پر کندہ کاری کے ابھرے ہوئے نقوش ہیں۔ایک دوسرے پر لپٹی ہوئی ڈنڈیوں، پھولوں اور پتیوں کے نمونے سجائے گئے تھے۔محراب مصلّیٰ کی قوس کے اردگرد پچی کاری میں نقوشِ عربیہ کے حسین دلربا پھول بوٹے اس کاریگر کا کارنامہ تھے جسے الحکم کی مخصوص درخواست پر بزنطی شہنشاہ نے قسطنطنیہ سے بھیجا تھا۔

مرسلہ: زاہد تسلیم، شادی پور

سر سے نوازا۔ایوارڈ وصول کرنے کے فوراً ہی بعد وہ چھوٹے چھوٹے پاؤں اٹھاتا ہوا اسٹیج سے نکل گیا۔ملکہ کو اس کا یہ مخصوص انداز پسند آیا۔اس سے پیشتر وہ ملکہ سے آٹھ بار ملاقات کر چکا تھا لہٰذا ملکہ اس کی صلاحیتوں سے متاثر تھی۔

نارمن کی منزلِ عشق چونکہ دھندلکوں میں کھوئی ہوئی تھی، لہٰذا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دو شادیوں کے بعد بھی وہ کسی کی نگاہِ کرم کا متلاشی کیوں رہتا ہے۔ایک بار بحری جہاز میں سفر کے دوران اس کی ملاقات ایک حسین اور نازک اندام خاتون این ایکس سے ہوگئی جو اخباری رپورٹر تھی۔نارمن نے اسے اپنے لطیفوں سے اتنا ہنسایا کہ وہ اس کے ساتھ کام کرنے پر رضامند ہوگئی۔ان کے درمیان کھلا عشق نہیں تھا، لیکن وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔وہ اس کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگی اور پھر اس کی زندگی میں اتنا دخیل ہوگئی کہ نارمن ہر قدم پر اس سے صلاح ومشورہ کرنے لگا۔وہ جب اس سے خوش ہوتا تھا تو اسے گود میں اٹھا لیتا تھا۔

این اس کے پانچ لاکھ پونڈ کے مینشن کے ایک بڑے کمرے میں رہتی ہے۔وہ اس کے خطوط کے جوابات لکھتی تھی۔(سر کا خطاب ملنے کے بعد اسے بارہ سو خطوط موصول ہوئے تھے) اس کے لیے کھانا پکاتی تھی۔سادہ مگر غذائیت سے بھرپور کھانا جو وہ فوج میں کھایا کرتا تھا۔اس کے پسندیدہ کپڑے نکال کر اسے پہناتی تھی۔

این مطلقہ تھی اور دوسری شادی کرنا چاہتی تھی لیکن یہ سوچ کر رک گئی کہ اس کے بعد نارمن بے سہارا ہو جائے گا۔نارمن ٹی وی، ریڈیو اور رسائل کو انٹرویو دیتا تھا اور چاہنے والوں سے ملاقاتیں کرتا تھا۔جب اس کا موڈ ہوتا تو وہ گولف کھیلنے چلا جاتا اور ان سارے مواقعوں پر این اس کے ساتھ ہوتی تھی۔"میں چاہتی تو ایک برس کے لیے اپنے گھر چلی جاتی لیکن اب کیا کروں۔نارمن میرے بغیر کیا کرے گا۔" اس نے ایک بار کہا تھا۔"وہ اپنی دلچسپ باتوں اور حرکتوں سے مجھے خوش اور نوجوان رکھتا ہے۔اس کا دل بہت شفاف ہے۔وہ جیسا کہ پبلک میں دکھائی دیتا ہے ویسا ہی گھر کے اندر بھی ہوتا ہے۔اس کا ظاہر و باطن مختلف نہیں ہے۔جب اس کے مکان پر کوئی ملاقات کے لیے آتا تھا تو وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا اور اسے کافی بھی پلاتا تھا۔یقیناً وہ خطاب کے لحاظ سے سر ہے، لیکن اپنی عمر کے آخری دور تک وہ اسکول کے کسی لڑکے کی طرح شرارتی اور چنچل تھا۔"

اس کی دلچسپ عادات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ آگے کی سیٹ پر بیٹھتا تھا جب کہ اس کی سیکریٹری این پچھلی سیٹ پر تنہا بیٹھتی تھی۔لوگ حیران ہوتے کہ وہ اپنی سیکریٹری کی اتنی عزت کرتا ہے!

2004ء تک اس نے برطانوی ٹی وی پر لوگوں کا دل بہلایا اور 'دی لاسٹ آف دی سمر وائن' میں کام کیا۔2005ء میں جب اس کی عمر نوے برس ہو چکی تھی، اس نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔بیماریوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔2006ء میں اس پر دل کا دورہ پڑا تو اسے ہیلی کاپٹر میں لیورپول کے ایک اسپتال میں لے جایا گیا۔جہاں ڈاکٹروں نے اسے سینے میں "پیس میکر" لگا دیا، تاکہ اس کی دھڑکنیں اعتدال پر رہ سکیں۔

اس کی فلم ایکسپریسو کی ڈی وی ڈی پر ریلیز کے دوران فیملی نے اس خبر کی تصدیق کی کہ وہ نسیان کا شکار ہے اور اس نے مرنے والی جائیداد کا مالک اپنے بیٹے کو بنا دیا ہے۔آئی لینڈ آف مین میں جو اس کا مکان ہے اسے بیچا جا رہا ہے تاکہ اس کے علاج میں رقم کی کمی آڑے نہ آسکے۔

اس کے پوتے اور نواسے جب اسے پرانی تصویر دکھاتے تو خود کو پہچاننے سے انکار کر دیتا۔یادداشت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔بالآخر 95 برس کی عمر میں 2010ء میں اس نے موت وزندگی کی کشاکش سے ایک نرسنگ ہوم میں نجات پالی اور چاہنے والوں کو داغ مفارقت دے کر اس دنیائے رنگ وبو سے رخصت ہوگیا۔

اس نے وہ کچھ پالیا تھا جس کی اسے توقع بھی نہیں تھی، لوگوں کی محبت اور پیار جس کا وہ بچپن میں بھوکا تھا۔اس کی تدفین 22 اکتوبر 2010ء کو ہوئی، جس میں جزیرے کے سارے لوگوں نے شرکت کی۔اس کے تابوت میں اس کی سوتی ٹوپی جو وہ فلموں میں پہنتا تھا، رکھی گئی۔تدفین کے موقع پر اس کی وصیت کے مطابق گلوکارہ ماریہ اینڈرسن نے اپنا مشہور گیت "ہو کین آئی ٹرن ٹو" گایا۔

اس کی موت پر اس کے گھر سے ایک اعلامیہ جاری ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ گزشتہ چھ ماہ سے سر نارمن وزڈم پر فالج کے کئی حملے ہوئے، جس سے ان کی جسمانی اور دماغی حالت پر منفی اثر پڑا۔تین دن پیشتر ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔وہ چھ بج کر چالیس منٹ پر موت سے ہم کنار ہوئے، لیکن ان کے چہرے پر تشنج اور درماندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔مرتے وقت وہ خوش تھے کہ ان کے سارے اعزا ان کے سرہانے موجود ہیں۔

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 77

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہوگیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں دوبارہ لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آگیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو رہا کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوالیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماری۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا ”نارتھ...... ہگسٹ“ دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگایا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے۔ تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہوجاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے گیا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرونکی نے ہم دونوں کو پکڑلیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکرٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی۔ تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑلیں۔ صابر تو پکڑ میں آگیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کائی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ نبیلی کا پٹر ہائر کیا۔ جیسے ہی جو پر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کرلیا۔ میں عبداللہ سے ملنے جارہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پروار کردیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کردی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کرلیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کردیا پھر بھی میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس پر فائرنگ کردی۔ میں کسی طرح سڑک تک پہنچ گیا اور گاڑی لانے کے لیے فون کردیا۔ پھر ہم نے ساتھیوں کی مدد سے اکرم چشتی کو اغوا کرلیا۔ اسے ہم ایذا دے رہے تھے کہ آواز آئی ”پولیس“۔ ہم نے خفیہ کیمروں سے پولیس کی پوزیشن دیکھی پھر اکرم چشتی کی آنکھوں اور کان میں کیمیکل ڈال کر چپکا دیا اور وہاں سے نکل گئے۔ پولیس نے نادر اور چشتی کو اس گھر سے برآمد کرلیا راستے میں عبداللہ کے آدمیوں نے پولیس پر حملہ کرکے نادر کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ ہم اس گھر سے نکل کر... کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی میرو تھی۔ وہ... بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرونکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگادیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرونکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی تھی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑلیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جارہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر کر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کرکے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوالیا اور مجھے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزاری تو بانو رہا ہو جائے گی۔

اب آگے پڑھیں

امونیا سونگھنے کے باوجود میرے ذہن پر ہلکی سی بے حسی طاری تھی شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے رامن کی بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اوشا کے ساتھ شب باشی کروں۔ میں نے اوشا کی طرف دیکھا وہ بدستور ساکت انداز میں کھڑی تھی۔ تب میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ میں نے اسے آواز دی۔ ”اوشا یہ سب کیا ہے کیا تم بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو؟“

میرا لہجہ جذباتی تھا مگر اندر سے میں جذباتی نہیں تھا میں صرف اوشا کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا پہلے کی طرح کھڑی رہی۔ اسے کوئی ایسی دوا دی گئی تھی کہ بہ ظاہر جاگ رہی تھی لیکن اس کا ذہن سو رہا تھا۔ رامن نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دے گی۔ ہاں جو تم کہو گے وہ کرے گی۔“

میں نے نظریں جما کر رامن کی طرف دیکھا۔ ”تم اور تمہارا آقا جانتے ہیں کہ وہ مجھ سے کس بات کا مطالبہ کر رہے ہیں؟“

”ہاں جانتے ہیں تب ہی تو کر رہے ہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”راج جی دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں زہر برداشت کرنے کی کتنی شکتی ہے۔“

”راج کنور کو اپنے بھائی کا خیال نہیں ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو اس کے علاج کا کیا ہوگا؟“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”اپنی اور بانو کی فکر کرو۔ اگر تم نے انکار کیا تو لائیو شو دیکھو گے۔“ اس نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کرکے شیطانی لہجے میں کہا۔ اس بار بھی میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا تھا۔ ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ پستول کی پروا کیے بغیر اس کا گلا دبا دوں۔ مگر عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔ رامن کسی زہریلے سانپ کی طرح چوکنا اور ہوشیار تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں۔

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میں راج کنور کی بات مان لوں تو بانو محفوظ رہے گی؟“

”کوئی ضمانت نہیں ہے تمہیں راج جی پر اعتماد کرنا پڑے گا۔“

راج کنور کے بجائے میں کسی زہریلے ناگ پر زیادہ اعتبار کرسکتا تھا۔ مگر میں نے منہ سے نہیں کہا۔ میں کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق راج کنور کھل کر سامنے آگیا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ میں یوں دنیا سے گزر جاؤں کہ اس کے دامن پر میرے خون کا کوئی داغ نہ آئے۔ اگر میں اوشا کی قربت کی وجہ سے مارا جاتا تو راج کنور آسانی سے اس کا الزام میری ہوس پرستی پر لگا سکتا تھا۔ اوشا اس قابل نہیں تھی کہ حقائق بیان کرسکتی۔ اسے کچھ یاد ہی کہاں ہوتا۔ راج کنور بنا کسی الزام کے ایک طرف میرا پتا صاف کردیتا دوسری طرف بڑا کنور بدستور بیمار رہ کر اس کا محتاج بنا رہتا اور یہی راج کنور کا اصل منصوبہ تھا۔ مجھے مارنا اور اپنی سفاک فطرت کی تسکین ایک ثانوی مقصد تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ آم کے ساتھ ساتھ گٹھلیوں کے دام بھی حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ بانو کو شاید خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر راج کنور صبح تک اپنا مقصد حاصل کرکے اسے واپس کمرے میں پہنچا دیتا تو وہ بھی یہی سمجھتی کہ میں نے سفلی جذبات سے مجبور ہوکر اوشا کی قربت اور موت کو قبول کرلیا ہوگا۔

”شہباز تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ رامن نے کہا۔ ”بس دس منٹ کی مہلت ہے اس کے بعد بانو کی عزت نہیں بچے گی۔“

”تم بے غیرت آدمی ہو جس لڑکی پر نظر رکھتے ہو اسے کسی اور کے بستر پر دیکھ سکتے ہو؟“ میں نے اسے اکسانے کے انداز میں کہا۔

”میں اس سے کوئی محبت نہیں کرتا ہوں بلکہ نفرت کرتا ہوں۔ ممتاز ہاؤس میں یہ کئی بار میری توہین کرچکی تھی وہاں یہ خود کو کچھ سمجھتی تھی لیکن یہاں اسے اپنی اوقات پتا چل جائے گی۔ ہم ویسے بھی راج جی کے نوکر ہیں ان کا بچا کچا کھاتے ہیں۔“ وہ بے حیائی سے ہنسا۔ ”یہ بھی جھوٹا کھالیں گے۔“

”فرض کرو میں تمہاری بات ماننے سے انکار کرتا ہوں اور بانو کی بے عزتی بھی برداشت کرلیتا ہوں۔“

”تو......“ وہ گڑبڑا گیا۔ ایسی کسی صورت حال کے بارے میں اس نے سوچا نہیں تھا۔

”اس کے بعد میں بڑے کنور سے تعاون سے بھی انکار کردوں گا۔ میں بھوک ہڑتال کردوں گا تو وہ میرا کیا کرلے گا۔ اسے میرا خون چاہیے لیکن اس صورت میں اسے میرا چند ہی لیٹر خون ملے گا اور وہ بھی اگر وہ ایک ساتھ نکلوا لے۔ اس کے علاج کے لیے ایک من خون درکار ہے اور ابھی اس کے پاس مشکل سے اس کا تہائی جمع ہوا ہے۔“

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔“ رامن نے سوچ کر

کہا۔ ''ابھی تو وہ کرو جو تم سے کہا جا رہا ہے۔''

میں نے اس کی بات ان سنی کرکے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میرا خیال ہے کہ راج اسٹیٹ، اس پیلس اور تمام کاروبار کا اصل مالک بڑا کنور ہے اور راج کنور صرف بھائی کا طفیلیہ ہے۔ اگر بڑا کنور غصے میں آگیا تو کیا راج کنور اس کا عتاب برداشت کر سکے گا۔ جب کہ میں اسے بتاؤں گا کہ راج کنور اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔''

''میں یہ سب نہیں جانتا۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''مجھے جو راج کنور نے کہا ہے میں وہی کروں گا۔''

''ٹھیک ہے میں راضی ہوں۔'' میں نے اوشا کی طرف قدم بڑھایا اور اس سے کہا۔ ''اوشا ساڑی اتار دو۔''

یہ سنتے ہی وہ مشینی انداز میں حرکت میں آئی تھی اور اس نے ساڑی کا پلو ہٹا دیا۔ حسب معمول اس نے ساڑی کے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ پلو گرانے کے بعد پھر کسی تراشے مجسمے کی طرح ساکت کھڑی ہوگئی تھی۔ یہ پوز ایسا نہیں تھا جسے کوئی مرد نظرانداز کر سکتا۔ رامن کی نظر بے ساختہ اس کی طرف گئی تھی اور میں اسی موقع کا منتظر تھا میں نے قالین پر گرتے ہوئے رول کیا اور رامن کے نزدیک آتے ہوئے دایاں پاؤں گھمایا۔ اس نے بچنے کی کوشش کی لیکن میری ٹھوکر اس کی کہنی پر لگ گئی تھی۔ وار زوردار تھا اس کے منہ سے چیخ کے ساتھ گالی نکلی۔ مگر پستول نہیں نکلا تھا۔ البتہ تکلیف نے اس کا بازو بیکار کر دیا تھا۔ میں نے قالین پر ہی سیدھا ہوتے ہوئے اس کے گھٹنے پر وار کیا۔ اگر یہ ٹھیک طرح سے لگتا تو اس کا گھٹنا ٹوٹ جاتا۔ مگر اس بار بھی وہ وار بچا گیا۔ میری ایڑی اس کے گھومتے گھٹنے کے پہلو میں لگی اور پاؤں مڑنے سے وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ اس بار بھی اسے چوٹ آئی تھی۔ پستول والا ہاتھ میری طرف تھا اور اب وہ اپنی تکلیف پر قابو پا چکا تھا اس نے بلاتکلف گولی چلا دی۔

مگر میں اس کا ارادہ بھانپ کر..... پہلے اٹھ گیا تھا۔ گولی میرے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان بننے والے خلا سے گزری تھی۔ کمرے کی محدود فضا دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔ میں اچھلا اور پشت کے بل اس پر گرا تھا۔ وہ اٹھ رہا تھا میرے وزن نے اسے دوبارہ زمین چٹا دی۔ اس کا منہ قالین پر لگا۔ اسی وجہ سے اس کا منہ ناک ایک ہوتے ہوتے رہ گیا تھا لیکن اسے دن میں تارے یقیناً نظر آگئے ہوں گے۔ لیکن یہ خیال میری غلط فہمی تھی۔ اسے معمولی چوٹ آئی تھی اور اس نے جھٹکا دے کر مجھے اچھالنا چاہا تھا۔ میں اچھلا اور دوبارہ اس پر گرا۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح اس سے پستول حاصل کرلوں۔ دوسری طرف وہ مجھے نشانہ بنانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جس طرح گولی چلائی تھی صاف لگ رہا تھا وہ ذہنی طور پر مجھے شوٹ کرنے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا اور یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ راج کنور اس کمرے میں ہونے والی کشمکش اور ہنگامے سے واقف تھا۔ فائر کی آواز کہاں تک گئی تھی اور جلد کون سی بلا مزید نازل ہونے والی تھی۔ ان سب باتوں کو ذہن سے نکال کر میں رامن کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رامن آسان آدمی نہیں تھا وہ تربیت یافتہ لڑاکا تھا۔ اوندھے منہ پڑے ہونے کی وجہ سے وہ پستول کو اوپر کرکے میرے خلاف استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ مجھے اپنے اوپر سے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کہنی سے اس کے پستول والے بازو پر وار کر رہا تھا۔ ہر وار پر اس کی کراہ نکل رہی تھی لیکن وہ پستول چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر میں نے سر اس کے سر پر مارا۔ اس کا سر قالین سے لگا۔ اس بار اس کا جسم ڈھیلا ہوا تھا۔ میں نے دوسری بار وار کرنے کے لیے سر اوپر کیا تھا۔ میری توجہ اسے دبائے رکھنے سے ذرا چوکی اور اس نے اچانک خود کو پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ وہ مجھے دھکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔ میں بے ساختہ اچھلتا ہوا قالین پر گرا اور وہ تڑپ کر مجھ سے دور ہوگیا۔ اس نے اٹھتے ہوئے پستول میری طرف کیا۔ میں قالین سے اٹھتے اٹھتے رک گیا۔

میں نے ایک جوا کھیلا تھا۔ اوشا کی مدد سے رامن کی توجہ بھٹکا کر اس پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار میں اس سے پستول حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے مجبور کرکے اپنی اور بانو کی آزادی کے لیے مجبور کر سکتا تھا۔ مگر وہ میری توقع سے زیادہ سخت جان ثابت ہوا تھا۔ یہ مختصر بازی جیت لینے پر رامن بھیانک انداز میں مسکرایا۔ اس کی باچھوں سے خون رس رہا تھا اور ماتھے پر بھی نیل کا نشان آگیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں سفاکی اور اس کے اندر کی درندگی نمایاں ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ذرا ہلے اور سرگوشی نما آواز آئی۔ ''گڈبائی مسٹر شہباز۔''

میرا جسم اکڑ گیا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا امکان کم تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا، اچانک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور منشی دل جی نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیکن مہلک پستول تھا۔ اس نے آتے ہی کڑک کر کہا۔ ''رامن خبردار.....''

رامن رک گیا تھا۔ اس کے پستول کا رخ میری طرف ہی تھا اور اسے گولی چلانے میں سیکنڈ کا دسواں حصہ لگتا۔ منشی جی نے پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی اور سرد لہجے میں بولے۔ ''کیا تم مرنا چاہتے ہو؟''

رامن مرنا نہیں چاہتا تھا اس نے پستول والا ہاتھ نیچے کرلیا اور فوراً ہی منشی جی نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور غرا کر بولے۔ ''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''اس نے مجھے غصہ دلایا اور مجھ پر حملہ کیا میں اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔''

''بکواس کرتا ہے یہ شخص۔'' میں نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو پوری بات بتاؤں گا لیکن پہلے آپ بانو کو بچائیں۔ وہ اس وقت راج کنور کے بیڈ روم میں ہے اور اس کی عزت اور جان کو خطرہ ہے۔''

منشی جی نے ایک نظر ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا اور لباس سے ایک واکی ٹاکی نکال کر کسی سے دھیمی آواز میں بات کرنے لگے۔ رامن مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اوشا ویسے ہی کسی حسین مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کی ساڑی کا پلو بدستور ڈھلکا ہوا تھا۔ میں نے اس کا لباس ٹھیک کیا تب بھی اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا لیکن وہ کسی حد تک ہوش میں تھی جبھی اس نے میرے حکم پر فوری عمل بھی کیا تھا۔ واکی ٹاکی پر بات کرکے منشی جی نے رامن سے کہا۔ ''یہاں سے چلو۔''

''منشی جی.....'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹی۔

''شہباز جی آپ ذرا صبر سے کام لیں بانو کچھ دیر میں واپس آجائے گی۔''

''اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔'' میں نے دیوار میں لگنے والی گولی کی طرف اشارہ کیا۔ ''گولی کا یہ نشان ثبوت ہے اور یہ سازش اصل میں بڑے کنور کے خلاف ہو رہی ہے۔''

''ہم سب دیکھ لیں گے، آپ یہیں رہیں۔ اسے بھی ٹھیک سے روک کر رکھیں اور دروازہ اندر سے بند کرلیں جب تک میری آواز نہ سنیں دروازہ مت کھولیے گا۔''

مجھے ہدایت دے کر منشی جی رامن کو لے کر چلے گئے۔ میں نے گہری سانس لی اور خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر میں نے دروازے اندر سے بند کیے۔ اوشا ابھی تک خاموش کھڑی تھی۔ وہ زہریلی لڑکی تھی اور نہ جانے اسے کون سی دوا استعمال کرائی گئی تھی جس کے زیر اثر وہ کہی گئی ہر بات پر عمل کر رہی تھی۔ میں نے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اس میں بانو کے علاوہ کوئی اور فرد دکھائی نہیں دیا تھا۔ ویسے رامن کی دی ہوئی دس منٹ کی مہلت پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایک منٹ بعد اچانک اسکرین تاریک ہوگئی۔ میں نے جلدی سے ریموٹ اٹھا کر چینل چیک کیے۔ دوسرے چینل آرہے تھے صرف اسی چینل پر اسکرین تاریک ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دوسری

جینیاتی تعمیر

فروری 1997 میں برطانیہ کے روز لین (Roslin) انسٹی ٹیوٹ ایڈنبرا میں ایک بھیڑ ڈولی کی کامیاب کلوننگ کی گئی۔ اپریل 2002ء کو سیلیرا جینومکس (ادارہ) نے انسانی جینوم کی نقشہ کشی مکمل کرلی اور اس طرح اربوں ڈالر کے عالمی منصوبے ہیومن جینوم پراجیکٹ کو شکستِ فاش دے دی، تاہم کلنٹن انتظامیہ .... 21 جون 2000ء کو سیلیرا جینومکس کے سربراہ کریگ ونٹر اور ہیومن جینوم پراجیکٹ کے غیر سرکاری نگرانِ اعلیٰ فرانسس کولنز کو مذاکرات کی میز پر لائے۔ فروری 2001ء کو انسانی جینیاتی نقشہ یا ہیومن جینوم کی تشریح شائع کردی گئی۔ واشنگٹن کے نیشنل ہیومن جینوم انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فرانسس کولنز کے مطابق یہ تحقیق اس بنا پر انتہائی اہم ہے کہ سائنس دانوں نے کم از کم جزوی طور پر جین کے معما اور پُراسراریت کو حل کرلیا۔ اس سے ایک بات یہ بھی سامنے آئی کہ انسان میں جین کی مقدار اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ سمجھی جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جینیاتی طور پر جو اچھائیاں اور برائیاں کسی فرد میں موروثی طور پر منتقل ہوتی ہیں اس کی ذمے داری مردوں پر ہے۔ یعنی وراثت مرد کے ذریعے منتقل ہوتی ہے۔

جین کے ذریعے ہر چیز کا فیصلہ ہوتا ہے کہ آنکھیں کیسی ہوں گی، رنگت کیا ہوگی اور کن بیماریوں کا خطرہ ہوگا۔ انسان میں کم و بیش 30 ہزار جینز ہوتی ہیں۔ 2003ء میں انسانی جینوم کا مکمل ڈرافٹ شائع ہوا۔

مرسلہ: ڈاکٹر عائشہ عمر، لاہور

طرف سے کوئی کارروائی ہوئی تھی اور کیمرا جو ویڈیو نشر کر رہا تھا وہ بند کر دیا گیا تھا۔ میں مضطرب ہو گیا۔ اگر یہ راج کنور کی کارروائی تھی تو وہ رامن کی ناکامی سے آگاہ ہو گیا تھا اور اب بانو کے خلاف کچھ کرنے جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا اس لیے کیمرا آن رکھنا بھی لازمی نہیں تھا۔

مجھے راج کنور کی جانب سے خطرہ تو تھا لیکن اس کی یہ حرکت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ مجھے اس طرح سے مجبور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کا اصل مقصد بڑے کنور کو علاج سے محروم کرنا تھا اور ثانوی مقصد میرا خاتمہ تھا۔ بانو اسے بونس میں ملتی۔ یوں وہ ایک تیر سے کئی شکار کرتا۔ اس نے پہلے اوشا کو بھیج کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہا اور اس میں ناکامی کے بعد وہ راست اقدام پر اتر آیا جسے کسی صورت راست قدم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اونچی طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود راج کنور ذاتی طور پر گھٹیا کردار کا مالک تھا۔ اس سے ایسے ہی کام کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں اوشا کے پاس آیا۔ "اوشا میری بات سن رہی ہو؟"

اس نے جواب میں صرف سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ "تمہیں یہاں کون لایا ہے؟"

اس سوال پر وہ ساکت رہی۔ صرف اسی سوال پر نہیں بلکہ میری طرف سے پوچھے گئے ہر سوال پر اس کا ایک ہی جواب تھا۔ البتہ جب میں اسے کچھ کرنے کو کہتا تو وہ فوری عمل کرتی تھی۔ گویا اس کا ذہن صرف احکامات پر عمل کی حد تک فعال تھا ورنہ اس کا شعور گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ یہاں کیسے آئی اور اسے کون لایا تھا؟ مجھے یقین تھا کہ جاگنے کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہے گا۔ منشی جی کو گئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا لیکن ابھی تک بانو کی واپسی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ بے چین ہو کر میں نے دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ باہر سے بند نکلا۔ بانو کے کمرے کا دروازہ بھی باہر سے بند تھا۔ جب کہ پہلے یہ دروازے بند نہیں ہوتے تھے۔ یقیناً یہ ابھی بند کیے گئے تھے اور ایسا منشی جی کی ہدایت پر کیا تھا۔ مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ میں باہر نہ نکلنے پاؤں۔ میں نے دروازہ بجایا اور چلا کر کہا۔ "کوئی ہے۔"

"آرام سے بیٹھو۔" باہر سے کوئی بولا۔ یہ گورکھا گارڈ کی آواز نہیں تھی جو ہمارے کمروں کے باہر پہرا دیتا تھا۔

"منشی دل جی کہاں ہیں؟"

"ہم کو نہیں معلوم آرام سے بیٹھو۔" اس نے پھر کہا۔

"آرام کے بچے، جلدی سے منشی جی کو بلاؤ ورنہ میں تمہارا دماغ خراب کر دوں گا۔"

وہ میری دھمکی کو محض دھمکی سمجھا تھا لیکن جب میں نے چار کلوگرام وزنی ڈمبل سے دروازہ بجانا شروع کیا تو وہ بوکھلا گیا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے چلا کر کہا۔

"آرام کر رہا ہوں۔" میں نے ہاتھ روک کر زہریلے لہجے میں کہا۔ "میں اسی طرح آرام کرتا ہوں۔ اب جب تک منشی جی نہیں آتے میں دروازہ بجاتا رہوں گا ہو سکتا ہے دروازہ ٹوٹ جائے۔"

ٹھیک ہے دروازہ مضبوط تھا لیکن چار کلوگرام وزنی ڈمبل کی مسلسل ضربوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات باہر موجود آدمی بھی سمجھتا تھا اس لیے اس نے مجبوراً منشی جی سے رابطہ کیا تھا۔ چند منٹ بعد ہی منشی جی کی آواز سنائی دی۔ "شہباز جی، آپ کیا کر رہے ہیں۔"

"پون گھنٹے کا وقت گزر گیا ہے اور بانو اب تک نہیں آئی ہے۔ منشی جی کیا اسے شملہ سے لانا ہے؟"

"وہ یہیں موجود ہے۔" منشی جی نے کہا۔ "محفوظ ہے بڑے کنور معاملہ سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"وہ جتنی جلدی معاملہ سلجھا لیں اتنا اچھا ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تاخیر سے صرف بڑے کنور کو نقصان ہوگا۔ ان کو میرا ایک قطرہ خون نہیں ملے گا۔"

یہ دھمکی نہیں تھی میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر بانو کو ذرا بھی نقصان ہوا تو اب یہ لوگ مجھ سے خون حاصل نہیں کر سکیں گے۔ منشی جی سے بات کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور بانو منشی جی کے ساتھ اندر آئی تھی۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی اور وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے آئی تو گرنے لگی تھی۔ میں نے بروقت اسے تھام لیا۔ اس نے ست لہجے میں کہا۔ "شہباز.... آپ .... میں یہاں سے کیسے گئی؟"

"یہ سازش ہے میں تمہیں آرام سے بتاؤں گا، یہ بتاؤ کہ اس وقت کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"ٹھیک ہوں، مجھے کوئی بو والی چیز سونگھائی تھی جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی اور کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ پھر منشی جی مجھے لے کر یہاں آئے۔"

"شہباز جی دیکھ لیں یہ بالکل ٹھیک ہے۔" منشی جی بولے۔

"میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ اسے لے جائیں اسے بھی

کوئی دوا دی گئی ہے۔" میں نے اوشا کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا معائنہ کرائیں۔ میں ذرا بانو سے بات کر لوں اس کے بعد میں بڑے کنور سے بات کرنا چاہوں گا۔"

منشی جی نے میری بات پر غور کیا۔ "کیا یہ ضروری ہے؟"

"یہ سمجھ لیں زندگی اور موت جتنا ضروری ہے۔"

منشی جی نے سر ہلایا اور اوشا کا بازو تھام کر رخصت ہو گئے۔ میں بانو کو سہارا دے کر اس کے کمرے تک لایا۔ پانی پی کر اس کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تھی۔ میں نے اسے کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ راج کنور نے میرے خلاف کیا سازش کی تھی اور میں نے کس طرح اسے ناکام بنایا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے بھرائی آواز میں کہا۔ "میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ ان لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ راج کنور مجھ سے کسی مقصد کے تحت ملا تھا۔"

"بانو ہم ان کے قیدی ہیں۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اب تک بچے ہوئے ہیں۔ میری جان اور تمہاری عزت محفوظ ہے۔ لیکن ہمیں ہر صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اس نے سہمی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "آپ کا مطلب ہے اگلی بار یہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں؟"

میں نے سر ہلایا۔ "میں نے کہا نا ہم ان کے قبضے میں ہیں۔"

اس کا دوپٹا یہاں نہیں تھا شاید جب اسے لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں کہیں رہ گیا ہوگا۔ کچھ عرصے میں اس کی جسامت میں بھی فرق آیا تھا اور پہلے والے لباس اسے تنگ ہونے لگے تھے۔ اسی لیے وہ میرے سامنے جھینپ رہی تھی۔ اس کی کیفیت محسوس کر کے میں اٹھنے لگا تو اس نے عجب انداز میں کہا۔ "مجھے اکیلے رہتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔"

"بانو حوصلہ کرو۔ میرے ساتھ ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑے گا۔ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہوگا اس لیے اس سے دعا کرو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ویسے بھی مجھے شاید ابھی بڑے کنور کی طرف سے بلاوا آ جائے۔"

"آپ اس سے کیا بات کریں گے؟"

"دیکھو آ کر بتاؤں گا۔" میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا تو وہ سمجھ گئی کہ میں مائک کی وجہ سے کھل کر نہیں کہہ سکتا اس نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے میں آرام کرتی ہوں۔ اب بھی میرا سر گھوم رہا ہے پتا نہیں کون سی دوا دی تھی ان لوگوں نے۔"

میں اپنے کمرے میں آیا۔ میری غنودگی غائب ہو گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو میری جسمانی مضبوطی تھی، کوئی دوا مجھ پر زیادہ دیر اثر نہیں کرتی تھی اور دوسری وجہ حالات تھے جنہوں نے نیند اڑا دی تھی۔ اگر میں رامن پر حاوی نہ ہوتا تو اس سے آگے نہ جانے کیا ہوتا۔ اگر میں راج کنور کا مطالبہ پورا نہ کرتا تو بانو کی عزت نہ بچتی اور اگر پورا کر دیتا تو جان سے جاتا یا نہ جاتا لیکن اس کے بعد ساری عمر خود سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہتا۔ رامن پر حملے کے وقت میرا خیال تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا صرف اپنا بچاؤ کرے گا لیکن اس نے جس طرح مجھ پر گولی چلائی اس سے اس کے عزائم بالکل واضح تھے۔ اگر منشی جی بروقت نہ آتے تو وہ مجھے شوٹ کر چکا ہوتا۔ اصل بات راج کنور کے میرے بارے میں عزائم نہیں تھے۔ میرے لیے پریشانی کا اصل سبب اس کا بڑے کنور کو نظر انداز کرنا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں بڑے کنور کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہوں۔ میرا خون اس کے علاج کے لیے لازمی ہے اس کے باوجود وہ مجھے جان سے مارنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

مجھے یقین کی حد تک شبہ ہونے لگا تھا کہ راج کنور کا اصل مقصد بڑے کنور کو صحت یابی سے روکنا تھا۔ وہ ٹھیک ہو جاتا تو اسٹیٹ اس کے ہاتھ میں آ جاتی۔ فی الحال سارے معاملات راج کنور دیکھ رہا تھا اور بڑا کنور اس پر انحصار کرنے پر مجبور تھا۔ یہ اقتدار کا کھیل ہے جو ہمیشہ سے کھیلا جاتا رہا ہے اس میں اصل اہمیت اقتدار کی ہوتی ہے۔ خون کے رشتوں کی اہمیت ثانوی ہوتی ہے۔ مجھے بڑے کنور سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ دیکھا جائے تو میری اصل دشمنی اسی سے تھی اور وہی مجھ پر آنے والی اس افتاد کی اصل وجہ تھا۔ وہ میرا خون اپنے مقصد کے لیے حاصل کر رہا تھا اور مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ اپنا کام نکلوانے کے بعد وہ اپنے وعدے سے مکر جائے گا۔ یہ لوگ سرے سے اخلاقیات کے قائل ہی نہیں تھے۔ ان کے نزدیک صرف اپنے مفاد کی اہمیت تھی۔ بڑے کنور کا مفاد مجھ سے تھا اس لیے میں پرآسائش قید خانے میں تھا اور وہ میری ہر بات ماننے پر مجبور تھا۔ اب تک میں اس کے دباؤ میں تھا کیونکہ اس نے وعدہ کیا ہوا تھا کہ میری اور بانو کی حفاظت کرے گا اور پھر بانو کو بہ حفاظت میاں ممتاز کے پاس بھجوا دے گا۔ لیکن راج کنور کی حرکت نے صورت حال کو بدل دیا تھا۔

اگرچہ یہ اچھا نہیں ہوا تھا لیکن مجھے اس سے ایک خیال سوجھا تھا اور میں کوشش کرتا تو اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے غور کر رہا تھا کہ مجھے بڑے کنور سے کس طرح بات کرنی چاہیے۔ معاملات پرسکون چلتے چلتے اچانک اتھل پتھل ہو گئے تھے۔ میں اس اونچ نیچ سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک خیال میرے ذہن میں واضح ہو رہا تھا۔ سات بجے میں نے معمول کی ایکسرسائز کی۔ بانو بھی اٹھ کر آ گئی تھی۔ اس نے میرا ساتھ دیا پھر ہم نے لڑائی کی مشق کی۔ نہ جانے حالات کی بات تھی یا بانو میں اس کی فطری صلاحیت تھی وہ دن بہ دن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ میں جو وار اسے سکھاتا۔ وہ ایک دو دن میں اس میں مہارت حاصل کر لیتی تھی۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو حیدر آبادی فراک پاجامہ میں وہ نازک اندام دوشیزہ نظر آئی تھی اور درحقیقت وہ نازک اندام تھی۔ مگر اب اس کی نزاکت مضبوطی میں بدل گئی تھی اور اس سے اس کی دلکشی میں بھی فرق نہیں آیا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”کسی بھی قسم کی لڑائی میں جسمانی قوت اور لڑنے میں مہارت سے پہلے نمبر آپ کی دماغی مضبوطی اور تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت کا آتا ہے۔ بہت سے اچھے لڑنے والے اس لیے مات کھا جاتے ہیں کہ وہ دماغی طور پر مضبوط نہیں ہوتے، جلد گھبرا جاتے ہیں اور مشکل کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ دوسرے جب تک آپ زخم اور اس کی تکلیف برداشت کرنا نہیں سیکھ لیتے آپ اچھے لڑنے والے نہیں بن سکتے ہیں۔“

وہ پنچنگ بیگ کے ساتھ کک اور باکسنگ کی مشق کر رہی تھی، اس نے ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے مجھے مار کھانے کی عادت بھی ڈالنا ہوگی؟“

”بالکل، کوئی اس کے بغیر ماہر نہیں بنتا ہے۔ لڑائی کا اصل فن مار کھا کر بھی کھڑے رہنا ہے۔“

ہمارے پاس باکسنگ گلوز اور سر پر چوٹ سے بچاؤ کے مخصوص ہیلمٹ بھی تھے۔ بانو اور میں نے گلوز و ہیلمٹ پہنے اور مدمقابل آ گئے۔ میں نے پنجوں کے بل اچھلتے ہوئے کہا۔ ”مقابلہ کرتے وقت اپنا عورت پن بھول جایا کرو۔ اپنی ساری توجہ صرف ایک چیز پر مرکوز رکھو کہ تمہیں اپنے حریف پر حاوی آنا ہے۔“

”میں سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔

میں نے اچانک اس کے جسم کے ایک نازک مقام پر پنچ مارا۔ وہ گڑبڑائی تو میں نے بازو سے پکڑ کر اپنی [illegible] گھماتے ہوئے زمین پر پٹخ دیا۔ میں نے قوت [illegible] اس کے باوجود اسے خاصی چوٹ آئی۔ ”تم نہیں [illegible] میں نے پنچ مارا تو تم لڑنا بھول گئیں اور میں نے [illegible] آسانی زیر کر لیا۔“

اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا لیکن وہ پھرتی سے اٹھی [illegible] پنجوں کے بل اچھلتے ہوئے دوبارہ لڑنے کے لیے [illegible] گئی۔ یہ باکسنگ سے زیادہ فری اسٹائل تھائی کک باکسنگ تھی۔ جو باکسنگ سے کہیں زیادہ مشکل اور خطرناک [illegible] کیونکہ اس میں ہاتھوں سے زیادہ پیر استعمال ہوتے ہیں [illegible] پیروں کی ضرب کہیں زیادہ سخت اور قوت والی [illegible] ہے۔ دس منٹ کی لڑائی میں بانو کا حشر ہو گیا تھا۔ وہ [illegible] رہی تھی اور اس کے لیے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ میں [illegible] اس کی خاصی مرمت لگا دی تھی۔ لیکن اس کا حوصلہ [illegible] تعریف تھا وہ اب تک ڈٹی ہوئی تھی۔ میں نے جان بوجھ [illegible] ایسی ضربیں لگانے سے گریز کیا تھا جس سے اسے خون [illegible] نیل والی چوٹ آئے۔ ناک اور منہ کے کھلے حصوں کو [illegible] نہیں بنایا تھا۔ دس منٹ بعد میں نے ہاتھ روک لیے۔ ”آج کے لیے اتنا کافی ہے۔“

وہ صوفے پر تک کر ہانپنے لگی۔ ”شکر ہے ورنہ مجھے [illegible] رہا تھا آپ مجھے بے ہوش کر کے چھوڑیں گے۔ قسم سے [illegible] ٹوٹ رہا ہے۔“

میں نے مشورہ دیا۔ ”جا کر گرم پانی سے غسل کر [illegible] ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے خود واش روم کا [illegible] کیا۔ نہا کر واپس آیا تو ناشتا آ چکا تھا۔ بانو لگا رہی تھی۔ [illegible] نے اشارے سے بانو سے کہا کہ وہ پہلے کھائے۔ اس [illegible] پہلے کھایا۔ میں اس کا معائنہ کرتا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد [illegible] جب وہ پوری طرح چاق و چوبند رہی تو میں نے مطمئن ہو [illegible] خود بھی ناشتا کیا۔ بانو نے تسلیم کیا کہ گرم پانی سے غسل کر [illegible] وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”درد کو نظرانداز [illegible] کروا سے اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھ لو کہ اب تمہیں اس کے ساتھ گزارا کرنا ہے۔ شام کو ایک سیشن اور ہوگا۔“

”آپ نے تو مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔“

”ڈرو مت اس سے لطف لو۔ دیکھو دنیا میں جب تک کسی کام میں لطف حاصل نہیں کرو گی تم اس میں کمال حاصل نہیں کر سکتیں۔“

”مار کھانے میں کمال!“

”ہاں، مار کھانے میں کمال ہی انسان کو بچاتا ہے۔ یہ فطرت کا اصول ہے وہی جاندار باقی رہتے ہیں جو سختی برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہر طرح کے حالات میں گزارا کر لیتے ہیں۔ کروڑوں سال پہلے ڈائنا سور جیسے عظیم الجثہ جانور مٹ گئے لیکن لال بیگ جیسا کمزور کیڑا ماہرین کے مطابق دو ارب سال سے اس زمین پر موجود ہے۔ کیونکہ اس میں نامساعد حالات برداشت کرنے کی بے پناہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔“

”آپ مجھے لال بیگ بننے کا مشورہ دے رہے ہیں۔“ اس نے شکوہ کیا۔ میں مسکرایا۔

”یہی سمجھ لو کہ اسی میں بقا ہے۔“

میرا خیال تھا کہ جلد نہ سہی بڑا کنور کچھ دیر سے مجھے طلب کرے گا کیونکہ میں نے منشی جی سے واضح پیغام بھجوایا تھا۔ لیکن اس سارے دن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا یعنی مجھے طلب نہیں کیا گیا تھا۔ اس شام بانو سے دوسری بار فائٹ ہوئی اس بار بھی میں نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا اور اس نے بڑھ کر مقابلہ کیا۔ وہ پوری قوت سے حملے کر رہی تھی کیونکہ میں نے اسے کہا تھا۔ کئی کامیاب وار کیے مگر زیادہ تر مار ہی کھائی۔ میں ہاتھ ہلکا رکھتا تھا مگر جان بوجھ کر اس کی نسوانیت کو نشانہ بناتا۔ وہ گڑبڑا جاتی لیکن جلد سنبھل بھی جاتی۔ وہ میرا مقصد جان گئی تھی اس لیے خود کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کر رہی تھی کہ جب وہ کسی کے مدمقابل آئے گی تو وہ اس کے جسم کے کمزور حصوں کو نشانہ بنانے کی پوری کوشش کرے گا اس لیے اسے پہلے سے تیار رہنا ہے۔ اس سے لڑتے ہوئے میں خود دس منٹ میں پسینے پسینے ہو گیا تھا اور سانس بھی کسی قدر پھول گیا تھا۔ ایکسرسائز کرنا الگ بات تھی اور کسی سے مقابلہ کرنا الگ۔ گھنٹوں ایکسرسائز سے مجھے اتنی تھکن نہیں ہوتی تھی۔ جتنی اس دس منٹ کے زبانی مقابلے سے ہو جاتی تھی۔ یہ مشق صرف بانو کے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی مفید ثابت ہو رہی تھی۔ صبح اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے تھکایا زیادہ تھا لیکن چوٹیں کم لگائی تھیں۔ اس کے باوجود اس کا برا حال تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی کے لیے میں نے بھی کچھ ہائے وائے کی اور کہا۔ ”لگتا ہے آج مجھے بھی گرم پانی سے ہاتھ لینا پڑے گا۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”اس کا مطلب ہے اس بار میں نے اچھا مقابلہ کیا ہے۔“

”ہر بار پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی ہو۔“ میں نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ یہ حقیقت بھی تھی۔ اگلے روز جب ناشتا آیا تو میں نے پوری بھوک کے باوجود اپنی اصل خوراک کا صرف ایک تہائی کھایا تھا۔ بانو حیران ہوئی۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔

”بس اتنا سا؟ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“

”تب اتنا سا کیوں کھایا ہے؟“

”بس آج سے میں اتنا ہی کھاؤں گا۔“ میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”میں اپنا خون اتنا رکھوں گا کہ خود زندہ رہ سکوں۔ اب میں کسی اور کو خون نہیں دوں گا۔“

بانو میرا مقصد سمجھ گئی۔ خود اس نے ڈٹ کر کھایا تھا۔ صرف دو بار جسمانی مقابلہ کرنے سے اس کی بھوک بڑھ گئی تھی۔ ماہرین کہتے ہیں جس کام میں انسانی ذہن کا سوچنے والا حصہ شامل نہ ہو وہ کتنی بار اور کتنا زیادہ کیا جائے انسانی جسم جلد اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے معمول کے مطابق لیتا ہے۔ جیسے ایکسرسائز کتنی کر لی جائے اس کا فائدہ ایک حد تک ہوتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب زیادہ ورزش کرنے سے بھی آپ کا جسم مزید مضبوط اور طاقتور نہیں ہوتا ہے۔ مگر کسی دوسرے سے مقابلہ مختلف چیز ہوتی ہے۔ اس میں انسان کا ذہن استعمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گھنٹوں کی ورزش بھی ہم پر وہ اثر نہیں ڈالتی تھی جو دس منٹ کا مقابلہ ڈالتا تھا۔ یہ کلیہ صرف جسمانی کاموں پر ہی نہیں بلکہ ذہنی کاموں پر بھی صادق آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک برس مطالعہ کرنے سے بہتر ہے آدمی ایک گھنٹا کسی عالم کی صحبت میں گزارے کیونکہ عالم سے بات کرتے ہوئے انسان کا دماغ استعمال ہوتا ہے اور مطالعے سے صرف معلومات جمع کرنے والا حصہ کام کرتا ہے۔

جیسے کمپیوٹر میں اس کا سب سے چھوٹا پرزہ یعنی پروسیسر سب سے زیادہ توانائی استعمال کرتا ہے کیونکہ وہ اس کا سوچنے والا حصہ ہے اسی طرح انسانی دماغ کا سوچنے والا حصہ سب سے زیادہ توانائی استعمال کرتا ہے۔ ویسے بھی عام آدمی کا دماغ کل توانائی کا بیس فیصد استعمال کرتا ہے۔ جو زیادہ دماغ استعمال کرتے ہیں ان کا دماغ اس سے زیادہ ہی توانائی استعمال کرتا ہوگا۔ عام طور سے لوگ دماغی کام کرنے والوں کو سست اور جسمانی لحاظ سے کمزور سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ جسمانی کام کرنے والوں سے زیادہ توانائی

استعمال کرتے ہیں۔ انسانی زندگی اور صحت کا دارومدار ہی توانائی کے حصول اور اسے سو فیصد خرچ کرنے پر ہے۔ جو لوگ زیادہ کھاتے اور کم توانائی خرچ کرتے ہیں وہ بالآخر بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں اور قبل از وقت دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ بانو نے کہا۔

''آپ نہ کھائیں لیکن مجھے تو آج معمول سے زیادہ بھوک لگ رہی ہے۔''

''تم کھاؤ کیونکہ تمہارے خون سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہے۔''

کچھ دیر میں دل نواز خان آ کر برتن لے گیا۔ اب وہ محتاط رہتا تھا اور اپنے تاثرات پر قابو رکھتا تھا۔ اس کے دل میں کیا تھا اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے سمجھا دیا تھا کہ اس کے ذاتی خیالات کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی اور دوسرے وہ مسلمان سہی لیکن میرے بدترین دشمنوں کا نوکر تھا۔ اس لیے وہ ان ہی کی صف میں شامل تھا۔ کم کھانے کے باوجود میں نے معمول کی ورزش کی تھی۔ دوپہر میں بھی اسی طرح کھایا اور نتیجے میں پیٹ فریاد کرتا رہ گیا لیکن میں نے فی الحال اس کی فریاد پر توجہ نہیں دی۔ انسان بہت پیٹ کے کہنے پر چلتا ہے کبھی پیٹ کو بھی انسان کے کہنے پر عمل کرنا چاہیے۔ میرے پیٹ کے ساتھ ساتھ بانو کو بھی تشویش ہو رہی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔

''اس طرح آپ کمزور ہو جائیں گے۔''

''ہاں لیکن مروں گا نہیں، البتہ خون دینے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔''

اس نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''یہ کوئی دوسرا حربہ استعمال کر سکتے ہیں آپ کا خون لینے کے لیے۔''

''تم فکر مت کرو وہ زبردستی نہیں کر سکتے۔ وہ جانتے ہیں اس کا نتیجہ نہیں نکلے گا۔ انہیں میرا خون مخصوص مقدار میں میری مرضی سے ہی مل سکتا ہے۔''

شام کی ایکسرسائز اور مقابلے میں ہی مجھے فرق محسوس ہونے لگا تھا۔ میں جلد تھک رہا تھا اور سانس بھی پھول رہی تھی۔ اس بار بانو حاوی رہی تھی۔ میں اسے اتنی ضربیں نہیں لگا سکا تھا جتنی کہ گزشتہ روز مقابلوں میں لگائی تھیں۔ وہ سیلف ڈیفنس کے طریقے بھی تیزی سے سیکھ رہی تھی۔ مقابلے کے بعد جب میں ہانپ رہا تھا تو اس نے رف پیڈ پر لکھا۔ ''آپ ٹھیک نہیں کر رہے ہیں اس طرح کمزور ہو کر آپ دشمن کا فائدہ کر رہے ہیں۔''

''یہ ضروری ہے۔ تم فکر مت کرو، میں ایک حد سے زیادہ کمزور نہیں ہوں گا اور ابھی تو کم خوراکی کا آغاز ہے اس لیے کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ جلد میرا جسم اس کا عادی ہو جائے گا۔''

''آپ ٹھیک سے کھائیں لیکن ان پر یہی ظاہر کریں کہ آپ کم کھا رہے ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلا کر لکھا۔ ''وہ اس طرح دھوکا نہیں کھائیں گے۔ بھیجے جانے والے اور بچنے والے کھانوں کی مقدار کا حساب رکھا جاتا ہوگا۔ اس سے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں انہیں دھوکا دے رہا ہوں۔''

''پھر بھی آپ کچھ تو خوراک بڑھائیں۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''میں اپنی خوراک کم کر دیتی ہوں۔''

''نہیں میں ایک پلاننگ کے تحت یہ سب کر رہا ہوں۔ اگر میں ٹھیک سے کھاؤں گا تو میرے جسم پر اثر نہیں ہوگا میں جسمانی طور پر کمزور نظر آنا چاہتا ہوں۔''

بانو مجھ سے متفق نہیں تھی لیکن وہ ایک حد سے زیادہ بحث یا اصرار بھی نہیں کر سکتی تھی اس لیے خاموش ہو گئی۔ رات کا کھانا کم کھانے کے بعد مجھے نیند مشکل سے آئی تھی دیر تک میں کروٹیں ہی بدلتا رہا تھا۔ بڑے کنور کے ابتدائی ردعمل کے بعد میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا کہ وہ اس معاملے کا بھی تاخیر سے نوٹس لے گا۔ اس دوران میں، میں اپنا وزن خاطر خواہ کم کر سکتا تھا۔ ایک دن پہلے میرا وزن بیاسی کلوگرام تھا اور ایک دن میں یہ کم ہو کر اسی کلوگرام رہ گیا تھا۔ اگلے روز بھی یہ معمول برقرار رہا تھا۔ میں نے خوراک کم رکھی اور ورزش پوری کرتا رہا۔ ورزش سے مجھے اتنا مسئلہ نہیں تھا جب بانو سے مقابلہ کرتا تو مجھے خاصا فرق محسوس ہوتا تھا۔ اس روز بھی میری کم خوراکی کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا تھا۔ رات کے وقت بانو نے میری توجہ دلائی۔ اس نے کاغذ پر لکھا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بڑے کنور کو اس بات کا علم نہ ہو کیونکہ یہاں مانک راج کنور نے لگوائے ہیں۔''

''مگر کھانا تو منشی جی کی نگرانی میں بنتا اور آتا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ میں اتنی خوراک نہیں لے رہا جتنی معمول کے مطابق لیتا ہوں۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل نواز خان نے اسے بتایا ہی نہ ہو۔ دل نواز کے خیال میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ بانو کی باتوں میں وزن تھا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بڑے کنور کو صورت حال کا علم تھا اور وہ کسی وجہ سے اب تک خاموش تھا۔ میں نے ٹھوس خوراک کم کی تھی لیکن جوسز لے رہا تھا۔ البتہ دودھ چھوڑ دیا تھا۔ میرے لیے جو جوسز آتے تھے ان میں اضافی منرلز اور وٹامنز ہوتے تھے۔ ان سے میرا جسم کمزور ہونے کے باوجود منرلز اور وٹامن کی کمی کا شکار نہ ہوتا۔ بہرحال ایک کھیل میں کھیل رہا تھا اور میرے دشمن بھی کوئی چال چل رہے تھے۔ دیکھنا یہ تھا کہ ہم میں سے کامیاب کون ہوتا ہے۔ اس سے اگلے دن سے میں نے ورزش کی تعداد اور دورانیہ بھی گھٹانا شروع کر دیا کیونکہ کم خوراک کے ساتھ میرا وزن تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ تیسرے دن تک میرا وزن اٹھتر کلوگرام ہو گیا تھا اور بہ قول بانو کے میں واضح کم ہو رہا تھا۔ البتہ ابھی مجھے کمزور نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ورزش کم کرنے کے باوجود بانو سے مقابلہ جاری رکھا۔ اگرچہ اس نے اصرار کیا تھا کہ اب میں مقابلہ نہ کروں یا دن میں ایک بار کروں لیکن میں نے مقابلہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا مجھے الگ فائدہ ہو رہا تھا۔ اب ہمارا مقابلہ دوستانہ مقابلے سے ذرا ہٹ کر سنجیدگی کی طرف جا رہا تھا۔ بعض اوقات تو ایسا لگتا جیسے ہم سچ مچ دشمن ہیں اور ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ میں نے بانو سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی رعایت نہ کرے اور بالکل یوں مقابلہ کرے جیسے میں اس کا دشمن ہوں۔ مگر اب میں خود بھی اسے کم رعایت دیتا تھا۔ اکثر اسے برابر کی چوٹ پڑتی تھی۔ کئی بار اسے زخم آئے یا نیل پڑ گئے۔ شروع میں وہ ہائے ہائے کرتی تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ چوٹوں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے لڑائی کے بعد دیر تک اس کا سانس قابو نہیں آتا تھا لیکن اب اس کا اسٹیمنا اس لحاظ سے بھی بہت بہتر ہو گیا تھا۔

اس کی صحت بھی اچھی ہوتی جا رہی تھی۔ تین دن میں میرا وزن چار کلوگرام کم ہوا تھا تو اس کے وزن میں مزید ایک کلوگرام کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا وزن باسٹھ کلوگرام سے اوپر چلا گیا تھا۔ اس کے پرانے سوٹ تنگ ہو گئے تھے۔ اس دن کے بعد سے اوشا بھی نہیں آئی تھی کہ وہ اپنے لیے نئے سائز کے کپڑے منگواتی اس لیے انہی سے گزارا کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اب تم روایتی ملبوسات کے بجائے اپنے سائز کے ٹراؤزر اور ٹی شرٹس منگوانا۔ یہ آرام دہ بھی ہوتے ہیں اور ان میں فٹنگ کا اتنا مسئلہ نہیں ہوتا۔ تم نمایاں بھی نہیں ہو گی۔''

وہ جھینپ گئی۔ ''ہاں، ان کپڑوں میں اب بہت نمایاں ہونے لگی ہوں۔''

میں بوکھلا گیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تم میں آنے والی تبدیلی دشمن محسوس نہیں کرے گا ورنہ وہ چوکنا بھی ہو سکتا ہے اور اس کے پاس حربوں کی کمی نہیں ہے۔''

اوشا چوتھے دن آئی تھی۔ اب تک ہمارا کام دل نواز خان کر رہا تھا۔ میرے کپڑے دھونے کے لیے وہی لے جاتا تھا لیکن بانو نے اسے اپنے کپڑے دینے سے انکار کر دیا۔ ''بے شک یہ مسلمان ہے لیکن میرے بارے میں جس طرح سوچتا ہے مجھے گوارا نہیں کہ یہ میرے کپڑوں کو ہاتھ لگائے۔''

وہ اوشا کے آنے سے خوش ہو گئی۔ ''تم کہاں تھیں اتنے دن سے؟''

''ہماری طبیعت خراب ہو گئی تھی ڈاکٹر علاج کر رہا تھا۔'' اوشا نے دزدیدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ کو کوئی کام تھا۔''

بانو اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ کچھ دیر بعد وہ باسکٹ میں اس کے کپڑے لے کر نکلی اور میرے پاس آئی۔ بانو نہیں آئی تھی اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔ میں اوشا سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اسے واش روم میں لے آیا۔ ''اوشا تجھے کیا ہوا تھا؟''

وہ میرے پاس آ کر خوش تھی۔ اس نے مخصوص نشیلے انداز میں کہا۔ ''پتا نہیں رے، چار دن پہلے رات بستر پر لیٹی تو پھر ہوش نہیں رہا۔ ہوش آیا تو محل کے اسپتال میں تھی۔ ایک دن وہیں رہی پھر ڈاکٹر نے جانے دیا۔''

''اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تجھے کیا ہوا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بس بول رہا تھا ہم بیمار ہو گئے تھے اب ٹھیک ہیں۔''

''اوشا یہ سب جھوٹ ہے۔'' میں نے کہا اور اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور اسے کس مقصد کے لیے میرے کمرے میں لایا گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اوشا کی بڑی آنکھیں مزید پھیل گئی تھیں۔

''کیا کہہ رہا ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں، میرا خیال ہے تمہیں کھانے یا پینے کی کسی چیز میں دوا دی گئی تھی۔ اس کے اثر سے تم ایکی

ہو گئیں جیسے سو گئی ہو لیکن تمہارا جسم جاگ رہا تھا اور دوسرے جو کہہ رہے تھے تم اس پر عمل کر رہی تھیں۔"

اس نے سادگی سے پوچھا۔ "پھر تو نے کیا کیا ہمارے ساتھ رات بتالی؟"

"لاحول ولا ....." میں نے گڑبڑا کر کہا۔ "ایسا ہوتا تو آج میں زندہ ہوتا۔"

"تجھے کچھ نہیں ہوگا رے، باپو کا کہا کبھی غلط نہیں ہوتا۔"

میں نے دل ہی دل میں اس کے باپو کو سنائیں اور منہ سے بولا۔ "راج کنور بہر صورت مجھے قتل کرنا چاہتا ہے اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو آج تم بھی زندہ نہ ہوتیں۔"

اس کے چہرے پر خوف نمودار ہوا۔ "ہمیں بھی مار دیتا وہ؟"

"ہاں قتل کے بعد آلۂ قتل کون رکھتا ہے اسے سب سے پہلے ٹھکانے لگاتے ہیں۔"

"تب تو نے اسے ناکام کیسے کیا؟"

میں نے کہانی کا آخری حصہ سنایا کہ کیسے میں نے رامن پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس نے جھرجھری لی۔ "تو نے اچھا نہیں کیا رے اگر وہ گولی مار دیتا تو....."

"تو میں مر جاتا لیکن جو ہوا نہیں اس کا کیا رونا۔"

اوشا پریشان ہو گئی تھی۔ "نہیں، تو سوچ یہ کھل کر تیرے ویرودھ ہو گئے ہیں، پکے دشمن۔ میں تیرے لیے کیا کر سکتی ہوں۔"

"تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتی ہو میں تمہیں ہوشیار کر رہا ہوں۔ یہ پھر تمہیں میرے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہاں محل میں کوئی چکر چل رہا ہے۔ راج کنور اور بڑے کنور میں میری وجہ سے کشیدگی پیدا ہوئی ہے مجھے نہیں معلوم یہاں کیا ہو رہا ہے۔ تم باہر ہوتی ہو اور جاننے کی کوشش کر سکتی ہو۔"

"ہم سمجھ گئے۔" اس نے سر ہلایا۔ "تیرے لیے راز کھوجنا ہے۔"

"اسے آسان زبان میں جاسوسی کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن بہت ہوشیاری سے اور کسی کو شک کا موقع دیے بغیر اپنا کام کرنا۔ اگر کسی کو شک ہو گیا تو تم جانتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔"

اس نے جھرجھری لی۔ "یہ بہت جالم لوگ ہیں، جس نوکر سے ناراج ہوں اسے کتوں کے آگے ڈلوا دیتے ہیں۔"

پتا نہیں صاحبان اقتدار اپنے معتوبوں کو کتوں کے آگے کیوں ڈلواتے ہیں؟ میں نے سوچا اور اوشا سے کہا۔ "باہر چلو اب ہم کھل کر بات کریں گے۔"

"اتنی جلدی کیا ہے رے۔" اس نے شوخی سے کہا اور میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ آج وہ خادماؤں والے لباس میں تھی۔ اس کے وجود سے کشش انگیز حرارت اٹھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کی بانہیں گلے سے نکالیں۔

"جلدی ہے، یہ لوگ اب زیادہ نظر رکھتے ہیں اور شک ہو گیا تو ہم اس طرح بات کرنے سے بھی رہ جائیں گے۔"

بادلِ ناخواستہ وہ میرے ساتھ باہر آئی۔ اس نے کہا نہیں لیکن جب میں نے بتایا کہ بانو کو بچانے کے لیے میں رامن سے بھڑ گیا تھا تو اس کا منہ بن گیا تھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ میں بانو کے لیے اس حد تک جاؤں۔ ساتھ ہی وہ جانتی تھی کہ مجھے ٹوکے گی تب بھی میں باز نہیں آؤں گا اس لیے اس نے کچھ کہا نہیں۔ "صاحب جی تمہارے لیے کیا لائیں؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہو سکے تو منشی جی کو کہہ دینا میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ بانو کے لیے کپڑے اور دوسری چیزیں لے آئی تھی۔ بانو کی چیزیں اسے دے کر اوشا نے مجھے کہا۔ "منشی جی کہہ رہے ہیں وہ مصروف ہیں پر جلد آپ کے پاس آئیں گے۔"

اوشا کی بات سن کر میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا تھا۔ ابتدائی تین دن کم خوراکی نے مجھے پریشان کیا تھا کھانے کے کچھ دیر بعد بھوک اندر سے پیٹ میں پنجے مارنا شروع کرتی تھی لیکن اب میں عادی ہو رہا تھا۔ پیٹ نے سمجھ لیا تھا کہ اسے اس سے زیادہ خوراک نہیں ملے گی۔ اس لیے وہ شور نہیں کر رہا تھا۔ ورزش بھی خوراک کے تناسب سے کم کر دی تھی اور بس اتنی کر رہا تھا جس سے میں فٹ رہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ وزن کم ہونے سے میرے ریفلیکسز تیز ہو گئے تھے اور بانو سے مقابلے میں یہ کام آتے تھے۔ اوشا غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ "صاحب تو کمزور ہو گیا ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"اور وہ بڑی بھاری ہو رہی ہے۔" اوشا نے معنی خیز انداز میں بانو کے کمرے کی طرف دیکھا۔ "پرانے کپڑے نہیں آرہے ہیں۔ نئے منگوائے ہیں۔ اندر والے کپڑے کا سائز بھی بدل گیا ہے۔"

میں نے اسے ٹوکا۔ "تو اس چکر میں نہ پڑ۔ بیٹھ کر کھا رہی ہے اس لیے وزن تو بڑھے گا۔"

اس شام بانو سے مقابلہ کیا تو مجھے اوشا کی بات ٹھیک لگی تھی۔ اس کا وزن واقعی نمایاں طور پر بڑھا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے گھونسوں اور پاؤں کے وار میں قوت آگئی تھی۔ پہلے اس کا پنچ لگتا تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا تھا لیکن اب پنچ لگتا تو اس کے پیچھے موجود قوت کا واضح احساس ہوتا تھا۔ اس کے لڑنے کے انداز میں جارحیت آگئی تھی۔ پہلے وہ جسم سمیٹ کر اور جھک کر لڑتی تھی لیکن اب وہ بے فکری سے حملے کرتی تھی۔ اس نے اچانک ایک اپر کٹ مارا۔ میں بروقت دفاع نہ کر سکا اور گھونسا میری تھوڑی پر لگا۔ ایک لمحے کو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا تھا اور جب یہ اندھیرا چھٹا تو میں قالین پر پڑا ہوا تھا۔ دبیز قالین کی وجہ سے چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن اس وار نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ بانو پریشان میرے پاس بیٹھی۔

"کیا ہوا آپ ٹھیک ہیں؟"

جواب میں، میں نے ٹانگیں ہوا میں گھمائیں اور ایک ٹھوکر اس کی پشت پر رسید کی۔ وہ لڑھک گئی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "گرے ہوئے دشمن کی خیریت دریافت نہیں کرتے ہیں۔"

اس نے منہ بسورا۔ "آپ میرے دشمن نہیں ہیں۔"

"چلو دشمن نہ سہی حریف تو ہوں ابھی۔" میں نے ٹھوڑی سہلائی۔ "تمہارے وار میں بہت قوت تھی ایک لمحے کو میرے حواس ہی گم ہو گئے تھے۔"

وہ شرمندہ ہو گئی۔ "آپ ہی نے کہا ہے کہ میں پوری قوت سے لڑا کروں۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی کرنا ہے۔ میں نے بالکل بھی برا نہیں مانا بلکہ خوش ہوں کہ تم میری ہدایت پر عمل کر رہی ہو۔" میں نے دوبارہ لڑائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

اس دن مقابلے کے بعد میں ہانپ رہا تھا اور بانو کا سانس ہموار تھا۔ یہ یقیناً خوراک میں کمی کا نتیجہ تھا۔ اس سے پہلے بھی کیا بار ہا دور ایسے گزرے جب عملاً فاقہ کشی سے واسطہ پڑا تھا لیکن اس وقت کوئی میرا خون نچوڑنے کے درپے نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے اتنی کوشش نہیں کرنا پڑتی تھی۔ حالات بالکل بدلے ہوئے تھے۔ ایک بھائی ڈریکولا بنا ہوا تھا اور مجھے میرے خون کی خاطر زندہ رکھے ہوئے تھا تو دوسرا بھائی بھیڑیے کی طرح مجھے ایک ہی بار میں چیر پھاڑ دینا چاہتا تھا۔ بانو نے پھر اصرار کیا۔ "اب آپ ورزش نہ کریں صرف مجھ سے مقابلہ کیا کریں اگر آپ اسی رفتار سے کمزور ہوتے رہے تو پھر میں ٹھیک سے نہیں سیکھ سکوں گی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مگر میں اپنا وزن مزید کم کرنا چاہتا تھا اور یہ خوراک میں کمی کے ساتھ ورزش سے ہی ہو سکتا تھا اگر میں ورزش چھوڑ دیتا تو وزن میں اتنی تیزی سے کمی نہیں آسکتی تھی۔ میں اپنی قوت بھی جانچ رہا تھا۔ وزن میں کمی اصل میں گوشت اور چربی میں کمی تھی۔ میرے مسلز پہلے کی طرح مضبوط اور بڑے تھے۔ جسم سے چربی چھٹی تو یہ زیادہ نمایاں ہونے لگے تھے۔ میری قوت میں بھی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ تین دن بعد میں سنبھل گیا تھا۔ چھٹے دن تک میرا وزن کم ہو کر چوہتر کلوگرام رہ گیا تھا اور اب وزن میں کمی کے اثرات چہرے اور جسم پر واضح محسوس کیے جا سکتے تھے۔ اگلا دن خون لینے کا تھا۔ میں اسی مرحلے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا اور میں اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ جب اوشا نے بانو کے بھاری ہوتے جسم کی طرف اشارہ کیا تو میں فکرمند ہو گیا تھا جو بات اوشا محسوس کر سکتی تھی وہ دوسرے بھی کر سکتے تھے میں نے بانو کو یہ بات بتائی اور مشورہ دیا۔

"اب تم اپنی خوراک پر قابو پانے کی کوشش کرو تاکہ وزن مزید نہ بڑھے اور جسمانی چستی میں اضافہ ہو۔"

میرے مشورے کے بعد وہ بھی خوراک کم لینے لگی تھی۔ ورزش اتنی ہی کرتی تھی اور مجھ سے مقابلے کا دورانیہ اب بیس منٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے چند دن میں اس پر بھی فرق نظر آنے لگا خاص طور سے چہرہ جو بھر کر موٹاپے کا اشارہ کر رہا تھا پھر سے دبلا ہو گیا۔ چہرے سے بھی انسان کی صحت جھلکتی ہے۔ بعض لوگ اتنے صحت مند نہیں ہوتے ہیں لیکن ان کا چہرہ بھرا ہوتا ہے اس لیے لوگ انہیں صحت مند یا اوور ویٹ سمجھتے ہیں۔ جب کہ بعض اچھے خاصے صحت مند لوگ صرف دبلے چہرے کی وجہ سے کمزور سمجھے جاتے ہیں۔ ساتویں دن صبح ناشتے کے بعد منشی جی نازل ہو گئے۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر چونکے۔ "شہباز جی آپ کو کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں نے خوراک کم کر دی ہے اور ورزش چھوڑ دی

ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"منشی جی، آپ انجان نہ بنیں، میں نے آپ سے براہ راست کہا اور پھر ملازموں سے کہلوایا کہ میں آپ سے اور بڑے کنور سے ملنا چاہتا ہوں لیکن آپ مسلسل ٹالتے رہے۔ اس لیے میں نے خون نہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

منشی جی فکر مند ہو گئے۔ "مگر کیوں، جب مسئلہ حل ہو گیا تھا۔"

"یہ مسئلے کا عارضی حل تھا۔ راج کنور پھر شرارت کرنے کے لیے آزاد ہے۔ میں نے بڑے کنور سے مشروط تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ وہ میری اور بانو کی حفاظت نہیں کر سکے اس لیے میں نے بھی اپنا تعاون واپس لے لیا ہے۔ آیندہ تعاون صرف اسی صورت میں ہوگا جب وہ مجھ سے ملاقات کریں گے۔"

منشی جی کچھ دیر خاموش رہے پھر بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔ "آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی سزا ملے گی لیکن میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔ جب تک میری بڑے کنور سے ملاقات نہیں ہوتی اور وہ میرے کچھ مطالبات نہیں مانتے میں خون نہیں دوں گا۔ ویسے آپ کے قبضے میں ہوں چاہیں تو ایک ہی بار میں سارا خون نکال لیں۔"

دھمکی کو رائگاں جاتے دیکھ کر منشی جی نے دوبارہ پینترا بدلا۔ "شہباز جی آپ بلا وجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ بڑے کنور چیک اپ کے لیے دلی گئے ہوئے تھے آج کسی وقت واپس آئیں گے تب آپ کی ان سے ملاقات ہو سکے گی۔"

میں نے عیاری کا جواب چالاکی سے دیا۔ "ٹھیک ہے مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ان سے ملاقات ہو جائے تب میں آپ کے ساتھ کلینک چلوں گا۔"

منشی جی پریشان ہو گئے۔ "لیکن خون نکالنے کے انتظامات ہو گئے ہیں۔"

میں ہنسا۔ "منشی جی، یہ کسی بڑے آپریشن کے انتظامات نہیں ہیں، خون نکالنا معمولی سا عمل ہے۔ یہ پانچ منٹ کے نوٹس پر دوبارہ انتظام کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے میں فی الحال خون دینے کے قابل نہیں ہوں آپ میری صحت دیکھ رہے ہیں۔ ابھی میں معمول کا کھا پی رہا ہوں۔ اگر میں کھانا چھوڑ دوں تو ایک ہفتے بعد خون نکالنے کے لیے ڈاکٹر کو میری نس بھی نہیں ملے گی۔ اس لیے بڑے کنور سے جتنی جلد میری ملاقات ہو جائے۔ میرے اور ان کے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ جب تک بڑے کنور سے ملاقات نہیں ہو گی اور میرے مطالبات نہیں مانے جائیں گے میں معمول کا کھانا پینا اور ورزش نہیں کروں گا۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ایسا کر رہے ہیں ورنہ میں پہلے ہی بات کرتا۔" منشی جی نے مکاری سے کہا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

"کیا دل نواز خان نے بتایا نہیں کہ میں نے خوراک کم کر دی ہے، کھانا بچ کر واپس جاتا ہے۔"

"اس حرام خور نے ایک بار بھی نہیں بتایا۔" منشی جی غیظ و غضب سے بولے۔ "میں ابھی اس سے پوچھتا ہوں۔"

"آپ اس سے پوچھیں اور مجھے یقین ہے بڑے کنور بھی کچھ حرام خوروں سے پوچھ گچھ کریں گے جو کھا تو ان کا رہے ہیں لیکن کام کسی اور کے لیے کر رہے ہیں۔"

منشی جی کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ "شہباز جی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "ویسے منشی جی جو شخص بڑے کنور کا علاج کر رہا ہے اسے آپ ہی تلاش کر کے لائے تھے؟"

"ہاں اسے میں نے تلاش کیا ہے۔" وہ فخر سے بولے۔ "سندھو جیسا ماہر تو نہیں ہے لیکن اس کا دعویٰ ہے وہ بڑے کنور کا علاج کر سکتا ہے۔"

"کتنا عرصہ ہو گیا اسے بڑے کنور کا علاج کرتے ہوئے؟"

"چار مہینے سے کر رہا ہے۔"

"یقیناً بڑے کنور کو فائدہ ہوا ہوگا۔"

"ہاں فائدہ تو ہوا ہے۔" منشی جی یک دم محتاط ہو گئے۔ "شہباز جی اگر آپ تعاون جاری رکھیں تو بڑے کنور جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔"

"میری طرف سے تو پورا تعاون تھا لیکن اس محل کے کچھ لوگ شاید بڑے کنور کو صحت یاب دیکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ اس لیے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔"

"ایسی کوشش نہیں کی گئی۔" منشی جی نے جلدی سے تردید کی۔ "آپ جانتے ہیں راج جی کی خواہش کیا ہے۔"

"اس کی خواہشات بہت زیادہ ہیں اور بعض اوقات انسان جسے خواہش سمجھ رہا ہوتا ہے وہی اس کی موت ثابت ہوتی ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "منشی جی، اوشا کو میرے پاس بھیجنے کا کیا مقصد تھا۔ وہ سندھو کی بیٹی ہے اور آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں وہ وش کنیا ہے۔ جو مرد اس کے پاس آئے گا وہ زندہ نہیں رہے گا۔ آپ خود اسے یہاں لے کر گئے تھے اور وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اب بھی آپ کہتے ہیں کہ وہ مجھے قتل کرنے کی کوشش نہیں تھی۔"

"اگر ایسا بھی تھا تو میں یقین دلاتا ہوں آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔" منشی جی نے صلح کن انداز میں کہا۔ ان کی کوشش تھی کہ مجھے خون دینے پر آمادہ کر لیں لیکن جب میں ٹس سے مس نہیں ہوا تو وہ مایوس لوٹ گئے۔ بانو وہاں موجود تھی اور خاموشی سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ منشی جی کے جاتے ہی وہ ورق پیڈ اور پنسل لے آئی۔ "آپ نے اس سے بہت کھل کر بات کی ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"دشمن سے رازداری اچھی چیز ہے لیکن بعض اوقات کھل کر بات کرنا بھی مفید ہوتا ہے۔" میں نے جواباً لکھا۔ "دیکھو دشمن ہمیں بے وقوف سمجھ رہا ہے تو ہم یہ تاثر کیوں نہ دیں کہ ہم بے وقوف بن رہے ہیں۔ اس طرح ہم اس کے عزائم بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ بڑا کنور اس کھیل میں شامل ہے لیکن اب مجھے لگ رہا ہے، مجھے جان بوجھ کر بڑے کنور تک رسائی کا موقع نہیں دیا جا رہا ہے دوسری طرف اسے شاید یہ بتایا جا رہا ہے کہ سب ٹھیک ہے میں خوش و خرم ہوں اور پوری طرح تعاون کر رہا ہوں۔"

"لیکن جب خون نہیں ملے گا تو یہ بڑے کنور کو کیا کہیں گے؟"

"یہی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ اپنی حکمت عملی چلاتے ہیں یا پھر کوئی پینترا بدلتے ہیں۔ بڑے کنور کے گرد موجود تمام افراد اس سے مخلص نہیں ہیں شاید ایک دو ہوں جو اسے خبردار کر سکتے ہوں تو ان کو اس کے پاس سے ہٹایا جا سکتا ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کیا منشی جی بھی راج کنور سے ملا ہوا ہے؟"

"میرا خیال ہے اگر وہ ملا ہوا نہیں ہے تب بھی وہ بعض معاملات میں اس کی حمایت کر رہا ہے۔ جیسے اس نے بروقت آ کر مجھے اوشا سے بچایا لیکن اب وہ اس معاملے کو بڑے کنور تک پہنچنے سے روک رہا ہے۔ مجھے یقین ہے تمہاری رہائی میں بڑے کنور کا ہاتھ نہیں ہوگا بلکہ اسے شاید خبر بھی نہیں ہوگی کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

"تب راج کنور نے مجھے کیسے چھوڑ دیا؟"

"وہ منشی جی کے سامنے مجبور ہوا ہوگا، شاید منشی جی نے معاملے کو دبانے کے لیے یہی شرط رکھی ہوگی کہ وہ تمہیں واپس کر دے اور پھر ہم سے کوئی تعرض نہ کرے۔"

"سوال یہ ہے کہ منشی جی نے بڑے کنور کو کیوں بے خبر رکھا۔ اگر وہ راج کنور کے ساتھ نہیں ملا ہے تو ایسا کیوں کر رہا ہے؟"

"میرا اندازہ ہے کہ منشی جی کے خیال میں بڑے کنور کی کہانی جلد یا بدیر ختم ہونے والی ہے اور راج کنور ہی اگلا حکمران ہوگا۔ اس لیے وہ ابھی سے اس کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اسے یہ خیال بھی ہے کہ ابھی بڑا کنور زندہ ہے اور وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ یہ سارا مفادات کا کھیل ہے اس میں سب حلیف ہیں اور سب حریف ہیں۔"

بانو نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "آپ نے بہت گہرائی سے ان کا تجزیہ کیا ہے۔"

"دشمن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش ہی مفید ثابت ہوتی ہے۔ اگر آپ دشمن کے بارے میں جانتے ہیں تو بہت کم قوت سے بھی اسے انجام تک پہنچا سکتے ہیں ورنہ بہت زیادہ طاقت بھی آپ کے کام نہیں آتی ہے۔ یہ اصول بڑی سلطنتوں سے لے کر عام آدمی تک یکساں لاگو ہوتا۔"

لکھ لکھ کر میرا ہاتھ تھک گیا تھا۔ اتنا زیادہ میں صرف امتحان میں لکھتا تھا اور اس سے بھی میری جان جاتی تھی۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ بی کاپی لینے کی نوبت نہ آئے جب کہ میرے آس پاس کے لڑکے دھڑا دھڑ بی کاپیاں لے رہے ہوتے تھے۔ لیکن میرے مارکس ہمیشہ ان سب سے زیادہ ہی آتے تھے۔ بانو جتنی تیزی سے لکھ رہی تھی لگتا تھا وہ بھی امتحان میں کئی بی کاپیاں لیتی تھی۔ اس نے لکھا۔ "اگر آپ بڑے کنور سے ملتے ہیں تو اس سے کیا مطالبہ کریں گے؟"

"میں تمہیں انڈیا سے باہر بھجوانے کا مطالبہ کروں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلا کر لکھا۔ "وہ مجھے واپس نہیں بھیجے گا۔"

"میں ممتاز ہاؤس کی بات نہیں کر رہا میں تمہیں اپنے

ساتھیوں کے پاس بھجواؤں گا وہاں سے تم اپنے طور پر کہیں جانے یا اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔"

وہ خوش ہوگئی۔ "میں بھی اب ممتاز ہاؤس واپس نہیں جانا چاہتی۔ میں اپنی زندگی آپ جینا چاہتی ہوں۔"

"مجھے امید ہے بڑا کنور مان جائے گا۔ اسے صرف میاں ممتاز کی فکر ہے کیونکہ اس سے اس کے کاروباری تعلقات ہیں۔ وہ ان تعلقات کو خراب نہیں کرنا چاہتا ہے۔ اگر میاں ممتاز کو علم نہ ہو تو اسے اعتراض نہیں ہوگا۔"

"لیکن اسے یہ فکر تو ہوگی کہ آپ کے ساتھیوں کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کہاں ہیں اور آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔"

"کنور خاندان یہاں کا حکمران ہے اور یہاں ان کی ذاتی طاقت بھی ہے اور ان کو ریاست کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ میرے ساتھی پاکستان سے آکر یہاں ان کے خلاف کیا کر سکتے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ یہ لوگ اس بارے میں فکر مند ہوں گے۔"

"وہ کوشش تو کر سکتے ہیں۔" بانو بولی۔ "اگر وہ آپ کی طرح ہیں تو مجھے یقین ہے وہ آپ کو آزاد کرانے کے لیے انڈیا تو کیا دنیا کے آخری سرے تک بھی جا سکتے ہیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، میرے ساتھی ایسے ہی تھے۔ وسیم، سفیر، بیتو، عبداللہ اور ایاز کو پتا چلتا تو وہ یہاں بھی آجاتے۔ مگر شاید بڑا کنور اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ چانس لے کر دیکھوں گا، ہوسکتا ہے وہ بانو کو یہاں سے بھیجنے پر آمادہ ہو جائے اس کے بعد میں اکیلے بہتر طور پر حالات کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے مہینا ہونے کو آیا تھا اور اب تک میں نے آزاد ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اتنے عرصے دشمن کی قید میں رہا تھا اور خود کو آزاد نہیں کرا سکا تھا۔ بانو میرے پاؤں میں ایک زنجیر کی طرح تھی۔ میں اسے کھوئے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنا ملک ہوتا تو شاید میں اتنی پروا نہ کرتا لیکن میری پاکستانیت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ایک پاکستانی لڑکی کو ان دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں۔ جن کے عزائم بانو کے لیے واضح تھے، وہ بھیڑیوں کی طرح اس پر رال ٹپکاتے ہوئے دانت تیز کر رہے تھے اور بے تابی سے اس وقت کے منتظر تھے جب انہیں اس پر تصرف حاصل ہو جاتا۔ راج کنور کی ایک سازش میں نے ناکام بنادی تھی۔ مگر ضروری نہیں تھا کہ میں اس کی ہر سازش ناکام بنا دیتا۔

جب میں بانو سے لکھ کر بات کر رہا تھا تو اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ میں اوشا کی مدد سے بڑے کنور کو پیغام بھجوا سکتا تھا۔ اگر وہ بے خبر تھا تو خبردار ہو جاتا۔ اوشا ملازمہ تھی لیکن اسے محل میں حرکت کرنے کی آزادی حاصل تھی۔ اگر بڑے کنور کے حصے کی طرف جانے پر کوئی پابندی تھی تو وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں جا سکتی تھی اور بڑے کنور کو میرا پیغام دے سکتی تھی۔ میں نے بانو کو اپنے خیال کے بارے میں بتایا، وہ پرجوش ہوگئی۔ "واقعی یہ آسان ہے۔ وہ بڑے کنور تک جا سکتی ہے۔"

"ہاں، کوشش تو کر ہی سکتی ہے۔"

بانو معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "آپ کے لیے سب کر سکتی ہے۔"

میں جھینپ گیا۔ پھر میں نے رف پیڈ سے ایک کاغذ الگ کیا اور اس پر بڑے کنور کے لیے انگریزی میں پیغام لکھا۔ "بعد آداب عرض ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو ان حالات کا علم ہے۔ راج کنور نے میرے اور بانو کے خلاف سازش کی ہے ہمیں کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی اور بانو کو راج کنور کے بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا۔ پھر ٹی وی پر دکھا کر مجھے دھمکی دی گئی کہ اگر میں نے اوشا کے ساتھ رات نہیں گزاری تو بانو کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ میں نے جان پر کھیل کر راج کنور کی یہ کوشش ناکام بنادی اور خشی جی بانو کو واپس لے آئے۔ لیکن اس دوران میں رامن نے مجھے مارنے کی نیت سے گولی چلائی۔ ویسے بھی یہ میرے قتل کا منصوبہ تھا کیونکہ اوشا کے ساتھ رات گزارنے کا مطلب اس دنیا سے انتقال کر جانا ہے۔ میں نہیں سمجھ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں لیکن میرے مطالبے کا کوئی جواب نہیں دیا جا رہا ہے۔ میں نے گزشتہ ایک ہفتے سے جب سے یہ واقعہ ہوا ہے۔ کھانا پینا کم کر دیا ہے اور میں خون دینے کی حالت میں نہیں ہوں اور نہ ہی میں خون دوں گا جب تک میرے کچھ مطالبات مان نہیں لیے جاتے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مخلص دشمن۔"

کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں کسی موقع پر یہ برآمد نہ ہو جائے اس لیے اسے صوفے کی گدی کے خلا میں ڈال دیا کہ ضرورت پڑنے پر میں آرام سے واپس نکال سکتا تھا۔ بانو دیکھ رہی تھی اس نے تفریحی انداز میں سر ہلایا اور رف پیڈ پر لکھا۔ "شہباز صاحب اگر ایسا ہو گیا تو میں ساری عمر آپ کا احسان نہیں بھولوں گی۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اس کے باوجود یہاں کا ایک ایک لمحہ مجھ پر بھاری ہے۔"

"احسان غیروں پر ہوتا ہے اور اب میں تمہیں اپنا ساتھی سمجھنے لگا ہوں۔ میرے اکثر ساتھی میری طرح ہیں۔ وہ اتنے مخلص اور بے غرض لوگ ہیں کہ اس جنگ میں جو ان کی نہیں ہے بے لوث میرا ساتھ دے رہے ہیں۔"

"لیکن میں ان کی طرح نہیں ہوں، میں تو خود آپ پر بوجھ ہوں۔" اس نے افسردگی سے کہا تو میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میرا اندازہ ہے آپ آرام سے بیٹھنے والے شخص نہیں ہیں۔ اب تک اس قید سے آزاد ہو گئے ہوتے یا کم سے کم کوشش ضرور کرتے۔ لیکن آپ کوشش بھی نہیں کر رہے ہیں اور اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپ میری وجہ سے صبر کر رہے ہیں۔"

میں نے سر ہلایا۔ "ہاں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اسی لیے میں تمہیں جلد از جلد یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔ اللہ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے۔"

بانو رف پیڈ لے کر چلی گئی تھی۔ یہ خاصا موٹا رف پیڈ تھا جس پر لکھ لیے جاتے تھے۔ بانو انہیں اپنے واش روم میں جلا کر ان کی راکھ واش بیسن میں بہا دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کاغذ بہائے تو ممکن ہے یہ آگے کہیں نظروں میں آجائیں اس لیے جلا کر راکھ بہانا ہی زیادہ مناسب تھا۔ مسلسل لکھ کر بات کرنے سے رف پیڈ آدھا رہ گیا تھا۔ اوشا ہر دوسرے تیسرے دن چکر لگاتی تھی اور وہ دو دن پہلے آخری بار آئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ آج یا اگلے روز چکر لگائے گی تب میں اس کے ہاتھ رقعہ بڑے کنور کو بھیج سکتا تھا۔ اگرچہ اس میں رسک تھا۔ عین ممکن تھا کہ اب بڑے کنور کے حصے کی طرف کسی کو جانے کی اجازت نہ ہو اور راج کنور کے اعتماد کے لوگ ہی اس طرف جا سکتے ہوں گے۔ اس صورت میں اوشا کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہوتے۔

اوشا شام کو آئی اور بڑے غلط موقع پر آئی۔ میں نے کچھ ہلکی ورزش کی تھی اور پھر حسب معمول بانو سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ اس دن وہ بڑے جارحانہ موڈ میں تھی۔ ایک موقع پر میرا پاؤں پھسلا اور میں نیچے گرا تو وہ مجھ پر سوار ہو کر گھونسے برسانے لگی۔ میں اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور اوشا باسکٹ اٹھائے اندر آئی۔ بانو کو یوں مجھ پر سوار گھونسے برساتے دیکھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اسے بلکہ شاید ہی کسی کو معلوم تھا کہ میں اور بانو لڑائی کی مشق کرتے تھے۔ اس لیے وہ اسے اصل لڑائی سمجھی۔ بانو کو مجھ پر حاوی دیکھ کر اس کا غصہ فطری تھا۔ اس نے باسکٹ ایک طرف پھینکی اور چیخ مار کر جھپٹی۔ بانو کا منہ نیچے تھا اس لیے وہ اسے نہیں دیکھ سکی لیکن میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اوشا کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کے سفید دانت جھلک رہے تھے۔ یہ بڑا خطرناک انداز تھا وہ بانو کو کاٹنے آرہی تھی۔ میں نے بانو کو دوسری طرف اچھال دیا اور اس دوران میں اس کے دو تین گھونسے بھی کھائے۔ بانو گری اور اٹھ رہی تھی کہ اوشا رخ بدل کر اس کی طرف لپکی۔ اسے آواز سے روکنے میں رسک تھا اگر وہ نہ سنتی اور بانو کو دانت مار دیتی تو اس کا زہر بانو کو منٹوں میں موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ میں نے اوشا کے پیروں پر ٹھوکر ماری وہ لڑکھڑا کر گری لیکن بانو اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس نے بانو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس پر منہ مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے بروقت اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔

ہلکے پھلکے بدن سے قطع نظر اس کا وزن خاصا تھا کیونکہ مجھے پورا زور لگا کر کھینچنا پڑا تھا۔ دوسری طرف بانو نے اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اوشا نے پھر کوشش کی لیکن وہ بانو کا ہاتھ نہیں پکڑ سکی تھی۔ اسے پیچھے کھینچ کر میں نے اٹھتے ہوئے اس کی کمر گھٹنے سے دبائی۔ وہ تڑپی۔ "چھوڑ رے.... مارے گا کیا؟"

"یہ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے برہمی سے کہا اور بانو کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن بادل ناخواستہ چلی گئی۔ اوشا جواب تک تڑپ اور اینٹھ رہی تھی اس کے جاتے ہی ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اٹھ گئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔

"میں اسے مار ڈالوں گی۔"

"تمہارا دماغ درست ہے۔ ہم آپس میں مقابلہ کر رہے تھے۔"

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ "وہ تجھے مار نہیں رہی تھی؟"

"نہیں، یہ مشق تھی۔" میں نے اس بار نرمی سے کہا۔ "تو نے بلا وجہ دخل دیا۔ جا کر اس سے معافی مانگ، اگر میں بروقت تجھے نہ روکتا تو تو نے اسے مار ہی دیا

تھا۔“

”معافی تو میں مانگ لوں گی رے، پر یہ کیسا مقابلہ تھا وہ تو لگا تجھے جان سے مار رہی تھی۔“

”مقابلے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ دیکھو ہم دونوں نے دستانے اور ہیلمٹ پہن رکھے ہیں۔“

اس بار اوشا شرمندہ ہو گئی۔ ”تب تو مجھ سے بڑی غلطی ہوئی رے، اب میں کیا کروں؟“

”اس سے معافی مانگ لو۔ بات ختم ہو جائے گی۔“

میں اسے بانو کے کمرے میں لایا میں اسے اکیلے بھیجنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن تھا بانو غصے میں اسے کچھ کہہ دیتی اور وہ پھر بپھر جاتی۔ بے شک بانو جسمانی لحاظ سے اس سے کہیں مضبوط ہو گئی تھی اور لڑائی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اوشا جیسی چار بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں لیکن اوشا کا واحد ہتھیار یعنی اس کا زہر سب پر بھاری ہوتا۔ اس کے دانتوں کی ایک کاٹ بانو کو مارنے کے لیے کافی تھی۔ بانو بیچ برہم تھی اور اس نے بڑی مشکل سے اوشا کی معافی قبول کی۔ بہر حال یہ معاملہ نمٹ گیا اور میں اوشا کو لے کر اپنے والے واش روم میں آیا۔ شاور چلا کر میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اوشا تجھے میرا ایک کام کرنا ہوگا پر کام بہت مشکل اور احتیاط والا ہے۔“

”تو اوشا کی جان مانگ لے رے۔“

”جان لینا اور دینا دونوں بہت آسان کام ہیں لیکن زندہ رہتے ہوئے دشمن کے عزائم ناکام بنانا اصل کام ہے۔ تجھے میری ایک چٹھی بڑے کنور تک اس طرح پہنچانی ہے کہ کسی کو بھی پتا نہ چلے۔ نہ تیرے جانے کا اور نہ تیرے چٹھی پہنچانے کا۔ بول یہ کام کرلے گی۔“

وہ فکر مند ہو گئی۔ ”ادھر بڑے کنور کے حصے پر پابندی ہے، ہر کوئی نہیں جا سکتا۔ میں بھی نہیں جا سکتی پر تیرے لیے کوشش کروں گی۔“

اس نے میرے خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ بڑا کنور اپنے ہی محل میں قید کر دیا گیا تھا۔ ”اوشا کامیابی سے زیادہ اہم رازداری ہے، اگر تو محسوس کرے کہ پکڑی جائے گی تو جو کاغذ تجھے دوں وہ کھا لینا۔ کسی اور کے ہاتھ نہ آئے میری بات سمجھ رہی ہے نا؟“

”ہم سب سمجھتے ہیں۔“ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پاس ہونے کی کوشش کی۔ ”تو جانتا ہی نہیں ہے اوشا کے لیے تو کیا ہے رے۔“

”میں جانتا ہوں اور تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن ابھی میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔“

وہ بجھ گئی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”بھگوان نے کیا انیائے کیا ہے ہمارے ساتھ۔“

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کے ساتھ انیائے ٹھیک ہوا تھا ورنہ وہ میرے لیے مسلسل خطرے کی گھنٹی بنی رہتی۔ میں اسے کمرے میں لایا اور صوفے کی گدی میں سے کاغذ نکال کر اسے دیا جو تعویذ کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ لے کر اسے اپنی نہ ہونے کے برابر بلاؤز کے گریبان میں غائب کر دیا۔ پھر مسکرا کر مجھے دیکھا تو میں جھینپ گیا کیونکہ میں خاصے غور سے یہ سارا عمل دیکھ رہا تھا۔ اس نے شوخی سے کہا۔ ”ایسے کیا دیکھتا ہے تجھ سے تو کچھ چھپا نہیں ہے رے۔“

میں نے موضوع بدل لینا مناسب سمجھا۔ ”میری چیزیں لائی ہو؟“

اس نے گری ہوئی باسکٹ اٹھائی۔ اس میں سے بانو کے لیے لائی ہوئی اشیا نکالیں تو میں نے ٹوکا۔ ”ایسے نہیں سب پہلے کی طرح رکھو اور پہلے بانو کو دے آؤ۔ پھر میری چیزیں مجھے دینا۔“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”شہباز تو اس کا کچھ زیادہ ہی کھیال نہیں رکھتا ہے رے۔“

”ہاں کیونکہ یہاں وہ میری ذمے داری ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم اسے کسی اور معنی میں مت لیا کرو، وہ خود بھی ایسی لڑکی نہیں ہے۔ اس کا اور میرا تعلق مرد عورت والا نہیں ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے بے دلی سے کہا اور باسکٹ اٹھا کر بانو کے کمرے میں چلی گئی۔ اگر اس وقت کوئی مائک پر کان لگائے بیٹھا ہوگا تو اسے یہاں ہونے والے ہنگامے کی کچھ گن مل گئی ہوگی۔ بہر حال اس سے اتنا فرق نہیں پڑتا کیونکہ راج اینڈ کمپنی اتنا تو جانتی تھی کہ بانو بھی ورزش کرتی ہے اور مجھ سے لڑائی کی تربیت بھی حاصل کر رہی تھی لیکن وہ اس کے مقاصد سے لاعلم تھے اور میں انہیں زیادہ سے زیادہ لاعلم رکھنا چاہتا تھا۔ اوشا چند منٹ بعد آئی اور میرا سامان نکال کر میز پر رکھا اور پھر لہراتی بل کھاتی چلی گئی۔ بعض خواتین مردوں کے معاملے میں ہار کی قائل ہی نہیں ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں ان کا کوا ہمیشہ سفید ہوتا ہے، اوشا بھی ان میں سے ایک تھی۔ میرا رویہ اس پر بالکل واضح تھا لیکن وہ ہمیشہ ...

... سے حملہ کرتی تھی اور ناکامی سے بددل نہیں ہوتی تھی۔ اس کا یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی میں اس کے سامنے مجبور ہو جاؤں گا۔

اس کے جاتے ہی بانو آ گئی۔ اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ روایتی مشرقی ملبوس کے بجائے اس نے مستقل ٹراؤزر اور شرٹ یا کرتہ پہننا شروع کر دیا تھا۔ یہ تمام کپڑے ڈھیلے اور اسٹریچ ایبل تھے۔ ان کے ساتھ وہ دوپٹا لے لیتی تھی۔ توقع کے عین مطابق اس کا مزاج برہم تھا۔ ”شہباز صاحب میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھتی ہے اور بلاوجہ میرے پیچھے پڑی ہے۔“

”وہ نادان ہے اور تم سمجھ دار ہو اس لیے اس کی سطح پر مت آؤ۔ وہ جو سمجھتی ہے اسے سمجھنے دو، اس سے تمہیں یا مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وہ کچھ ٹھنڈی ہوئی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اگر وہ کامیاب ہو جاتی، مجھے کاٹ لیتی تو اب تک میں مر چکی ہوتی۔“ اس نے کہتے ہوئے جھرجھری لی۔

”وہ جذباتی ہو گئی تھی لیکن میں نے اسے سمجھا دیا ہے اب وہ محتاط رہے گی۔“ میں نے کہا اور اشارے سے اسے منع کیا کہ اب اس موضوع پر مزید بات نہ کرے۔ اس نے سر ہلایا اور بولی۔

”ٹھیک ہے ویسے وہ بری لڑکی نہیں ہے۔“

”ٹھیک کہا اصل میں وہ ماحول برا ہے جس میں وہ رہ رہی ہے۔ بہر حال وہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔“

بانو نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا ”آئندہ اسے اندر سے بند رکھیے گا۔“

”تم فکر مت کرو میں خیال رکھوں گا۔“

اوشا کی بات سے تصدیق ہو گئی تھی کہ بڑے کنور کے خلاف سازش کا جال مضبوط ہو رہا تھا۔ اسے مجھ سے بے خبر رکھا گیا تھا اور اس بے خبری میں اس کا معتمد خاص منشی جی بھی شامل تھا۔ اگر سازش کا آغاز تھا تو اس کی تکمیل میں زیادہ دیر باقی نہیں رہی تھی کیونکہ بڑا کنور جس درجے کا آدمی تھا زیادہ دیر بے خبر نہیں رہ سکتا تھا اور ایک بار وہ خبردار ہو جاتا تو اسے شکار کرنا یا اپنے راستے سے ہٹانا آسان نہ ہوتا۔ اصل میں ہاتھی کا شکار تھا۔ ہاتھی ایک بار خبردار ہو جائے تو شکاری کو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ راج کنور پارٹی اپنے منصوبے کو آخری مرحلے میں لے آئی تھی۔ اگر بڑا کنور مارا جاتا یا بے بس کر دیا جاتا تو اس کے فوری بعد میرا نمبر آتا۔ جیسے جیسے میں غور کر رہا تھا میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ راج کنور کی اصل کامیابی بڑے کنور کو راستے سے ہٹانا تھا۔ لیکن وہ اس کامیابی کا جشن مجھے قتل اور بانو کو بے آبرو کر کے مناتا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنی سازش میں کامیاب ہوتا میرا بڑے کنور سے رابطہ لازمی تھا۔ میری ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی، اب آخری امید اوشا سے تھی۔ اگر وہ اس تک پہنچ جاتی تب کچھ ہو سکتا تھا۔ مگر میں نے مزید غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ بڑا کنور اس وقت نہایت نازک پوزیشن میں تھا۔ وہ بیمار تھا اور اس کے آس پاس تمام ہی لوگ راج کنور کے وفادار یا زرخرید تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کے ایک اشارے پر بڑے کنور کے نیم مردہ وجود کو مکمل طور پر موت کی وادی میں دھکیل سکتے تھے۔ میں نے بانو کو اشارہ کیا کہ وہ رف پیڈ اور پنسل لائے۔ وہ جلدی سے لے آئی اور میں نے لکھ کر اسے اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ”اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

”بانو تیار رہو کسی وقت بھی مشکل آ سکتی ہے۔ ذہنی اور جسمانی طور پر نمٹنے کے لیے تیار رہو۔“

”لیکن ہم خالی ہاتھ کیا کر سکتے ہیں۔“

بانو کے پاس اس کی جوڑے والی سلاخ تھی۔ وہ اسے مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی تھی لیکن اس کے لیے دشمن کا غافل اور نزدیک ہونا لازمی تھا۔ ہمیں اس سے بہتر ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ مجھے کمرے میں موجود ورزش کی مشینوں کا خیال آیا۔ ان میں راڈز، تاریں اور رسیاں تھیں۔ میں نے ایک مشین سے دو عدد راڈز نکالیں۔ یہ دو فٹ لمبی اور تقریباً تین کلوگرام وزنی ٹھوس اسٹیل پائپ سے بنی تھیں۔ نزدیک سے حملے یا دفاع کے لیے یہ بہترین ہتھیار ثابت ہوتا لیکن آتشیں ہتھیاروں کے سامنے بیکار تھا۔ ان میں کہیں سوراخ نہیں تھا جس سے رسی باندھ کر انہیں دور مار ہتھیار بنایا جا سکتا بہر حال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ میں نے راڈز مشین میں یوں لگا دیے کہ ضرورت پڑنے پر انہیں فوری نکالا جا سکتا۔ یہ پائپ ویسے بھی کلپس سے لگے ہوئے تھے۔

وزن کھینچنے والی مشین میں بہت مضبوط نائلون کی رسیاں تھیں مگر اتنی مضبوط گرہ کے ساتھ بندھی تھیں کہ انہیں صرف کاٹ کر نکالا جا سکتا تھا اور ہمارے پاس کاٹنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس موقع پر بانو کے پاس موجود لائٹر کام آیا

اور اس سے جلا کر رسی مشین سے الگ کر لی تھی۔ رسی مشین کے پیچھے تھیں اس لیے جب تک کوئی مشین استعمال کرنے کی کوشش نہ کرتا اسے پتا نہیں چلتا کہ رسی ہے ہی نہیں۔ گلا گھونٹنے کے لیے رسی ہاتھوں سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ رسی کے دو ٹکڑے کر کے ان کے سروں پر موٹی گرہ لگا کر میں نے بانو کو طریقہ سمجھایا کہ کس طرح شکار کے گلے میں رسی ڈال کر اسے کھینچنا ہوگا جس سے وہ بے بس ہو جائے اور زیادہ مزاحمت نہ کر سکے۔ رات سونے سے پہلے ہم نے راؤز سے حملے کی مشق کی۔ اصل میں مشق بانو نے کی۔ میں نے اسے متواتر وار کرنا سکھایا جس میں فریق کو سنبھلنے کا موقع نہ ملے۔ بانو نے پوچھا۔

"اگر فرض کریں یہ ہمیں الگ کر دیں۔ مجھے آپ کی مدد حاصل نہ ہو تو اس میں صورت میں کیا کروں؟"

"جس وقت یہ تمہیں قابو کر کے الگ کر رہے ہوں اس وقت مزاحمت مت کرنا کیونکہ وہ پوری طرح ہوشیار اور تعداد میں زیادہ پھر مسلح بھی ہوں گے۔ جب کوئی اکیلے تمہارے پاس آئے تب تم اس پر قابو پا سکو گی۔ تمہیں پستول یا اس جیسا کوئی ہتھیار حاصل کرنا ہوگا۔"

"مجھے چلانا نہیں آتا ہے۔"

"بہت آسان ہے اور اسے درست طریقے سے پکڑنا تو آتا ہوگا۔ اس کے بعد کام آسان ہو جائے گا۔ تم اگر راج کنور کو یرغمال بنا لو تو ان سے اپنی بات منوا سکتی ہو۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ موقع ملنے پر تم اسے قتل کرنے کے بجائے ناکارہ کر دو۔ کامیابی کی صورت میں تم مجھے بلواؤ گی اور اس کے بعد ہم مل کر طے کریں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں سے نکلنے کا ایک یہی طریقہ ہے۔ اچھا ہوا میں نے آپ سے بات کر لی، اب واضح ہے کہ ہنگامی صورت حال میں مجھے کیا کرنا ہے۔"

"ممکن ہے راج کنور ہاتھ نہ آئے تو اس صورت میں تم کسی اور کو قابو کر سکتی ہو لیکن رامن سے الجھنے سے گریز کرنا۔ مجھے وہ بہت خطرناک اور ماہر آدمی لگتا ہے۔ الٹا تم پر قابو پا لے گا اور پلان ناکام ہو جائے گا۔ تمہارا بہترین ہتھیار عورت اور بہ ظاہر کمزور ہونا ہے۔ اس لیے تم اسے استعمال کرنا اور انہیں کمزور ہونے کا تاثر دینا جب دھوکے میں آ جائیں تب وار کرنا۔ ایک بار پھر کہہ دوں بیجا وار کرنے کے بجائے صبر سے کام لینا بے شک تمہیں تھوڑا بہت برداشت بھی کرنا پڑے تو کر لینا میری بات سمجھ رہی ہو"

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ سمجھ گئی کہ میں نسوانیت کے حوالے سے بات کر رہا ہوں کہ اسے ان لوگوں کی حرکتیں بھی برداشت کرنے... ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"سوتے وقت اپنے ہتھیار اپنے پاس..." میں نے کہا۔ "جوڑے کی سلاخ اور چھوٹی سی رسی... لباس میں چھپا سکتی ہو۔"

یہ ساری گفتگو حسب معمول لکھ کر کی جا رہی تھی... خدشہ تھا کہ پہلے کی طرح ہمیں کھانے میں نیند کی... جائے گی۔ اس لیے ہم یہ کرتے تھے کہ پہلے بانو کھا... اور اس کے نصف گھنٹے بعد میں کھاتا جب مجھے اطمینان... جاتا کہ کھانے میں کوئی خواب آور شے شامل نہیں... خاص طور سے رات کے کھانے میں احتیاط کرتے تھے... نے بانو سے کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ محسوس کرے کہ کھا... بعد اسے خلاف معمول غنودگی محسوس ہو رہی ہے... کر کے پیٹ خالی کر لے۔ یہ ساری احتیاطیں اس لیے... رہی تھیں کہ ہم بے خبری میں ان لوگوں کے ہتھے... جائیں۔ بلکہ یہ ہمارے لیے ایک چانس بھی تھا، اگر... کھانے میں خواب آور دوا دی جاتی اور ہم اسے نا... دیتے تو راج کنور اینڈ پارٹی پر قابو پا سکتے تھے۔ راج... اصل آدمی تھا۔ وہ ہمارے ہاتھ آ جاتا تو ہم اس کے... سے کچھ بھی منوا سکتے تھے۔

منشی جی دوبارہ نہیں آئے اور نہ ہی خون لینے... کیا اس کا مطلب تھا کہ اب انہیں میرے خون کی... نہیں تھی۔ خون کی ضرورت بڑے کنور کو تھی اور ان... خلاف سازش کی جا رہی تھی جو یقیناً اپنے آخری مر... داخل ہو گئی تھی۔ فی الحال سازشیوں کی ساری توجہ ا... تھی اس لیے ہم محفوظ تھے لیکن جیسے ہی وہ بڑے کنور... حاصل کرتے یقیناً اس کے بعد ہماری باری آتی۔ یہ... والا معاملہ ہوتا۔ اس میں یا تو دشمن کامیاب ہو جاتا... اس کے چنگل سے آزاد ہو جاتے۔ میں نے ایک فیصلہ... تھا کہ اگر ہم نے راج کنور پر قابو پا لیا اور اس کی... یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہے تو محفوظ جگہ پہنچ... اس سانپ کا سر کچل دوں گا۔ وہ ایسا دشمن تھا جو... ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوتا اور اسے چھوڑ دیتا تب بھی...

... چھوڑتا۔ اسی طرح مجھے موقع ملتا تو نائیک اور رامن ... کنور کا کانٹا نکالتا۔ مگر یہ سب موقع ملنے پر تھا۔

اگلے دن اوشا غیر متوقع آ گئی۔ بہ ظاہر وہ نئے تولیے لے کر آئی تھی۔ شاید راج کنور کی طرف سے اس پر پابندی ہٹا دی گئی تھی وہ اسی کا فائدہ اٹھا رہی تھی لیکن اس نے آتے ہی اشارہ کیا کہ اس کے پاس وقت کم ہے اور میں اس سے واش روم میں بات کروں۔ ہم واش روم میں آئے تو اس نے جان بوجھ کر میرے گلے سے لگ کر کان میں سرگوشی کی۔ "شہباز یہاں گڑبڑ ہے۔ محل میں نوکر کہہ رہے ہیں کہ بڑے کنور کو اس کے کمرے میں قید کر دیا ہے اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے دروازے پر راج کنور کے گورکھے نوکر ہیں۔ میں نے ایک بار جانا چاہا پر انہوں نے روک دیا میں نے صفائی کا بہانہ کیا تھا۔"

"اوشا راج کنور سازش کر رہا ہے اور وہ کامیاب رہا تو جانتی ہو کیا ہوگا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "وہ تجھے مار دے گا اور اسے اپنی جگہ بٹھا لے گا۔" اس کا اشارہ بانو کی طرف تھا۔ میں نے ... کر کہا۔

"سن اب تو بڑے کنور کی طرف نہیں جائے گی۔ وہ ... کہاں ہے؟"

وہ ذرا پیچھے ہٹی اور اپنے بلاؤز سے کاغذ نکالا وہ اس کے بدن کی گرمی اور نمی سے بھیگا ہوا تھا۔ میں نے اسے جیب میں ڈال لیا۔ "اوشا اب تو ایک کام اور کرے گی۔ کیا تو باورچی خانے میں جا سکتی ہے؟"

"ہاں جا سکتی ہوں۔"

"وہاں ایک پٹھان دل نواز خان ہے وہی ہمارے لیے کھانا تیار کرتا ہے۔"

"جانتی ہوں رے آگے بول۔"

"تجھے اس پر نظر رکھنی ہوگی۔ ہمیں پہلے بھی کھانے میں کوئی دوا دی گئی تھی جس سے ہم بے ہوش ہو گئے تھے۔ اب بھی شاید ایسا ہو۔"

"اگر ہمیں پتا چل جائے تو ہم کیا کریں؟"

"تم کسی بھی طرح مجھے خبردار کر دو گی۔" میں نے کہا۔ "اوشا مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر میں یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا تو تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ "سچ؟"

"ہاں کیونکہ تمہیں یہاں چھوڑا تو یہ سفاک لوگ تمہیں

نہیں چھوڑیں گے۔ تم میرا ساتھ دو گی تو میں تمہیں مرنے کے لیے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔"

وہ مزید خوش ہو کر مجھ سے مزید چپک گئی تھی۔ "اگر میں جان دے کر تجھے بچا سکتی ہوں تو جرور بچاؤں گی۔"

"اب تم جاؤ اگر زیادہ دیر یہاں رہیں تو ان لوگوں کو شک ہو سکتا ہے اور وہ تم پر پابندی لگا سکتے ہیں یا تم کو بھی کہیں قید کر دیں گے اور تم کچھ نہیں کر سکو گی۔"

"یہ تو ہے رے۔" اس نے بے دلی سے کہا اور بادلِ ناخواستہ مجھ سے الگ ہوئی۔ مجھے خیال آیا اور میں نے پوچھا۔

"باہر پہرے پر کون ہے؟"

"رامن ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔ "اس کے ساتھ ایک گورکھا ہوتا ہے۔"

"رامن دن رات تو نگرانی نہیں کر سکتا ہے رات کے وقت کون ہوتا ہے۔"

"پتا نہیں رات کو ہم ادھر آئے نہیں۔"

"آج رات آنے کی کوشش کرنا اور پھر دیکھنا کہ یہاں کون ہوتا ہے؟"

بانو اپنے کمرے میں تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ "ایسا لگ رہا ہے وہ وقت قریب ہے جب راج کنور ہمارے خلاف حرکت میں آئے گا۔ بڑا کنور تقریباً قید تنہائی میں ہے۔"

"اگر یہ اس پر قابو پا چکے ہیں تو ہمارے خلاف اتنے سکون سے کیوں بیٹھے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کچھ معاملات ہیں جو ابھی راج کنور دیکھ رہا ہو گا۔ جاگیر اور دوسرے کئی معاملات ہو سکتے ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ بڑے کنور سے ملکیت منتقل کرانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ بڑے کنور کو راستے سے ہٹانے سے پہلے یہ ضروری ہو گا۔ بہرحال راج کنور ہمیں بھولا نہیں ہو گا وہ بے تابی سے ہمارے خلاف کچھ کرنا چاہ رہا ہو گا۔"

"تب ہمیں بہت ہوشیار رہنا ہو گا۔" اس نے کہا۔ میں نے تائید کی اور بڑے کنور کے لیے لکھا ہوا کاغذ بھی اس کے حوالے کر دیا کہ وہ دوسرے کاغذات کے ساتھ اسے بھی جلا دے۔ میرے اندر ایک مسلسل بے چین کرنے والی کیفیت موجود تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ جلد کچھ وقوع پذیر ہونے والا ہے۔ رات کا کھانا خلاف توقع دل نواز خان کے بجائے ایک اور ملازم لایا۔ وہ شکل و صورت سے کسی قبیلے کا لگ رہا تھا۔ اس نے طریقے سلیقے سے کھانا میز پر لگایا اور چلا گیا۔ حسب معمول پہلے بانو نے کھایا۔ میں دیکھ رہا تھا اس نے بیس منٹ میں کھانا ختم کر لیا تھا اور سر کے اشارے سے او کے کہا۔ لیکن میں نے کچھ دیر اور انتظار کرنے کا سوچا۔ بعض خواب آور دوائیں دیر سے اثر کرتی ہیں۔ بانو اٹھی تھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھی کہ رک کر اس نے سر تھام لیا اور پریشان نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں تیزی سے اس کے پاس آیا۔

"کیا ہوا؟"

"سر چکرا رہا ہے اور دل گھٹ رہا ہے۔"

میں اسے بازو سے تھام کر واش روم میں لایا اور شاور چلا دیا۔ "الٹی کر دو، جلدی....."

اس نے کموڈ پر جھکتے ہوئے کوشش کی۔ پھر بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "نہیں ہو رہی ہے۔"

"پلیز کوشش کرو ورنہ دوا تمہیں بے ہوش کر دے گی۔"

اس نے حلق میں انگلیاں ڈالیں اور پھر کوشش کی۔ بار بار اسے ابکائی آ گئی۔ کوشش کر کے اس نے کھایا پیا نکال دیا تھا۔ اگرچہ وہ ساری خوراک نکال نہیں سکی تھی لیکن کھانے کا بڑا حصہ باہر آ گیا اور اس کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی تھی۔ پھر اس نے منہ دھویا۔ وقت کم تھا ہم باہر آئے۔ میں نے دل پر جبر کر کے کھانے کا اتنا حصہ ضائع کیا جتنا ممکن تھا تاکہ آنے والوں کو شک نہ ہو۔ ہمارے برتنوں میں کچھ کھانا موجود تھا۔ پھر میں اور بانو اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے اشارے سے کہا کہ وہ یوں ظاہر کرے جیسے نیند آ رہی ہے۔ اس نے بلند آواز سے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "آج اتنی جلدی نیند آنے لگی ہے۔"

"ہاں مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "کہیں ان لوگوں نے پھر کھانے میں کچھ ملا تو نہیں دیا ہے۔"

"ہاں شاید....." بانو بولی۔ میں نے اشارے سے اسے ساکت ہو جانے کو کہا۔ اس کی آنکھیں بچ بچ بند ہو رہی تھیں اور مجھے خدشہ تھا کہ وہ سو ہی نہ جائے۔ وہ خود بھی یہ بات محسوس کر رہی تھی اس لیے جاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بار بار اپنی انگلی دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ خود کو تکلیف دے کر وہ اپنے اوپر چھاتی غنودگی کو بھگا رہی تھی۔ کھانے سے پہلے مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن یہ جان کر بھوک اڑ گئی کہ کھانے میں خواب آور دوا موجود ہے۔ میں نے اٹھ کر دروازے سے کان لگا کر سن گن لی لیکن باہر مکمل سناٹا تھا۔ بانو نے میری طرف دیکھا اور اشارے سے کہا کہ وہ نیند بھگانے کے لیے ورزش کرنا چاہتی ہے۔ میں نے سر ہلا کر اجازت دی تو اس نے اٹھ کر اسکیپنگ شروع کر دی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ جیسے ہی باہر کوئی آہٹ ہو وہ واپس اپنی نشست پر آ کر سوتی بن جائے۔ میں جسم ڈھیلا چھوڑ کر صوفے پر ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ تقریباً نصف گھنٹا گزر گیا۔ میرے حساب سے اب تک انہیں آ جانا چاہیے تھا۔ مگر کوئی نہیں آیا تھا۔ بانو نیند بھگانے کے لیے وقفے وقفے سے ورزش کر رہی تھی۔ اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا۔ بانو صوفے سے دور تھی اور اس کے پاس موقع نہیں تھا۔ اس نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور نیچے قالین پر گر گئی اور وہیں ساکت ہو گئی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور نیند کے انداز میں گہرے لیکن سست سانس لینے لگا۔ آنے والے دو تھے اور میں نے رامن کی منحوس آواز سنی۔

"گئے دونوں؟"

"ہائے کیسی سندر ہے، انوپم ناری ہے۔" نائیک نے للچائے انداز میں کہا۔ "کیسی بھری بھری ہو رہی ہے۔"

رامن کو اس کا تبصرہ ناگوار گزرا۔ "زیادہ کوئی بننے کی اوشکتا (ضرورت) نہیں ہے۔ اسے راج جی کے بیڈ روم میں پہنچانا ہے۔"

"جرور۔" نائیک ہنسا۔ "اس کے بعد تو ہمیں ہی ملے گی۔"

ان دونوں کی بکواس سن کر میرا خون کھولنے لگا تھا نہ جانے بانو کا کیا حال تھا لیکن غنیمت رہا کہ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ نائیک میری طرف آیا۔ اس نے بکواس جاری رکھی تھی لیکن اس کا رخ بدل گیا تھا اب وہ مجھے گالیاں دیتے ہوئے بڑکیں مار رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ رامن نے پھر ٹوکا۔ "جب موقع تھا تب تو کچھ کر نہیں سکے۔"

نائیک کھسیا گیا۔ "اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"ٹھیک نہیں تھی یا اس نے ٹھیک کر دی تھی۔" رامن نے طنز کیا۔

"اب میں اسے بتاؤں گا۔" نائیک نے مشتعل ہو کر میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ میں ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا اس لیے بے ہوش آدمی کا سا ردعمل دیا۔ میرا سر بے جان انداز میں گھوم گیا۔ ان دونوں کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ رامن نائیک سے برتر حیثیت رکھتا تھا کیونکہ نائیک اس سے دب کر بات کر رہا تھا اور وہ اسے ذلیل کیے جا رہا تھا۔ اگر وہ اس کے مساوی ہوتا تو نائیک یقیناً اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ وہ بات برداشت کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ رامن نے پھر اسے ٹوکا۔

"زور بعد میں دکھانا ابھی تو اسے اس کے اصل ٹھکانے پر لے جاؤ۔"

"میں اسے راج جی کے کتوں کو کھلاؤں گا۔" نائیک کتے کی طرح بھونکا اور اس نے مجھے کھینچ کر صوفے سے نیچے گرا دیا۔ "اس وزنی لاش کو میں اکیلے کیسے لے جاؤں گا۔"

"تب کسی کو بلا لو۔" رامن نے بے پروائی سے کہا اور بانو کو اٹھا کر شانے پر ڈال لیا۔ کروٹ کے بل گرنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا تھا کہ میں آنکھوں میں جھری پیدا کر کے دیکھ سکتا تھا۔ رامن بانو کو لے کر چلا گیا اور نائیک میرے ساتھ وہاں رہ گیا تھا۔ رامن کے حکم کے باوجود اس کے دماغ سے کیڑا نکلا نہیں تھا اور جیسے ہی رامن بانو کو لے کر وہاں سے نکلا اس نے جلدی سے اندر سے دروازہ بند کیا اور تیزی سے میری طرف آیا۔ اس کے عزائم خطرناک لگ رہے تھے۔ اس نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک چھوٹا کھل جانے والا چاقو نکالا اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ابھی تجھے مجا آئے گا....." جملے کے آخر میں اس نے ایک گندی گالی دی اور میرے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پکڑی تھی کہ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہوتا میں نے سر سے ایک بھرپور ٹکر اس کی ناک پر رسید کیا۔ وہ یقیناً حلق پھاڑ کر چلانا چاہتا تھا لیکن گردن میری گرفت میں تھی، اس کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکل سکی تھی۔ دوسری ٹکر پر وہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ دروازہ وہ پہلے ہی اندر سے بند کر چکا تھا اس لیے اس کی فکر نہیں تھی کہ کوئی اندر آ جائے گا۔ میں نے چھوٹی رسی نکالتے ہوئے اس کے گلے میں ڈالی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی تلاشی لیتا رہا۔ لیکن اس بدبخت کے پاس سوائے اس چاقو کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے رسی اس طرح کھینچی ہوئی تھی کہ وہ سانس لیتا رہے لیکن اگر آواز نکالنے کی کوشش

کرے تو وہ اس کمرے سے باہر نہ جائے۔ اس لحاظ سے میں بے فکر تھا کہ جب تک نائیک خود کسی کو نہ بلاتا کوئی یہاں نہیں آتا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ ان دونوں کے ساتھ ہی آتا۔ اس کی تلاشی لے کر میں نے اسے جھٹکا دے کر قالین پر چت لٹایا اور اسی کا چاقو اس کی گردن سے لگایا تو اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ سمجھا میں اس کا گلا کاٹنے والا ہوں۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”شہباز جی مجھے نہ مارو۔“

”کیوں؟“ میں نے خونخوار سرگوشی کے ساتھ پوچھا۔ ”تم اس قابل ہو کہ تمہیں معاف کیا جائے؟“

اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ”میں نوکر ہوں جو مالک کہتے ہیں کرتا ہوں۔“

”اگر تم مالک کے کہنے پر عمل نہ کرو تو....؟“

”تو وہ مالک ہیں، مار ڈالیں گے۔“

”اب تمہارا آقا میں ہوں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو زندہ نہیں رہو گے۔“ میں نے اسے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔

وہ کھڑے ہوتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں بولا۔ ”مانوں گا جو تم کہو گے مانوں گا۔“

”باہر کون کون ہے؟“

”صرف ایک گورکھا ہے۔“

”اسے اندر بلاؤ۔“ میں نے اس کی گردن پر چاقو رکھتے ہوئے کہا۔ پھر مشین سے لوہے کا پائپ نکالا اور دروازے کے پاس نائیک کے ساتھ یوں کھڑا ہو گیا کہ آنے والا گورکھا مجھے فوراً نہ دیکھ سکے۔ صرف بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھ سکے۔ نائک نے آدھا دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کو کہا۔ عقب سے چاقو کی نوک نائیک کی گردن سے لگی تھی اور میں پوری طرح تیار تھا اگر وہ کوئی اشارہ کرتا یا آواز نکالتا تو میں بلا تکلف اس کی گردن کاٹ دیتا اور اس کے بعد جو ہوتا دیکھا جاتا۔ مگر نائیک کو اپنی جان پیاری تھی۔ اس نے کوئی اشارہ یا حرکت نہیں کی اور گورکھا اس کے حکم پر اندر آیا۔ میں نے دروازہ بند کیا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اس کا ہاتھ اپنے شانے پر موجود رائفل کی طرف گیا لیکن اس سے پہلے لوہے کا وزنی پائپ اس کے سر پر لگا، وہ چکرا کر نیچے گرا تھا۔ اس موقع پر نائیک نے چالاکی کی، وہ گورکھے کے زیادہ نزدیک تھا اس نے گورکھے کی گن اتارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا کرتہ پکڑ کر اسے پیچھے کھینچا اور قالین پر پھینک دیا۔ گورکھے کے سر پر ایک اور ضرب لگا کر اس کی بے ہوشی کو پکا کیا اور پھر اس کے شانے سے لٹکی خودکار رائفل اتار لی۔ یہ شاید بھارتی ساختہ کلاشنکوف رائفل کا کوئی ورژن تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے میں نے بھی یہ گن نہیں دیکھی تھی لیکن اس کے فنکشن تقریباً دوسری مروجہ خودکار رائفلوں جیسے تھے۔ میرے ہاتھ میں رائفل آتے ہی نائیک پھر شریف بن گیا تھا۔ گورکھے کے پاس اس کا ایک اضافی میگزین بھی تھا۔ اس کی نبض دیکھی۔ نبض سست تھی اور دو تین گھنٹے سے پہلے اس کے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

میں نے نائیک کی طرف دیکھا جو خوف زدہ لگ رہا تھا اس نے رعایت حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا تھا۔ ”اب بتاؤ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”تم بے ہوش نہیں ہوئے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ بانو کو کہاں لے گئے ہیں۔“

”راج جی کے بیڈ روم میں۔“

”راج کا بیڈ روم کہاں ہے؟“ میں نے اپنے اندر ابھرتے اشتعال کو دباتے ہوئے پوچھا۔

”اسی محل میں ہے۔“

میری نظروں نے نائیک کی ناک کو افسوسناک بنا دیا تھا لیکن وہ کتے کی دم اتنی آسانی سے سمجھنے والا شخص نہیں تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اچانک اس کے سر پر گھونسا مارا وہ کراہ کر زمین پر دراز ہوا تو میں نے اسے اوندھے منہ لٹا کر رسی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور منہ میں ایک چھوٹا تولیہ ٹھونس دیا۔ پھر میں نے چاقو کی نوک اس کی کلائی پر آزمائی تو وہ تڑپ گیا لیکن میں نے پروا کیے بغیر پہلے ایک ہاتھ اور پھر دوسرے ہاتھ پر چار پانچ انچ لمبے اور کوئی نصف انچ گہرے کٹ لگائے۔ میرا گھٹنا اس کی پشت سے لگا ہوا تھا اس لیے وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ بس تڑپ رہا تھا۔ میں نے جھک کر کہا۔ ”نائیک..... تم میرے کچھ سوالوں کا جواب دو گے۔ ہر غلط بیانی اور جواب سے انکار پر ایسے ہی ایک زخم کا اضافہ ہوتا رہے گا۔“

اس نے سر زمین پر پٹخ کر اقرار کیا۔ میں نے اسے آواز کے معاملے میں خبردار کرتے ہوئے کپڑا اس کے منہ سے نکال دیا۔ اس نے ناک سے رونے جیسی آواز نکالتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان کے لیے اب کچھ مت کرنا میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔“

”راج کا بیڈ روم کہاں ہے؟“

”یہاں سے کچھ دور ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں تمہیں لے چلتا ہوں۔“

”کتنی دور ہے اور کہاں کہاں سے گزرنا پڑے گا تفصیل سے بتاؤ۔ راستے میں دوسرے گارڈز اور کیمرے بھی ہوں گے۔“

”میں تمہیں ایسے راستے سے لے جاؤں گا جہاں کیمرے اور گارڈز نہیں ہوں گے۔“ وہ سسکتے ہوئے بولا۔ وہ چھوٹے دل کا آدمی تھا لیکن اس وقت تو بچوں سے بھی گیا گزرا ہو رہا تھا۔

”نائیک تم مجھے جانتے ہو اور میری پوزیشن بھی سمجھ رہے ہو۔ میرے لیے یہ آر یا پار والا معاملہ ہے یا تو میں بچ نکلوں گا یا یہیں مارا جاؤں گا۔ لیکن ایک بات یقینی ہے یہاں مارے جانے کی صورت میں مرنے والا میں اکیلا نہیں ہوں گا اس میں اور بھی لوگ شامل ہوں گے۔ ان میں سے ایک فرد کے بارے میں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے لہجے کو خوفناک بناتے ہوئے کہا۔

”کک..... کس کے بارے میں؟“ وہ ہکلایا۔

میں نے اسے گردن سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ ”تمہارے بارے میں..... تم مرنے والوں میں شامل ہو گے۔ اس لیے زندہ رہنا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ مرنے مارنے کی نوبت نہ آئے۔ میرا پلان بہت سادہ اور پرامن ہے میں راج کنور کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھیوں سمیت با حفاظت یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں جب کسی محفوظ جگہ پہنچ جاؤں گا تو راج کنور کو بھی چھوڑ دوں گا تم نے تعاون کیا تو ظاہر ہے تم زندہ رہو گے۔“

میں اسے امید دلا رہا تھا ورنہ اسے اپنی زندگی کے بارے میں زیادہ خدشات لاحق ہوتے تو وہ جان بچانے کی کوشش ضرور کرتا۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”تم مجھے چھوڑ دو گے؟“

”کیوں نہیں کیا مجھے تمہارا اچار ڈالنا ہے اور دوسرے میں تم لوگوں کی طرح نفسیاتی مریض نہیں ہوں جو بلا وجہ دوسروں سے بیر پال لوں۔ ٹھیک ہے تم لوگوں نے میرے خلاف سازش کی اور مجھے مارنے کی کوشش کی لیکن اگر تم اور راج کنور مجھ سے تعاون کریں تو میں دشمنی بھول جاؤں گا [illegible] صورت میں تمہیں [illegible] کر میں بھارتی پولیس کو اپنے پیچھے [illegible] نہیں کروں گا۔“

[illegible] نے رونا اور کراہنا بند کر دیا تھا۔ اس نے میری بات پر غور کیا اور سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں لے جاؤں گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر یہاں گولی چلی، مجھے یا راج جی کو نقصان ہوا تو پھر تم لوگوں کا نکلنا ناممکن ہو گا۔“

”فکر نہ کرو مجھے اپنی زندگی پیاری ہے لیکن میں کوئی چکر بازی برداشت نہیں کروں گا۔ اس لیے شرافت سے چلنا۔“

”اس حصے میں کیمرے اور گارڈز نہیں ہیں پر راج جی کی کھاس کھادمائیں ہیں۔“

میں سمجھ گیا وہ راج کنور کی حرم سرا کی بات کر رہا تھا وہاں کیمروں اور مرد گارڈز کی موجودگی ممکن نہیں تھی۔ لیکن وہاں تک جانے کے لیے بھی تو ہمیں محل کے دوسرے حصوں سے گزرنا پڑتا۔ یہ بات میں نے نائیک سے کہی۔ ”تم فکر مت کرو ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔“

نائیک کی کلائیاں اور آستین لہولہان ہو رہی تھیں پہلے اس نے واش روم میں سرد پانی سے اپنے زخم دھوئے اس سے خون رک گیا تھا۔ آستینیں خود دھل گئی تھیں۔ تکلیف سے اس کی کراہیں نکل رہی تھیں۔ میں نے لوہے کے دونوں پائپ ساتھ لے لیے تھے۔ انہیں عقب میں ٹراؤزر میں اڑس لیا۔ پہلے نائیک باہر نکلا اور میں اس کے بالکل پیچھے تھا۔ رائفل کی نال اس کی پشت سے لگی تھی اور میں نے اسے خبردار کر رکھا تھا کہ میری انگلی ٹریگر پر ہے اور کسی بھی غیر متوقع صورت حال میں اسے ترکھ رسید ہونے میں ایک لمحہ لگے گا۔ میں اس سے یوں لگ کر چل رہا تھا کہ کوئی دیکھتا تو اسے رائفل نظر نہ آتی۔ ویسے بھی یہ چھوٹے دستے والی گن تھی۔ کمرے کا دروازہ میں نے اندر سے لاک کر کے بند کیا تھا اب باہر سے کوئی اسے بغیر چابی کے نہیں کھول سکتا تھا۔ پہلے چابی گورکھے کے پاس تھی اور اب میری جیب میں تھی۔ پہلی راہداری میں نائیک بائیں طرف مڑ گیا۔ جب مجھے کلینک لے جاتے تھے تو دائیں طرف جاتے تھے۔ بڑے کنور کی رہائش گاہ بھی اسی سمت میں آتی تھی میں پہلی بار محل کے اس حصے میں جا رہا تھا اور یہ میرے لیے مکمل اجنبی تھا۔

مجھے اوشا کا خیال بھی آیا تھا میں نے اسے دل نواز خان کی نگرانی کرنے کو کہا تھا کہ وہ کھانے میں کچھ شامل کرے تو مجھے خبردار کر دے۔ شاید اسے موقع نہیں ملا تھا۔ پھر کھانا بھی کوئی اور لایا تھا اس لیے اوشا کو خبر بھی نہیں ہوئی ہو گی۔ ورنہ وہ لازمی مجھے خبردار کرتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود کسی مشکل میں پڑ گئی ہو۔ مگر فی الوقت میں اس کے

بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس جگہ پہلا موقع ملا تھا اور میں اسے ذرا سی غفلت سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ نائیک کو قبضے میں کر کے میں نے کوئی بہت بڑا کام نہیں کیا تھا۔ نائیک راج کنور کے کتنا ہی قریب سہی لیکن تھا تو ایک ملازم اور وہ اپنا مفاد و جان خطرے میں دیکھ کر بے دریغ اسے قربان کر دیتا۔ یہ بات نائیک بھی سمجھتا تھا اس لیے وہ پوری احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ کوئی موڑ مڑنے سے پہلے وہ جھانک کر دیکھتا تھا۔ ہم دو راہداریاں عبور کر چکے تھے اور اب تک کوئی فرد نظر نہیں آیا تھا۔ جہاں تک میں نے دیکھا تھا کوئی کیمرا بھی نظر نہیں آیا تھا، ہاں کوئی پوشیدہ کیمرا لگا ہو تو مجھے خبر نہیں تھی۔ نائیک ایک بڑے سے دروازے کے سامنے رکا۔ اس پر لکڑی کے کام سے نقاشی کے ایسے نمونے تیار کیے گئے تھے کہ بیان سے باہر تھے۔

”یہاں کیوں رکے ہو؟“ میں نے ممکنہ حد تک دھیمی آواز میں پوچھا۔

”یہی راج جی کا حصہ ہے۔“

جب دروازہ ایسا رنگین تھا تو اندر کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سرگوشی کی۔ ”راج جی کی اولاد، اندر کیسے جائیں گے؟“

”میں کھلواتا ہوں میں یہاں جا سکتا ہوں۔“ اس نے کہا اور ہاتھ بڑھایا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

”ایک منٹ ذرا ادھر آؤ۔“ میں اسے کھینچ کر راہداری کے ایک ایسے گوشے میں لے گیا جہاں نسبتاً تاریکی تھی۔ ”تم دروازہ کھلواؤ گے تو کھولے گا کون؟“

”چنبیلی کھولے گی۔“

”یہ چنبیلی کون ہے؟“

راج جی کی کھاس ملاجمہ ہے۔ وہ یہاں کی نگران بھی ہے۔“

”اور کتنی عورتیں ہیں۔“

”آٹھ ہیں۔“ نائیک نے ہونٹوں پر زبان پھیری ”راج جی نے پورے ہندوستان سے چن کر ہیرے جمع کیے ہیں۔“

میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ اگر آٹھ مرد ہوتے تو مجھے اتنا خطرہ نہ ہوتا لیکن آٹھ عورتوں کو خاموش کرانا دنیا کا دشوار ترین کام ہے ان میں سے کسی ایک پر بھی ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا تو میں ناکام ہو سکتا تھا۔ میرے لیے اہم ترین امر راج کنور پر قابو پانا تھا۔ وہ عیار آدمی اگر خطرہ بھانپ کر غائب ہو جاتا تو میں اور بانو یہاں پھنس کر رہ جاتے۔ پھر آزادی کے لیے ہمیں اپنی جان پر کھیلنا پڑتا۔ میں نے پوچھا۔ ”چنبیلی کے پاس اسلحہ ہوتا ہے؟“

”میں نے تو نہیں دیکھا۔“

”وہ لباس میں چھپا سکتی ہے۔“

نائیک پہلی بار مسکرایا۔ ”وہ اور دوسری عورتیں جو پہنتی ہیں اسے لباس نہیں کہا جا سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے دروازہ کھلواؤ اور یہ تمہارا کام ہو گا کہ چنبیلی کو قابو کرو۔“

”میں کیسے؟“ وہ بدکا۔

”مرد ہو ایک نازک عورت کو قابو نہیں کر سکتے۔“ میں نے اسے جھاڑا۔ ”گلا دبا دینا لیکن مارنا مت، بے ہوش کرنا۔“

اس نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ راج کنور کی خاص خادمہ پر ہاتھ اٹھانے کے خیال سے وہ ڈر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے سمجھایا کہ کام پوری طرح سے کرنا۔ کوئی کسر رہ گئی اور ہنگامہ ہوا تو سب سے پہلے وہ مارا جائے گا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ انداز مخصوص تھا فوراً ہی اندر سے ایک لوچ دار آواز آئی۔ ”کیا ہے نائیک؟“

”دروازہ کھول چنبیلی، راج جی سے ملنا ہے۔“

”راج جی تو اس وقت یم دوت سے بھی نہ ملیں۔“ چنبیلی معنی خیز انداز میں بولی۔ ”آج تو ان کی دل پسند ناری آئی ہے بیڈ روم میں۔“

”چنبیلی وقت ضائع مت کر، معاملہ بہت اہم ہے راج جی کو فوراً بتانا ہے۔“ اس بار نائیک نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اندر سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے نائیک کو آگے دھکیلا اور وہ چنبیلی کو عملاً رگڑتا ہوا اندر گیا تھا۔ چنبیلی نے ہلکی سی برہم آواز نکالی۔

”یوں کیوں گھسا آ رہا ہے۔“

مگر مجھے دیکھتے ہی اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی تھی۔ میں نے رائفل کا رخ ان دونوں کی طرف کیا اور نائیک سے بولا۔ ”اپنا کام کرو۔“

جواب میں نائیک نے لپک کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ یہ راہداری تھی جس کے دونوں طرف چار چار دروازے تھے اور ان میں یقیناً راج کا حرم مقیم تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا کہ وہاں اور کوئی عورت نہیں تھی۔ وہ یقیناً اپنے کمروں میں تھیں۔ آخری حصے میں ایک بند دروازہ تھا اور وہ شاید راج کنور کے بیڈ روم میں کھلتا تھا۔ چنبیلی کی زبانی سن کر کہ بانو راج کے بیڈ روم میں پہنچ گئی تھی میرے اندر پھر وہی آگ سر سرانے لگی تھی جو مجھے نتائج کی پروا کیے بغیر مرنے مارنے پر مجبور کرتی تھی۔ بانو کو مجھ سے جدا ہوئے آدھے گھنٹا ہونے کو آیا تھا اور یہ وقت کافی سے زیادہ تھا۔ میں دعا ہی کر سکتا تھا کہ اللہ نے اسے اور اس کی عزت کو محفوظ رکھا ہو۔ دروازہ بند کر کے میں نے نائیک اور چنبیلی کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ نائیک بہ آسانی اس حسین عورت پر قابو پا لے گا۔

وہ کسی قدر طویل قامت تھی اور نہایت متناسب جسم تھا۔ وہ عمر کے اس دور میں تھی جب عورت پر شباب اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ یعنی تیس بتیس سال کی تھی۔ اس نے ریشم جیسے کپڑے کا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ کپڑا اتنا ہلکا تھا کہ اس کی ٹانگیں جھلک رہی تھیں۔ اوپر اس سے بھی ہلکے کپڑے کا چھوٹا سا کرتہ پہن رکھا تھا جس کا گریبان بلا ضرورت تا حد نگاہ کشادہ تھا۔ بلا ضرورت یوں کہ اگر کرتے میں گریبان نہ ہوتا تب بھی سب نظر آ رہا تھا۔ مجھے نائیک سے اتفاق کرنا پڑا کہ اس ٹرانسپیرنٹ لباس میں اسلحہ چھپانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی ذاتی حشر سامانیاں کم نہیں تھیں مگر یہ اسلحہ موجودہ صورت حال میں بیکار تھا۔

لیکن اس وقت جو ہوا وہ میرے لیے غیر متوقع تھا۔ نائیک نے اس کا گلا دبوچا تھا۔ جواب میں اس نے اپنا گھٹنا نائیک کے زیر ناف رسید کیا۔ اس بدبخت نے فوراً اس کا گلا چھوڑ دیا۔ آزاد ہوتے ہی وہ سر جھکاتے ہوئے گھومی اور بلبلاتے ہوئے نائیک کے پہلے سے زخمی منہ پر مارا۔ ایک گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ نائیک اچھل کر پیچھے آیا اور اس کا ارادہ واویلا مچانے کا تھا۔ میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں نے عقب سے اپنے بائیں بازو کی کہنی اس کی گردن پر ماری اور وہ بنا کوئی آواز نکالے... نیچے ڈھیر ہو گیا۔ دبیز قالین کی وجہ سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اس ایک وار نے بتا دیا تھا کہ چنبیلی لڑنے بھڑنے میں مہارت رکھتی تھی حالانکہ دیکھنے میں وہ قطعی بے ضرر اور عام سی عورت نظر آتی تھی۔ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ”آواز نہ نکالنا اور نہ حرکت کرنا ورنہ یہ تم سے زیادہ [illegible] ہے۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“ اس نے سکون سے پوچھا۔ وہ بالکل بھی ہراساں نہیں لگ رہی تھی۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ نائیک جیسے نامردوں کے مقابلے وہ کہیں زیادہ حوصلے والی تھی۔

”میری ساتھی راج کنور کے بیڈ روم میں ہے۔ میں اس کی واپسی چاہتا ہوں۔“

”اب تو دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”راج جی اپنا کام کر چکے ہوں گے۔“

”اس صورت میں مجھے راج سمیت تم سب کی جان چاہیے۔“ میں نے رائفل بلند کی۔ ”آگے چلو اور دونوں ہاتھ اوپر کر لو۔“

اس نے ہاتھ اوپر کیے اور بولی۔ ”لو کر لیے۔“

”تم راج کنور کی خاص خادمہ ہو اور پھر عورت ہو کسی بھی وقت اس کے بیڈ روم میں جا سکتی ہو۔“

”ہاں میں کسی وقت بھی جا سکتی ہوں۔“

”تب چلو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”راج جی بعد میں مجھے معاف نہیں کریں گے۔“

”کسی کو معاف کرنے یا نہ کرنے کا مرحلہ بعد میں آئے گا۔ ابھی تو یہ فیصلہ ہونا ہے کہ میں اسے معاف کروں گا یا اس نے اپنے لیے معافی کا ہر دروازہ بند کر لیا ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ فکر مند نظر آنے لگی۔ میں نے پھر کہا۔ ”میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ یہ دروازہ کھولنا کوئی مسئلہ نہیں ہے ایک برسٹ اسے کھولنے کو کافی ہو گا۔ ایک..... دو..... تین۔“

”اوکے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں تیار ہوں لیکن دروازہ کھلے گا یا نہیں میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ راج جی انکار کر دیں گے تو میں مجبور نہیں کر سکوں گی۔“

”تم فکر مت کرو پہلے دستک تو دو۔ دروازہ کھولنے کے اور بھی طریقے مجھے آتے ہیں۔“

وہ متوالی چال چلتے ہوئے دروازے تک پہنچی۔ اس نے مخصوص انداز میں دستک دی لیکن کچھ کہا نہیں۔ اندر سے جواب نہیں ملا تھا۔ ایک منٹ بعد اس نے پھر دستک دی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”اگر تم کوئی غلط اشارہ دے رہی ہو تو یہ اصل میں یم دوت (موت کے فرشتے) کے لیے ہو گا۔“

دوسری بار جواب نہ ملنے پر اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی۔ ”ایسا کبھی نہیں ہوا، راج جی جواب ضرور دیتے

ہیں۔"

"فرض کرو وہ جواب دینے کے قابل نہ ہوں۔"

وہ چونکی۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس نے جس ناری کو تر نوالہ سمجھ کر یہاں بلوایا ہے وہ تم سے کم نہیں ہے۔"

"کیا اس نے راج جی کے ساتھ کچھ کیا ہے؟"

میں چنبیلی کی طرف سے ہوشیار تھا اور ایک فاصلہ رکھے ہوئے تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ "بالکل اب تم عام انداز میں دستک دو اور آواز سے بولو کہ اندر جو ہے وہ دروازہ کھول دے۔"

چنبیلی ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن جب میں نے رائفل کی نال اس کی طرف کی تو مجبوراً اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے زور سے دروازہ بجایا اور بلند آواز سے بولی۔ "اندر جو ہے دروازہ کھول دے۔"

اس کے فوراً بعد میں نے کسی قدر اونچی آواز میں کہا۔ "بانو یہ میں ہوں۔ کیا تم اندر ہو؟"

میری آواز پر ردعمل ہوا اور اندر سے ایک ہلکی سی آواز آئی۔ "شہباز یہ آپ ہیں؟"

"ہاں میں ہوں۔" میں نے زیادہ بلند آواز سے کہا۔

یقیناً کمرا ساؤنڈ پروف نوعیت کا تھا اور دروازے کے پاس پہنچ کر بلند آواز سے بولنے سے بھی مشکل سے اندر سنائی دے رہی تھی۔ بانو کی آواز سن کر میں نے نہ جانے کتنی دیر بعد سکون کا سانس لیا تھا۔ بہ ظاہر میں اوپر سے پرسکون تھا لیکن اندر سے تشویش سے برا حال تھا۔ بانو کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ آزاد ہے۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی صورت نظر آئی اور مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر آنے لگی۔ چنبیلی اسی لمحے کی منتظر تھی اس کے قریب آتے اس نے بلا تکلف بانو کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ بانو کی رفتار کی وجہ سے قوت دہری ہو گئی تھی۔ بانو کے لیے یہ وار غیر متوقع تھا وہ کراہ کر جھکی تو چنبیلی نے مہارت سے اس کے بال پکڑتے ہوئے اسے گھمایا اور اپنے سامنے کر لیا۔ اس نے بانو کی گردن دائیں بازو سے کس لی اور بایاں ہاتھ اس کی دائیں کنپٹی پر جما دیا۔ ساتھ ہی اپنے پاؤں بانو کے پیروں میں اس طرح پھنسائے کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ اس نے اتنی تیزی سے کیا کہ میں کچھ کر ہی نہیں سکا تھا۔ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "بس اتنی سورما ہے یہ؟"

"چھوڑ دو اسے ورنہ میں گولی مار دوں گا۔"

"مار دو پہلے یہ مرے گی۔"

وہ دھمکی نہیں دے رہی تھی چنبیلی نے بانو کو اس طرح جکڑا تھا کہ وہ اس کی گردن توڑ سکتی تھی اور یہ پیشہ ورانہ تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ راج کنور کے حرم سرا کی نگران اتنی ماہر لڑاکا نکلے گی۔ بانو خود کو چھڑانے کے لیے زور لگا رہی تھی مگر یہ طاقت کا نہیں بلکہ مہارت کا کھیل تھا اور مہارت میں وہ چنبیلی سے کوسوں پیچھے نظر آ رہی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اتنی کوشش کے بعد میں ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ تم بانو کو چھوڑ دو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" میں کہتے ہوئے ایک قدم آگے آیا تو وہ بانو کو لیے ایک قدم پیچھے ہٹی اور دروازے میں داخل ہو گئی۔ لیکن وہ اسے بند نہیں کر سکتی تھی اس کے لیے اسے بانو کو چھوڑنا پڑتا۔ میں مزید آگے بڑھا اور وہ اسی طرح پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ کمرے میں آتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا۔

یہ شاہانہ قسم کا کمرا تھا۔ جس میں نہ صرف عیش و عشرت کے تمام لوازمات فراہم کیے گئے تھے بلکہ رنگین لمحوں کو دو آتشہ کرنے کے لیے تمام انتظامات بھی موجود تھے۔ کوئی شریف عورت اس کمرے میں ایک لمحے کے لیے بھی سر اٹھا کر نہیں رہ سکتی تھی۔ بانو اس حالت میں بھی گھبرائی ہوئی تھی اور نہ بالکل پرسکون تھی۔ راج کنور جہازی سائز گول بیڈ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ یہ بیڈ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا جب بانو کو بے ہوش کر کے اس پر ڈالا گیا تھا اور ایک کیمرا یہ منظر دکھا رہا تھا۔ چنبیلی نے ایک نظر اسے دیکھا۔ "کیا یہ مر گیا ہے؟"

"نہیں زندہ ہے حرکت تو کر رہا ہے۔"

ایک لمحے کو چنبیلی کی توجہ بیڈ کی طرف گئی اس کی گرفت بانو پر ذرا ڈھیلی پڑی تھی۔ بانو بھی صبر سے انتظار کر رہی تھی اور اب تک اس نے معمولی سی مزاحمت کی تھی اسی وجہ سے چنبیلی اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوئی۔ بانو نے اس کا سر تھامتے ہوئے خود کو پوری قوت سے آگے جھکایا۔ چنبیلی عملاً اس سے چمٹی ہوئی تھی مگر اس کا جسم اوپر اور آزاد تھا جس میں وہ گھوم کر سامنے قالین پر آ گری اور بانو اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ لیکن جب بانو نے اسے گھونسا مارنے کی کوشش کی تو اس نے نیچے پڑے پڑے دونوں پاؤں جوڑ کر بانو کے سینے پر مارے اور وہ اچھل کر پیچھے جا گری۔ اسی لمحے میرے پاؤں کی ٹھوکر چنبیلی کے سر پر لگی۔ اس نے آخری لمحے میں بچنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ گھوم کر گری دو...

...تھی کہ میں نے گن کی نال سے اس کا سر بجایا اور اس ... سکون سے لیٹ گئی۔ میں نے بغیر کسی رعایت کے وار ... کیا تھا وہ نہایت خطرناک ثابت ہو رہی تھی اور اسے عورت ... ہونے کی رعایت دینا آخری غلطی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ بے ... ہو گئی تھی پھر بھی میں نے نبض دیکھی۔ اس کی طرف سے اطمینان کر کے بانو کے پاس آیا وہ اٹھ گئی تھی۔

"کیسی ہو تم؟ اسے تم نے قابو کیا ہے؟" میں نے راج کی طرف دیکھا۔ وہ تکلیف میں تھی لیکن میرے سوال پر فخر سے مسکرائی۔

"ایک منٹ لگا تھا، میں نے اسے آواز نکالنے کا یا کسی کو مدد کے لیے بلانے کا موقع نہیں دیا۔"

بانو کو یہاں پہنچاتے وقت راستے میں رامن نے کئی بار اس کے صبر کا امتحان لیا لیکن وہ خود پر ضبط کر کے بے ہوش بنی رہی۔ رامن اسے یہاں ڈال کر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی راج کنور آ گیا۔ جیسے ہی نزدیک آیا۔ بانو نے لیٹے لیٹے اس کے حلق پر لات ماری۔ وار کی شدت ہلکی رکھی تھی کہ گردن نہ ٹوٹ جائے مگر اس کی آواز بند ہو جائے۔ وہ کامیاب رہی۔ راج کنور نیچے جا گرا اور سانس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ بانو نے اٹھ کر اس کی گردن پر ہاتھ مارا۔ تیسرے وار پر وہ بے ہوش ہو گیا تھا اس کی بیہوشی کو یقینی بنانے کے لیے بانو نے اس کی کنپٹی پر کئی گھونسے بھی رسید کیے تھے۔ پھر اسے کھینچ کر بیڈ پر ڈال دیا۔ اس نے جوش و خروش سے یہ سارا منظر نامہ بیان کیا۔ میں اسے داد دیتا رہا پھر میں نے بے اختیار اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"تم نے کمال کر دیا۔"

"اس کے بعد میں انتظار کرنے لگی آپ نے کہا تھا کہ آپ آئیں گے۔"

"فرض کرو میں نہ آتا۔"

"تب میں راج کنور کے ہوش میں آنے کے بعد اس کی مدد سے آپ کو تلاش کرا کے یہاں بلوا لیتی۔ میں اس کا ... دیکھ چکی ہوں اسے آسانی سے قابو کر سکتی ہوں۔ لیکن یہ ... ہے؟"

"یہ راج کنور کے حرم سرا کی انچارج ہے اور میرا خیال ہے یہ مارشل آرٹ کی ماہر ہے اس نے نائیک کو بھی ..."

بانو نے غور سے اسے دیکھا۔ "دیکھنے میں تو عام سی لگتی ..."

"مارشل آرٹ کے ماہر عام طور سے ہلکے اور عام سے جسم کے مالک ہوتے ہیں۔"

"آپ یہاں کیسے آئے؟" بانو نے آس پاس کے ماحول کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایک منٹ تم یہاں رکو میں ذرا نائیک کو لے آؤں وہ باہر پڑا ہوا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو شور مچ جائے گا۔"

لیکن جب میں باہر آیا تو نائیک اپنی جگہ سے غائب تھا اور یہاں سے نکلنے والا دروازہ جسے میں نے اندر سے بند کیا ہوا تھا اب کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے واپس آیا۔ "وہ خبیث غائب ہے اس کا مطلب ہے سارے محل کو علم ہو جائے گا۔"

ہم نے اندر سے دروازے بند کیے اور پورے کمرے کا معائنہ کیا کہ اس میں آمد و رفت کا کوئی اور راستہ تو نہیں ہے۔ لیکن وہاں کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ایک شاہانہ قسم کا واش روم تھا جس میں جہازی سائز باتھ ٹب بھی تھا۔ لیکن اس سے بھی نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔ "یہ بات یقینی ہے کہ راج کنور کے محافظ اس کمرے کے باہر جمع ہو رہے ہوں گے۔ انہیں اندر آنے سے روکنا ہوگا۔"

"دروازے اندر سے بند ہیں۔"

"انہیں کھولا جا سکتا ہے۔ گولی مار کر یا کسی اور طریقے سے، وہ اندر گیس بھی چھوڑ سکتے ہیں۔"

"گیس۔" وہ پریشان ہو گئی۔

"راج کو چھڑانے کے لیے وہ سارے حربے استعمال کریں گے۔ اس لیے اس کا جلد ہوش میں آنا ضروری ہے۔" میں نے راج کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی کنپٹی پر ہلکی سی سوجن تھی اور نبض بھی سست تھی۔ میرا خیال تھا کہ راج کے اس عشرت کدے میں کہیں ہتھیار بھی چھپے ہوں گے۔ لیکن تلاش بسیار کے بعد ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ یہاں عورتیں اور لڑکیاں زبردستی بھی لائی جاتی ہوں گی۔ اگر ان کے ہاتھ ہتھیار لگ جاتا تو راج کنور مارا جاتا۔ اس لیے یہاں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ بانو نے دیواروں پر لگی تمام واہیات تصاویر اتار اتار کر ایک طرف ڈھیر کرنا شروع کر دیں۔ ایک تصویر اتاری تو اس کے پیچھے چھپا ہوا سیف سامنے آ گیا۔ اس دوران میں میں نے ایک دراز میں رکھی سوتی رسی برآمد کی اور اس سے چنبیلی کے ہاتھ پشت پر کر کے باندھ دیئے۔ دونوں پاؤں باندھے اور پھر ان کو کھینچ کر ہاتھوں کی رسی سے

ملا دیا۔ اب اس کے پاؤں پیچھے کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور کمر کمان ہو رہی تھی۔ بانو نے دل چسپی سے دیکھا۔

"یہ کیا کررہے ہیں؟"

"اسے بے بس کررہا ہوں۔"

ان سب کاموں سے فارغ ہو کر میں نے سیف کا معائنہ کیا۔ یہ جدید ترین سیف تھا جو بیک وقت نمبروں اور فنگر پرنٹ کی مدد سے کھلتا تھا۔ ایک چیز بھی کم ہو تو سیف نہ کھلتا۔ سیف میں کیا تھا یہ تو راج کے ہوش میں آنے کے بعد پتا چلتا۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ میں نے چنبیلی کو جس طرح باندھا تھا وہ تکلیف سے جلد ہوش میں آ گئی۔ اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "کھولو مجھے۔"

"آرام سے لیٹی رہو اور اوپر والے کا شکر ادا کرو کہ ابھی تک زندہ ہو۔"

"تم لوگ بیکار کوشش کررہے ہو یہاں سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔"

"جلد تم اس ناممکن کو ممکن ہوتے دیکھو گی۔"

بانو نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا اس نے تصاویر اتار دی تھیں اور مجسمے گرا دیے تھے۔ اب ماحول کسی قدر بہتر لگ رہا تھا۔ چنبیلی نے سر گھما کر دیکھا اور تمسخرانہ انداز میں بولی۔ "یہ کیا کررہی ہے؟"

"وہی جو ہر شریف لڑکی کو کرنا ہے۔ تم شریف نہیں ہو اس لیے یہ بات نہیں سمجھو گی۔"

"راج بے ہوش ہے؟"

"ہاں لیکن بے ہوش ہونے سے اس کی عزت میں کوئی کمی آئی ہے جو تم اسے اس طرح پکار رہی ہو۔"

"میں نے کبھی اس کی عزت نہیں کی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "میں ہمیشہ اس سے نفرت کرتی رہی ہوں۔"

"اور اس کی نوکری بھی کرتی رہی ہو۔" میں ہنسا۔ "ویسے میرا اندازہ ہے تم نے اپنی نوکری کا آغاز اسی بیڈ روم سے کیا ہوگا۔"

"ہاں۔" وہ لڑھک کر پہلو کے بل لیٹ گئی اس کے موجودہ لباس میں یہ پوز نہایت سنسنی خیز تھا اور وہ عملاً جامے سے باہر ہو رہی تھی۔

"اس لیے تم اس سے نفرت کرتی ہو؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "نفرت کی وجہ کچھ اور ہے وہ میں تمہیں یا کسی کو نہیں بتا سکتی۔"

"ٹھیک ہے میں مان لیتا ہوں تم اس سے نفرت کرتی ہو۔ تب یہاں کیوں ہو، چلی جاتیں کہیں اور یا راج کنور کا کام تمام کردیتیں۔"

"یہ دونوں کام ممکن نہیں ہیں۔"

"تب بہتر ہوگا اپنی بکواس بند کرو۔"

"مجھے کھولو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔"

"تھوڑی تکلیف برداشت کرلو۔"

"مجھے کھولو ورنہ میں چیخنے لگوں گی۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ اس شاطر عورت نے بھانپ لیا تھا کہ میں عورت سے بلاوجہ سخت سلوک نہیں کرسکتا تھا اس لیے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہی تھی۔

"شوق سے۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور راج کنور کی طرف بڑھا۔ بیڈ کی تلاشی لیتے ہوئے ہم نے اسے الٹ پلٹ دیا تھا۔ چنبیلی سچ مچ چلانے لگی۔ میں نے ریشمی بیڈ شیٹ کا ایک ٹکڑا چاقو سے کاٹا اور واپس آ کر اسے چنبیلی کے منہ میں ٹھونس دیا۔ بانو خوش ہو کر بولی۔

"یہ ٹھیک کیا اس کے ساتھ۔"

میں نے کھانا نہیں کھایا تھا اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ وہاں ایک طرف میز پر بے شمار پھل سجے ہوئے تھے۔ انہیں واش روم میں دھویا اور ان سے پیٹ پوجا کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بانو بھی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے جو کھایا تھا وہ الٹی کر کے نکال دیا تھا۔ اسے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ اس دوران میں میں نے اسے اپنی روداد سنائی۔ اس نے کہا۔ "نائیک نے سب کو خبردار کردیا ہوگا۔"

"لازمی بات ہے۔ ویسے یہ کام تو بعد میں بھی ہوتا۔ اگر راج سے بات کرنے کا موقع مل جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بہرحال اب بھی بازی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ شکار ہمارے نرغے میں ہے۔"

گفتگو کے دوران میں راج پر نظر رکھے ہوئے تھا اور وقفے وقفے سے چنبیلی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرت انگیز عورت ثابت ہوئی تھی اور کوئی بھروسا نہیں تھا کہ خود کو آزاد کرا لیتی۔ ایک بار اس نے کوشش کر کے اس طرح کروٹ لی کہ اس کا رخ ہماری طرف ہو گیا تھا۔ اس سے ایک تو اس کے ہاتھ پاؤں چھپ گئے تھے اور دوسرے سامنے سے اس کا جسم بہت نمایاں ہو رہا تھا اس لیے بانو نے دوبارہ اسے الٹ دیا۔ وہ ناک سے غوں غاں کر کے اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ جواب میں بانو نے آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا۔ ظاہر ہے اس نے بھی ناگفتنی سنائی ہوگی۔ جب اس نے بانو پر ہاتھ اٹھایا تھا وہ اس سے تپی ہوئی تھی۔ پیٹ بھر کر میں نے خود کو آسودہ محسوس کیا تھا اور میرے خیال میں اب حرکت میں آ جانا چاہیے تھا۔ البتہ مجھے باہر والوں کی خاموشی پر حیرت تھی۔ کیا وہ کسی چکر میں تھے؟

"راج کو ہوش میں لانا ہوگا۔" میں نے کہا اور وہاں موجود فریج سے یخ بستہ پانی کی بوتل نکالی اور راج کے منہ پر الٹنے لگا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ بوتل ختم ہونے سے پہلے کسمسانے لگا تھا۔ پھر اس نے زیرلب گالی دی اور بڑبڑایا۔

"کیا بدتمیزی ہے.... نائیک کہاں مر گیا ہے؟"

"اٹھ جاؤ بیٹے ورنہ نائیک سے پہلے تم جہنم رسید ہو جاؤ گے۔" میں نے اسے تھپڑ مارا۔ دوسرے تھپڑ پر اس نے آنکھیں کھول دیں اور تیسرے تھپڑ پر اس کے حواس بحال ہو گئے تھے۔ اصل میں اس کے ہوش مجھے دیکھ کر ٹھکانے آئے تھے۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔

"شہباز تم....."

"نہیں یہ میرا بھوت ہے۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "بہتر ہوگا جلدی سے اپنے حواس بحال کر کیونکہ میں اور تم دونوں نہایت سنگین صورت حال سے دوچار ہیں۔"

وہ جھٹکے سے بستر پر اٹھ بیٹھا اور اپنا منہ صاف کیا۔ بانو کو دیکھ کر وہ چونکا اور پھر اس کی آنکھوں میں سفلی جذبات آئے تھے کہ میں نے گھما کر اس کے شانے پر لات رسید کی اور وہ بستر سے نیچے لڑھک گیا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور دوبارہ بیڈ پر دھکیل دیا۔ "اب تم نے بانو کو اس طرح دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گا۔"

میرے لہجے پر وہ لرز اٹھا۔ شاطر آدمی تھا اس نے فوراً پینترا بدلا۔ "ٹھیک ہے اب میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ لیکن تم میرے ساتھ ایسا سلوک مت کرو۔"

"تم اس سے بھی برے سلوک کے مستحق ہو لیکن فی الحال تمہیں کچھ نہیں کہوں گا ہاں تم خود بھی کوئی بے عزتی والا کام یا بات مت کرنا۔"

اس نے اس بار شرافت سے بانو کی طرف دیکھا۔ "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ چند دنوں میں اتنی تیز ہو جائے گی۔ یہ تو بالکل بدل گئی ہے۔"

"راج کنور یہ تمہیں موت کے گھاٹ بھی اتار سکتی ہے لیکن شکر کرو صرف بے ہوش کیا۔ کیونکہ ابھی ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔"

راج کنور کی نظر چنبیلی پر گئی پہلے وہ چونکا اور پھر اس کے چہرے پر مایوسی آ گئی تھی۔ "تم لوگوں نے اسے بھی قابو کرلیا ہے۔"

"ہاں، البتہ نائیک نکل گیا اور اس نے یقیناً تمہارے سارے کمانڈوز کو اس کمرے کے باہر جمع کرلیا ہوگا۔"

"نائیک بچ گیا۔" مایوسی کی جگہ فوراً امید نے لے لی۔

"ہاں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ کسی بھی احمقانہ حرکت کی صورت میں وہ صرف تمہاری لاش حاصل کرسکتے ہیں۔ انہیں کسی احمقانہ حرکت سے باز رکھنا تمہاری ذمے داری ہے۔ اس لیے انہیں حکم دو کہ اس کمرے سے دور رہیں اور کسی حرکت سے گریز کریں۔"

مولانا ثناء اللہ امرتسری

(1287ھ/1868ء۔ 1368ھ/15 مارچ 1948ء)

مفسر، مُناظر اور عالم دین۔ ابوالوفا کنیت، والد کا نام خضر تھا۔ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کشمیر تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب کشمیر کے نومسلم خاندان منٹو سے ملتا تھا۔ آپ نے مولانا غلام رسول قاسمی، مولانا احمد اللہ امرتسری، مولانا احمد حسن کانپوری، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے علومِ دینیہ کی تحصیل کی۔ مسلک کے لحاظ سے اہلِ حدیث تھے چنانچہ اپنے مسلک کی ترویج کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔ اخبار اہلِ حدیث جاری کیا۔ فنِ مُناظرہ میں مشاق تھے۔ زندگی بھر آریہ سماج اور قادیانیوں سے معرکۃ الآراء مباحثے کیے اور دینِ اسلام اور ختمِ نبوت کی حقانیت ثابت کرتے رہے۔ تقسیمِ پاک و ہند کے بعد سرگودھا میں مقیم ہوئے۔ آخر عمر میں فالج ہو گیا اور اسی عارضے سے وفات پائی۔ آپ نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ عربی زبان میں قرآن کی تفسیر کا نام "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" ہے۔ اردو تفسیر کا نام "تفسیر ثنائی" ہے۔

مرسلہ: احمد ندیم، لاہور

”میں کہہ سکتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے باہر جانا ہو گا۔“ اس نے چالاکی سے کہا۔ لیکن میں ایک طرف موجود جدید قسم کے انٹرکام کو دیکھ چکا تھا اس کی مدد سے راج کنور پورے محل میں کسی سے بھی رابطہ کر سکتا تھا میں نے اس کا کورڈ لیس اٹھا کر اسے تھمایا۔

”اس کے ہوتے ہوئے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے آدمیوں سے رابطہ کرو اور جو کہا ہے وہی کرو۔“

اس نے مایوسی سے کورڈ لیس لیا اور اس پر ایک نمبر دبایا۔ میں نے رائفل کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ بادل ناخواستہ اس نے دوسری طرف کال ریسیو کرنے والے کو حکم دیا۔ ”رامن سے بات کراؤ.....رامن سب میرے کمرے سے دور چلے جائیں اور میرے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہ کریں۔“

جیسے ہی اس نے جملہ مکمل کیا میں نے اس سے کورڈ لیس لے کر اسے آف کر دیا۔ ”امید ہے اب تمہارے ساتھی کچھ دیر سکون سے بیٹھیں گے۔“

”تم یہاں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ تمہیں کنور پیلس کی سیکیورٹی کا اندازہ نہیں ہے۔“

”مجھے اندازہ ہے یا نہیں لیکن تمہیں ایک چیز کا اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ تمہاری سیکیورٹی مجھ سے منسلک ہے۔ اگر مجھے کوئی خطرہ ہوا تو وہ تم سے گزر کر مجھ تک آئے گا۔ اگر دنیا سے رخصتی کا وقت آیا تو امید یہی ہے تم مجھ سے پہلے وفات پاؤ گے۔“

بانو ذرا دور صوفے پر بیٹھی چنبیلی کی نگرانی کر رہی تھی۔ وہ میرے پاس آئی۔ ”اس سے دوسری عورتوں کا پوچھیں وہ کہاں ہیں اور چپ کیوں ہیں؟“

یہ سوال میرے ذہن میں بھی تھا لیکن دوسری چیزوں میں الجھ کر ذہن سے نکل گیا تھا۔ میں نے چنبیلی کے بجائے راج کنور سے پوچھ لیا۔ ”یہاں آٹھ عورتیں اور ہیں لیکن اس ہنگامے کے دوران کسی نے اپنے کمرے سے جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔“

اس نے بانو کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”انہیں سخت حکم ہے جب ان کی ڈیوٹی نہیں ہو گی وہ اپنے کمرے تک محدود رہیں گی اور باہر کچھ بھی ہو جائے وہ باہر نہیں آئیں گی۔“

میں نے تجسس سے پوچھا۔ ”یہ تمہاری ملازم ہیں یا تم نے انہیں زبردستی رکھا ہوا ہے؟“

”یہ چھ مہینے کے کنٹریکٹ پر آئی ہیں، چھ مہینے بعد ان کا معاوضہ دے کر واپس بھیج دیا جائے گا۔“

”سب واپس چلی جاتی ہیں؟“

”نہیں جو مجھے اچھی لگتی ہیں ان کو میں دوبارہ پیشکش کرتا ہوں۔“

اس عشرت کدے میں داخل ہونے کے دو دروازے تھے اور دونوں اندر سے بند تھے۔ کوئی کھڑکی نہیں تھی اور نہ ہی روشن دان دکھائی دے رہا تھا مگر یہاں گھٹن کے بجائے ایسی تازگی تھی جیسے ہم کھلی فضا میں سانس لے رہے ہوں۔ یقیناً یہاں وینٹی لیشن سسٹم کام کر رہا تھا۔ میں اور بانو ہر ممکن تلاشی لے چکے تھے لیکن ہمیں یہاں کوئی ہتھیار نہیں ملا تھا۔ مگر مجھے یقین تھا راج کنور نے کسی خفیہ جگہ ہتھیار چھپایا ہو گا۔ ”راج کنور یہاں تمہارے پاس جو ہتھیار ہے میرے حوالے کر دو۔“

”یہاں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“ اس نے فوراً انکار کیا۔

”سوچ لو بعد میں کوئی ہتھیار نکل آیا تو تمہیں اس جھوٹ کی سزا ملے گی۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں بلاوجہ اسے نہیں مار سکتا اور نہ تشدد کر سکتا ہوں وہ میری اس مجبوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”او کے فی الحال میں مان لیتا ہوں اگرچہ مجھے یقین نہیں ہے تمہاری بات کا۔ اس سیف میں کیا ہے؟“ میں نے دیوار میں لگے سیف کی طرف اشارہ کیا۔

”سیف میں کیا ہوتا ہے؟“ اس نے الٹا سوال کیا۔

”دولت، قیمتی اشیا اور قیمتی راز و دستاویزات۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسے کھولو۔“

”کیوں؟“ وہ بدکا۔

”میں دیکھنا چاہتا ہوں اس میں کیا ہے؟“

”اس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔“

”تم شاید میرے شریفانہ رویے سے دھوکا کھا رہے ہو۔ اگر تم نے ایک منٹ کے اندر سیف نہیں کھولا تو میں تمہارے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کاٹ دوں گا۔“

اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا میں نے نائیک کا چاقو نکال کر اسے کھولا۔ اس کا بلیڈ چھوٹا لیکن نہایت تیز دھار تھا۔ ایک منٹ پورا ہونے پر میں نے اسے بیڈ پر اوندھے منہ گرایا اور اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس نے مدافعت کی کوشش کی لیکن اس کا بظاہر صحت مند مگر عیاشی سے کھوکھلا ہونے والا جسم میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ تھام کر پشت پر کیا اور چاقو اس کی چھوٹی انگلی سے لگایا تھا کہ وہ تڑپ کر بولا۔ ”اچھا.....اچھا کھولتا ہوں، پلیز ایسا مت کرو۔“

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پشت سے اتر آیا۔ پھر اسے کھینچ کر بیڈ سے نیچے اتارا اور سیف کی طرف دھکا دیا۔ ”کھولو اسے لیکن کوئی چالاکی مت دکھانا جو تمہیں قبل از وقت مرحوم کر دے۔“

اس کی حالت بری ہو رہی تھی اور وہ کانپ رہا تھا۔ دوسروں کی زندگیوں اور جسموں سے خدا بن کر کھیلنے والوں کو میں نے اپنے حوالے سے اسی طرح بزدل پایا تھا۔ اس نے سیف کے سامنے پہنچ کر میری طرف دیکھا اور التجا آمیز لہجے میں بولا۔ ”شہباز اس میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔“

”یہ فیصلہ سیف کھلنے کے بعد میں خود کروں گا۔“ میں نے کہا اور اس سے دو قدم پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میرا زاویہ ایسا تھا کہ سیف کھلتے ہی اندر موجود چیزیں میری نظر میں آتیں۔ اس کا پورا امکان تھا کہ اندر کوئی ہتھیار ہوتا اور راج کنور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ بادل ناخواستہ اس نے پہلے سیف کے فنگر پرنٹ چیک کرنے والے حصے پر یکے بعد دیگرے اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے لگائے اور پھر ڈیجیٹل پیڈ پر ایک طویل نمبر ملایا۔ اسے زبانی یاد تھا اور ملانے کی ایسی مشق تھی کہ اس کی انگلیاں رقص کے انداز میں تھرک رہی تھیں۔ میں کوشش کے باوجود نمبر یاد نہ رکھ سکا۔ آخری نمبر ملتے ہی کلک کی آواز آئی۔ میں نے بانو کو سانس روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی سانس روک لی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایک خاص انداز سے سیف کھولنے پر اندر موجود بے ہوش کر دینے والی گیس خارج ہو جاتی اور مجھے پتا نہ چلتا۔ خود راج خاموشی سے سانس روک لیتا اور گیس سے محفوظ ہو جاتا۔ لیکن ایسی کوئی حفاظتی تدبیر اس سیف کے ساتھ منسلک نہیں تھی۔ راج بدستور گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس نے ہینڈل گھما کر سیف کا بھاری بھرکم دروازہ کھولا۔ میں نے گن تان لی تھی اور اسے حکم دیا۔

”راج بہت آہستہ سے حرکت کرنا۔“

سیف کا دروازہ کھلا اور اندر موجود چیزیں نظر آنے لگیں۔ اندر کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ البتہ دو الگ الگ خانوں میں تہ در تہ کرنسی نوٹوں کی گڈیاں اور سونے کی اینٹیں رکھی تھیں۔ یہ بہت بڑی دولت تھی۔ صرف نوٹوں کی گڈیاں ہی کئی سو کی تعداد میں تھیں۔ پورے سیف میں بس یہی دو چیزیں تھیں۔ کرنسی کی گڈیاں اس طرح رکھی تھیں کہ ان کی مالیت اور ملک سے تعلق کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ میں نے اسے حکم دیا۔

”اسے پورا کھولو۔“

اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ مگر اندر اور کچھ نہیں تھا۔ ”کرنسی کس ملک کی ہے۔“

”انڈین، ڈالرز اور یورو ہیں۔“ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اب اس کا یہ سوچ کر دم نکل رہا تھا کہ میں اس کی یہ دولت نہ ہتھیا لوں۔ حالانکہ اسے اپنی جان کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ میرا نقطۂ نظر اس سے بالکل الگ تھا۔ میں نے اگلا حکم دیا۔

”کرنسی اور سونا باہر نکالو۔“

اس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن میرے تاثرات دیکھ کر اس کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ وہ کرنسی نکال کر نیچے قالین پر ڈھیر کرنے لگا۔ بانو میرے پاس آئی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں یہاں سے نکلنے کی سوچیں۔“

”تم پریشان مت ہو جلد یہاں سے نکلیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم اپنا کام کرو چنبیلی پر نظر رکھو اور اگر یہ آزاد ہونے کی کوشش کرے تو بے دریغ اس پر پائپ استعمال کرنا۔“

میں نے دونوں پائپ بانو کے حوالے کر دیے تھے۔ اس سے بات کرتے ہوئے میں راج پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا کہ وہ کہیں چھپا ہوا ہتھیار نہ نکال لے۔ مگر اس سیف میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ کرنسی کے بعد اس نے اندر سے سونے کی اینٹیں نکال کر قالین پر رکھنا شروع کیں۔ یہ خاصی بڑے سائز کی اینٹ تھی میں نے راج سے ایک اینٹ لے کر دیکھا اس پر ٹو کے جی لکھا تھا۔ اندر ایسی پچاس سے زائد اینٹیں تھیں یعنی یہ سو کلوگرام سے زیادہ سونا تھا جس کی مالیت کروڑوں میں تھی۔ کرنسی اس سے کہیں زیادہ مالیت کی تھی کیونکہ نصف رقم ڈالرز اور یورو میں تھی۔ اب سیف خالی تھا اور اس میں کچھ نہیں رہا تھا۔ راج کنور نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور ڈوبتے لہجے میں بولا۔

”تم اس کا کیا کرو گے؟“

میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ”تم نے احمقانہ سوال کیا ہے تمہیں اصل میں یہ پوچھنا چاہیے کہ میں تمہارا کیا کروں گا۔“

مگر وہ مخصوص بنیاد ذہنیت رکھتا تھا اور صدمے سے اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ کرنسی اور سونے کو اسی طرح پڑے چھوڑ کر میں راج کنور کو ایک طرف لایا۔ اس نے التجا کی۔ ”مجھے کچھ پینے دو ورنہ شاید میرا ہارٹ فیل ہو جائے۔“

مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔ صدمے سے اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے پی لو لیکن ایک حد تک، مجھے تم سے بات کرنی ہے اور اس کے لیے تمہارا ہوش میں رہنا نہایت ضروری ہے۔“

اس نے برانڈی کی ایک بوتل سے اپنے لیے گلاس میں کچھ مقدار نکالی اور اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ وہ بلا نوش تھا ورنہ تقریباً چوتھائی گلاس یوں نہ پی جاتا۔ دوسری بار گلاس خالی کر کے اس کی حالت بہتر ہوئی تھی اور اس نے تیسری بار گلاس میں انڈیلنا چاہا تو میں نے اسے روک دیا۔ ”بس اتنا کافی ہے۔“

مجبوراً اس نے بوتل اور گلاس ریک پر رکھ کر حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ ”شہباز کیا چاہتے ہو تم؟“

”آسان الفاظ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ بڑے کنور کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ مت سمجھنا مجھے اس سے کوئی ہمدردی ہے۔ بلکہ ایک طرح سے میری جان چھوٹ رہی ہے۔“

”ان کی طبیعت خراب ہے اس لیے وہ ابھی کسی سے مل نہیں رہے۔“

”تم نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا کنور تمہاری قید میں ہے اور اس کا علاج روک دیا گیا ہے کیونکہ میرا خون نہیں لیا گیا اور نہ ہی مجھے اس سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ تم نے اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس جاگیر اور تمام دولت کا مالک بڑا کنور ہے؟“

اس سوال پر راج کنور کا چہرہ بگڑ گیا تھا اس نے نفرت سے کہا۔ ”یہ سچ ہے۔“

”اور تم اس کے دست نگر تھے۔ مگر تم اب نہیں ہو۔ اس نے سب تم پر چھوڑ رکھا ہے۔ تو اب ایسا کیا ہوا کہ تم بغاوت پر اتر آئے؟“

”ایسی بات نہیں ہے....“

”او کے نہ بتاؤ....“ میں بے پروائی سے کہا۔ ”میں بڑے کنور سے معلوم کر لوں گا۔“

وہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ بڑا کنور یہیں موجود ہے اور اب میں چاہوں تو اس سے یا کسی سے بھی مل سکتا ہوں۔“

اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اس نے جلدی سے کہا۔ ”سنو شہباز میں تمہیں اور اس لڑکی کو بہ حفاظت پاکستان واپس بھیج سکتا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”میرے پاس سرحد تک پرواز کا لائسنس اور ہیلی کاپٹر ہے۔ میرا پائلٹ ایک سابق انڈین ائرفورس آفیسر ہے وہ سرحد پر بعض ایسی جگہوں سے واقف ہے جہاں ریڈار کام نہیں کرتا ہے۔ وہ وہاں سے ہیلی کاپٹر لے جاتا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں ممتاز ہاؤس آیا تھا۔“

”بالکل یاد ہے۔“

”بس اسی طرح میں تمہیں بھی وہاں لے جا سکتا ہوں۔ اس میں صرف ایک گھنٹا لگے گا۔“

راج کنور کی پیشکش پرکشش تھی۔ ہیلی کاپٹر کی مدد سے ہم بہت کم وقت میں پاکستان جا سکتے تھے۔ لیکن راج کنور نے اچانک ہی مفاہمت کی بات کی تھی۔ یہ میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی آخر وہ کس لیے یوں تعاون پر از آیا تھا؟ میں نے محسوس کیا کہ جب میں نے بڑے کنور سے ملنے کی بات کی تو وہ کچھ بدحواس ہوا اور پھر جلدی سے یہ پیشکش کی۔ تو کیا وہ چاہتا تھا کہ میں بڑے کنور سے نہ ملوں۔ اس میں اس کا کوئی مفاد پوشیدہ تھا۔ حالانکہ ان بھائیوں کی آپس کی لڑائی سے میرا کیا مفاد وابستہ ہو سکتا تھا۔ مگر کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے اس معاملے میں دل چسپی لینی چاہیے یا نہیں۔ جیسے میرے حالات تھے اور میں بہ ظاہر آزاد ہونے کے باوجود مشکل حالات سے دوچار تھا۔ ذرا سی دیر میں بازی پلٹ سکتی تھی اور میں ایک بار پھر راج کنور جیسے شیطان صفت آدمی کا قیدی بن جاتا۔ میری تو خیر تھی کہ اس معاملے میں وسیع تجربہ رکھتا تھا لیکن بانو کے ساتھ کچھ ہوتا ہوا اور میرے سامنے ہو یہ میری برداشت سے باہر ہوتا۔ اس صورت میں راج کنور کی پیشکش مان لینا ہی مناسب تھا۔ مگر میں جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس کی پیشکش پر کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر مطالبہ کیا۔

”راج کنور، مجھے دو عدد پستول اور ایک شاٹ گن چاہیے۔“

”کیوں، تمہارے پاس یہ رائفل ہے تو۔“

”بحث مت کرو جب میں نے کہا ہے تو فوراً منگواؤ۔“

اس نے ایک بار پھر انٹرکام سے رابطہ کیا اور پھر میری طرف دیکھا۔ ”کس قسم کے ہتھیار چاہئیں؟“

”پستول غیر ملکی ہوں، بریٹا یا وِلسن اینڈ اسمتھ اور شاٹ گن ری پیٹر ہو، ان سب کی اضافی گولیاں اور ہاں اس رائفل کے دو میگزین اور منگواؤ۔“

راج کنور نے یہ تمام چیزیں نوٹ کرا دیں تو میں نے اس سے انٹرکام لے کر دوسری طرف موجود فرد سے کہا۔ ”یہ سب سامان اوشا کے ہاتھ بھجوا دو۔“

”شہباز۔“ دوسری طرف سے رامن کی آواز آئی۔ ”بہتر ہوگا راج جی کو چھوڑ دو تمہیں یہاں سے نکلنے دیا جائے گا۔“

”مشورے دینے کے بجائے اپنی فکر کرو۔ اگر میں نے راج سے تمہاری جان مانگ لی تو یہ اپنی جان بچانے کے لیے میری بات مان لے گا۔ تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔ جب اوشا آئے تو سب دروازے سے دور ہٹ جائیں۔ کوئی بھی شرارت کرتے ہوئے سوچ لینا کہ راج جی کو مرنے میں بس ایک سیکنڈ لگے گا۔“ میں نے بات مکمل کر کے انٹرکام بند کر دیا۔ مگر اسے رکھنے لگا تو اس کی سرترنم نکل گئی۔ میں نے بٹن دبایا۔ ”اب کیا ہے؟“

”شہباز جی میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس بار منشی دل جی کی مکار آواز آئی۔

”کریں منشی جی، سنا ہے آپ نے بھی پٹڑی بدل لی ہے۔“

”نہیں جی، ہم تو پشتوں سے کنور پریوار کے نمک خوار ہیں۔“ اس نے کمال صفائی سے الزام جھٹلا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی وفاداریاں بڑے کنور یا راج کنور نہیں بلکہ کنور خاندان کے ساتھ تھیں۔

”تب فرمائیے کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

”آپ راج جی کو چھوڑ دیں۔ اس کے بدلے آپ جہاں کہیں گے آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔“

”جیسے دوسری دنیا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”منشی جی کیا ایسا ہی ہوگا۔“

”میں آپ کو یقین....“

”منشی جی اس یقین کی ضرورت آپ کو ہونی چاہیے اور آپ کو میری اس بات پر ذرا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ راج کو چھڑانے کی کسی کوشش کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کے ہاتھ چند لاشیں آئیں گی اور ان میں سے ایک لاش یقینی طور پر راج کنور کی ہوگی۔ اس لیے فی الحال جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کریں اور ہاں اب میں بڑے کنور سے ملنا چاہوں تو میرا خیال ہے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔“

منشی جی کو ایک لمحے کے لیے چپ لگ گئی تھی پھر انہوں نے کہا۔ ”بڑے کنور کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”جب ایک بیمار آدمی کا علاج ہی بند کر دیا جائے گا تو اس کی طبیعت کیسے ٹھیک ہوگی۔ لیکن مجھے امید ہے مجھے دیکھ کر ان کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”نہیں جی مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ اس نے بادل ناخواستہ کہا۔

میں نے انٹرکام رکھ کر راج کنور سے کہا۔ ”یہاں سب ایک سے بڑھ کر ایک مکار ہیں۔ تم سب آپس میں ملے ہوئے ہو اس بیمار اور بے بس شخص کے خلاف۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں بڑے کنور سے کوئی ہمدردی نہیں ہے؟“ راج کنور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اب تم اس معاملے میں پڑ رہے ہو۔ شہباز تم یہاں جتنا الجھو گے اتنا ہی تمہاری بہ حفاظت واپسی کے امکانات کم ہو جائیں گے۔“

”مجھے اس سے ہمدردی نہیں ہے لیکن تم لوگ مکاری دکھا رہے ہو اور مجھے یقین ہے اتنی آسانی سے یہاں سے جانے نہیں دو گے۔“

”میں ضمانت دیتا ہوں۔“

”تم کیسے ضمانت دو گے؟“

”میرا پائلٹ تمہیں ہیلی کاپٹر میں لے جائے گا اور ایک گھنٹے بعد تم سرحد کے پاس ہو گے۔“

”ایک گھنٹے میں انڈین ائرفورس کا کوئی معمولی جیٹ طیارہ اس ہیلی کاپٹر کو مار گرائے گا۔ اگر تم ضمانت دے رہے ہو تو ٹھیک طرح سے دو۔“

”کیا مطلب؟“

”تم بھی اس ہیلی کاپٹر میں ہو گے اور ہمیں سرحد پار چھوڑ کر واپس آ جاؤ گے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ اس نے انکار کیا۔

”تم انکار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“ میں نے کہا اسی لمحے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بانو کو اشارہ کیا اور اس نے نزدیک جا کر پوچھا۔

”کون ہے۔“

”ہم اوشا ہیں۔“ باہر سے اوشا کی آواز آئی۔

”تمہارے ساتھ اور کون ہے؟“ بانو نے پھر سوال کیا۔

”کوئی نہیں۔“ اوشا نے کسی قدر ہچکچا کر جواب دیا۔

”تمہارے ساتھ کوئی ہے۔“ بانو سخت لہجے میں بولی۔ ”اس سے کہو ایک منٹ کے اندر دور چلا جائے ورنہ راج کنور کا ایک کان کاٹ دیا جائے گا۔“

میں بانو کی چالاکی پر مسکرایا۔ اب وہ ان معاملات کو سمجھنے لگی تھی۔ ایک منٹ بعد اوشا نے اطلاع دی کہ اب کوئی نہیں ہے۔ بانو نے سائیڈ پر ہوتے ہوئے ذرا سا دروازہ کھولا اور جیسے ہی اوشا اندر آئی دروازہ بند کر دیا۔ اوشا نے ایک چھوٹا سا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ وہ اس نے قالین پر رکھ دیا اور تیزی سے میری طرف آئی۔ اس نے میرا بازو تھام لیا۔

”شکر ہے بھگوان، ورنہ ہم تو مرنے والے ہو گئے تھے۔“

”تم نے اپنا کام ٹھیک سے نہیں کیا۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”ہمارے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔“

”بھول ہو گئی ہم سے۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔ ”ہم اس پٹھان کو دیکھ رہے تھے اور بھوجن کوئی اور لے گیا۔“

”اس بیگ میں کیا ہے؟“

”پتا نہیں ہمیں منشی جی نے دیا تھا۔“ وہ سادگی سے بولی۔

میں نے راج کنور کو بیگ کی طرف دھکیلا۔ ”اسے کھولو اگر اس کے ساتھ کوئی ٹریپ ہوا تو تم اس کا شکار ہو گے۔“

”نن.... نہیں۔“ وہ ہکلایا۔

”کھولو اسے۔“ اس بار میرے دھکے سے وہ بیگ کے پاس جا گرا اور جلدی سے یوں اس سے دور ہو گیا جیسے اس میں کوئی زہریلا سانپ ہو۔

”اس کا مطلب ہے تمہیں یقین ہے اس میں کچھ ہے۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور انٹر کام پر منشی جی سے رابطہ کیا۔ ”منشی جی میں نے کہا تھا چالاکی مت کرنا۔“

وہ انجان بن گیا۔ ”میں نے کیا کیا ہے جی؟“

”تم نے ایک ٹریپ والا بیگ بھیجا ہے اور اسے تمہارا آقا کھولے گا۔ اب تم بتاؤ اس میں کیا ہے۔“

منشی جی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”بیگ کو نیچے کی طرف لگی زپ سے کھولیں تو کچھ نہیں ہوگا۔“

”اگر اسے اوپر سے کھولا جائے تو کیا ہوگا؟“

”اس میں بے ہوشی کی گیس بھری ہے وہ آزاد ہو جائے گی۔“

”یہ خدشہ تو نیچے سے کھولنے میں بھی ہے۔“

”نہیں نیچے سے کھولنے کی صورت میں گیس نہیں نکلے گی۔“

”اچھا دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور راج کنور کو حکم دیا۔ ”بیگ اٹھاؤ اور واش روم چلو۔“

وہ تیار نہیں تھا لیکن جب میں نے چاقو سے اس کی گردن پر ہلکا سا چرکا لگایا تو وہ مان گیا اور کراہتے ہوئے بیگ اٹھا لیا۔ ”شہباز تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

”مجھے تسلیم ہے کہ میں اچھا نہیں کر رہا ہوں لیکن میں بہت برا ابھی نہیں کر رہا ہوں اور تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں اس سے زیادہ برا سلوک کروں۔“

اوشا اور بانو باہر رہ گئے تھے میں نے واش روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور رائفل کا رخ راج کی طرف کرتے ہوئے اسے بیگ کھولنے کو کہا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے بیگ کو الٹا۔ اس کے نیچے بھی ایک زپ کمال صفائی سے لگی تھی۔ جیسے ہی وہ زپ کھولنے لگا میں نے سانس روک لی۔ راج نے بھی سانس روک لی تھی۔ میں نے اسے حکم دیا۔ ”سانس لو۔“

جب اس نے سانس نہیں لی تو میں نے عقب سے اس کی کمر پر عین گردے کے مقام پر ٹھوکر رسید کی۔ مارے تکلیف کے اس کا منہ کھل گیا تھا اور اس نے بے ساختہ سانس لی۔ پھر جلدی سے سانس روک لی۔ لیکن میرا مقصد پورا ہو گیا تھا اگر بیگ سے کوئی گیس نکلی تھی تو راج کنور نے سانس لے کر اسے اپنے جسم میں اتار لیا تھا۔ راج کنور بد حواس ہو کر پیچھے ہٹا تھا اور اس نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید اس پر گیس اثر کر رہی ہے مگر اس کے چہرے پر صرف بے پناہ خوف کے آثار تھے۔ ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس پر کسی گیس نے اثر کیا ہے۔ جب کچھ لمحے تک کچھ نہیں ہوا تو اس نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ سانس

لی۔اس کا خوف اور احتیاط دیکھ کر مجھے دال میں کالا محسوس ہونے لگا۔اس نے چند گہرے سانس لیے اور ٹھیک رہا تو میں نے بھی سانس لی۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔چند گہرے سانس لے کر دوبارہ سانس روکی اور اسے بیگ سے اسلحہ نکالنے کا حکم دیا۔ اس بار بھی اس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔اس نے لرزتے ہاتھوں سے پستول، شاٹ گن اور ایمونیشن نکالا۔ بیگ خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے شاٹ گن شانے پر ٹانگی اور دونوں پستول اٹھا لیے۔

"اب یہ سب سمیٹ کر باہر چلو۔"

"بیگ بھی؟"

"ہاں بیگ بھی۔"

مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ منشی جی نے ایک بار پھر چالا کی دکھائی تھی، بیگ میں بے ہوش کرنے والی گیس ہوتی تو راج کنور کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی۔شاید بیگ میں کوئی مہلک قاتل گیس تھی۔راج نے میگزین اور شاٹ گن کے بلٹ کا ڈبا اٹھا لیا تھا۔ہم باہر آئے۔بانو اور اوشا ایک طرف بیٹھی آپس میں سر جوڑے محو گفتگو تھیں۔ میں نے چاقو سے چنبیلی کے ہاتھ پیروں کی رسیاں کاٹیں اور اسے کھڑے ہونے کا حکم دیا۔اتنی دیر سے اس مشکل پوز میں بندھے بندھے اس کی حالت غیر ہو گئی تھی اور منہ میں کپڑا ہونے کی وجہ سے وہ آواز بھی نہیں نکال سکتی تھی۔میں اسے بازو سے تھام کر دروازے تک لایا۔میرے اشارے پر بانو نے دروازہ کھولا اور میں نے چنبیلی کو باہر دھکیل دیا۔وہ لڑکھڑا کر گری۔بانو نے دروازہ اندر سے بند کر کے لاک کر دیا اور آہستہ سے بولی۔"شہباز صاحب ہمیں راج کی پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ورنہ کسی اور طریقے سے یہاں سے نکلنا مشکل ہوگا۔"

"اتنی عجلت کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔"ہم بہت مشکل صورت حال سے دوچار ہیں، باہر موجود لوگ حد درجے سفاک اور سازشی ہیں۔ایسے لوگوں کے سامنے بہت محتاط رہنا ہوگا مجھے شبہ ہے اس بیگ میں کوئی زہریلی گیس پوشیدہ ہے جو انسان کا کام تمام کر سکتی ہے۔"

"زہریلی گیس۔" بانو نے خوفزدہ نظروں سے بیگ کی طرف دیکھا۔"اسے بھی باہر پھینک دیں۔"

"نہیں یہ ایک اچھا ہتھیار ہے۔"

"تب آپ نے چنبیلی کو کیوں باہر نکالا؟"

"وہ بیکار تھی اس کی جان کی کسی کے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے اور وہ خطرناک ہو سکتی تھی۔" میں نے جواب دیا۔"یہ رات ہمیں یہیں گزارنا ہوگی اور پوری طرح ہوشیار رہنا ہوگا۔چنبیلی کے ہوتے ہوئے دو آدمیوں پر نظر رکھنا پڑتی اب صرف راج کی نگرانی کرنا ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" بانو نے بے دلی سے کہا۔

"آج رات تمہیں اور کچھ سیکھنے کو ملے گا۔"

"وہ کیا؟"

میں نے ایک پستول کا میگزین نکالا اور پھر ایک طرف کر کے اس کا ٹریگر دبایا۔بعض اوقات چیمبر میں گولی ہوتی ہے اور لوگ میگزین نکال کر سمجھتے ہیں کہ پستول خالی ہے۔آئے دن لوگ اسی غلط فہمی میں خود مرتے ہیں یا کسی اور کو مار دیتے ہیں۔کلک کی آواز آئی۔ میں نے پستول بانو کو تھمایا۔"پہلے اس کے فنکشن سمجھو۔"

یہ بریٹا تھا اور اصلی تھا۔ استعمال کے لحاظ سے یہ آسان اور مہلک پستول ہے، اس کی رینج اور درستگی اپنے سائز کے دوسرے ہتھیاروں سے بہتر ہے۔بانو دل چسپی لے رہی تھی۔اسے پستول کے فنکشن سمجھنے میں چند منٹ لگے۔اس کے بعد میں نے اسے میگزین لوڈ اور ان لوڈ کرنے کی پریکٹس کرائی۔ بھرے پستول سے وہ کسی قدر خوفزدہ دکھائی دی تھی لیکن اس نے ہمت کر کے یہ کام کر لیا۔آدھے گھنٹے تک میں اسے آتشیں اسلحے کے بارے میں بریف کرتا رہا۔ایک بات درجن بار دہرائی تاکہ اس کے ذہن نشین ہو جائے۔اس آدھے گھنٹے میں وہ تیزی اور مہارت سے پستول کو لوڈ ان لوڈ، لاک ان لاک کرنا سیکھ گئی تھی۔دوسرا اعشاریہ اڑتیس ولسن اینڈ اسمتھ تھا یہ استعمال میں ذرا مشکل تھا کیونکہ نال بہت چھوٹی ہوتی ہے اور صرف ماہر لوگ ہی اس سے اچھا نشانہ لگا سکتے ہیں۔میں نے بریٹا بانو کے سپرد کر دیا۔

"اب تم نشانے بازی کی مشق کرو گی۔"

"میں پستول چلاؤں گی؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"ہاں تو یہ سب کس لیے سکھا رہا ہوں؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

میں نے راج سے کہا۔"منشی جی کو اطلاع کر دو کہ ہم کچھ شوٹنگ پریکٹس کر رہے ہیں اس لیے فائرنگ کی آواز سن کر بھڑکنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ کمرے میں جو صراحیاں مجھے موجود تھے ان کو ٹارگٹ کے طور پر استعمال کیا۔ بانو نے چلانا بہت ڈرتے ڈرتے کیا اور جھٹکے سے پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا اس نے چیخ بھی ماری تھی۔ میں نے اسے سمجھایا۔"یہ کیا حرکت ہے۔ پستول مضبوطی سے پکڑو اور دھیان سے فائر کرو ڈرو مت یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

دو تین فائر کر کے بانو کا خوف کم ہوا اور ایک میگزین ختم کرتے کرتے اس کا نشانہ بھی اتنا بہتر ہو گیا کہ وہ دس گز کے فاصلے سے مجسمے کے سینے کا نشانہ لیتی تو گولی کہیں نہ کہیں ضرور لگتی۔اتنے فاصلے سے نشانہ لینے کے لیے اسے واش روم کے پاس جانا پڑتا تھا اور ہم سب احتیاطاً کمرے کے دوسرے حصوں میں چلے جاتے کہ گولی کسی صورت ہمیں نہ لگے۔اب بانو اتنی پرجوش ہو گئی کہ وہ مزید فائر کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے روک دیا۔"اتنا کافی ہے دوسرے میگزین کم ہیں۔اب بریٹا کے تین میگزین فالتو ہیں۔"

اوشا یہ سب دل چسپی سے دیکھ رہی تھی اس نے مجھ سے کہا۔"مجھے بھی سکھا رہے۔"

"ابھی نہیں، گولیاں کم ہیں ہاں یہاں سے نکلے تو تم کو سکھاؤں گا۔" میں نے کہا۔"ہاں یہ دیکھو کہ اسے پکڑتے کیسے ہیں اور چلاتے کیسے ہیں۔"

میں نے اسے دوسرے پستول سے تربیت دی۔میرا خیال تھا کہ وہ نہیں سمجھ سکے گی لیکن اس نے بانو سے بھی زیادہ تیزی سے پستول کو استعمال کرنا سیکھ لیا تھا بس اب عملی مشق کی ضرورت تھی۔ضرورت پڑنے پر وہ کچھ نہ کچھ کر سکتی تھی اور کچھ نہیں تو ڈرا کر دبا سکتی تھی۔راج کنور بیڈ پر بیٹھا تھا۔میں نے اسے اٹھنے کو کہا ایک طرف شاہانہ قسم کے صوفے رکھے تھے۔میں نے بانو اور اوشا سے کہا۔"تم دونوں یہاں لیٹ کر آرام کر لو تاکہ کل صبح کے لیے پوری طرح چاق و چوبند رہو۔"

"اور آپ؟"

"میں تین چار گھنٹے جاگتا رہوں گا پھر تمہیں اٹھا دوں گا اور تم راج کی نگرانی کرو گی اس دوران میں میں نیند پوری کر لوں گا۔"

وہ بستر پر لیٹ گئیں۔میں راج کنور کے سامنے آ بیٹھا۔وقت گزاری کے لیے اس سے سوال کرنے لگا۔"تم اکیلے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔"دو بہنیں بھی ہیں۔ایک کی شادی کر دی تھی اور دوسری قبائلیوں کے حملے میں غائب ہو گئی۔"

"تم لوگوں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"بہت کوشش کی، بڑے بھیا تو پاگل ہو گئے تھے ان کی بہت لاڈلی تھی۔ہمارے آدمی آپریشن کے بعد بھی مہینوں قبائلیوں کے علاقے میں اسے تلاش کرتے رہے لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔شاید وہ آپریشن کے دوران ماری گئی یا اسے لے جانے والے قبائلیوں نے انتقاماً مار دیا ہو۔"

میں نے اسے یاد دلایا۔"تم نے ان کے ساتھ کچھ کم کیا تھا۔ہزاروں لوگ تو میری آنکھوں کے سامنے مارے گئے تھے اور وادی میں جو تھے وہ بھی کہاں بچے ہوں گے، بعد میں سنا تھا کہ زیر زمین بستی کو بم سے دھماکا کر کے بٹھا دیا گیا تھا؟"

راج کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔"پانچ ہزار سے زیادہ قبائلی بچے تھے۔جوان کم تھے زیادہ عورتیں اور بچے بوڑھے تھے۔انہیں ریاست کے شمال مشرق میں ایک جگہ دی ہے۔"

"جنگل، جہاں وہ اپنی بقا کی جدوجہد کر رہے ہوں گے یا بھوک اور موسم کے ہاتھوں فنا ہو چکے ہوں گے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔"کیا وہ تمہاری اور میری طرح انسان نہیں تھے۔"

راج کنور خاموش رہا۔وہ شرمندہ ہونا جانتا ہی نہیں تھا بس میرے سامنے اس وقت اکڑ نہیں سکتا تھا۔انسان کے حق میں جتنا سفاک خود انسان ہے اتنے سفاک تو درندے بھی نہیں ہوتے ہیں۔ میں نے اگلا سوال کیا۔"تم نے دو بار مجھے مروانے کی کوشش کی۔ایک بار نائیک کے ہاتھوں اور دوسری بار اوشا کی مدد سے، دونوں بار تمہیں ناکامی ہوئی۔سوال یہ ہے کہ تم میری موت کیوں چاہتے ہو اور وہ بھی اس طرح کہ تمہارے دامن پر داغ نہ آئے۔"

"مجھے تسلیم ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔"وجہ تم جو چاہے سمجھتے رہو۔"

"میں چاہوں تو تم اپنی زبان سے بھی بتا سکتے ہو لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے میں جانتا ہوں۔البتہ بڑے کنور سے تمہارا اختلاف کس بات پر ہوا ہے اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"وجہ کوئی نہیں ہے میں اس کی غلامی کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔سب کچھ میں کرتا ہوں اور میرے نام پر کچھ بھی نہیں ہے۔میرے بعد میرے بیوی بچوں کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔"

میں چونکا۔"تمہارے بیوی بچے ہیں؟"

''ہاں لیکن وہ یہاں نہیں ہیں میں نے ان کو شہر میں رکھا ہے۔''

''دوسرے لفظوں میں تم نے جاگیر کی آمدنی سے ہیر پھیر کرکے خاصا کچھ بنالیا ہے اور وہ سب شہر میں ہے جہاں تمہارے بیوی بچے ہیں۔ بائی دی وے کتنے بچے ہیں؟''

''دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔''

''بڑے کنور نے شادی نہیں کی؟''

''وہ چاہتا تو اسے لڑکی مل سکتی تھی۔ اسے بیماری ہے لیکن وہ ناکارہ نہیں ہے اس نے خود شادی نہیں کی۔''

''شاید اسے خوف ہوگا کہ کہیں اس کی اولاد میں بھی یہ بیماری نہ منتقل ہوجائے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''اگر بڑے کنور کا انتقال ہوجائے تو یہ جاگیر اور سب کچھ تمہارے نام ہوگا؟''

''لازمی بات ہے اس کا میرے سوا کوئی وارث نہیں ہے۔''

''تمہاری دو بہنیں بھی تو ہیں؟''

''ایک غائب ہے اور دوسری میرے حق میں دست بردار ہوگئی ہے۔''

''گویا تم نے پورا بندوبست کر رکھا ہے۔ کیا تمہاری بہن اپنی خوشی سے دست بردار ہوئی یا تم نے اس کے ساتھ زبردستی کی ہے؟''

اس سوال پر وہ خاموش رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر سادھنا یہاں ہوتی تو وہ بھی جاگیر کی وارث ہوتی۔ راج کنور اس کا بھی دشمن بن جاتا اس لحاظ سے یہ اچھا ہوا کہ وہ یہاں نہیں تھی، ہمارے ساتھ محفوظ اور وسیم کے ساتھ خوش و خرم تھی۔ بانو اور اوشا بارہ بجے کے قریب لیٹی تھیں۔ میں نے چار بجے ان دونوں کو اٹھادیا۔ وہ واش روم سے منہ ہاتھ دھو کر آئیں تو میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ بانو کے پاس برینٹا تھا اور وہ راج کنور کی نگرانی کرسکتی تھی۔ میں نے اسے خبردار کیا۔ ''مجھے سوتا پاکر کسی شرارت کا خیال ذہن میں مت لانا میں تمہیں گولی مارتے ہوئے ایک بار سوچوں گا لیکن یہ تمہیں شوٹ کرکے بہت خوش ہوں گی۔ اس لیے صبح تک زندہ رہنے کی کوشش کرنا۔''

میں بستر پر دراز ہوا اور چند منٹ میں گہری نیند سو گیا تھا۔ میں نے آٹھ بجے اٹھانے کو کہا تھا لیکن اوشا نے مجھے ساڑھے سات بجے ہی جھنجوڑ کر اٹھادیا۔ ''شہباز دروازے پر کوئی ہے۔''

میں جاگ گیا تھا اور دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک سن سکتا تھا۔ بانو مستعدی سے راج کنور کی نگرانی کررہی تھی جو صوفے پر دراز سو رہا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے تک آیا اور سائیڈ پر ہوکر بلند آواز سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''شہباز دروازہ کھولو۔'' ایک دھیمی آواز نے کہا تو میں چونک گیا۔

''بڑے کنور؟'' میں نے شک سے پوچھا۔

''ہاں میں ہوں دروازہ کھولو تم سے بات کرنے آیا ہوں۔''

بڑے کنور کا وہاں آنا میرے لیے غیر متوقع تھا کیونکہ منشی جی کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ بڑے کنور تک رسائی میں ہر ممکن رکاوٹ ڈالنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ مگر بڑا کنور خود کمرے کے باہر موجود تھا۔ میں بلند آواز سے بات کررہا تھا اور راج کنور بیدار ہوگیا تھا۔ بڑے کنور کا نام سن کر وہ بھی چونکا تھا میں اس کے پاس آیا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ''باہر بڑا کنور آیا ہے وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''بڑا کنور۔'' اس نے ناقابل یقین لہجے میں کہا۔ ''وہ یہاں کیسے آسکتا ہے۔''

''کیوں نہیں آسکتا کیا اس لیے کہ وہ تمہاری قید میں تھا۔'' میرا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ اس نے اقرار کرلیا۔

''ہاں اسے کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔''

''تب اس کی باہر موجودگی بتا رہی ہے کہ باہر کوئی بڑی تبدیلی آچکی ہے جس کے نتیجے میں بڑا کنور یہاں تک آیا ہے۔''

میری چھٹی حس اشارہ دے رہی تھی کہ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ راج کنور بھی سخت تشویش زدہ ہو رہا تھا میں اسے دروازے تک لایا۔ پستول اس کی پشت سے لگا کر اوشا کو دروازہ کھولنے کو کہا۔ اس نے دروازہ کھولا تو عین سامنے بڑا کنور اپنے مخصوص چوغے میں روپوش کھڑا تھا اس کے دائیں طرف منشی جی اور بائیں طرف رامن تھا۔ نائیک ان کے پیچھے تھا ان کے علاوہ چھ مسلح گورکھے بھی کھڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بڑا کنور اب آقا تھا اور وہ سب اس کی آقائی تسلیم کرچکے تھے۔ پانسا پلٹ گیا تھا صرف میرے لیے نہیں بلکہ راج کنور کے لیے بھی۔ بڑے کنور نے پہلی بار بلند اور تیز آواز میں کہا۔ ''شہباز ملک ہتھیار ڈال دو اور باہر آجاؤ۔''

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(نیاز ملکانی سکھر کا جواب)

عابد سلطان..........سکھر

بستی تمام لٹ گئی ویرانہ ہوگیا
شادی کہاں یہ گھر تو عزا خانہ ہوگیا

اختر حسن..........لاہور

بجھ گیا آخر چراغ شام بھی
اک یہی باقی مرا ہمراز تھا

(عفت مہتاب ملتان کا جواب)

زرین عمر..........کراچی

عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا
یہ اک عجیب تماشائے رہگزر دیکھا

انیتا بنت فاطمہ..........لاہور

عزیز خاطر ہے باغباں کی
قفس کے خوگر بھی ہوگئے ہیں

(عاشق حسین، حیدرآباد کا جواب)

ارشاد حسن..........لاہور

اک دن وہ تھا کہ تکیہ تھا کسی کا زانو
اب سر اٹھتا ہی نہیں اپنے سرزانو سے

کنیز فاطمہ..........راولپنڈی

ان کا یہ پوچھنا بھی قیامت سے کم نہ تھا
فیضان عشق نے مجھے بخشا ہے یوں دوام

زاہد علی خان..........کوئٹہ

اس شمع سے کب رونق محفل میں لگی آگ
اک راز ہے اس راز کی غایات نہ پوچھو

(نیاز کھوکھر لاہور کا جواب)

نسرین شفیق.....کراچی

ہماری قبر کو کیا احتیاج عنبر و عود
مہک رہا ہے ہر اک استخواں اگر کی طرح

ابریز گل..........پشاور

ہتھیلیوں کہ کلائیوں سے خون رستا رہا
مگر وہ شوخی رنگ حنا نہیں آئی

انس فاروقی..........شادی پور

ہم اتنی دور کہاں تھے کہ پھر پلٹ نہ سکیں
سواد شہر سے کوئی صدا نہیں آئی

واصف خان.....جہلم

ہر اہل دل کے واسطے سقراط کی طرح
لے کر پیالہ زہر کا دنیا کھڑی رہی

انیس احمد..........لاہور

ہر قطرے میں پوشیدہ سمندر کا تلاطم
ہر ذرے میں اک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے

عباس علی خان..........لاہور

یہی کے مصائب بھی زمانے کے ستم بھی
حسرت ہی رہی جی میں کہ جئیں کبھی ہم بھی

(نسرین ممتاز ملتان کا جواب)

احمد یار خان..........ملتان

کہتے تھے ملک رات نہ ہووے گی اب ایسی
تاروں نے بھی دیکھی نہ تھی تاریک شب ایسی

زاہد حسن..........نارووال

کوئی بنتا نہیں ہے کسی کا سہارا اے دوست
پیڑ سوکھے ہوئے پتوں کو گرا دیتا ہے

نسرین آفاق..........کراچی

شہید عشق ہوئے قیس نامور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح

(نازش محمود چوکی کا جواب)

اقتدار حسن..........اسلام آباد

ساتھ دے دیں گے اشک بھی روحی
بے کلامی کلام ہو تو سہی

زاہد سلطان..........ٹوبہ ٹیک سنگھ

سنتے ہیں گلستان میں بہاروں کی ہے آمد
آنکھوں سے یہ اشکوں کی روانی ارے توبہ

(وہاب ظفر حیدرآباد کا جواب)

آفتاب علی..........روہڑی
جانتے ہیں کہ ٹوٹ جائیں گے
زخمِ دل پھر بھی سی رہے ہیں ہم
احمد توقیر..........چوکی
جیسے سناٹا سکوتِ موت کا
دل کی ویرانی کا یہ انداز تھا

(نازافروز راولپنڈی کا جواب)
ناعمہ تحریم..........کراچی
کچھ تو مل جائے لبِ نازک سے
زہر کھانے کی اجازت ہی سہی
(زاہد خان کوئٹہ کا جواب)
سلیم کامریڈ..........کھاناں
یہ گھٹاؤں سے برستی مستیاں
گر اجازت ہو وضو کرتے چلیں
عارف خان..........سکھر
یوں بلاوجہ دھڑکتا نہیں دل
آپ نے پیار سے دیکھا ہوگا
انتظار حسین..........کراچی
یہ حوادث کا تلاطم یہ زمانہ ظالم
غم سے بھڑکے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتا ہے
(احمر سلیم میانوالی کا جواب)
سلیم کامریڈ..........کھاناں
یہ اجتناب ہے عکسِ شعور محبوبی
یہ احتیاط ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
احسان خان..........جھنگ
یقین آنے کو تو آجائے ان کے عہد و پیاں کا
مگر چشمِ بت، وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
(طحہٰ یاسین حیدرآباد کا جواب)
محمد عقیل چیمہ..........حافظ آباد
واں شہر ڈوبتے ہیں ادھر بحث کہ انہیں
خم لے گیا یا خمِ محراب لے گیا
(علی، ملتان کا جواب)
عظمت علی ایم کام..........سرشتہ
نظر ملی اور ان کی آنکھیں جھکیں
بس اتنی سی بات اور ہم برباد

(نازافروز کا جواب)
عظیم اشرف..........گندرہ کلاں گجرات
کیوں دیکھ کے آئینے میں حیران ہو خود پر
چڑھتا ہے یوں ہی رنگ فقیراں کی دعا کو
منظر علی خان..........لاہور
کسی نے کان نہیں ہیں مری صدا پہ دھرے
مرے وجود میں اک شخص مرگیا چپ چاپ
نظر ملتانی..........ملتان
کوئی آئے تو نہ لوٹے مایوس
پھول دامن میں کھلائے رکھنا
(نوشین اختر لاہور کا جواب)
عابد علی..........لاہور
مگر یہ کیا کہ خود اپنا ہی گھر جلاتے ہو
یہ احتجاج کا انداز ناروا ہے بہت
نسرین مصطفیٰ..........کراچی
مانگ بن جاتے ہیں ہستی کی سیہ زلفوں میں
ہم اندھیروں میں بھی رہتے ہیں اجالا بن کر
(نوشین ملک سکھر کا جواب)
منظر علی خان..........لاہور

نہ ہر زن زن است نہ ہر مرد مرد است
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

عباس سید..........لاہور
نہ جانے کتنے چراغوں کا خوں ہوا ہوگا
نہیں ہے سہل کسی دل کو بے وفا کہنا
(اظہر اقبال لاہور کا جواب)
شاکر عطر خان..........ڈیرہ مراد جمالی
ایک ایک کرکے خود سے بچھڑنے لگے ہیں ہم
دیکھو تو جاکے قافلۂ سالار کون ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہورہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کردیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 94
30 ستمبر 2013ء
میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔
نام: ....
پتا: ....
انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔
کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 ستمبر 2013ء تک علمی آزمائش 94 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی
قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔
نام ....
پتا ....
محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)
55
مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 94

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک علمی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 ستمبر 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

فیض آباد میں 1804 میں پیدا ہوئے۔ مولوی حیدر علی اور مفتی حیدر عباس سے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ فنون سپاہ گری کے ماہر تھے۔ فن شہسواری میں اپنی مثال آپ تھے۔ شاعری شروع کی تو اپنے والد جناب ...... سے اصلاح لیا اور حزیں تخلص کیا مگر تھوڑے دن۔ شیخ ناسخ کے کہنے پر تخلص بدل لیا جو آج وجہ شہرت ہے۔ ابتدا میں غزل کہتے تھے مگر والد کی نصیحت پر مرثیہ کہنے لگے۔ 1859 میں پٹنہ (عظیم آباد) 1871 میں حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔

علمی آزمائش 93 کا جواب

عبدالستار ایدھی 1947ء میں بھارتی ریاست گجرات سے پاکستان آئے۔ اسی دوران ان کی... والدہ اپاہج ہو گئیں۔ وہ دواؤں کی خاطر ادھر ادھر بھاگتے رہے مگر اپنی والدہ کو بچا نہ سکے۔ ماں کی موت کے بعد انہوں نے عہد کیا کہ اب وہ کسی اور کو اس طرح مرنے نہیں دیں گے اور انہوں نے 1950 میں گجراتی برادری کے لیے سماجی خدمت کا کام شروع کیا۔ چندہ جمع کر کے پہلے کلینک کھولا پھر ایک ایمبولینس فراہم کی۔ جذبہ خدمت کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے ایمبولینسوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ 2002ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے متاثرین کی امداد کے لیے ایک لاکھ ڈالرز بھیجے۔

انعام یافتگان

1-سعید قائم خانی، حیدر آباد 2-احمد جاوید، کراچی 3-نیاز وٹو، فیصل آباد

4-نسیم احمد، لاہور 5- فصاحت لاشاری، سکھر

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے

کراچی سے سید امجد علی عابدی، تہمینہ عالم، محمد عبداللہ (لانڈھی) عطیہ نورین، ناعمہ تحریم، عذرا احترام رضوی، محمد علی مشاہد، سید عزیز الدین، عروج عالم، ثانیہ احسن، سنجیدہ احمر، امیر الاسلام، محمد فیضان، آفتاب منصور، طارق حبیب، جمیل عثمانی، احسن خان اچکزئی، اختر بلقیس کوکب، انوار علی شاہ، ثناء اللہ بخاری، اختر عباس، نعمت مرزا، جاوید اقبال، اقبال احمد چشتی، منظر خان، نعیم اختر، فیضان انصاری، ڈھوڈا مل، فیض مسیح، اختر حسین۔ لاہور سے منظر علی خان، امروز اسلم، ثناء اللہ بخاری، شاہینہ بتول، کوکب گردیزی، چوہدری نیاز مسلم خان، فیض ملک، بہادر خان، زینت انصاری، شہباز خان، محمد ...

... بیگ، آفتاب خان، کمال حسن، ماسٹر فیض محمد، انوار شاہ، مسز نادر شاہ، انور کلیم شاہ، یوسف خان، سلمان زیدی، فلک شیر، ابراہیم شاہ، پہلوان اختر، نگار ملک، فیض الحسن، مرزا یوسف۔ اسلام آباد سے فریدہ افتخار، انور یوسف زئی، سیف الرحمن خان، بلال مصطفیٰ، شریف الحسن شاہ صلاح الدین، اسلم خان، مہر خان، محمد مصطفیٰ، اصغر عباس، نعمت شاہ، شگفتہ ملک، شیخ اسلام، شبیر زیدی، سید محمد متقی، اختر خان اچکزئی، شرف الدین۔ راولپنڈی سے محمد ظفر اقبال نصرت حسین، افتخار الدین، ... خان، ملک نوروز، عدنان سعیدی، راجا سعید، غضنفر عباس، ابرار الحسن، شریف شاہ، صالح الرحمن، نعمان سید عباس ...، قاسم جان، انور علی انور، فیاض خان بلبل، مرزا یاسین۔ ملتان سے محمد شفیق بھٹی، تسفیہ خانم، زین اسلام، زینت ...، قیام الدین، خلیل الرحمن، سعید بخش، شہزاد علی، سلطان شاہ، باقر علی زیدی، نوازش ملتانی، عابدہ کلثوم، زینت جہاں، زینب شفیق، شیریں عدنان، زہیب سلطان، ملک ممتاز مستر۔ پشاور سے معراج الدین (جہاں آباد)، کلیم الدین، شیر خان، ... فاروقی، مولانا ریاض الحسن، قاسم خان، احمد مجاہد، فقیر خان، قیام خان، مرتضیٰ زیدی، فہیم عباس پہلوی۔ کوئٹہ سے تقی ...، فرید خان، مستقیم اللہ، مفتی کاظمی، عائشہ بختاور، خاقان عباس، ارباب اچکزئی، فیاض ناصری، شہید حسین۔ جہلم سے ... اللہ خان، ابرار شیخ، جاوید محمد خان، محمد سہیل، حلیم اللہ خان، یاسمین، محمد ندیم، کاظم بیگ، ارتضیٰ حسین، مانک چند سندھی، ... عباس خان۔ منڈی بہاؤالدین سے خرم جہاں زیب (ملک والی) زاہد گل، تاثیر حسین۔ حیدر آباد سے اقرا (لطیف آباد) ... ملکانی، سعید انصاری، فتح خان، منا، ریاض، سبط جعفر خاقانی، انوار علی، عماد یاسر، عدنان ختنائی، افروز جہاں، ثمینہ ...، جعفر حسین۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، ندیم ڈڈیال، منظر خان، درویش خان، محمد مظہر، سید محمد میثم رضوی، سبط حسن باقری، اکبر خان۔ سرگودھا سے ظفر اقبال جاوید (سلانوالی) اظہر یونس، بابو سلام بنگالی، نوید ہاشمی، رانا ظفر اقبال، ... فاطمہ، منظر حسین، نصیر عباس، نصرت افروز، کلیم اللہ چغتائی، ارباز خان، خاقان عباسی۔ کوہاٹ سے شاہ وقار حسین، ... شاہ، فدا حسین، امجد خان، ملک سفیر، نیاز ملکانی۔ ڈی آئی خان سے سارہ نواز بھٹی، ارشاد حسین جعفری، فہیم الدین، ... محمد خان۔ رحیم یار خان سے محمد عابد (اسلام آباد، بدلی شریف) فضل عباس، افضال منیو، نسیم شاہ ملک فیروز الدین، ... محمود، ثنا بتول، محمد سراج الدین، عمر مقصود، ایم اے شاہد، علی عباس، طاہر خادم، فیاض بلوچ، عثمان علی خان، محمود ...، نصرت خاتون، نیاز احمد نیازی، سید عدنان، ذاکر علی خادم، راؤ خرم علی، عطیہ نفیس، نورین تبسم، سائرہ ممتاز، شاہانہ ...۔ نارووال سے محمد عدیل اختر (قوئے کلاں شکر گڑھ) سید جرار حیدر، حاجی خان، عطاء الرحمن، ندیم بیگ، مقصود حسین، ملک فیاض، نسرین ملک، شیخ مقصود، عمران امتیاز، افتخار عمران۔ نوشہرا سے فضل محمد (کیولری روڈ) عاصم ہاشمی، خالد نسیم میمن، عبدالمنان، ہادی علی قادر خان، نصرت پرویز، نوید علی خان، ظفر بخش، امجد علی امجد، سراج شیخ۔ اوکاڑہ سے سید احسن محمود ...، جاوید آصف، محمد علی، جاوید آصف، محمد عثمان، اشفاق حسن، نیاز احمد، مس کومل خان، انتظار حسین، فہمیدہ شیخ۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ (خادم علی روڈ) رحیم گل، امینہ خان، فواد حسن۔ بہاولنگر سے معظم علی (چشتیاں) حفیظ محمد، احمد ...، ارشد علی خان، علی خواجہ، عباس احمد، فصیح الدین، نسیم سلطان، فاطمہ حسن، فضل علی۔ گوجرانوالہ سے شاہد مقبول، فخر الحسن، ... ایم، جمیل حیدر، آفاق احمد واسطی۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ، جمیل حیدر، نقی مصطفیٰ، محمد احمد نسیم، آفاق احمد، ...۔ حافظ آباد سے محمد عقیل چٹھہ (کسوکے روڈ) چوہدری ممتاز، جاوید اقبال، شجاعت علی، نوید احمد۔ میانوالی سے ذکا ... عطا محمد (حافظ والا پیلاں) ولید احمد، سلمان سیفی، فرقان رفیق۔ بہاولپور سے محمد ظفر اقبال، سعادت علی خان، الطاف ... نبیل احمد، جمیل خان، فیروز خان، عابد حسین شیخ، نثار عباس دیانی، عاصم ملک، حمیرا کوکب واسطی۔ فیصل آباد سے محمد ...، ماسٹر عبدالعزیز (سمندری) عون محمد، مہرین عنبر، نرگس ناز، عمیر یونس، راجا محمد زبیر، الطاف قریشی، رفیع محمد، شائلہ، ... اقبال، امجد خان۔ نصیر آباد سے شاکر عطر خان (مراد جمالی) گجرات سے ڈاکٹر عظیم اشرف (گندرہ کلاں)۔ ظفر ... سے رانا محمد سجاد (نواں شہر شاہ جمال) ثمینہ ممتاز ارشاد کھوکھر، عائشہ۔

ممالک غیر سے شیزا موسیٰ زبیری (لیک ویلے یو ایس اے) اسلم اشفاق آسی، بریڈ فورڈ (یو کے) حیات محمد وٹو، ٹورنٹو (کینیڈا) ... اسماعیل، انٹاریو (کینیڈا)، اشفاق احمد، یاسین ملک، عباس کیانی، العین (یو اے ای)، سلطان محمد (کویت)۔ ناصر خان، ضیاء عباس ...، شارجہ (یو اے ای)

☆☆☆

ڈیٹ

مکرمی جناب
السلام علیکم!
زندگی کے نشیب وفراز ہی کہانیوں کو جنم دیتے ہیں۔ میری زندگی میں یوں تو بہت سارے مدّوجزر آئے اور اگر انہیں ترتیب وار لکھوں تو ایک اچھی کہانی بن سکتی ہے۔ فی الحال میں اپنی زندگی کا ایک اہم اور ناقابلِ فراموش واقعہ بہ شکل کہانی تحریر کررہی ہوں امید ہے پسند آئے گی۔
سنبل
(کراچی)

میں شاپنگ مال سے باہر آرہی تھی کہ میری نظر عینی پر گئی۔ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ عینی ہی تھی۔ میری کالج کے زمانے کی دوست قرۃ العین لیکن سب اسے عینی ہی کہا کرتے تھے۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔ اس کا شاداب چہرہ، روشن آنکھیں، متناسب بدن اور ساری دلکشی و رعنائی رخصت ہوگئی تھی اور اب میرے سامنے مرجھائے چہرے اور کھچڑی بالوں والی دبلی پتلی وقت سے پہلے بوڑھی ہوجانے والی عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک پندرہ سولہ سال کی نوعمر لڑکی بھی تھی۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچی اور گرمجوشی سے بولی۔ ''تم ہتم عینی ہونا؟''

وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو پھر اس کے چہرے پر ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ آہستہ سے بولی ''ہاں، میں عینی ہی ہوں اور اگر میری یادداشت صحیح کام کررہی ہے تو تم یقیناً سنبل ہو۔''

''شکر ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔'' میں خوش دلی سے بولی۔ ''تم تو بہت بدل گئی ہو۔ اپنا کیا حال بنالیا ہے۔ لگتا ہے کہ وقت نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔''

''میں یہاں کھڑے ہوکر اپنی آپ بیتی تو نہیں سنا سکتی۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ پھر اس نے اپنا پرس کھول کر ایک کارڈ نکالا اور مجھے پکڑاتے ہوئے بولی ''اس پر میرا فون نمبر درج ہے۔ اگر ملنا چاہو تو فون کرلینا۔ میں تمہیں اپنا پتا سمجھادوں گی پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

یہ کہہ کر وہ اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چل دی۔ اس نے یہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ وہ لڑکی کون ہے۔ ویسے چہرے کے نقوش سے تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ اس کی بیٹی ہوگی لیکن عینی نے اس کا تعارف نہیں کروایا اور نہ ہی اس لڑکی نے مجھے سلام کیا۔ مجھے عینی سے اس بدمزاجی اور اکھڑپن کی توقع نہ تھی کیونکہ کالج کے دنوں میں تو وہ بہت خوش مزاج، ہنس مکھ اور زندگی سے بھرپور ہوا کرتی تھی۔

ڈرائیور گاڑی لے کر آگیا تھا۔ اس لیے میں نے عینی کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور گھر چلی آئی۔ اس روز عدیل کو شام کی فلائٹ سے اسلام آباد جانا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ان کا سامان ہی پیک کردوں۔ احتیاطاً فون کرکے پوچھ لیا کہ وہ کتنے دن کے لیے جارہے ہیں اوران کے کون کون سے جوڑے رکھ دوں۔ جواب میں وہ بولے۔ ''رہنے دو۔ میں خود ہی پیکنگ کرلوں گا۔ بس تم جلدی سے کھانا بنالو۔ میں لنچ گھر پر ہی کروں گا۔''

میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میری تو جان ہی نکل گئی کیونکہ عدیل ایک بجے لنچ کرنے کے عادی تھے اگر اس میں ذرا سی دیر ہوجائے تو انہیں غصہ آجاتا تھا۔ منہ سے کچھ نہ کہتے بس کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگ جاتے اور کھانا میز پر لگنے تک ان کی چہل قدمی جاری رہتی۔ میں ان کی ناراضی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے سارے کام چھوڑ کر ملازمہ کے ساتھ کھانا بنانے میں لگ گئی ورنہ وہ تو اپنے حساب سے کام کرتی رہتی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ عدیل کی غیر موجودگی میں ہم لگ بھگ تین بجے تک کھانا کھاتے ہیں کیونکہ بچے بھی دو، تین بجے کے درمیان اپنے اپنے اسکول اور کالجوں سے واپس آتے تھے۔ میرا بڑا بیٹا کامران انجینئرنگ کے دوسرے سال میں، عدنان سیکنڈ ایئر اور بیٹی نائلہ میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔

عدیل بڑی جلدی میں آئے اور کھانا کھا کر ائرپورٹ چلے گئے۔

☆☆☆

عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد گئے تھے۔ ان کے جانے کے دو تین دن بعد مجھے عینی کا خیال آیا۔ میں نے فوراً ہی پرس سے اس کا کارڈ نکال کر نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے اس نے ہی فون اٹھایا۔

''عینی! میں تم سے ملنا چاہ رہی ہوں، اپنا پتا سمجھادو۔''

''بہت جلدی خیال آگیا۔'' وہ طنزیہ لہجہ میں بولی۔ ''میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم مجھے بھول گئی ہوں گی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''دراصل عدیل اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں سارے کام مجھے ہی دیکھنا پڑتے ہیں۔ بس اسی لیے فرصت نہ مل سکی۔''

''خیر چھوڑو،' میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ یہ بتاؤ کہ کب آرہی ہو؟''

''جب تم کہو۔ میں تو کسی روز بھی آسکتی ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ چھٹی کا دن مناسب رہے گا۔'' اب اس کے لہجے میں نرمی اتر آئی تھی۔ ''اس روز مجھے فرصت ہوتی ہے۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

اس نے اپنا ایڈریس بتادیا۔ وہ گلشن اقبال کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ اتوار کے دن صبح گیارہ بجے اس سے ملنے آؤں گی۔ وہ شام میں آنے کے لیے کہہ رہی تھی جو میرے لیے ممکن نہ تھا کیونکہ مہمانوں کی متوقع آمد کے پیشِ نظر میں شام کے وقت گھر پر رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔

فون رکھنے کے بعد میں عینی کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ اتنی تلخ اور بدمزاج کیوں ہوگئی تھی جبکہ میرے ساتھ پڑھنے والی عینی تو ایسی نہ تھی۔ جب میں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو پہلے روز ہی اس سے دوستی ہوگئی۔
ہوا

یوں کہ پہلا لیکچر ختم ہونے کے بعد جب میں کینٹین گئی تو وہاں بہت زیادہ رش تھا اور اس ہجوم میں کاؤنٹر تک پہنچنا بہت مشکل لگ رہا تھا جبکہ مجھے شدت سے کچھ کھانے پینے کی خواہش ہو رہی تھی اور میرے پاس صرف بیس منٹ تھے پھر دوسرا پیریڈ شروع ہو جاتا۔ میں حیران پریشان کھڑی کاؤنٹر تک پہنچنے کی تدبیر سوچ رہی تھی کہ عینی اپنے ہاتھوں میں ایک ٹرے پکڑے ہوئے میرے قریب آئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی ''آ جاؤ'' میں سمجھی کہ شاید اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لیے خاموش کھڑی رہی لیکن جب اس نے دوبارہ آنے کا اشارہ کیا تو اس کی پیشکش رد نہ کر سکی اور اس کے ساتھ ایک خالی میز پر بیٹھ گئی۔

''کیا تمہارے ساتھ کوئی اور نہیں ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں'' وہ برگر کی پلیٹ اور جوس کا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، یہ اعزاز تمہیں مل رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''دراصل مجھے اکیلے کھانے کی عادت نہیں ہے، اس لیے ہمیشہ دو آدمیوں کے لیے سامان لیتی ہوں۔ ابھی میری یہاں کسی سے دوستی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے تمہیں اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ کیا تم میری دوست بننا پسند کرو گی؟''

''ضرور۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مجھے اتنی اچھی دوست کہاں مل سکتی ہے، جو اکیلے کھانے کی عادی نہ ہو۔''

''زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ روز روز نہیں چلے گا۔ ایک دن تم، ایک دن میں۔ کہو منظور ہے؟''

''منظور'' میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد میں اور عینی ایک جان دو قالب بن گئے۔ کالج میں ہمارا بیشتر وقت ساتھ ہی گزرتا۔ کلاس روم، لائبریری، کینٹین، ہر جگہ ہم اکٹھے ہی جاتے۔ دوسرے کلاس فیلوز نے ہماری دوستی کو دیکھتے ہوئے 'پنج بھیناں دی جوڑی' کا خطاب دے دیا تھا لیکن ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں عینی کے بارے میں بہت کچھ جان گئی۔ اس کے والد کا اپنا کاروبار تھا۔ والدہ گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ پیسے کی فراوانی اور لاڈ پیار نے عینی کو خاصا آزاد خیال اور خود مختار بنا دیا تھا۔ وہ بہت سے فیصلے اپنی مرضی سے کرنے لگی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اکثر مجھ سے کہیں باہر چلنے کی فرمائش کیا کرتی لیکن میں نے کبھی اس کی بات نہیں مانی۔ کیونکہ میں اپنے والدین کو دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی۔ انہوں نے جس اعتماد اور بھروسے کے ساتھ مجھے مخلوط تعلیمی ادارے میں بھیجا تھا اسے قائم رکھنا میرا فرض تھا۔ اس کے برعکس عینی جب کسی لڑکے اور لڑکی کو آپس میں سرگوشیاں کرتے دیکھتی تو اس کا دل مچل اٹھتا اور وہ حسرت آمیز لہجے میں کہتی۔

''یار دیکھو! کتنا خوش نصیب جوڑا ہے۔ کیا مزے سے بیٹھے اپنے دل کی باتیں ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں۔''

''اتنی بے صبری بھی کیا ہے؟'' میں ہنستے ہوئے کہتی۔ ''تھوڑا انتظار کر لو، کوئی نہ کوئی چاہنے والا مل جائے گا۔''

''تم تو ہمیشہ نیک پروین کی طرح نصیحتیں ہی کرتی رہنا۔ دیکھتی نہیں ہو کہ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔''

''اللہ نہ کرے۔ ایسی بدشگونی کی باتیں کیوں کرتی ہو۔ تمہیں رشتوں کی کیا کمی ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہت اچھا جیون ساتھی ملے گا۔''

''تم بھی کمال کی باتیں کرتی ہو۔'' وہ جھنجلاتے ہوئے بولی۔ ''فی الحال مجھے جیون ساتھی کی نہیں بلکہ ایک بوائے فرینڈ کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی میں آنکھ بند کر کے کنوئیں میں چھلانگ نہیں لگا سکتی۔ شادی اپنی مرضی اور پسند سے کروں گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے کسی سے دوستی کروں، اسے سمجھنے اور جاننے کی کوشش کروں اور اگر وہ مجھے پرپوز کرتا ہے تو والدین کو اپنی پسند سے آگاہ کر دوں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مان جائیں گے؟''

''انہیں ماننا پڑے گا۔ زندگی مجھے گزارنی ہے، اس لیے انہیں میری مرضی اور پسند کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''تمہیں اس دنیا میں آئے ہوئے صرف انیس سال ہوئے ہیں اور تمہارا تجربہ ان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ آج تم جسے ہیرا سمجھ رہی ہو وہ کل کو پتھر سے بھی زیادہ ناکارہ ثابت ہو۔ اس لیے بہتر ہے کہ زندگی کے اہم فیصلے کا اختیار والدین کے پاس ہی رہنے دو۔ وہ اپنے تجربے کی روشنی میں تمہارے لیے کسی بہتر شخص کا انتخاب کریں گے۔''

''میں تو تمہیں بہت روشن خیال اور آزاد ذہن کی سمجھتی تھی۔ یہ معلوم نہ تھا کہ تم اتنی دقیانوسی باتیں بھی کرتی ہو۔'' اس نے تنک کر کہا۔

میں نے اس کی بات کا برا نہیں منایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم جو چاہو سمجھو تمہیں سمجھانا میرا فرض تھا۔ ہم یہاں پڑھنے آتے ہیں، لڑکوں سے دوستی کرنے نہیں۔ آگے تمہاری مرضی۔''

''تم بے فکر رہو۔ میں سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھاؤں گی۔'' اس نے گویا مجھے تسلی دینے کی کوشش کی، دن گزرتے رہے۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر چھوٹی موٹی بحث ہوتی رہتی۔ وہ محبت کی شادی پر یقین رکھتی تھی اور مجھے بھی اس بارے میں قائل کرنے کی کوشش کرتی رہتی جبکہ میرا استدلال یہ تھا کہ ہمارے معاشرے میں برسا برس سے والدین ہی اپنی اولاد کے رشتے طے کرتے آئے ہیں اور کبھی کوئی شادی ناکام نہیں ہوئی لیکن جب سے محبت کی شادی کا رجحان بڑھا ہے تو اسی نسبت سے علیحدگی اور طلاق کے واقعات میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبت کی شادیاں بالعموم کامیاب نہیں ہوتیں۔

وہ میری کسی دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ تنگ آ کر میں نے بھی اسے سمجھانا چھوڑ دیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی مرضی کے آگے کسی دوسرے کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور وہی کرتے ہیں جو اُن کے من میں سمائے۔ وقت نے کچھ اور فاصلہ طے کیا اور ہم دونوں دوسرے سال میں آ گئے۔ پھر اتفاق یہ ہوا کہ پریکٹیکل کے لیے گروپ بنائے گئے۔ ان میں ہم دونوں کو الگ الگ گروپ میں رکھا گیا۔ اس طرح ہمارا ہر وقت کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اب صرف ہماری ملاقات تھیوری کلاسز میں ہوا کرتی تھی۔ اس کے باوجود ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ اب بھی پہلے کی طرح اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کیا کرتی تھی۔

ایک دن اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا کہ ہمارا ایک کلاس فیلو اسد علی شاہ اس میں دلچسپی لے رہا ہے اور اس کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہے۔ میں اسد کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس لیے فوری طور پر کوئی تبصرہ نہیں کیا البتہ اپنی عادت کے مطابق یہ مشورہ ضرور دیا کہ اتنی جلدی کسی اجنبی پر بھروسا کرنا ٹھیک نہیں اس لیے اس راہ پر قدم بڑی احتیاط سے اٹھانا ہوگا۔ اسے میرا مشورہ پسند نہیں آیا اس لیے منہ بناتی ہوئی چلی گئی، پھر رفتہ رفتہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا اور وہ اسد سے قریب ہوتی چلی گئی۔ تیسرے سال تک پہنچتے پہنچتے ہم ایک دوسرے کے لیے تقریباً اجنبی ہو چکے تھے اور ہمارا تعلق صرف ہائے ہیلو تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

پورے کالج میں اسد اور عینی کی دوستی کے چرچے تھے۔ اب اس نے اسد کے ساتھ ریستوران، سنیما ہال اور دیگر تفریحی مقامات پر بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسد کے بارے میں اپنے طور پر معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ وہ کسی وڈیرے کا بیٹا ہے اور اندرونِ سندھ ان کی کافی زمینیں اور جائداد وغیرہ ہے۔ وہ ڈیفنس کے علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر لے کر رہ رہا تھا اور ایک شاندار گاڑی میں بیٹھ کر کالج آیا کرتا تھا۔ میں اسد کے بارے میں یہ باتیں جان کر پریشان ہو گئی کیونکہ جانتی تھی کہ اس طرح کے امیر زادے محض اپنی دل بستگی کے لیے شہر کی لڑکیوں سے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان گھرانوں میں خاندان سے باہر شادی نہیں کی جاتی۔ اس لیے اسد کے والدین کبھی بھی عینی کو اپنی بہو بنانے پر راضی نہ ہوں گے۔

میں نے اپنی عزیز ترین سہیلی کو آنے والے خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی اور پوچھا کہ کیا وہ اسد کے خاندانی پس منظر کے بارے میں جانتی ہے۔

''ہاں'' اس نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ ''اس کا باپ بہت بڑا زمیندار ہے اور نواب شاہ میں ان کی کافی زمینیں ہیں۔''

''تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں خاندان سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے۔''

''جانتی ہوں۔''

''اس کے باوجود تم نے اس سے تعلق استوار کر رکھا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی تمہارا نہیں ہو سکتا۔''

''وہ میرا ہے اور ہمیشہ میرا ہی رہے گا۔'' اس نے گردن ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا۔ ''اسد نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو راضی کر لے گا اور اگر وہ تیار نہ ہوئے تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے پاس آ جائے گا۔''

میں نے جل کر کہا۔ ''تم میں ایسے کون سے سرخاب

فاروقیہ

خاندان فاروقی، نسبت حضرت عمر فاروقؓ سے ہے۔ اس خاندان نے ہندوستان میں دریائے تاپتی اور دریائے نربدا کے مابین واقع خاندیش کی نیم خودمختار، مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی اور 1601ء تک دو سو سال تک حکومت کی۔ شہنشاہ اکبر نے فاروقی خاندان کے باقی ماندہ بہت سے افراد کو گرفتار کرلیا۔ انہیں مغلوں کا وظیفہ خوار بننے پر مجبور کیا اور خاندیش کے علاقے کو داندیش نام کے ایک مغل صوبے میں تبدیل کردیا۔ اس خاندان کا بانی ملک راجا احمد غالباً پہلے بہمنی سلطان علاؤ الدین بہمن شاہ اور اس کے جانشین محمد اول کے وزیر خارجہ جہاں کا چھوٹا بیٹا تھا۔ فیروز تغلق نے شکارگاہ میں خدمات کے صلے میں راجا احمد کو اس کی درخواست پر تھال نیر کے قریب کروند کا گاؤں دے دیا تھا۔ وہ 722ھ میں وہاں گیا تھا اور اس نے مقامی طور پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد گرد و نواح کا مزید علاقہ زیر کاشت لے آیا۔ راجا احمد نے بگلانہ کے پڑوسی راٹھور راجا کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرکے اور گوندوانہ پر حملہ کرکے اتنے وسائل حاصل کرلیے کہ تقریباً 1382ء کے بعد وہ حکومت دہلی سے خودمختار ہوجانے کے قابل ہوگیا اور اپریل 1399ء میں فوت ہوگیا۔ اکبر کے عہد تک فاروقی خاندان کی خودمختاری کا دارومدار اس پر رہا کہ سلطنتِ دہلی کے تعلقات اپنے پڑوس میں واقع مضبوط مسلم سلطنتوں مثلاً مالوہ، گجرات، سلطنت بہمنیہ اور اس کی وارث ریاست احمد نگر سے خوش اسلوبی سے برقرار رہتے ہیں، ان حکمرانوں نے فاروقیوں کو اپنے برابر کبھی تسلیم نہیں کیا۔ راجا احمد نے اپنی بیٹی کی شادی سلطنتِ مالوہ کے بانی دلاور خاں کے بیٹے ہوشنگ سے کردی تھی۔ آگے چل کر مشرقی خاندیش میں احمد کا جانشین نصیر خان اس دوستی و یگانگت کو ترک کرکے گجرات کی سیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہوگیا۔ کیونکہ مالوہ کا حکمران ہوشنگ شاہ اسے گجرات کے سلطان احمد اول کے حملوں سے بچانے کی نااہلیت ثابت کرچکا تھا چونکہ نصیر خان کو بہمنیوں کے ساتھ تعلق سے جو امیدیں وابستہ تھیں، وہ موہوم ثابت ہوئیں۔ لہٰذا اس نے گجرات کے احمد شاہ کی رضامندی سے 1435ء میں برار پر حملہ کردیا لیکن دو مرتبہ بہمنی سپہ سالار ملک التجار کے ہاتھوں سخت شکست کھائی اور اس کا دارالحکومت برہانپور اس کی نظروں کے سامنے تاخت و تاراج ہوگیا۔ بالآخر ستمبر 1437ء میں وفات پاگیا۔ نصیر خان کے دو فوری جانشینوں عادل خان اور مبارک خان نے کسی ظاہری تامل کے بغیر گجرات کی بالادستی قبول کرلی۔ لیکن عادل خان ثانی نے گوندوانہ اور جھاڑکنڈ کے راجاؤں اور کول و بھیل جیسے رہزن قبیلوں کے خلاف حملوں میں کامیابی حاصل کرکے مقررہ خراج کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی، یہاں تک کہ 1498ء میں محمود باتقرا نے [illegible] کی طرف پیش قدمی کرکے اسے اس تاخیر کی تلافی کرنے پر مجبور کیا۔ عادل خان ثانی کی وفات کے بعد خاندیش کی سیاسی حالت خاندانی رقابتوں کے باعث ابتر ہوگئی اور اس کی مضبوط تر ہمسایہ ریاستوں کو یہاں مداخلت کا موقع مل گیا۔ خاندیش میں محمد اول کے جانشین مبارک شاہ ثانی کے عہد میں مغلوں کے ساتھ فاروقیوں کا پہلا معرکہ ہوا۔ 1585ء سے قبل جب اکبر شمالی میں اپنی سلطنت کی توسیع کرچکا، جنوبی ہند میں مغلوں کا دباؤ خطرناک طور پر محسوس کیا جانے لگا۔ اور 1586ء میں عادل چہارم سے، جو فاروقی خاندان کا آخری حکمران تھا، مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس مغل فوج کو، جو احمد نگر میں مداخلت کے لیے مامور ہوئی تھی، راستہ دے اور اس کی مدد کرے۔ 1587ء میں عادل خان چہارم احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجوں کے خلاف آشتی کی لڑائی میں مغلوں کی مدد کرتے ہوئے مارا گیا۔ اور یوں فاروقی خاندان کی دو سو سالہ حکومت بھی ختم ہوگئی۔

مرسلہ: سلطان محمد، کویت

کے پر لگے ہوئے ہیں جو وہ عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر تمہاری زلفوں میں پناہ لینے آجائے گا۔ اگر ایک مہینے اس کا باپ پیسے نہ بھیجے تو اسے دن میں تارے نظر آجائیں گے۔ اس کے باوجود تم اس کی باتوں پر یقین کررہی ہو۔"

"تمہی بتاؤ پھر میں کیا کروں؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"اس سے کہو کہ اگر وہ واقعی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اپنے والدین کو رشتے کی بات کرنے تمہارے گھر بھیجے۔ یہیں سے اس کے قول و فعل کا تضاد سامنے آجائے گا۔"

"یہ بات میں اس سے کہہ چکی ہوں لیکن اس کا خیال ہے کہ فی الحال یہ مناسب نہ ہوگا۔ ایک بار وہ ڈاکٹر بن گیا تو اس کے لیے اپنے والدین کو راضی کرنا آسان ہوجائے گا۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ عینی سے کھیل رہا ہے لیکن اب اسے سمجھانا بے سود تھا۔ وہ بہت آگے جاچکی تھی اور اسد کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی لہٰذا میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اس کی بہتری کے لیے دعائیں مانگنے لگی۔ وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا دیکھتے ہی دیکھتے فائنل ایگزام سر پر آگئے اور میں سب کچھ بھلا کر پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔ ہاؤس جاب شروع ہوئی تو ہم دونوں کو الگ الگ اسپتالوں میں بھیج دیا گیا۔ اس طرح عینی سے میرا رابطہ تقریباً ختم ہوگیا۔ اس زمانے میں موبائل فون کا رواج اتنا عام نہیں ہوا تھا اور ان لوگوں نے کچھ عرصہ قبل ہی اپنی رہائش بھی تبدیل کرلی تھی اور میرے پاس ان کے نئے گھر کا نمبر نہیں تھا۔ ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی میرے لیے ایک رشتہ آگیا۔ ابو نے صرف میری مرضی ہی معلوم نہیں کی بلکہ مجھے عدیل سے ملاقات کا موقع بھی فراہم کیا۔ ہم دونوں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تقریباً دو گھنٹے تک باتیں کیں۔ عدیل نے اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ وہ ایم بی اے کرنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں منیجر کی پوسٹ پر فائز تھے اور ان کا ارادہ مزید تعلیم کے لیے امریکا جانے کا تھا۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں تو وہ میرے راستے کی رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میری زندگی میں ابھی تک کوئی مرد نہیں آیا اور مخلوط تعلیمی اداروں میں پڑھنے کے باوجود کسی لڑکے سے دوستی تو کیا کبھی کھل کر بات بھی نہیں کی۔

عدیل کی امی بیمار رہتی تھیں۔ اس لیے انہیں شادی کی جلدی ہورہی تھی۔ امی ابو نے فوری طور پر انتظامات کیے اور شادی کی تاریخ طے کردی۔ میری بڑی خواہش تھی کہ عینی کو بھی اپنی شادی میں بلاؤں لیکن اس سے کسی طرح رابطہ نہیں ہوپایا تھا۔ دو چار کلاس فیلوز سے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر شادی کا دن بھی آہی گیا اور میں دلہن بن کر عدیل کے گھر آگئی۔

وہ ایک مثالی شوہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے مجھے اتنا پیار اور خوشیاں دیں کہ میں دنیا کو بھلا بیٹھی اور عینی بھی میرے لیے بھولی بسری یاد بن کر رہ گئی۔ شادی کے ایک سال بعد عدیل کو امریکی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور انہوں نے امریکا جانے کی تیاری شروع کردی۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے چنانچہ تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے بھی ویزا مل گیا اور ہم دونوں اپنے سرپرستوں کی دعاؤں کے ساتھ دیارِ غیر آگئے۔

امریکا آنے کے بعد عدیل بہت مصروف ہوگئے صبح یونیورسٹی جانا۔ شام کو پارٹ ٹائم ملازمت۔ ان کی واپسی آٹھ بجے تک ہوتی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ پھر پڑھنے بیٹھ جاتے۔ اس طرح مجھے ان سے بات کرنے کا کم ہی موقع ملتا تھا۔ البتہ ہفتہ اور اتوار کو انہیں فرصت ہوتی تھی۔ ان دو دنوں میں ہم گھر کے سارے کام نمٹاتے اور تھوڑی بہت تفریح بھی کرلیا کرتے تھے۔ پھر میں نے سوچا کہ اس طرح خالی ہاتھ بیٹھنے سے بہتر ہے کہ میں بھی عدیل کا ہاتھ بٹاؤں۔ چنانچہ میں نے عدیل کی اجازت سے ایک اسپتال میں ملازمت کرلی، اس کے لیے مجھے ایک امتحان پاس کرنا پڑا، اور تب مجھے معلوم ہوا کہ بیرونِ ملک ہماری ڈگریوں کی کیا وقعت ہے۔

ملازمت کے دوران ہی مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی اپنی تعلیمی استعداد میں اضافہ کروں چنانچہ میں نے اسپیشلائزیشن کی تیاری شروع کردی۔ عدیل کا کورس تو دو سال میں ختم ہوگیا لیکن مجھے ایف آر سی ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے پانچ سال کا عرصہ درکار تھا چنانچہ عدیل نے امریکا میں ہی کل وقتی ملازمت اختیار کرلی۔ اس دوران میرے یہاں تین بچوں کی پیدائش ہوئی۔ درمیان میں ایک مرتبہ ہم لوگ پاکستان آئے لیکن ایک ماہ بعد ہی واپس جانا پڑ گیا۔

ہمیں امریکا میں رہتے ہوئے دس سال ہوچکے تھے کہ اچانک ہی عدیل کو وطن کی یاد ستانے لگی اور وہ واپسی

کے لیے پر تولنے لگے۔ دراصل بچے بڑے ہو رہے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد ایک ایسے معاشرے میں پروان چڑھے جہاں بے باکی، آزادی اور جنسی بے راہ روی عام تھی چنانچہ ہم دونوں سب کچھ سمیٹ کر پاکستان واپس آگئے۔ یہاں ہمارے لیے ملازمت کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ عدیل کو تو فوراً ہی ایک بڑی فرم میں ڈائریکٹر کی جاب مل گئی۔ میں نے بھی ایک اسپتال جوائن کرلیا لیکن گھریلو ذمے داریوں کی وجہ سے زیادہ عرصہ وہاں کام نہ کرسکی۔ چنانچہ میں نے وہ ملازمت چھوڑ کر اپنا پرائیویٹ کلینک کرلیا جہاں شام کو دو گھنٹے بیٹھ کر میں مریضوں کو دیکھا کرتی۔ میرا مقصد پیسے کمانا نہیں تھا بلکہ اپنی تعلیم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

عینی کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن میں ماضی کی فلم چل رہی تھی اور میں اس کی موجودہ زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسد سے اس کی شادی ہوئی یا نہیں پھر مجھے خیال آیا کہ اگر اسد ہی اس کا شوہر ہوتا تو وہ گلشن اقبال کے اس چھوٹے سے فلیٹ کے بجائے ڈیفنس کی کسی کوٹھی یا جاگیردار کی حویلی میں رہ رہی ہوتی، صحیح صورتِ حال کا اندازہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی ہوسکتا تھا۔

میں نے مطلوبہ فلیٹ پر پہنچ کر کال بیل دبائی تو عینی نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ اس روز کے مقابلے میں خاصی فریش نظر آرہی تھی۔ شاید پرانی سہیلی سے ملنے کے تصور سے اس کے چہرے کی شادابی لوٹ آئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بغل گیر ہوگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد جب آنسوؤں کا ریلا تھما تو وہ مجھے لے کر چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں آگئی جو انتہائی خوب صورتی اور نفاست سے سجایا گیا تھا۔ وہ مجھے صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ ”تم بیٹھو، میں کچھ پینے کے لیے لے کر آتی ہوں۔“

وہ چلی گئی اور میری نظریں ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگیں۔ اچانک میری نظر ریک پر رکھی ایک تصویر پر گئی تو میں چونک گئی۔ بلاشبہ وہ اسد ہی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ان دونوں کی شادی ہوگئی تھی۔ پھر وہ اس فلیٹ میں کیوں رہ رہی ہے اور اسد کہاں ہے۔ اسے تو چھٹی والے دن گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ میں ابھی انہی خیالوں میں گم تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں میں ایک ٹرے لے کر آئی جس میں دو گلاس جوس کے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گلاس مجھے تھمایا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اب بتاؤ، اچانک کہاں غائب ہوگئی تھیں۔ اتنا عرصہ کہاں رہیں۔ اگر اب بھی سرِراہ ملاقات نہ ہوتی تو تمہارا پتا نہیں چلتا۔“

”تمہارا شکوہ بجا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ حالات کی ستم ظریفی نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کردیا۔ ہاؤس جاب کے فوراً بعد ہی میری شادی ہوگئی۔ میری بڑی خواہش تھی کہ تمہیں اپنی شادی پر بلاؤں لیکن کوشش کے باوجود تم سے رابطہ نہ ہوسکا۔ شادی کے ایک سال بعد امریکا چلی گئی اور وہاں دس سال گزارنے کے بعد حال ہی میں واپس آئی ہوں۔“

”اچھا“ وہ اشتیاق سے بولی۔ ”شوہر کیا کرتے ہیں۔ کتنے بچے ہیں اور تم خود کیا کر رہی ہو۔ ڈگری کہیں رکھ کر بھول گئیں یا اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل کیا؟“

”تم نے تو ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوالات پوچھ ڈالے۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔ ”عدیل نام ہے ان کا، ایم بی اے کرنے کے بعد امریکا چلے گئے، وہاں سے ایم ایس کیا اور اب ایک کمپنی میں ڈائریکٹر لگے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایف آر سی ایس کرلیا اور آج کل پرائیویٹ کلینک کر رہی ہوں۔ تین بچے ہیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی، تینوں ابھی پڑھ رہے ہیں۔“

”واہ! تم تو چھپی رستم نکلیں۔ شادی کرلی۔ پڑھ لیا اور بچے بھی پیدا کرلیے، خوب...... بہت خوب۔“

خدا جانے اس جملے میں طنز پنہاں تھا یا واقعی وہ میری تعریف کر رہی تھی لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی اور خوش دلی سے بولی۔ ”میں نے تو اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا، اب تم اپنی سناؤ۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے، اپنی عمر سے دس سال بڑی نظر آرہی ہو۔ لگتا ہے، وقت نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ شوہر اور بچے کہاں ہیں؟ چھٹی کے دن تو انہیں گھر پر ہونا چاہیے۔“

”شوہر گاؤں میں ہیں، اپنی خاندانی بیوی کے پاس اور بیٹی کو میں نے نانی کے یہاں بھیج دیا ہے تاکہ تم سے کھل کر باتیں کرسکوں۔“

میں حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی پھر اسد کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ اسد ہی ہے نا، گویا تمہاری اس کے ساتھ شادی ہوگئی تھی۔“

”ہاں... یہ سانحہ مجھ پر گزر چکا ہے۔“ وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔

”خدا کے لیے کھل کر بات کرو عینی۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اسد تو تمہیں بہت چاہتا تھا پھر اس نے دوسری شادی کیوں کرلی؟“

”وہ شاید اب بھی مجھے چاہتا ہے لیکن اس میں اظہار کی جرأت نہیں ہے۔ وہ بزدل ثابت ہوا۔ اس میں خاندانی روایت سے لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اسی لیے ہتھیار ڈال دیے اور رسم و رواج کے مطابق اپنے ہی خاندان میں شادی کرلی۔“

”وہ تو کہا کرتا تھا کہ تمہاری خاطر سب کو چھوڑ دے گا پھر وہ اپنی بات سے کیسے مکر گیا؟“

”وہ سب کہنے کی باتیں تھیں جب عمل کا وقت آیا تو اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی اور اس نے خاموشی سے اپنے والدین کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا۔“

”یاد کرو، میں نے تم سے یہی بات کہی تھی۔ آج کے زمانے میں کوئی شخص اتنا احمق نہیں ہوسکتا کہ ایک لڑکی کی خاطر لاکھوں کی جائداد کو لات مار کر چلا آئے لیکن تم پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ اس لیے تم نے میری ایک نہ سنی۔“

”ہاں... میں واقعی اس کے عشق میں پاگل ہوگئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے لڑکے اور لڑکی کا شادی سے پہلے ملنا، ایک دوسرے کو جاننا اور سمجھنا بہت ضروری ہے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ جس شخص کو ہم نے کبھی دیکھا نہیں، اس کے بارے میں کچھ جانتے نہیں پھر بھی اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن یقین جانو، اسد سے ملنے کے بعد مجھے ایک لمحے کے لیے بھی گمان نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے دھوکا کرسکتا ہے۔ اس کی شرافت کی تو میں گواہی دے سکتی ہوں کہ اس نے کئی بار تنہائی ملنے کے باوجود مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بس اپنے سامنے بٹھا کر مجھ سے باتیں کرتا اور موقع بہ موقع شعر پڑھ کر میری تعریفیں کیا کرتا۔ سچ پوچھو تو وہ بھی میرے پیار میں پاگل ہوگیا تھا۔“

”اسی لیے اس نے تمہیں چھوڑ کر دوسری شادی کرلی۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اس نے مجھے چھوڑا نہیں ہے۔ وہ اب بھی میرے پاس آتا رہتا ہے اور دوسری شادی کرنا اس کی مجبوری تھی۔“

”میں نہیں مانتی۔ اگر اسے واقعی تم سے محبت ہوتی تو دوسری شادی کبھی نہ کرتا۔“ میں نے جل کر کہا۔

”تمہیں حالات کا علم نہیں ہے اسی لیے یہ بات کہہ رہی ہو۔ میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی میرے بھی رشتے آنے لگے۔ ان میں ایک دو تو اتنے اچھے تھے کہ امی ابو ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میں پریشان ہوگئی اور میں نے اسد پر زور دینا شروع کیا کہ وہ جلد از جلد اپنے والدین کو رشتے کے لیے میرے گھر بھیجے۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا لیکن جب میرا اصرار حد سے بڑھ گیا تو اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ فی الحال ایسا ممکن نہیں۔ اس کے والدین کبھی بھی خاندان سے باہر شادی کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ ویسے بھی اس کی منگنی ماموں زاد سے ہوگئی ہے جو اپنے ساتھ جہیز میں کئی مربع زمین لے کر آئے گی۔ اگر وہ یہ منگنی توڑتا ہے تو اسے نہ صرف اس زمین سے محروم ہونا پڑے گا بلکہ دونوں خاندانوں میں دشمنی پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے جس کے نتیجے میں کئی جانیں ضائع ہوسکتی ہیں اور عین ممکن ہے کہ اس جرم کے پاداش میں والدین اسے جائداد سے بھی عاق کردیں۔ گویا مجھ سے شادی کرنے میں اسے ہر طرف سے گھاٹا تھا، میں اس پر برس پڑی اور پوچھا۔ ”اگر یہ بات تھی تو تم نے مجھ سے پیار کا ناٹک کیوں رچایا؟“

”مجھے تم اچھی لگتی تھیں اس لیے دوستی کا ہاتھ بڑھادیا۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ آگے چل کر یہ دوستی پیار میں بدل جائے گی۔“

”اب میں کیا کروں۔“ میں سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”تم نے تو مجھے بیچ منجدھار میں لا کر چھوڑ دیا۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑا صبر اور انتظار کرنا ہوگا۔“

”ذرا میں بھی تو سنوں تمہارے پاس اس مسئلے کا کیا حل ہے؟“

”دیکھو، ہمارے خاندان میں دوسری شادی کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ ہمارے کئی بزرگوں نے دو شادیاں کی ہیں۔ پہلی بیوی گاؤں میں تو دوسری شہر میں رہتی ہے۔ میری شادی ماموں زاد سے ہو جائے تو میں آزاد اور خود مختار ہو جاؤں گا اور تم سے شادی کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔“

”لیکن میں اتنا عرصہ انتظار نہیں کرسکتی۔ گھر والوں کی طرف سے مجھ پر شادی کے لیے شدید دباؤ ہے۔ کسی وقت بھی میرا رشتہ کہیں اور طے ہوسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر تم

سے شادی کرلیتا ہوں۔ فی الحال تم یہیں رہنا۔ جب حالات سازگار ہوجائیں گے تو تمہیں اپنے ساتھ حویلی لے جاؤں گا۔"

"میرے والدین شاید اس پر تیار نہ ہوں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"انہیں راضی کرنا تمہارا کام ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی حل نہیں۔ تمہیں اپنانا چاہتا ہوں لیکن اپنی مجبوری بھی بتاچکا ہوں۔ اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ تم میری شادی تک انتظار کرو یا پھر جیسے کہہ رہا ہوں، اس طرح مجھ سے شادی کرلو۔"

میرے پاس انتظار کی گنجائش نہیں تھی اور اسد سے دور ہونے کا تصور بھی میرے لیے سوہانِ روح تھا چنانچہ میں نے دوسرے حل کو ترجیح دی اور امی کو اعتماد میں لے کر ساری بات انہیں بتادی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ اسد کا خیال دل سے نکال دوں۔ اس کے اور ہمارے طرزِ معاشرت میں زمین آسمان کا فرق ہے اور وہ پہلے ہی بتاچکا ہے کہ ان کے یہاں شادی خاندان میں ہوتی ہے تو کیا میں اپنی محبت کا بٹوارا برداشت کرسکوں گی لیکن مجھے اپنے پیار کی طاقت پر بہت اعتماد تھا۔ میں نے امی سے کہا کہ ایک بار اس سے میری شادی ہوجائے پھر اسے ایسا باندھ کر رکھوں گی کہ وہ گاؤں اور اپنی ماموں زاد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جائے گا۔

جب ابو کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بھی پریشان ہوگئے۔ انہوں نے مجھ سے علیحدگی میں بات کی اور بولے۔ "بیٹی، میں سمجھتا ہوں کہ وہ تم سے وعدہ کرکے پھنس گیا ہے اور اب جان چھڑانے کی کوشش کررہا ہے۔ اگر اس میں ہمت ہوتی تو وہ اپنے گھر والوں کے سامنے ڈٹ جاتا اور انہیں تمہارا رشتہ مانگنے پر مجبور کردیتا لیکن وہ بزدل اور لالچی ہے۔ میں اس طرح چوری چھپے تمہیں ایک اجنبی شخص کے حوالے نہیں کرسکتا۔"

میں نے ابو کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور التجائیہ انداز میں بولی۔ "یہ میری زندگی ہے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق جینا چاہتی ہوں۔ خدا کے واسطے آپ مجھے اس حق سے محروم نہ کریں۔ آگے چل کر جو کچھ ہوگا، اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرلوں گی۔"

"تم جذباتی ہورہی ہو۔" ابو نے غصے سے کہا۔ "لیکن میں تمہیں جانتے بوجھتے اندھے کنوئیں میں نہیں دھکیل سکتا۔"

"تو پھر میرا فیصلہ بھی سن لیجیے۔" میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اسد نہیں تو پھر کوئی نہیں۔ میں ساری عمر یونہی بیٹھی رہوں گی۔"

ابو میری ضد کے آگے مجبور ہوگئے اور انہوں نے اسد سے ملنے پر رضامندی ظاہر کردی۔ اس نے ابو سے بھی وہی باتیں کیں جو پہلے مجھ سے کرچکا تھا۔ اس طرح ایک دن بڑی سادگی سے میرا نکاح اسد کے ساتھ ہوگیا۔ یہ بڑی عجیب شادی تھی جس میں مہندی ہوئی نہ مایوں، نہ ڈھولک بجی اور نہ سہیلیوں نے گیت گائے۔ البتہ نکاح کے موقع پر ابو نے چند قریبی رشتے داروں کو مدعو کرلیا تھا جبکہ برات میں اسد کے ہمراہ اس کے چند دوست آئے تھے۔ شادی سے پہلے ہی ابو نے یہ فلیٹ خرید کر میرے نام کردیا تھا۔ اسد نے اسے ضرورت کے مطابق ڈیکوریٹ کرلیا تھا۔ شادی کے بعد رخصت ہوکر اسی فلیٹ میں آئی اور آج تک یہیں مقیم ہوں۔ دوسرے روز اسد نے ایک ہوٹل میں ولیمہ کا اہتمام کیا جس میں وہی لوگ موجود تھے جنہوں نے نکاح میں شرکت کی تھی۔

شادی کے ایک ہفتہ بعد ہی اس نے گاؤں جانے کی تیاری شروع کردی۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولا "یار، پیے ختم ہوگئے ہیں۔ جب تک پڑھائی چل رہی تھی بابا خود ہی خرچہ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب مجھے وہاں جاکر کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔"

"تمہیں ان سے پیسے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ ڈاکٹر بن گئے ہو، یہیں کسی اسپتال میں جاب کرلو۔"

اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "پاگل ہوگئی ہو۔ بھلا آٹھ دس ہزار سے میرا کیا گزارہ ہوگا۔ اس سے زیادہ تنخواہ تو میرے منشی کی ہے۔"

"ہمیشہ آٹھ دس ہزار پر تو نہیں پڑے رہوگے۔ سال دو سال پریکٹس کرلو۔ اس کے بعد اپنا کلینک کھول لینا۔ اس سے زیادہ کمانے لگوگے۔"

"بات تو ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن سچ پوچھو، ہم زمیندار لوگ ہیں، یہ نوکری وغیرہ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔"

"اگر ایسا تھا تو میڈیکل میں داخلہ کیوں لیا تھا۔ ایک سیٹ کیوں ضائع کی؟"

"مجھے بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ اسی بہانے تم سے بھی ملاقات ہوگئی۔"

وہ دو دن کا کہہ کر گیا تھا لیکن اس کی واپسی ایک ہفتے بعد ہوئی۔ اس نے آتے ہی نوٹوں کی ایک گڈی میرے حوالے کی اور بولا۔ "بڑی مشکل سے آنے کی اجازت ملی ہے۔ بابا سے جھوٹ بولنا پڑا کہ میں نے شہر میں ایک کام شروع کیا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے واپس جانا بہت ضروری ہے۔ اس پر وہ ناراض ہوگئے اور بولے کہ تمہیں کوئی کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں گاؤں میں رہ کر اپنی زمینداری سنبھالو۔ ویسے بھی اب تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ یہ شہر کے چکر لگانا چھوڑ دو۔"

یہ سن کر میرا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ میری اسکیم پہلے مرحلے میں ہی فلاپ ہوتی نظر آرہی تھی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ شادی کے فوراً بعد اسد کو بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے پر آمادہ کرلوں گی۔ اس طرح وہ کم از کم پانچ سال کے لیے تو اپنے گھر والوں سے دور ہوجاتا اور اس کا ماموں بھی مایوس ہوکر اپنی بیٹی کی شادی کسی اور جگہ کردیتا لیکن اس کے گھر والے مجھ سے بھی زیادہ تیز نکلے اور انہوں نے وقت ضائع کیے بغیر پنچھی کو پنجرے میں بند کرنے کی تیاری شروع کردی تھی۔

اسد نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس شادی سے میری حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اور وہ اس کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارنے کی کوشش کرے گا۔ اسے اپنے ماموں کی بیٹی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ محض خاندانی روایت سے مجبور ہوکر یہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کی یہ طفل تسلیاں میرے لیے بے کار تھیں۔ جانتی تھی کہ شادی کے بعد اس کے لیے دو کشتیوں میں سواری کرنا مشکل ہوجائے گا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں چاہتی بھی تو احتجاج نہیں کرسکتی تھی کیونکہ اسد نے پہلے ہی مجھے سب کچھ بتادیا تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے اکیلے رہنے کی عادت ڈال لینی چاہیے کیونکہ زمینداری اور شادی کے بکھیڑوں میں پڑجانے کے بعد اس کے لیے جلدی جلدی آنا ممکن نہ ہوگا۔

میں نے تنہائی دور کرنے کے لیے ملازمت کرنے کا پروگرام بنایا تو اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ ایک کل وقتی ملازمہ رکھی جو چوبیس گھنٹے میرے پاس رہتی اور اتوار کے دن اپنے گھر جاتی تھی۔ اس کا بھی ایک بیٹے کے سوا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ بہو اسے ساتھ رکھنے پر تیار نہ تھی۔ لہٰذا اس نے میرے گھر کو اپنا ٹھکانا بنالیا اور اتوار کے اتوار بیٹے اور پوتے پوتیوں کی محبت میں ان سے ملنے چلی جاتی۔ امی چاہتی تھیں کہ اسد کی غیر موجودگی میں ان کے ساتھ رہوں لیکن میں دنیا والوں کو باتیں بنانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

بالآخر اسد کی شادی کا دن بھی آن پہنچا اور یہ محض اتفاق ہی ہے کہ اسی روز میرے یہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اسد کو ڈلیوری کی ممکنہ تاریخ کا علم تھا لیکن شاید شادی کے ہنگاموں میں گھر کر وہ یہ بات بھول گیا، اس دوران امی اور ملازمہ ہی میرے ساتھ رہیں۔ پندرہ دن بعد وہ آیا تو بیٹی کی پیدائش کا سن کر اس کا منہ بن گیا اور اس نے بیٹی کو گود میں لینے یا پیار کرنے کے بجائے اسے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ مجھے اس کا رویّہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے۔ تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ تم جانتی ہو کہ ہمارے یہاں بیٹی کی پیدائش کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی جگہ اگر بیٹا ہوتا تو میں اپنا سینہ چوڑا کرکے چل سکتا تھا اور تمہارے لیے بھی اپنی جگہ بنانے میں آسانی ہوجاتی۔"

"اپنی ماں اور بہنوں کے بارے میں کیا کہوگے؟"

"میں فضول بحث کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" وہ تڑخ کر بولا۔ "جو کچھ ہوتا آرہا ہے یا ہورہا ہے اسی کو دیکھ کر بات کرتا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جب اس کی شادی ہوگی تو یہ جہیز میں اپنے حصے کی جائداد بھی لے جائے گی اور اس طرح ہماری زمینیں کم ہوجائیں گی۔"

مجھے اس کی بے حسی اور سنگ دلی پر بہت غصہ آیا۔ ابھی میری بیٹی کو دنیا میں آئے ہوئے پندرہ دن بھی نہیں ہوئے تھے اور وہ اس کے بارے میں ایسی بات کررہا تھا۔ میں نے جل کر کہا۔ "اگر زمینوں کی اتنی ہی فکر ہے تو میں اس کا حق تمہیں بخشتی ہوں۔ بے شک تم جہیز میں ایک تنکا بھی مت دینا لیکن کم از کم اسے باپ کی شفقت سے محروم تو نہ کرو۔"

میری بات سن کر وہ نرم پڑ گیا اور بچی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے کب اس سے انکار کیا ہے۔ یہ میری بیٹی ہے اور اس کی پرورش و حفاظت کی ذمّے داری بھی مجھ پر عائد ہوتی ہے۔"

میں وقتی طور پر بہل گئی۔ اس نے حسبِ معمول ایک موٹی رقم مجھے تھمائی اور جلد آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ کبھی ہفتہ دس دن میں ایک چکر لگالیتا ورنہ دو دو مہینے اس کی صورت نظر نہ آتی، میں نے اس صورتِ حال سے سمجھوتا کرلیا تھا اور اس دن کا انتظار کررہی تھی

جب وہ مجھے اور بیٹی کو اپنے گھر والوں سے ملوانے کے لیے گاؤں لے کر جائے لیکن وہ دن آج تک نہیں آیا۔“

اتنا کہنے کے بعد عینی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میرے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میں نے اسے پانی پلایا تو کافی دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس نے ٹشو سے اپنا چہرہ صاف کیا اور گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہوئے بولی۔ ”اسی طرح ایک سال اور گزر گیا پھر میں نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا تو وہ بولا۔ ”بابا بہت بیمار ہیں جس کی وجہ سے گھر کے سبھی افراد پریشان ہیں اور اس موقع پر ایسی بات کر کے میں ان کی پریشانی میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔“

میں صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئی لیکن اس کے لہجے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھے ٹال رہا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً اس کے باپ کی خیریت دریافت کرتی رہتی اور وہ یہی کہتا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور اسی وجہ سے اس پر کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کبھی بھی دنیا والوں کے سامنے اپنی بیوی کے طور پر ظاہر نہیں کرے گا اور اس طرح میری بیٹی اپنے حق سے محروم رہے گی۔ چنانچہ میں نے ایک الگ اکاؤنٹ کھول کر اس میں پیسے جمع کرنا شروع کر دیے تاکہ بیٹی کی شادی کے وقت کام آسکیں۔ خدا کے فضل سے اس اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع ہو چکی ہے کہ مجھے شادی کے اخراجات اور جہیز کے لیے کسی کی طرف دیکھنا نہیں پڑے گا۔“

”اس کے بعد تم نے دوبارہ گاؤں جانے کی بات نہیں کی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں وقفے وقفے سے اسے یاددہانی کرواتی رہی لیکن اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔ پھر اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اور زیادہ مصروف ہو گیا۔ باپ کی ساری ذمّے داری اس پر آگئی تھی لہٰذا اس کے پاس میرے لیے وقت نہیں تھا۔ البتہ وہ کبھی کبھار فون کر کے میری اور بیٹی کی خیریت معلوم کر لیتا تھا۔ اس کے ڈرافٹ بھی آتے رہتے۔ ویسے مجھے پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میری اپنی آمدنی اچھی خاصی تھی تاہم بیٹی اب بڑی ہو رہی تھی جب وہ معصوم سوال کرتی کہ بابا کیوں نہیں آئے تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا۔

چھ ماہ بعد وہ آیا تو میں نے اس سے فیصلہ کن انداز میں بات کی اور کہا کہ میں اس طرح ڈر اور خوف کے سائے میں زندگی نہیں گزار سکتی۔ میری بیٹی کی آنکھیں ہر وقت اس کے انتظار میں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ آخر وہ کس جرم کی سزا میں باپ کی شفقت سے محروم ہے اور یہ محرومی اسی صورت میں دور ہو سکتی ہے جب وہ ہمیں اپنے ساتھ گاؤں لے جائے۔ اس پر وہ طیش میں آگیا اور بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں گاؤں جانے کی اتنی بے چینی کیوں ہے؟ تم شہری ماحول کی عادی ہو۔ وہاں دو دن بھی نہیں رہ سکتیں۔ ہماری بیٹی شہر کے بہترین اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ وہاں تو ایک کچا پکا پرائمری اسکول ہے جس کا ماسٹر بھی ہفتے میں ایک بار آتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں وہاں مستقل رہنے پر اصرار نہیں کروں گی لیکن تم ایک بار مجھے اپنے گھر والوں سے ملوا دو تاکہ انہیں میرے اور لبنیٰ کے بارے میں علم ہو جائے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے اگر میں نے ایسا کیا تو بھونچال آجائے گا۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میری شادی وٹے سٹے کی ہے۔ جیسے ہی یہ بات انہیں معلوم ہوگی میری بہن کو طلاق ہو جائے گی اور اس کے ردِعمل میں مجھے بھی ایسا ہی کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی میں بیوی کے جہیز میں آئی ہوئی زمینوں سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔ میں نے پوری صورتِ حال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی تم اپنی ضد پر قائم رہو گی؟“

میں لاجواب ہو گئی۔ تاہم حجت تمام کرنے کے لیے کہا۔ ”تم تو کہا کرتے تھے کہ تمہارے خاندان میں دو شادیاں کرنا ایک عام سی بات ہے۔ ایک بیوی گاؤں میں رہتی ہے دوسری شہر میں، پھر تم اتنا کیوں ڈر رہے ہو؟“

”اپنی بہن کی وجہ سے“ وہ اداس لہجے میں بولا۔ ”اگر اس کا مسئلہ نہ ہوتا تو مجھے کسی کی پروا نہیں تھی اور میں تمہیں ڈنکے کی چوٹ پر اپنے ساتھ گاؤں لے جا سکتا تھا لیکن اب ایسے حالات ہو گئے ہیں کہ میں اس شادی کو خفیہ رکھنے پر مجبور ہوں۔“

وہ تو اپنی صفائی پیش کر کے چلا گیا۔ اب میرے پاس اندھیروں میں بھٹکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میری آخری امید دم توڑ چکی تھی۔ میں نے اسد کو ماضی کی یاد سمجھ کر بھلانے کی کوشش کی اور ساری توجہ بیٹی پر مرکوز کر دی۔ امی کو جب حقیقت کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے اسد سے طلاق لینے کا مشورہ دیا جسے میں نے فوراً ہی مسترد کر دیا۔ میں اپنی بیٹی کو اس کے باپ کے نام اور شفقت سے محروم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر دوسری شادی کر لیتی تو نہ جانے سوتیلے باپ کا رویّہ اس کے ساتھ کیسا ہوتا۔ چنانچہ میں نے اپنی بیٹی کے سکون اور بہتر مستقبل کی خاطر تنہائی کا زہر پینا قبول کر لیا۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکی تو میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا، صاف لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ ایک ایسی عورت جو اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک گئی ہو۔ اس لمحے مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتی۔ میں نے گفتگو کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”کیا وہ اب بھی تم سے ملنے آتا ہے؟“

”ہاں۔“ وہ چہرے پر پھیکی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ”شاید وہ مجھے چھوڑ دیتا لیکن بیٹی کی وجہ سے یہ تعلق قائم رکھنے پر مجبور ہو گیا لیکن مجھے اس کے آنے یا نہ آنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کی جب مرضی ہوتی ہے، ہفتہ دس دن، مہینے دو مہینے میں ایک چکر لگا لیتا ہے۔ البتہ لبنیٰ اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھتی ہے اور میں بھی بیٹی کی وجہ سے اسد کو برداشت کر رہی ہوں۔ البتہ اس تجربہ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اولاد کی کڑی نگہداشت والدین کی اولین ذمّے داری ہے۔ لبنیٰ فرسٹ ایئر میں آگئی ہے لیکن ابھی تک اس کے پاس موبائل فون اور کمپیوٹر نہیں ہے۔ وہ اکثر ان چیزوں کے لیے ضد کرتی رہتی ہے تاہم میں نے اپنا دل پتھر کر لیا ہے اور شادی ہونے تک وہ ان سے محروم رہے گی۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی لڑکے سے رابطہ بڑھائے۔ ہمارے وقت میں جو کام کاغذ کے پرزے کرتے تھے اسے نیٹ اور موبائل نے پر لگا دیے ہیں۔ البتہ میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ جہیز میں اسے بیش قیمت موبائل اور لیپ ٹاپ ضرور دوں گی۔ اب جان گئی ہوں کہ ڈیٹنگ لڑکیوں کے لیے زہر قاتل ہے۔ خدا معاف کرے۔ اسی لیے میں اپنی معصوم بیٹی کی جاسوسی کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ اس کے کالج جانے اور آنے کے اوقات مقرر ہیں۔ اسے کسی سہیلی کے گھر جانے کی اجازت نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی دوست میرے گھر آتی ہے۔ میں کرید کرید کر اس سے ان لڑکیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی زندگی میں بھی کوئی اسد آئے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ لگتا تھا اپنی داستان سنانے کے بعد اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ بچے کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ لہٰذا گھر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ میں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔“

”آج نہیں پھر کبھی۔“ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی کسی روز لبنیٰ کو لے کر آنا۔ جب ارادہ ہو تو فون کر دینا۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں گی۔“

وہ دروازے تک چھوڑنے آئی۔ پھر مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ”تم سے ملنے کے بعد شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا ہے۔ کاش میں تمہاری بات مان لیتی۔ کاش مجھ پر ڈیٹنگ کا بھوت سوار نہ ہوا ہوتا۔ کاش میں نے محبت کی شادی نہ کی ہوتی۔“

میں دل پر بوجھ لیے واپس آگئی لیکن اس کے کہے ہوئے آخری جملے سارے راستے میرے دماغ میں گونجتے رہے۔ گھر آکر بھی بہت دیر تک انہی خیالوں میں الجھی رہی۔ کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹی تو ماضی کی یادیں ایک فلم کی مانند میرے ذہن کے پردے پر چلنے لگیں۔

☆☆☆

عینی نے کہا تھا کہ کاش وہ میری بات مان لیتی۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ اسے اسد کے ساتھ دیکھ کر میرے دل میں بھی حسد و رشک کے جذبات ابھرنے لگے تھے۔ مجھے اپنی ہی کہی ہوئی باتیں کھوکھلی محسوس ہونے لگیں اور عینی کے ساتھ اسد کو دیکھ کر اپنی زندگی میں کسی کمی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ شاید میں ہی غلط تھی۔ صرف عینی ہی نہیں بلکہ کالج کی زیادہ تر لڑکیوں نے کسی نہ کسی کے ساتھ پیئر بنایا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ شاید ڈیٹنگ آج کے دور کی ضرورت ہے۔ ہر لڑکی چاہتی ہے کہ شادی سے پہلے وہ اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں جان سکے۔ اسے پرکھ سکے۔ اسی لیے وہ لڑکوں سے دوستی کر کے ان کے ساتھ ڈیٹ پر جانا شروع کر دیتی ہے تاکہ اپنے لیے کسی بہتر جیون ساتھی کا انتخاب کر سکے۔ میں نے اس انداز سے سوچنا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ میری بس نکل چکی ہے۔ کیونکہ ہماری کلاس میں لڑکیاں زیادہ اور لڑکے کم تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ لڑکوں کی تعداد لڑکیوں کے مقابلے میں آدھی تھی اور ان میں سے زیادہ تر نے کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ جوڑا بنایا ہوا تھا۔ میں

مایوس تو ضرور ہوئی لیکن یقین تھا کہ بہت جلد میری زندگی میں بھی اسمارٹ سا لڑکا آجائے گا۔

ایک دن میں گھر جانے کے لیے کالج کے نزدیکی بس اسٹاپ پر پہنچی تو وہاں ایک لڑکا موٹر سائیکل سمیت موجود تھا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ لڑکا اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ کبھی کبھی چور نگاہوں سے میری طرف بھی دیکھ لیتا۔ مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں بس آگئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور گھر آگئی۔

دوسرے دن پھر وہ مقررہ وقت پر وہاں موجود تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں اسے وہاں کھڑے ہونے سے منع نہیں کر سکتی تھی۔ اس روز بھی وہ چپ چاپ کھڑا دائیں بائیں دیکھتا رہا اور جیسے ہی میری بس آئی تو وہ بھی وہاں سے روانہ ہوگیا۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ وہ لڑکا میرے اسٹاپ پر پہنچنے سے پہلے وہاں آجاتا اور میرے روانہ ہونے تک وہیں کھڑا رہتا۔ پھر ایک دن اس نے عجیب حرکت کی۔ جیسے ہی میں اسٹاپ پر پہنچی، وہ موٹر سائیکل کھڑی کرکے تیزی سے میرے پاس آیا اور میرے ہاتھ میں ایک تہ کیا ہوا پرچہ تھما کر واپس چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرکے جا چکا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ پرچہ اپنے پرس میں ڈال لیا۔

گھر آ کر میں نے کمرا بند کیا اور وہ پرچہ کھول کر پڑھنے لگی۔ اس میں لکھا تھا۔ ”محترمہ! میرا نام نعمان ہے۔ میرا تعلق ایک شریف خاندان سے ہے اور میں کوئی آوارہ لڑکا نہیں ہوں۔ اس لیے میرے بارے میں بدگمان نہ ہوں۔ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ اس لیے دیکھنے چلا آتا ہوں۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ آپ کو یہ پسند نہیں۔ میں بھی آپ کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کسی جگہ بیٹھ کر تھوڑی سی گفتگو کر سکیں۔ اس طرح ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا بہتر موقع مل سکتا ہے، اپنا فون نمبر لکھ رہا ہوں اگر مناسب سمجھیں تو رابطہ کر سکتی ہیں۔“

یہ خط پڑھ کر میں زیرِ لب مسکرا دی اور میرے دل کا چور سامنے آگیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ اس نے ابھی تک میرے ساتھ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی تھی اور بڑے مہذب و شائستہ انداز میں اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ اگر وہ چھچھورا یا آوارہ لڑکا ہوتا تو میرا تعاقب کرتے ہوئے گھر تک بھی آسکتا تھا۔ راہ چلتے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا اور اسی وجہ سے میں اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوگئی۔

دو دن تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اس کی پیشکش کا کیا جواب دوں۔ بار بار میرا ہاتھ ٹیلی فون کی جانب بڑھتا لیکن احتیاط میرا راستہ روک لیتی۔ میں ایک دوراہے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ دل کا مشورہ تھا کہ ایک بار ملنے میں کیا حرج ہے۔ اگر وہ میرے معیار کا ہوا تو بات آگے بڑھائی جا سکتی ہے ورنہ اس معاملے کو یہیں ختم کر دینا بہتر ہوگا جبکہ دماغ مجھے ایسا کوئی قدم اٹھانے سے روک رہا تھا۔ میں خود ڈیٹنگ کے خلاف تھی اور اسی بات پر عینی سے اکثر بحث ہوتی رہتی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ایک طرف تو اپنی عزیز ترین سہیلی کو اس کے بوائے فرینڈ سے ملنے سے منع کرتی تھی اور دوسری جانب جب ایک اجنبی نے میرے دل کے دروازے پر دستک دی تو میں اس سے ملاقات کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ یہی وہ تضادات ہیں جو قدم قدم پر ہمارے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ دماغ کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اگر کسی جاننے والے نے مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آگئی۔ ہمارا پورا خاندان اسی شہر میں مقیم تھا۔ ابو کے کئی دوست اور امی کی بہت سی ملنے والیاں بھی مجھے جانتی تھیں۔ محلے پڑوس کے لوگ اور میرے کلاس فیلوز ان کے علاوہ تھے۔ کسی کی نظر بھی مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بڑی بدنامی ہوگی۔ خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ امی ابو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ نہ بابا، میں کسی اجنبی لڑکے کی خاطر اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتی، میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے سوچا۔

تیسرے دن وہ اسی مخصوص جگہ پر اپنی موٹر سائیکل سمیت موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ایک مخصوص اشارہ کیا لیکن میں نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اس نے مایوسی کے انداز میں سر ہلایا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرکے وہاں سے چلا گیا۔ اس وقت مجھے اس پر بہت ترس آیا اور یوں لگا جیسے اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں لیکن اس کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں اتنا بڑا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھی۔

ایک بار میں نے سوچا کہ عینی سے اس سلسلے میں مشورہ کروں لیکن فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ پہلے تو میرا خوب ریکارڈ لگاتی اور اس کے بعد اپنے نظریہ کی حمایت کرتی کہ مجھے اس سے ضرور ملنا چاہیے۔ لہٰذا میں نے خود ہی اس معاملے سے نمٹنے کا فیصلہ کرلیا، مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکا کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا۔ اور اگر اس نے تنگ کرنے کی کوشش کی تو میں ایسے لوگوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتی تھی۔

تین دن بعد وہ ایک بار پھر میرے راستے میں آن کھڑا ہوا۔ اس بار اس نے پھر وہی حرکت کی اور مجھے ایک تہ کیا ہوا کاغذ تھما کر چل دیا، میں نے گھر آ کر وہ خط پڑھا۔ لکھا تھا ”اگر آپ ملنا نہیں چاہتیں تو اس کے لیے مجبور نہیں کروں گا لیکن ٹیلی فون پر بات کرنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں آج رات دس بجے آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔“ نیچے اس کے گھر کا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

اس کا خط پڑھ کر میں شش و پنج میں پڑ گئی۔ اس زمانے میں موبائل فون کا رواج نہیں تھا اور اگر میں گھر کے نمبر سے اسے فون کرتی تو سی ایل آئی پر میرا نمبر آجاتا پھر وہ دن رات کسی بھی وقت فون کرکے مجھے پریشان کر سکتا تھا اور اگر گھر کا کوئی فرد اس کا فون ریسیو کر لیتا تو میری شامت آجاتی۔ اس سے بات کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کسی پی سی او سے اسے فون کرتی لیکن رات دس بجے میرے لیے گھر سے باہر نکلنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں نے اس کا نمبر اپنی کاپی میں لکھا اور وہ پرچہ پھاڑ کر پھینک دیا۔

ایک ہفتے تک خاموشی رہی۔ میں سمجھی کہ اس نے مایوس ہو کر میرا خیال دل سے نکال دیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ اگلے روز وہ پھر اسی مخصوص جگہ پر موجود تھا۔ اس بار وہ بدلے ہوئے انداز میں نظر آرہا تھا ہمیشہ کی طرح وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر تہ شدہ پرچہ مجھے پکڑا دیا۔ اس بار اس نے دھمکی آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے لکھا تھا ”محترمہ، میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا ہے اب بھی آپ نے مجھے فون نہ کیا تو میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہوگا کہ اپنی ماں کو رشتہ مانگنے آپ کے گھر بھیجوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر آتے ہی ہیں، البتہ آپ کے والدین یہ ضرور پوچھیں گے کہ میری امی کو اس گھر کا راستہ کیسے معلوم ہوا پھر آپ کیا جواب دیں گی۔“

یہ خط پڑھ کر میں کانپ گئی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے اگر واقعی اس کی ماں رشتہ مانگنے آگئی تو میری پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی۔ امی ابو تو یہی سمجھیں گے کہ نعمان مجھے

فاتحہ

سورۂ فاتحہ، قرآن مجید کی پہلی سورت کا نام ہے۔ اس سورت کا نام فاتحۃ الکتاب ہے اس لیے کہ قرآن مجید کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ یہ سورہ مکی ہے۔ بعض مدنی کہتے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی ہے۔ ایک بار مکہ میں نازل ہوئی جب نماز فرض کی گئی۔ پھر مدینہ میں نازل ہوئی جب قبلہ کی تبدیلی ہوئی۔ اس کا نام اُمّ الکتاب اور اُمّ القرآن بھی ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو اُمّ القرآن نہ پڑھے۔ سورہ وافیہ اور سورہ کافیہ بھی اس کا نام ہے۔ اس لیے کہ یہ قرآن کے اکثر مضامین پر جامعیّت کے ساتھ مشتمل ہے۔ سورۃ الکنز بھی اس کا نام ہے۔ کیونکہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فاتحہ الکتاب میرے عرش کے خزانوں سے ایک خزانہ ہے۔ سورۂ شفاء اور سورۂ شافیہ بھی اس کا نام ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: فاتحة الکتاب شفاءٌ من کلّ داء الا السلام۔ سورۃ الثانی بھی اس کا نام ہے۔ کیونکہ وہ ہر نماز میں دو دو بار پڑھی جاتی ہے۔ سورۃ الصلوٰۃ بھی اس کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ نماز میں پڑھنی واجب اور بعض کے نزدیک فرض ہے۔ سورۃ الحمد اور سورۃ الاساس بھی اس کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ قرآن مجید کی اساس (بنیاد) ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا ہے: جب تو بیمار ہوجائے یا تجھے صحت کی شکایت ہوجائے تو اساس (الحمد) کو لازم پکڑ۔ سورۃ الحمد اس لیے کہ اس میں خدا کی حمد درج ہے۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلو پیڈیا

مرسلہ: احسن فاروق، کوٹ ادو

جانتا ہے یا میں اس سے ملتی رہتی ہوں اور میرے ہی ایما پر اس نے یہ رشتہ بھیجا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے نعمان کو روکنا ہوگا۔ اس کے لیے میں اسے فون کرنے کا خطرہ بھی مول لے سکتی ہوں۔

میری ایک کلاس فیلو ہمارے ہی محلے میں رہا کرتی تھی، رات کھانے کے بعد میں نے امی سے بہانہ بنایا کہ میرے کچھ نوٹس سعدیہ کے پاس ہیں، وہ لینے جارہی ہوں۔ آدھ گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔ سعدیہ کے یہاں میرا آنا جانا رہتا تھا۔ اس لیے امی نے اجازت دے دی۔ میں پہلے سعدیہ کے پاس گئی۔ اس سے کچھ دیر باتیں کیں، نوٹس لیے اور دس بجے وہاں سے چل دی۔ راستے میں ایک میڈیکل اسٹور پر رک کر میں نے نعمان کو فون کیا۔ وہ شاید اسی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھالیا۔ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”نعمان صاحب! اس وقت جلدی میں ہوں۔ زیادہ بات نہیں کرسکتی۔ کل دو بجے فون کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کے فون کا انتظار رہے گا۔“ اس نے بڑی شرافت سے کہا۔

یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گھر آگئی، میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی جیسے میلوں کا سفر طے کرکے آئی ہوں، جب حواس قابو میں آئے تو سوچنے لگی کہ اگلے روز اس سے کیا بات کروں گی۔ وہ یقیناً ملنے پر اصرار کرے گا جس کے لیے میں تیار نہ تھی۔ پھر یہ معاملہ کس طرح آگے بڑھے گا، پہلے ٹیلی فون پر ہی اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہوں اگر وہ میرے معیار کا ہوا تو آگے کے بارے میں سوچوں گی۔

دوسرے دن میں نے کالج سے واپسی پر ایک پی سی او سے اسے فون کیا اور تیز لہجے میں بولی۔ ”فرمایئے نعمان صاحب! آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”میرا تو خیال تھا کہ اب تک آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

”میں نجومی نہیں کہ کسی کے دل کا حال جان سکوں، جب تک آپ اپنی زبان سے نہیں کہیں گے، اس وقت تک مجھے کیا معلوم ہوسکتا ہے۔“

”بات یہ ہے کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ اس لیے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”صرف دوستی!“ میں نے شوخ لہجہ میں کہا۔ ”آپ تو اپنی والدہ کو رشتے کے لیے بھیجنے والے تھے۔“

”پہلے ہمیں ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جب ہمارے درمیان ایک تعلق قائم ہوجائے گا۔ اس کے بعد ہی شادی کی بات شروع کی جاسکتی ہے۔“

”ٹیلی فون کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن میں آپ سے کسی عام جگہ پر ملنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں اور آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ سے ملنے کے بارے میں فیصلہ کرسکوں گی۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی“ وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ”لیکن آپ کم از کم اپنا فون نمبر تو دے دیں تاکہ بوقت ضرورت آپ سے رابطہ کرسکوں۔“

یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ ہمارے گھر میں ایک ہی فون ہے جو سب کے استعمال میں رہتا ہے۔ اگر میرے بجائے گھر کے کسی دوسرے فرد نے فون ریسیو کرلیا تو میری شامت آجائے گی۔“

”اوہو، آپ تو بہت ہی ڈرپوک واقع ہوئی ہیں۔ جبکہ آج کل کی لڑکیاں اپنے دوستوں اور سہیلیوں سے گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہیں۔ انہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ البتہ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ کوئی بھی بے احتیاطی آگے چل کر میرے لیے مسئلہ بن سکتی ہے۔“

”یہ تو بڑی مشکل ہوگئی۔ آپ ملنا چاہتی ہیں اور نہ ہی اپنا نمبر دے رہی ہیں پھر یہ معاملہ کس طرح آگے بڑھے گا۔“

”میں آپ کو وقفے وقفے سے فون کرتی رہوں گی۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دوسرے کو جان لینے کے بعد کوئی بہتر صورت سامنے آجائے۔“

یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔ آج ان دنوں کو یاد کرکے سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ مجھ میں اتنی عقل کہاں سے آگئی تھی کہ نعمان کے جال میں پھنسنے سے محفوظ رہی۔ شاید کسی غیبی طاقت نے مجھے بھٹکنے سے بچالیا تھا حالانکہ میں اس کی مردانہ وجاہت اور پُرکشش شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھی اور بار بار میرے دل سے یہی صدا بلند ہوتی تھی کہ مجھے نعمان کی پیشکش قبول کرلینی چاہیے لیکن فطرتاً ڈرپوک واقع ہوئی تھی اس لیے اس کے ساتھ کسی ریستوران یا تفریحی مقام پر جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی

تھی۔ آئے دن اخبارات میں نوجوان جوڑوں کی گرفتاری کی خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اس تصور سے ہی میری روح کانپ گئی کہ اگر پولیس نے مجھے بھی نعمان کے ساتھ راز و نیاز کرتے ہوئے پکڑلیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی اور یہی وہ ڈر تھا جس نے مجھے تباہ ہونے سے بچالیا۔

دو چار دفعہ کی گفتگو کے بعد میں نے نعمان سے کرید کرید کر جو معلومات حاصل کیں۔ ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ وہ لائنز ایریا کے ایک کوارٹر میں اپنے معذور باپ، ماں، دو چھوٹے بھائیوں اور چار بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ باپ کی بیماری کے باعث اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی اور اسے انٹر کے بعد ملازمت کرنا پڑ گئی۔ اب وہ ایک سرکاری ادارے میں جاب کررہا تھا جہاں سے اسے تین ہزار روپے تنخواہ مل رہی تھی۔ اس معمولی آمدنی میں اتنے بڑے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوسکتے تھے چنانچہ اس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر ویڈیو فلمیں بنانے کا کام شروع کردیا۔ وہ دونوں شادی بیاہ کی ویڈیو بنایا کرتے تھے جس سے اسے کچھ اضافی آمدنی ہوجاتی تھی۔ اب نعمان کی ساری امیدیں اپنے ماموں سے وابستہ تھیں جو دبئی میں تھے اور انہوں نے وعدہ کررکھا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ اسے اپنے پاس بلالیں گے۔

نعمان کے حالات جان کر مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ ابو کسی قیمت پر اس کا رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ جب میں نے اپنا اور اس کا موازنہ کیا تو دونوں کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ وہ لائنز ایریا کے کوارٹر میں رہتا تھا جبکہ ہم نارتھ ناظم آباد کے چار سو گز کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ میں ڈاکٹر بننے والی تھی وہ محض انٹر پاس تھا۔ اس کا باپ بے روزگار تھا جبکہ میرے ابو کھاتے پیتے شخص تھے اور ہمیں زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔

میں نے نعمان کو مشورہ دیا کہ وہ دبئی جانے کے بجائے اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے پر توجہ دے کیونکہ ڈگری کے بغیر اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ اس نے فوراً ہی وقت کی کمی کا بہانہ کردیا اور بولا۔ ”بعض اوقات شادی کی تقریب میں ریکارڈنگ کرتے بناتے دو بج جاتے ہیں۔ صبح دفتر جانے کے لیے بھی بڑی مشکل سے آنکھ کھلتی ہے۔ اس صورتِ حال میں پڑھائی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”پھر تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔ میرے والدین شاید ایک انٹر پاس کو داماد بنانا قبول نہ کریں۔“

”اگر تم چاہو تو سب کچھ ممکن ہے۔“ وہ عاجزی سے

فارقلیط

انجیل مقدس میں رسول اکرمؐ کا نام۔ ”ڈکشنری آف اسلام“ میں لکھا ہے کہ یہ عبرانی لفظ "par<clete" کی عربی شکل ہے۔ اس لفظ کے معنی اور تشریح میں سخت اختلاف ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ اس کے معنی ”ہمدرد“ کے ہیں۔ موجودہ عیسائی اس کے معنی ”روح القدس“ لیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ لفظ بحثوں اور مناظروں میں بہت کھینچا تانی کا موجب بنا ہوا ہے۔ اس بحث کا آغاز انجیل یوحنا کے چودھویں باب کی سولہویں آیت سے ہوتا ہے۔ ”وانا من الاب فیعطیکم فارقلیط“ (ترجمہ: اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے) اس کے بعد سترہویں آیت ہے۔ ”یعنی روحِ حق جسے دنیا حاصل نہیں کرسکتی۔“ یہ ایک قابلِ غور حقیقت ہے کہ آیت سابق میں ”فارقلیط“ کا ترجمہ ہمدرد کیا جاتا ہے اور اگلی آیت میں اسی لفظ کا ترجمہ ”روح القدس“ کیا گیا ہے۔ ”اردو انسائیکلوپیڈیا“ کے مطابق ”ایک اور نسخے میں اس کے معنی زندگی کی پاک روح کے لیے لکھتے ہیں جو انجیل 1907ء میں رائج تھی، اس میں سترہویں آیت تھی ہی نہیں۔ یہ آیت بعد میں تشریح کے طور پر بڑھائی گئی۔“ مسلمان کہتے ہیں کہ فارقلیط کے معنی احمد کے ہیں۔ مسلمان مصنفین کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورہ الصف کی چھٹی آیت میں جس رسول کی خوشخبری دی گئی ہے اور جس کا نام احمد بتایا گیا، وہ فارقلیط ہی ہے۔

مرسلہ: نازش کاظمی، لاہور

بولا۔ ”بس مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔ ایک بار دبئی چلا گیا تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ تم دیکھنا کہ صرف ایک سال بعد ہم کسی بہتر علاقے میں مکان لے لیں گے اور ہمارے گھر میں بھی وہ تمام چیزیں ہوں گی جنہیں اسٹیٹس سمبل سمجھا جاتا ہے پھر تو تمہارے والدین کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ گھر میں میری شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اگر کوئی اچھا رشتہ آ گیا تو میں انکار نہیں کر سکوں گی۔“

”کیا تم میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتیں کہ اس معاملے کو ایک سال کے لیے ٹال دو۔ بس میں ایک چکر دبئی کا لگا کر آ جاؤں پھر میرے پاس اتنا کچھ ہوگا کہ تمہارے ابو انکار نہیں کر سکیں گے۔“

”اچھا کوشش کروں گی۔ پہلے تم جاؤ تو سہی۔“ میں اسے مطمئن کرنے کے لیے بولی۔

سچ پوچھیں تو مجھے اس کے حالات جان کر خاصی مایوسی ہوئی تھی۔ وہ اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر دبئی چلا جاتا تو وہاں بھی اسے کوئی معمولی ملازمت ہی ملتی۔ اس کی ساری زندگی بہنوں کا جہیز جمع کرنے میں گزر جاتی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جن لوگوں کی تنخواہ کم ہو، وہ اپنی فیملی کو ساتھ نہیں رکھ سکتے اور مجھے ساری زندگی اسی جنجال پورہ میں گزارنا ہوتی۔ اس تصور سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی لیکن فوری طور پر اس سے قطع تعلق کرنا ممکن نہ تھا چنانچہ میں نے اسے اندھیرے میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ معمول کے مطابق تیسرے چوتھے روز فون کر لیتی اور اسے دبئی جانے کے لیے ترغیب دیتی رہتی۔ وہ بھی ہمیشہ ایک ہی رٹ لگاتا کہ ٹیلی فون پر بات کر کے اس کی تشنگی دور نہیں ہوتی لہٰذا ہمیں کہیں باہر ملنا چاہیے۔ ایک روز مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں ڈیٹ پر جانے کا شوق کیوں ہے۔ وہاں بھی باتیں ہوں گی، وہ ہم ٹیلی فون پر کر لیتے ہیں۔“

”تم نہیں جانتیں، جانم“ وہ سرشاری کے عالم میں بولا۔ ”ڈیٹنگ کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔“ مجھے اس کا یہ عامیانہ انداز اچھا نہیں لگا اور میں نے غصے سے کہا۔ ”آئندہ اگر تم نے ایسی بات کی تو میں فون کرنا چھوڑ دوں گی۔“

وہ گھبرا گیا اور جلدی سے بولا۔ ”ایسا غضب نہ کرنا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہیں باہر چلنے کے لیے نہیں کہوں گا۔“

کچھ دن سکون سے گزر گئے پھر اللہ نے کرم کیا اور ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی میری شادی عدیل سے طے پا گئی۔ اب میں نے اس کھیل کو منطقی انجام تک پہنچانے کا فیصلہ کیا اور اسے آخری بار فون کرتے ہوئے بولی۔ ”میں چھٹیاں گزارنے چچا کے پاس اسلام آباد جا رہی ہوں۔ اب دو مہینے بعد ملاقات ہوگی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ تم وہاں سے بھی فون کر سکتی ہو۔“

”میں نہیں جانتی کہ وہاں ٹیلی فون کی سہولت مل سکتی ہے یا نہیں، اس لیے تمہیں پہلے سے مطلع کر رہی ہوں تاکہ تم پریشان نہ ہو جاؤ۔ ویسے بائی دا وے دبئی جانے کا کب تک پروگرام ہے؟“

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی تک ویزے کا بندوبست نہیں ہوا۔ نہ جانے کب تک انتظار کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، تم انتظار کرو۔ میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا اور اس طرح نعمان کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

آج سوچتی ہوں کہ اگر نعمان کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اس کے ساتھ ڈیٹنگ کے لیے چلی جاتی تو میرا حشر عینی سے بھی بدتر ہوتا۔ اسے کم از کم مالی آسودگی تو ہے۔ مانا کہ اس کی محبت کا بٹوارا ہو گیا ہے لیکن اس نے ہمیشہ اس کی ضرورتوں کا خیال رکھا اور وہ ایک آزاد و خودمختار زندگی گزار رہی ہے۔ جبکہ نعمان سے شادی کرنے کے بعد مجھے اس کے بھرے پُرے کنبہ کا بوجھ بھی شیئر کرنا پڑتا۔ شاید اس نے بھی یہی سوچ کر مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی کہ وہ میری کمائی پر عیش کرے گا اور اس طرح اسے اپنا بوجھ ہلکا کرنے میں آسانی رہے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے بروقت عقل آ گئی اور میں نعمان کے جال میں پھنسنے سے بچ گئی۔

میری تمام نوجوان لڑکیوں سے گزارش ہے کہ ”ڈیٹنگ جیسی لعنت سے دور رہیں اور اپنی قسمت کا فیصلہ والدین پر چھوڑ دیں۔ محبت کی شادی محض ایک سراب ہے جس نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد کر دی۔ مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں سہیلیوں کی داستان پڑھنے کے بعد ایسی کئی لڑکیاں راہ راست پر آ جائیں گی جنہیں ان کے نام نہاد بوائے فرینڈز نے خوش گوار مستقبل کے خواب دکھا کر گمراہ کیا ہوا ہے۔
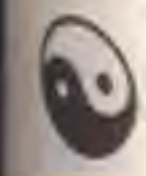
فرشتہ

جناب معراج رسول
السلام علیکم!
یہ میری سرگزشت نہیں میرے نانا کی ہے لیکن اس سرگزشت میں بہت بڑا سبق ہے جو میں اتنے سال کے بعد قارئینِ سرگزشت سے شیئر کرنا چاہ رہا ہوں۔ امید ہے ہر پڑھنے والے کو یہ سچ بیانی پسند آئے گی۔

اختر
(کراچی)

سلیم میاں کی بیوی کا جب سے انتقال ہوا، تب سے سلیم میاں نے وہ پر پرزے نکالے کہ اللہ کی پناہ!
بیوی کے جیتے جی اس طرح کھل کھیلنے کی نوبت نہ آئی۔ البتہ چوری چوری دل کے ارمان نکالتے رہے۔ بیوی کو فرشتوں کو علم نہ ہوتا کہ میاں باہر کیا کرتے پھرتے ہیں۔

گھر میں گھستے وقت سلیم میاں ایسے بن جاتے جیسے نیکی کا فرشتہ! چہرے پر ایسی معصومیت اور مسکینیت کہ بیوی واری قربان ہونے لگتیں۔

”ہے ہے! کون ناشدنی کہتی ہے کہ بڑے صاحب پرائی بہو بیٹیوں کو تاکتے جھانکتے ہیں۔ بھلا ہو تو لے کسی مرد

کے چہرے پر ایسا نور!"

اور سلیم میاں بیوی کو اور فدا کرنے کے لیے چہن سے بولتے۔

"سچ کہتا ہوں بیگم! تمہارے تلوے دیکھ کر کسی حور اور پری کو دیکھنے کی بھی خواہش نہیں ہوتی۔ وہی مثل ہے بیگم تیری ایڑی پر کروں قربان چوٹی حور کی۔"

بیگم کے سیاہ چہرے پر سرخی دوڑ جاتی اور وہ بڑے ٹھسے سے کہتیں۔ "اے لو! بوڑھے منہ مہاسے! شرم نہیں آتی تم کو۔"

میاں اور کہتے۔ "سچی بات کہہ رہا ہوں بیگم! اور سچی بات میں شرم کیسی؟ اور ہاں ایسی لغو خبریں تم سنتی کس سے ہو؟"

"امامی کی ماں حرامزادی بتا رہی تھی۔"

"اس حرامزادی نے مجھے کس کو گھورتے دیکھا؟" بڑے صاحب زبردستی گرج دار آواز بنا لیتے۔

"وہ بتا رہی تھی شبراتن نے کہا ہے۔"

"اور شبراتن نے کہاں دیکھا مجھے۔ ذرا بلاؤ تو اس امامی کی ماں کو، کم بخت کی کھال گرا دوں گا۔ نمک حرام!"

"اے بس جانے بھی دیجیے!" بیگم لاڈ کرنے لگتیں۔ "مجھے کب ان چھدام کی لونڈیوں کا یقین آتا ہے۔ موئی جھوٹ سچ لگاتی ہی پھرتی ہیں۔"

بڑے صاحب کا مصنوعی غصہ دودھ کے ابال کی طرح اتر جاتا اور دل ہی دل میں کہتے۔ "یا اللہ تیرا شکر ہے!"

بیوی کو ناراض کر کے سلیم میاں کو زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کہیں بھی چین نہ مل سکتا۔ باہر وہ شیر بن کر گھومتے لیکن گھر کے اندر بھیڑ بن جاتے، بھیگی بلی۔ کیا مجال جو بیگم کی مرضی کے خلاف ایک حرف بھی کہہ سکیں۔

سچ تو یہ ہے کہ سلیم میاں بیگم کو نہیں بلکہ بیگم سلیم میاں کو بیاہ لے گئیں۔

سلیم میاں کے باپ کا کبھی ڈنکا بجتا تھا۔ دروازے پر بقول شخصے ہاتھی جھولتے تھے۔ لوگ کہتے تھے۔ اگر میاں کے گھر کے خالی بکس بھی جھاڑے جائیں تو چاندی اور سونا جھڑے۔ محرم میں جب گھر صاف کروایا جاتا تو محلے کی لونڈیاں کونے کھدروں میں منہ ڈال کر اور ٹٹول کر بہت کچھ پا جاتیں۔ پیسے، سونے کے چھلے، چاندی کی انگوٹھیاں!

سلیم میاں کی ماں یہ سب دیکھتیں تو مسکرا کر کہتیں۔ "جس کی قسمت کا تھا اسے مل گیا۔"

سلیم میاں بڑے لاڈوں کے پلے تھے۔ دس بچے گزر کر ایک اللہ آمین کر کے بچا تو ماں باپ دن رات صدقے قربان ہوا کرتے۔ سات برس تک تو سلیم میاں کے پیروں نے زمین چھوئی نہیں۔ اناؤں کی گود گود رہے۔ بڑے ہوئے تو امیروں جیسی خو، بو کہاں جاتی۔ پھر لاڈلے بیٹے، ادھر منہ سے کچھ نکلا اور کام تیار!

سلیم میاں ہوش سنبھالتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ دن عید اور رات شب برات۔

اور آخر ماں باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی جیسے دولت کے پر لگ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھرا پُرا گھر سنسان ہو گیا۔ جس ڈیوڑھی پر ہاتھی جھولتے تھے وہاں خاک اُڑنے لگی۔ اچھے کے ساتھی سب ہوتے ہیں برے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ قرضے پر قرضہ چڑھا اور ایک روز باپ دادا کی حویلی کی اینٹ اینٹ نیلام ہو گئی۔

سلیم میاں کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس طرح تیورا کر گرے جیسے پوری حویلی ٹوٹ پڑی ہو۔

آنکھ کھلی تو خود کو فضل صاحب کے یہاں پایا۔ ایسا لگا فضل صاحب فرشتہ ہوں، انسان نہیں، انسان انسان کے کام نہ آئے تو انسان کا ہے کو فرشتہ کہا جائے گا۔

فضل صاحب نے سلیم میاں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔ "بیٹا! آج سے یہ تمہارا ہی گھر ہے۔" اور سلیم میاں نے واقعی اپنا گھر سمجھا۔

رجب میں فضل صاحب کی چونتیس برس کی بیوہ اور اکلوتی لڑکی سلیم میاں کی بیگم بن گئیں اور سلیم میاں گھر دامادی قبول کر کے بیگم کے ہاتھوں بک گئے۔

بیگم سے ڈرنے کی بہت سی وجوہات تھیں۔ بیگم ہر اعتبار سے بڑی تھیں۔ عمر، جسامت، دولت اور پھر ان کا اپنا گھر!

میاں کے گھر جاتیں تو شاید کچھ دب بھی جاتیں مگر جب میاں ہی ان کے گھر پر آ پڑے تو ڈر کاہے کا! اور شیر ہو گئیں۔

سلیم میاں کو دبنا ہی پڑتا، بیوی کی بدولت دوسری زندگی پائی اور بیوی کی دولت نے بھرم رکھ لیا۔ ورنہ میاں کسی شہر میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے۔ بیوی کے سامنے پوری آزادی تو نہیں مل پائی مگر سلیم میاں بالاخانے پر جانے سے نہ چوکتے۔ جام پر جام لنڈھا کر جب کسی رات گھر آنے کے قابل نہ رہتے تو بیگم پورا گھر سر پر اٹھا لیتیں۔

اور میاں ڈرتے ڈرتے تاروں کی چھاؤں میں ... کی طرح نمودار ہوتے تب بیگم اس طرح دوڑتیں ... میاں کو گردن سے پکڑ کر باہر اچھال دیں گی۔ "کیوں ... کہاں تھے تم؟"

"وہ ...... وہ ...... بیگم ...... رحمت خاں کے یہاں میلاد تھا ...... ان کے لڑکے کی ......"

"میں کہتی ہوں تم بلا کہے سنے رات بھر کیوں غائب رہے۔ میلاد ہو یا محفل ...... میری اجازت کے بغیر کیوں گئے تم؟"

"تمہارے سر عزیز کی قسم بیگم! میں جا نہیں رہا تھا لیکن رحمت خاں سر ہو گئے بہت کہا کہ بیگم سے پوچھ آؤں! مگر وہ ... بھوت کی طرح کھوپڑی پر سوار ہو گئے! آپ کے بغیر محفل سونی رہے گی، فضل میاں کے بعد آپ ہی ان کی جگہ پُر کریں گے۔"

"اب اگر ایسے غائب ہوئے تو گھر کا دروازہ نہیں کھلے گا سمجھے۔" بیگم کا غصہ ذرا دھیما ہوتا اور سلیم میاں دل ہی دل میں۔ "جل تو جلال تو۔" کی گردان کرتے ہوئے کہتے۔

"نہیں بیگم! اب ایسا نہیں ہوگا۔ وہ تو میں پھنس گیا ورنہ میرا دل تم میں پڑا تھا تمہارے بغیر تو ایک لمحہ مجھے قرار نہیں!"

میاں کی چکنی چپڑی باتوں میں بیگم موم کی طرح پگھل جاتیں اور سلیم میاں کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔

"مار لیا پالا۔"

وہ اندر ہی اندر چلا پڑتے، اور پھر اس طرح بستر میں دبک جاتے جیسے کوئی شریر بچہ ماں کی سرزنش پر سیدھا ہو جاتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ سال نکل گئے اور سلیم میاں نے دفی ترقی کر لی۔ آگے پیچھے ان کو چار ڈگریاں مل گئیں اور بیگم اپنے فرمانبردار شوہر کی طرف سے ذرا بیگانہ ہو کر بچوں میں لگ گئیں۔

سلیم میاں نے اطمینان کی سانس لی بیگم کی آنکھ بچی اور میاں غائب۔ دو ایک بار بیگم نے پوچھا۔ "میاں کہاں گئے تھے؟"

جواب ملا تحصیل گئے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے بلایا تھا۔ تحصیل دار کے یہاں دعوت ہے۔ کبھی کچھ کبھی کچھ، بیگم کی کوتاہ گردن فخر سے اکڑ جاتی، یہ سب عزت انھی کی بدولت تھی۔

سلیم میاں بڑی دیر سے لوٹتے، لڑکھڑاتے قدم، چڑھی ہوئی آنکھیں جیسے ڈپٹی صاحب نے نشہ پلا دیا ہو!

بیگم سوچتیں۔ خوشی کے مارے میاں کے پیر زمین پر نہیں پڑتے! چاؤ سے پوچھتیں "کہو جی کیا کیا کھایا۔ کیا باتیں ہوئیں؟"

میاں اکڑ کر جواب دیتے۔ "ارے جنت میں تھے جنت میں! انگریزی کھانے واہ! واہ! زبان ابھی تک چٹخارے لے رہی ہے اور..." بڑی دیر تک وہ اس جنت کا حال بیان کرتے رہتے اور آخر میں تان ٹوٹتی! "بس بیگم اس جنت میں ایک حور کی کمی تھی!"

"کون؟" بیگم چونک کر پوچھتیں اور میاں مکھن کا ڈباوے مارتے۔ "آنکھوں میں جھانک کر اس حور کو دیکھ لو۔"

بیگم بڑی مشکل سے اپنی موٹی کمر کو لچکا کر شرمایا تیں۔ اور میاں سوچتے! لو بھئی بیگم نے مکھن کا پورا ڈبا ہضم کر لیا۔

سنا ہے کہ جس روز بیگم نے سلیم میاں کو ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا اس روز سلیم میاں نے زندگی میں پہلی بار سجدہ کیا اور وہ بھی شکرانے کا۔ بلا سے کوئی بھی سجدہ کیا' پر کیا تو! ورنہ بہت سے لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے۔ رحمن خاں تو میاں سے پوچھ رہے تھے۔ "کیوں میاں سجدہ کدھر کیا تھا؟"

سوم تک تو سلیم میاں نے دنیا کے دکھاوے کو بیوی کا غم منایا مگر چوتھے روز گھبرا کر نکل پڑے۔ آزاد فضا میں پھڑ پھڑانے والے پنچھی کا گھر کے پنجرے میں کیا دل لگتا۔ گھر میں سوائے بچوں کے اور دل لگنے کا سامان بھی کیا تھا، ویسے میاں کو بچوں سے بھی کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بیگم کے... دکھانے کو چوم چاٹ لیتے، یا بچے زبردستی گلے میں جھول جاتے تو مجبوراً ہنس بول لیتے۔ اب یہ بھی نہ تھا۔

بوڑھی نانی بچوں کے پیچھے مٹی رہتیں اور سلیم میاں پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھتے کہ بچے کس حال میں ہیں۔ انہیں اپنی رنگ رلیوں سے فرصت نہ تھی۔ صبح نکلتے تو دوپہر کو آتے اور دوپہر کو جاتے تو رات یا پھر رات گزار کر دوسری صبح ہوتی تب گھر میں گھستے۔

بیوی کا ڈر نکل ہی گیا تھا۔ اب بات بات میں ٹانگ کون لیتا۔ بوڑھی ساس اپنے سفید بالوں کی لاج میں ایک لفظ نہ کہتیں۔

بہتوں نے صلاح دی کہ عقد ثانی ہو جائے تو شاید میاں نچلے بیٹھیں، مگر یہ علت پھر کون پالتا۔

یوں ہی اللّے تللّے تھے۔ جیب گرم تھی۔ باہر نکل کر جس ندی میں چاہا ہاتھ دھولیا۔ گھر میں کنواں کھود کر کون گرتا۔ گھر کے یک رنگے کھانے میں وہ مزہ کہاں جو بازار کی نت نئی مٹھائیوں میں۔

لوگ کہتے پھرتے تھے۔ ”سلیم میاں سے بڑا غنڈا اب نہ پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہوا ہے۔“

سلیم میاں اگر سن بھی لیتے تو کیا! چکنا گھڑا۔ ادھر پانی پڑا اور پھسل گیا۔ شرم ہوتی تو باپ کی گاڑھی کمائی، منی جان، بنی جان اور پتا نہیں کتنی جانوں پر نہ اٹھ جاتی۔ دادا کی حویلی یوں کھڑے کھڑے نہ بک جاتی، اور سلیم میاں نکھٹو بن کر سسرال میں پڑے پڑے روٹیاں نہ توڑا کرتے۔ ایسے لوگوں کو اگر غیرت آنے لگے تو دنیا میں سلیم میاں جیسے لوگ کیوں ہوں۔

وقت جیسے پر لگا کر اُڑنے لگا۔ اور ساتھ ہی سلیم میاں نے سسر کی پونجی اڑانا شروع کر دی۔ اس بے دردی سے جیسے حرام کا مال ہو۔ ویسے سنا یہ بھی ہے کہ مال حقیقت میں حرام کا تھا۔ مرے پہ الزام کون لگا تا سچ ہی ہوگا۔

غریبوں کا خون پسینا ایک کر کے کمایا ہوا پیسا فضل میاں کے سیف میں بند تھا۔

جس گاؤں میں چلے گئے گلا دبا کر وصول کر لیا۔ جھوٹا الزام لگا کر پھانس لیا۔ فصل کی فصل اُجاڑ لاتے کوئی اف نہ کرتا۔ منہ سے ایک لفظ نکلا اور ہنٹر برس گیا۔ بھولے بھالے دیہاتی زمیندار جی کے مختار سے ایسے ڈرتے جیسے وہ ملک الموت ہوں۔

اب یہ روپیا کہاں جاتا! اصلی جگہ تو مُنّی جان کا کوٹھا اور اس کی خرانٹ ماں کی جیب تھی۔

سلیم میاں بھری جیب لے کر جاتے۔ جھوٹے برتن چاٹ کر خالی واپس آتے۔ حسب سابق اس ڈیوڑھی پر بھی پھٹکار برسنے لگی پھر چھ نوکروں اور لونڈیوں کی جگہ ایک نوکر اور ایک پرانی ماما رہ گئی۔

سیف اجڑ گئی۔ چرمراتے ہوئے نوٹ کھنکھناتے ہوئے روپے اور جگمگاتے ہوئے زیور جو اس کا سہاگ تھے لٹ گئے اور وہ بیوہ بن کر ایک کونے میں کھڑی اپنے حسین ماضی کی یاد میں کھوگئی۔

پہلی ٹھوکر پہ سلیم میاں اوندھے منہ گر کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ لیکن دوسری بار ایسے جھاڑ پونچھ کر الگ ہو گئے جیسے روپیا کپڑوں کی گرد تھی۔ زیادہ میلا ہوا دامن جھٹک دیا۔ عزت کا رونا اب کس کو تھا، ساری شرم اور خاندانی غیرت دور کھڑی منہ چڑھا رہی تھی۔ اور سلیم میاں منہ پھیرے کھڑے تھے۔

انسان اگر ایک بار دلدل میں پھنس جائے تو پھر دھنستا ہی چلا جاتا ہے سلیم میاں کا بھی یہی حال ہوا۔ شروع میں نکلنا چاہتے تھے مگر جتنا ابھرنے کی کوشش کی اس سے زیادہ دھنس گئے اور پھر تو ایسے پھنسے کہ بھول کر بھی نکلنے کا خیال نہ آیا۔

برتن بکے، مسہریاں، تخت، پلنگ، الماریاں اور یہ لمبے چوڑے صندوق جنہیں کھولتے ہی میں کلیجا منہ کو آجاتا بھلا نازک اندام سلیم میاں جو یونہی اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، ان چیزوں کا استعمال کیا کرتے اونے پونے بیچ کر قصہ تمام کیا۔ دو چار روز میں یہ روپیا بھی اڑ گیا۔

نشہ ٹوٹا تو میاں بکھر کر رہ گئے گھر میں دھول اُڑا گئی تھی...... کھیت اور امرود کے باغ کی ہریالی کھٹکنے لگی۔

رحمت خاں کے گرانقدر مشورے نے اس ہریالی میں بھی آگ لگا دی...... اور پھر جائیں تو جائیں کہاں؟ اور پھر منہ چھپائے گھر میں پڑے رہتے۔ بچوں کی قسمت اور بُڑھیا کی چال سے حویلی بکنے کی نوبت نہ آسکی ورنہ سلیم میاں تو سسر کی عزت اور وقار کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دیتے۔ اور تو کسی بات کا خیال نہیں تھا بس ایک صدمہ دل کو پامال کر رہا تھا، وہ یہ کہ منی جان کی ماں نے انہی سلیم میاں کو جن کے قدموں تلے وہ پلکیں بچھاتی تھیں اپنے نوکروں سے دھکے دے کر باہر نکال دیا تھا اور منی جان جو سلیم میاں پر جی جان سے قربان تھی، کسی زمانے میں ان کے پیچھے زہر کھائے لیتی تھی، اس نے بھی سوکھا منہ بنا کر کا سا جواب دے دیا۔ ”میاں اگر جیب گرم کر کے آؤ گے تو سر پر بٹھائیں گے۔ مگر خالی مولی تو یہاں سے دھکے ہی ملیں گے۔“

سلیم میاں سر پکڑے پکڑے گھر تک آئے جیسے مُنّی نے بات نہ کی ہو، سر پر لٹھ رسید کر دیا ہو، مہینا بھر تک سوگ منایا مگر پھر...... دل کی اٹھتی ہوئی ترنگوں سے بر ما کر باہر نکل پڑے!

صبح سے لے کر شام تک کوئی سو دو سو چکر تو گلیوں کے لگاتے، تھک جاتے تو شبو میاں کے چبوترے پر آکر ستانے لگتے۔

محلے کی عورتوں اور لڑکیوں کا نکلنا دوبھر ہو گیا۔ وہ دہیاں جو سلیم میاں کے آگے ”میاؤں ٹیاؤں کیا کرتیں۔ بلی تمندی محلے کے احاطے میں آنکھ مچولی اور اونچا نیچا کھیلا کرتیں...... اب سر ڈھانپے آنکھیں نیچی کیے دبی دبی سہمی سی سامنے سے جاتیں۔ سلیم میاں ان کل کی بچیوں کو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے جیسے وہ کوئی عجیب چیز ہوں۔ یہ منہ بند کلیاں! سلیم میاں جھوم جھوم جاتے۔ مانو ان کو شراب کی بوتلوں کا نشہ بن پیے چڑھ گیا ہو۔

چبوترے پر ٹہلتے ٹہلتے گلے میں ایسی تکلیف ہو جاتی کہ بار بار کھنکھارتے، وہ بھی اس وقت جبکہ کوئی عورت یا لڑکی سامنے سے گزرتی۔

محلے کی بات تھی لوگوں نے بہت ضبط کیا مگر جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو غیرت مند باپوں نے لڑکیوں کی اور خوددار شوہروں نے اپنی بیویوں کی آمدورفت بند کر دی۔ بڑی بوڑھی عورتیں کبھی کبھار ایک دوسرے کے گھر چلی جاتیں۔

سلیم میاں منہ بند کلیوں اور شگفتہ پھولوں کی جگہ ان خزاں رسیدہ سوکھے ٹھنڈ درختوں کو دیکھتے تو خود بھی مرجھا کر رہ جاتے۔

کھچڑی بالوں کی سفیدی بڑھتی گئی۔ چہرے پر جھریوں کا جال بچھ گیا۔ ایک نہ دو تین تین جوان لڑکیوں کے بوجھ نے کمر کو جھکانا شروع کر دیا۔ لڑکا پروان چڑھا تو باپ کے قدم پہ قدم رکھنے لگا۔ لڑکیوں کے سر پر اگر نانی نہ ہوتیں تو شاید وہ بھی نچلی نہ بیٹھتیں...... نانی نے ایسا جکڑا تھا کہ کسمسا بھی نہ سکتی تھیں۔

بڑی بڑی رئیس زادیوں کو تو بر ملتے نہیں جب سے ملک کا بٹوارہ ہوا لڑکوں کا کال پڑ گیا تو بھلا سلیم میاں کے یہاں داماد کہاں سے آتے، مانا کہ ان کی لڑکیاں ایسی تھیں کہ اگر چراغ لے کر ڈھونڈھا جاتا تو ایک ایسی نہ ملتی، مگر قسمت کی کھوٹی نکل گئیں۔ سلیم میاں کے نام ہی سے لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے۔

”نا بابا؟ جیتی جاگتی مکھی کون نگلے! ایسے باپ کی بیٹیوں کا کیا اعتبار!

سلیم میاں خوب سمجھتے تھے کہ انہی کے کارن لڑکیوں میں گھن لگا جا رہا ہے کوئی سمیٹنے کو تیار نہیں، مگر پروا کس کو تھی۔

کچھ دنوں سے رات کی نیند بھی حرام ہو گئی۔ دن کے علاوہ اکثر رات گئے تک ٹہلتے دیکھے گئے۔

فارس الشدیاق

احمد بن یوسف ایک عرب مصنف اور صحافی بیروت میں پیدا ہوا۔ قاہرہ کے مارونی اسکول میں تعلیم پائی۔ کچھ عرصے تک مصر کے سرکاری اخبار ”الوقائع لمصریہ“ میں کام کیا۔ کچھ عرصہ مالٹا میں قیام کیا اور وہاں کے حالات پر ایک کتاب لکھی۔ 1850 کے بعد چند برسوں میں پیرس کا سفر کیا اس کے بعد وہ لندن گیا اور ایک سفرنامہ لکھا جس میں عربوں اور دوسری اقوام کا ناقدانہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ لندن سے استنبول گیا اور وہاں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ 1860ء میں اس نے ترکی حکومت کی مالی اعانت سے ایک ہفت روزہ اخبار ”الجوائب“ جاری کیا جس میں اس نے اسلام کی حمایت کو اپنا موقف قرار دیا لیکن ساتھ ہی اس نے مسلمانوں کو یورپی علوم سے بھی روشناس کرایا۔ 1884ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلیم اس اخبار کا پرانا معیار قائم نہ رکھ سکا اور کچھ عرصہ بعد اخبار بند ہو گیا۔

مرسلہ: نہال اصغر، لاہور

محلے والے چوکنا ہوئے۔ ایسے آدمی کا کیا ٹھیک راتوں رات کسی گھر میں پھاند پڑے...... جوان جہان لڑکیاں! خدا نہ کرے اونچ نیچ ہو جائے تو چہرے پر سے یہ شرافت کا اشتہار ایک حملے ہی میں اتر جائے۔ بد اچھا پر بدنام برا! دبے دبے الفاظ میں کہا گیا۔ سلیم میاں گرم ہو کر بولے۔ ”میں سڑک پر ٹہلتا ہوں کسی کو کیا؟“

سب چپ ہو کر اپنی اپنی فکر میں لگ گئے۔ دروازوں میں تالے لگنے لگے۔ چھ بجے شام ہی سے کواڑ بند ہو جاتے کیا مجال جو کوئی کسی کام یا بات کے لیے بھی کھلوائے۔

شبو میاں سلیم میاں کے دوست تھے، ہم نوالہ اور ہم پیالہ۔ مگر چپکے چپکے اپنی جوان سالی اور بھانجی کو کمرے کے اندر سلا کر قفل بند کرنے لگے اور چابی اپنے نیفے میں اڑس لیتے۔ چھ بجے شام کی بند صبح سات بجے کھولی جاتیں۔

سلیم میاں کی بے تابی کا راز کھل ہی گیا۔ سلیم میاں رحمت خاں کی لڑکی کے فراق میں راتیں آنکھوں میں کاٹ رہے تھے۔ نوراں ان کی بڑی لڑکی مہ لقا کے ساتھ کی تھی

جب تک چھوٹی رہی مہ لقا کے گھر گڑیوں کا بیاہ رچاتی رہی اِدھر سر پر اوڑھنی پڑی اُدھر باپ نے مہ لقا کے گھر آنا جانا بند کردیا۔ پھر وہ اپنی خالہ کے ساتھ تھیم پور چلی گئی۔

پورے چھ برس بعد وہ واپس آئی تو پہلے کی نوراں سے زمین و آسمان کا فرق تھا جہاں پیر رکھ دیتی زمین کی چھاتی بھی دھڑک اٹھتی، لمبی چوڑی، سرخ و سفید چہرہ، ٹھوس بدن ایسا کسا بندھا خیال آتا کہ اگر انگلی مار دو تو دھن دھن کی آواز نکلے۔ سلیم میاں نے ایک روز اس کو دیکھ لیا تو حیران ہی رہ گئے کل کی لونڈیا کیچلی بدل کر ایسی نکلی کہ سلیم میاں کے منہ میں پانی ہی چھوٹ گیا۔ وہ بھول گئے کہ خود مہ لقا بھی ایسا سنہرا اور سرخ سیب بن چکی تھی جسے دیکھ کر نوراں کے باپ بھی للچا اٹھتے، وہ بھول گئے کہ یہی نوراں ان کی گود میں کھیل چکی ہے۔ کل کی دھول اُڑاتی نوراں نشہ بن کر ان کے دل و دماغ پر چھاتی چلی گئی...... یہ نشہ...... جس طرح اترا وہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے بڑی انوکھی ہے، جس نے سلیم میاں کو ایسی پٹخنی دی کہ سلیم میاں کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ بات جس نے سلیم میاں کو یکسر بدل دیا۔ بڑے وحشی کو رام کیا تھا اس ایک لفظ نے۔ برسات کی اندھیری رات لیکن بڑی نشیلی رات تھی وہ! سلیم میاں اگر اس رات کا لطف حاصل کرنے باہر نہ نکل پڑتے تو بھلا اور کون نکلتا۔ حسبِ معمول وہ رحمت خاں کے مکان کا طواف کرکے ناکام لوٹ رہے تھے کہ اچانک وہ ایک دھیمی لیکن سریلی چیخ سن کر ٹھٹک گئے۔

انہوں نے مڑ کر دیکھا، موتی مسجد کے پاس دو تاریک سائے حرکت کررہے تھے۔ سلیم میاں کانپ سے گئے! رات کا وقت! سناٹا اور گہرا اندھیرا! اچانک دو میں سے ایک سایہ بھاگ نکلا...... اور اس کے پیچھے دوسرا... قدموں کی بھاری چاپ اور...... پھر کوئی چیخا! ''ارے بچاؤ!'' آواز کسی عورت کی تھی۔ سلیم میاں بڑی ہمت کرکے بڑھے۔ ''کون ہے کیا بات ہے؟'' ان کی آواز دور تک پھیل گئی، پیچھے والا سایہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ''بچاؤ مجھے اس بدمعاش سے۔'' آواز نوراں کی تھی۔ انہوں نے ٹارچ چمکائی اور نوراں کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ سلیم میاں کا پورا جسم پسینے میں ڈوبنے لگا! ''کون؟ یہ کون ہے نوراں؟''

نوراں سسکتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔ ''یہ غنڈا... بہت دنوں سے میرے پیچھے لگا تھا باپ جی۔'' سلیم میاں کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں، انہیں لگا دور سے مہ لقا پکار رہی ہو۔ ''باپ جی! باپ جی!''

تیکھے دبلے سلیم میاں میں خدا جانے کہاں سے اتنی قوت آگئی۔ بجلی کی طرح وہ لپکے اور دوسرے لمحے وہ بھاگتا ہوا سایہ ان کی گرفت میں پھڑپھڑانے لگا۔ لات، گھونسے، تھپڑ اور گالیاں۔ ''حرامزادے، غنڈے، بدمعاش، سؤر کی اولاد!'' وہ بے سدھ پٹتا رہا مگر پھر جانے کیسے نکل بھاگا۔ سلیم میاں ہانپ رہے تھے ان کے جسم میں گرم گرم لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اندھیری رات! گہری خاموشی! تنہا نوراں اب؟؟ اب؟؟ موقع!!! مدت کی آرزو۔ وہ بڑھے۔ مگر جیسے کوئی ان کے کان کے پاس چلانے لگا۔ ''باپ جی، باپ جی'' وہ لرز گئے۔ ''یہ غنڈا بہت دنوں سے میرے پیچھے پڑا تھا باپ جی!'' نوراں ان کے جذبات سے بے خبر روتی ہوئی کہنے لگی۔ ''میں بکری باندھنے پچھواڑے آئی۔ معلوم نہیں کیسے اندر گھس آیا۔ ابا باہر گئے ہیں گھر پر اماں ہیں سو بخار میں پڑی ہیں، بدحواس ہوکر میں گھر سے نکل بھاگی۔ اور یہ کمینہ! تم آگئے باپ جی! فرشتہ ہو تم! فرشتہ!''

سلیم میاں کے کانوں پر کسی نے شربت کی پچکاری ماری ہو۔ ایسا مقدس! ایسا معصوم لفظ عطر میں ڈوبا ہوا شہد میں لتھڑا ہوا۔ ان کا سارا وجود روشنی میں نہا گیا۔ چاروں طرف جیسے اجالا پھٹ پڑا۔ ان کی دھندلی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

ایسا لگا وہ اچانک ہلکے پھلکے سے ہوکر آسمان پر تیرنے لگے ہوں، نرم نرم روئی کے گالوں جیسے بادلوں کے اندر تیرتے ہوئے وہ سلیم میاں نہیں تھے کوئی اور بولا تھا۔ نرم اور شہدیلی آواز میں سے لوچ اور انوکھے پیار سے شرابور لہجے میں بولے۔ ''چل بٹی! تجھے گھر پہنچادوں!'' اور پھر اگلے دن انہوں نے ایک فیصلہ کیا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا مگر ان کی ایک ہی ضد تھی۔ یہاں ان کی بیٹیوں کی قسمت پر ان کی بدنامی کا گہن لگا ہے۔ ان کی ڈولیاں نہیں اٹھیں گی۔ بالآخر ان کی ساس نے بھی نواسیوں کی وجہ سے سپر ڈال دیا۔ حویلی بکی اور وہ سب کراچی آگئے۔ کراچی آکر انہوں نے پاکستان کوارٹرز میں چھوٹی سی دکان کھول لی، پنج وقتہ نمازی بن گئے۔ قریب کی مسجد میں تہجد تک پڑھنے جاتے۔ وہیں اختر سے ملاقات ہوئی دوستی بڑھی اور انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کے لیے ان کی دونوں بیٹیوں کو مانگ لیا۔ آپ سلیم میاں سے میرا رشتہ سمجھ گئے ہوں گے۔ نہیں سمجھے تو سمجھ لیں میں ان کی بڑی بیٹی کا بڑا بیٹا ہوں، حاجی سلیم کا نواسہ۔

پیاسا

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم!

امید ہے کہ بخیریت ہوں گے، میرے دوست کی سرگزشت بھیج رہا ہوں اگر پسند آجائے تو یہ دکھ بھری کہانی کسی شمارے میں لگادیں بہت مہربانی ہوگی۔

امانت خان

(کراچی)

ماجد نام تھا اُس کا۔ وہ ایک خوبصورت آدمی تھا۔ سرخ و سفید رنگ، اس پر ہلکی ہلکی بھوری مونچھیں۔ چھریرا جسم، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بہت خوش اخلاق تھا۔

میں اس زمانے میں ملیر میں رہا کرتا تھا جہاں چھوٹے چھوٹے کوارٹر ہوا کرتے تھے۔ اسی اسی گز کے۔ ماجد ان ہی کوارٹروں میں سے ایک میں کرائے پر آیا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔

وہ زمانہ ایسا تھا کہ کسی اکیلے آدمی کو شک اور شبے کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا کہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے۔ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

سیدھی سادی زندگی تھی۔ اس لیے جرائم کی شرح بھی بہت کم تھی اور اکیلے آدمی کو بھی کرائے پر مکان مل جایا کرتا تھا۔ جبکہ آج تو فیملی والوں کو بھی بہت چھان پھٹک کر مکان دیا کرتے ہیں۔

بہرحال وہ آکر رہنے لگا۔ چونکہ وہ ایک خوش اخلاق اور ملنسار انسان تھا۔ اسی لیے محلے والوں سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ خاص طور پر مجھ سے۔

اس شخص کو بہت سی دل چسپ کہانیاں یاد تھیں۔ وہ ہندوستان سے پاکستان بہت دیر میں آیا تھا۔ پہلے وہ کان پور میں رہا کرتا تھا۔ چونکہ اس کی باتیں بہت مزے کی ہوا کرتیں۔ اس لیے ہم اس سے کان پور کی باتیں سنا کرتے۔ وہاں کے داداؤں کے قصے، پتنگ بازی کے مقابلے۔ وہاں کی مجلسی زندگی وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ وہ ایسا آدمی تھا جس کے ساتھ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ایک شام میں نے اس سے پہلی بار اس کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ ”یار ماجد بھائی! ایک بات بتاؤ تمہارے گھر والے کہاں ہیں۔“

”کان پور میں۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ سب وہیں رہ گئے اور میں اکیلا پاکستان آگیا ہوں۔“

”خیریت! ان کے ساتھ کیوں نہیں رہ گئے یا انہیں اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے میرا عشق یہاں تک لے آیا ہے۔“ اس نے پہلی دفعہ بتایا۔

”عشق!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کس سے عشق کرتے تھے۔“

”کرتا نہیں تھا بلکہ کرتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ میرے دھیان سے ایک پل کے لیے بھی الگ نہیں ہوتی ہے۔“

”لیکن وہ ہے کہاں۔“

”اسی کراچی میں۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ ہجرت کر کے یہاں آگئی ہے اور میں اس کے پیچھے سب کو چھوڑ کر آگیا ہوں۔“

”کیا تم اس سے ملتے نہیں ہو؟“

”بھائی میرے...... بس یہ ایک کہانی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ کان پور کی گلیوں اور محلوں میں پروان چڑھنے والی محبت کی داستان ہے۔“

”ماجد بھائی، مجھے ضرور سناؤ۔“

”کیوں۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”کیا اس پر کوئی کہانی لکھنی ہے؟“

”ہوسکتا ہے کبھی اس کی بھی نوبت آجائے۔“ میں نے کہا۔

اور اب برسوں کے بعد اس کی نوبت آگئی ہے۔ اسی لیے میں ماجد اور اس کے بے پناہ عشق کی کہانی لکھ رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ ماجد اب کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ لیکن اس نے جو عشق کی کہانی سنائی وہ آج بھی میری یادداشت میں زندہ ہے۔

اس نے یہ کہانی اس رات نہیں سنائی بلکہ کئی دنوں کے بعد سنائی تھی۔

”یہ کہانی اس وقت کی ہے، جب رادھا کالج جایا کرتی تھی۔ رادھا میرے پڑوس میں رہنے والی ایک ایسی لڑکی تھی جس کے ساتھ کھیل کود کر میں نے اپنا بچپن گزارہ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے تھے۔ ہندو اور مسلمان کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ اس کے والد میرے والد کے دوست تھے۔ میں رادھا کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کے ذریعے انیلہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھا کرتی تھیں۔“

میرے اور رادھا کے مکان کی چھتیں ایک دوسرے سے ملتی تھیں۔ مجھے پتنگ بازی کا شوق تھا۔ شام ہوتے ہی میں اپنی چرخی اور پتنگیں لے کر چھت پر چلا جاتا اور پتنگوں کے پیچ لڑایا کرتا۔ کبھی کبھی رادھا بھی اپنی چھت پر آکر میری حوصلہ افزائی کیا کرتی۔ ”واہ واہ! شاباش، کھینچو، ڈھیل دو، دیکھو وہ کالی والی جانے نہ پائے۔ اسے کاٹنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

ایک شام رادھا کے ساتھ میں نے ایک اور لڑکی کو دیکھا جو اس کی طرح مجھے بڑھاوے دے رہی تھی، وہ ایک دلکش اور چنچل قسم کی لڑکی تھی۔

رادھا نے اس کا تعارف انیلہ کہہ کر کروایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی پڑھا کرتی تھی۔ دونوں میں بہت دوستی تھی۔ بہر حال رادھا نے ہم دونوں کی دوستی کرادی۔

اب انیلہ ہفتے میں کم از کم دو بار رادھا کے گھر آنے لگی۔ دونوں لڑکیاں چھت پر آجاتیں جہاں میں پتنگ اُڑانے میں مصروف رہتا۔

چھوٹی سی منڈیر تھی۔ انیلہ منڈیر پھلانگ کر میرے پاس آجاتی۔ اس دوران رادھا ہماری چوکیداری کیا کرتی۔ کیا خوبصورت دن تھے اور کیسی کیسی دلکش قسم کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہمارے ساتھ ہوا کرتیں۔

ہم تینوں کبھی کبھی برلاس کے ریستوران میں چائے پینے اور فلمی گانے سننے بھی چلے جایا کرتے۔ اس زمانے میں گراموفون ریکارڈ رہوا کرتے تھے۔

برلاس کے ریستوران میں فرمائشی گانے سنوائے جاتے۔ ہم بہت دیر تک رفیع اور لتا کے پیار بھرے گانے سنا کرتے۔

ماجد اپنی کہانی سناتے سناتے اپنے ماضی میں سفر کرنے لگا تھا۔ اس کا خوبصورت رومان بھرا ماضی اس کی آنکھوں میں اپنی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔

اس رات ماجد آگے اور کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بولتے بولتے آنسو آگئے تھے۔ اس لیے میں نے بھی اس سے مزید بات نہیں کی۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنی داستان پھر سنانی شروع کی۔ ”میں اور انیلہ بہت آسانی سے ایک دوسرے کے ہوسکتے تھے۔ ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہمارے گھر والے بھی تیار ہوجاتے۔ لیکن ایک رکاوٹ یہ تھی کہ انیلہ نے ایک شرط سامنے رکھ دی تھی کہ میں اپنی محبت اور محبوبہ کو چھوڑ دوں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیسی محبت کیسی محبوبہ! ماجد بھائی، تمہاری محبت تو انیلہ تھی۔ یہ دوسری محبت کہاں سے آگئی۔“

”دوسری محبت میری موسیقی تھی۔“ اس نے ایک اور انکشاف کیا۔ ”میں پنڈت ہری پرشاد سے گلوکاری سیکھ رہا تھا۔ یہ جنون تھا میرا۔ اور ان کا خیال تھا کہ میں بہت آگے جاؤں گا۔“

”کمال ہے! تم نے آج تک اس کا نہ تو ذکر کیا اور نہ ہی میں نے تمہاری گائیکی سنی۔“

”ہاں، میں نے بتایا نہیں ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”اس موضوع پر کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔“

”خیر، تم انیلہ کے بارے میں کہہ رہے تھے۔“

”اس نے یہ شرط لگادی تھی کہ میں گلوکاری چھوڑ دوں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ شوق مجھے راس نہیں آئے گا۔ لیکن میرے لیے یہ ناممکن تھا۔ بلکہ دونوں ہی ناممکن تھے۔ نہ تو میں انیلہ کو چھوڑ سکتا تھا اور نہ موسیقی کو۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ تم مجھے اسی طرح قبول کرلو جس طرح میں ہوں۔ میں دونوں کو وقت دوں گا۔ تم کو بھی اور اپنی گائیکی کو بھی۔ لیکن وہ نہیں مانی۔ دراصل یہ شرط اس کی بھی نہیں تھی بلکہ اس کے والدین کی تھی۔ اس بات پر ہمارے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہوتا چلا گیا۔

ایک دن رادھا میرے گھر آئی۔ وہ بہت اداس ہو رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”ماجد بھائی، شاید تم کو یہ نہیں معلوم کہ میری سہیلی مجھے چھوڑ کر جارہی ہے۔“

”جارہی ہے۔ کہاں جارہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پاکستان۔“ اس نے بتایا۔ ”ان کے انتظامات مکمل ہوگئے ہیں۔ سامان بھی بندھ گیا ہے۔ وہ میرا اور تمہارا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔“

”ایسا نہیں ہوسکتا۔“ میں پاگل سا ہونے لگا تھا۔ ”وہ اس طرح نہیں جاسکتی۔ میں اسے نہیں جانے دوں گا۔“

”وہ جارہی ہے۔“ رادھا نے کہا۔ ”تم سے تو اتنا بھی نہیں ہوسکا کہ شادی کر کے اس کو روک سکو۔ تم تو اپنی سرسوتی کو منانے میں لگے ہوئے ہو اور تمہاری محبت تم سے روٹھ کر جارہی ہے۔“

”رادھا، میں اپنی جان دے دوں گا۔“

”اس سے کیا ہوگا؟ کیا اس کا جانا رک جائے گا۔“

”میں اس کے ساتھ ہی پاکستان چلا جاؤں گا۔“

”لیکن اپنی سرسوتی کو تم نہیں چھوڑو گے۔ اسی طرح گاتے رہو گے۔ کیوں؟“

”نہیں، انیلہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔ معافی مانگ لوں گا موسیقی سے۔ اپنے سُروں کو تیاگ دوں گا۔“

”تو جلدی کرو۔ جاؤ اس کے پاس۔“ رادھا نے کہا۔ ”یہ خبر اسے سنادو۔“

”لیکن افسوس! میں نے بہت دیر کردی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ انیلہ کے گھر والے یوں ہی نہیں جارہے بلکہ انہوں نے فون پر پاکستان میں اس کا نکاح کردیا ہے اور انیلہ اب کسی اور کی ہوکر جارہی ہے۔ وہ چلی گئی اور میں پاگل ہوکر کان پور کی گلیوں میں بھٹکتا رہا۔ وہ چھت اداس ہوگئی جہاں وہ میری پتنگوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتی۔ وہ ریستوران اداس ہوگیا جہاں ہم بیٹھ کر کھایا پیا کرتے تھے۔ وہ ماحول اداس اور وہ سڑکیں اداس ہوگئیں جن پر گھنٹوں بھٹکتے رہتے۔ وہ شخص تو سارے شہر کو ویران کرگیا۔“

”ہاں، اس دوران یہ ہوا کہ میں نے اپنی پہلی محبوبہ یعنی موسیقی کو زیادہ وقت دینا شروع کردیا۔ ظاہر ہے اب میرا سارا وقت صرف اس کے لیے تھا۔ اس کے علاوہ میں اور کس کی آغوش میں پناہ لیتا۔ پھر جب دل کی بے کلی بہت زیادہ ہوگئی تو میں بھی پاکستان آگیا۔ یہ ہے میری کہانی۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، جانتا ہوں میں۔ اس کا پتا بھی معلوم ہے۔“

”کیا تم نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔“

”نہیں، کیا کرنا ہے اس سے مل کر۔ البتہ اپنی موسیقی سے روز ملتا ہوں۔ کیونکہ دل کی تسلی کے لیے بس یہی میرے ساتھ رہ گئی ہے۔“

”لیکن ماجد بھائی، میں نے تو کبھی تمہاری آواز نہیں سنی۔“ میں نے کہا۔

”میں رات کے اندھیرے اور سناٹے میں میدان میں جا کر اپنے سُروں کو جگایا کرتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”اس لیے کسی کو معلوم نہیں ہو پاتا۔“

"کیا مجھے نہیں سناؤ گے۔"

"کیوں نہیں۔ آج ہی رات تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔" ماجد نے کہا۔ "لیکن یہ مت کہنا کہ میری نیند خراب کردی۔"

"بے فکر رہو۔ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے بھی سننے کا بہت شوق ہے۔"

اسی رات ماجد نے میرے گھر آکر مجھے جگادیا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ اس طرح گہری نیند سے اٹھائے جانا بہت ناگوار تو گزرا تھا لیکن میں اس کی آواز سننے کے شوق میں اس کے ساتھ ہولیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی سرسوتی دیوی نے اس پر کیسی مہربانیاں کی ہیں۔

اس وسیع و عریض میدان میں کرکٹ کی پچ بنی ہوئی تھی۔ ہم اس پر جاکر بیٹھ گئے۔ اس وقت وہاں بے پناہ خاموشی تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان پر چاند پوری طرح روشن تھا۔

بہت خوبصورت ماحول تھا۔ اس وقت تک مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ماجد کی آواز واقعی اتنی خوبصورت ہوگی۔ اس نے رات کا راگ مالکوس شروع کردیا۔ ایک فلمی بھجن تھا۔ "من تڑپت ہری درشن کو آج" نوشاد صاحب کی کمپوزیشن میں۔

میں گنگ ہوکر رہ گیا تھا۔ کیا آواز تھی اس کی۔ دل میں اتر جانے والی۔ بے خود کردینے والی۔ ایسی آواز میں نے کم ہی سنی ہوگی۔ واقعی ماجد نے سرسوتی دیوی سے محبت کا حق ادا کردیا تھا۔

اس نے استاد امانت علی خان کی بھی دو چار چیزیں سنائی اور میں پاگل ہوکر رہ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ "ماجد مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری آواز میں اتنا جادو ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اب تم ہی بتاؤ، کیا سُروں سے میری دوستی نہیں ہے؟ کیا میں موسیقی کو ترک کرسکتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا۔ "کاش، تمہاری انیلہ کی سمجھ میں یہ بات آجاتی کہ تم ایک انتہائی سچے فنکار ہو۔ بیجو کی طرح، تان سین کی طرح۔"

"لیکن مجھے تو کسی نے نہیں سمجھا۔" ماجد پھر اداس ہونے لگا۔ "بہرحال سب کچھ چھوٹ چکا ہے۔ لیکن میں نے موسیقی سے اپنا رشتہ بحال ہی رکھا ہے۔"

"تمہیں بحال رکھنا ہی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "خدا نے تمہیں بہت بڑی نعمت دی ہے۔ اس کو سنبھال کر رکھنا۔"

اس کے بعد اس نے یہ معمول بنالیا۔ وہ ہفتے میں دو تین راتیں مجھے ضرور اپنے ساتھ لے لیتا اور ہم اس میدان میں آجاتے۔

پھر اس کی مدھر تانیں فضاؤں میں گونجنے لگتیں۔ ہر طرف سے جیسے ہوائیں اس کے راگ سننے کو دوڑی چلی آتیں۔ میں آنکھیں بند کرکے نہ جانے کن جہانوں کی سیر کرنے لگتا۔

ایک دن اس نے مجھے بتایا۔ "بھائی، اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ نہ جانے وہ کیسی ہے۔ کس حال میں ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس کے پاس جاؤ اور اس کی خیریت معلوم کرکے آجاؤ۔"

"لیکن مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تمہیں دور سے اس کا گھر دکھادوں گا۔ وہ ناظم آباد میں رہتی ہے۔"

"میں وہاں جاکر کہوں گا کیا۔ نہ وہ مجھے جانتے ہیں اور نہ میں ان کو جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرے یار، بس تم کسی بہانے اس سے ایک بار مل لو۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس کو میرا اسلام کہنا اور اس کی خیریت معلوم کرلینا بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔"

"پھر وہی بات، میں اس سے کہوں گا کیا؟"

"کچھ بھی کہہ دینا۔" اس نے کہا۔ "یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں، بس تم میرا یہ کام کردو۔"

ساجد نے اتنی التجا کی کہ میں اس کے ساتھ ناظم آباد کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس زمانے میں ناظم آباد شہر کا ایک پوش علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ پڑھے لکھوں کی رہائش تھی وہاں (اور آج بھی ہے)

ماجد پر کوچۂ دلدار میں داخل ہوتے ہی بے قراری کی ایک کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ نہ جانے وہ بے چارہ اس کوچے میں کتنے برسوں کے بعد آیا ہوگا۔

کچھ دور اس گلی میں آنے کے بعد اس نے ایک دو منزلہ خوبصورت سے مکان کی طرف اشارہ کردیا۔ "وہ رہا مکان۔ میں گلی کے کونے والے ہوٹل میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

وہ چلا گیا اور اس وقت میرے ذہن میں انیلہ سے ملنے کا ایک بہانہ آگیا۔ یہ اس کے شوہر کا گھر تھا۔ وہ کانپور کی رہنے والی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اس کے کچھ رشتے دار آج بھی کانپور میں رہتے ہوں۔ ظاہر ہے اس کا شوہر اس کے رشتے داروں کو

تو جانتا نہیں ہوگا۔

میں ان سے یہ کہہ سکتا تھا کہ میں رشتے میں انیلہ کا کزن لگتا ہوں اور اس سے ملنے آیا ہوں۔ اس خیال نے دل کو تقویت دی اور میں نے دروازے پر دستک دے دی۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں انیلہ سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں رشتے میں ان کا کزن لگتا ہوں۔ کانپور سے آیا ہوں۔"

"اچھا۔" اس نے ایک طویل ہنکاری لی۔ "تم اس کے کزن لگتے ہو اور تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ اس کا پتا تمہیں معلوم ہوگیا اور سیدھے یہیں چلے آئے۔"

"واقعی مجھے کچھ نہیں معلوم۔" میں گڑبڑا گیا تھا۔ "یہ ایڈریس تو میں نے کہیں سے حاصل کیا تھا۔"

"خیر، جو بھی ہو۔ اب ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "اسے طلاق ہوگئی ہے۔ وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"کیا۔" مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ "چلی گئی ہے۔ کہاں؟"

"یہ ہمیں نہیں معلوم۔ تم اس کے کزن ہو تو اس کے گھر والوں سے معلوم کرو۔"

اتنا کہہ کر اس نے دروازہ بند کردیا۔ میں چند لمحوں تک حیرانی کے عالم میں کھڑا رہا پھر تیزی سے واپس ہولیا۔ بے چارہ ماجد اسی ہوٹل میں بہت بے چینی سے میرا انتظار کررہا تھا۔

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک سانس میں درجنوں سوالات کر ڈالے۔ "بتاؤ کیسی ہے وہ۔ کس حال میں ہے۔ میرے لیے کیا کہہ رہی تھی؟"

"ماجد بھائی، تمہارے لیے ایک بری خبر بھی ہے اور اچھی خبر بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"خدا کے لیے جلدی سناؤ یار۔ سسپنس میں نہ رکھو۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ یہ گھر چھوڑ چکی ہے۔" میں نے بتایا۔ "وہ اب یہاں نہیں رہتی۔"

"کیا؟"

"ہاں، کیونکہ اسے طلاق ہوچکی ہے۔"

"طلاق ہوچکی ہے۔" بے چارہ ماجد یہ سن کر بوکھلا گیا تھا۔ "کیوں طلاق ہوئی ہے اس کو؟ وہ تو بہت اچھی ہے۔ پھر اس کو طلاق کیوں ہوگئی؟ کس لیے طلاق ہوگئی۔ وہ ایسی تو نہیں ہے کہ کوئی اسے طلاق دے دے۔"

"اب یہ سب اس کے گھر والوں سے جاکر معلوم کرو۔" میں نے کہا۔ "تمہیں ان کا ایڈریس تو معلوم ہوگا۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔" ماجد نے بتایا۔ "وہ یہاں سے قریب ہی کچھ فاصلے پر، فردوس کالونی میں۔"

"تو آؤ، اس کے گھر چلتے ہیں۔"

ہم وہاں سے پیدل ہی چل پڑے۔ اس زمانے میں پیدل چلنا آج کی طرح دشوار نہیں تھا۔ کیونکہ گاڑیوں کی اتنی بھرمار نہیں ہوتی تھی۔

فردوس کالونی کا فاصلہ زیادہ بھی نہیں تھا۔ ہم اس مکان کے سامنے پہنچ گئے جو ماجد کی محبوبہ انیلہ کے والدین کا تھا... وہ بھی ایک چھوٹا سا مکان تھا۔

"وہ دیکھو بھائی۔" اس نے اشارہ کیا۔ "وہ رہا اس کا مکان۔ اب تم جاؤ۔"

"ماجد بھائی، میرا خیال ہے کہ تم بھی چلو۔" میں نے کہا۔ "اب تو بے چاری کو شوہر سے طلاق ہوچکی ہے۔ تم ہندوستان سے ایک دوسرے کو جانتے چلے آئے ہو۔ اس لیے اب اس سے ملنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

بے چارہ ماجد بہت مشکل سے راضی ہوا تھا۔

ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔ ماجد کی تو ہمت نہیں ہورہی تھی۔ دروازے پر میں نے ہی دستک دی تھی۔ ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا تھا۔

وہ انیلہ کا باپ ہی ہوسکتا تھا۔ اس سے کچھ کہنے سننے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کیونکہ اس نے ماجد کو پہچان لیا تھا۔ اس نے کچھ سنے بغیر دروازہ کھول دیا۔ "آؤ، تم دونوں اندر آجاؤ۔"

عجیب فضا تھی اس گھر کی۔ بہت بوجھل سی، ہم اندر جاکر بیٹھ گئے۔ وہ آدمی بھی ہمارے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ اس کی ساری توجہ ماجد کی طرف تھی۔ وہ اسی کو دیکھے جارہا تھا۔

بہت دیر تک ایک بے چین کردینے والی خاموشی ہمارے درمیان رہی تھی۔ پھر اس نے ماجد سے پوچھا۔ "ہاں میاں، اب کیوں آئے ہو؟"

"جناب، بہت دنوں سے آپ لوگوں کی خیریت نہیں معلوم ہوسکی تھی۔" ماجد نے کہا۔ "آج اس طرف آیا تھا سوچا کہ معلوم کرتا چلوں۔"

"بہت دیر سے آئے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "انیلہ کا تو انتقال ہوچکا ہے۔"

"کیا؟" ماجد کے ساتھ ساتھ خود میں بھی شاک میں

آ گیا تھا۔

اس دوران انیلہ کی بوڑھی ماں بھی سامنے آ گئی۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق انیلہ کی موت کا ذمے دار ماجد ہی تھا۔

"ہاں، وہ بدنصیب تم ہی کو یاد کرتے کرتے مر گئی۔" اس کی ماں نے کہا۔ "اپنے شوہر کے سامنے بھی وہ تمہارا ہی ذکر کیا کرتی۔ اس لیے اس سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ اس پر سختیاں کرنے لگا لیکن اس نے تمہارا ذکر نہیں چھوڑا۔ وہ تمہارا ہی نام لیا کرتی تھی۔ ہم نے بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے دل و دماغ پر تو سوائے تمہارے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ آخر اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔"

عورت اتنا بتا کر رونے لگی تھی۔ کمرے کی فضا بہت ہی بوجھل ہو گئی تھی۔ ایک عجیب سا دکھ تھا جس کے احساس نے خود مجھے بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

ماجد رو رہا تھا۔ خود میری آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ کیسی تھی یہ داستان۔ پھر اس کے بوڑھے باپ نے ماجد سے کہا۔ "جانتے ہو میاں، مرنے والی کی آخری خواہش کیا تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر تم سے ملاقات ہو جائے تو یہ پیغام دے دوں کہ تم اسے تو حاصل نہیں کر سکے لیکن اپنی پہلی محبت یعنی موسیقی کو پوری طرح اپنا لو۔ اس سے منہ نہ موڑ لینا۔ بلکہ اس میں خوب ترقی کرنا اور تمہیں ترقی کرتا دیکھ کر اس کی روح کو سکون ملتا رہے گا۔"

ماجد روتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔ میں راستے بھر اسے تسلیاں دیتا رہا تھا۔ کئی دنوں تک اس کی حالت غیر رہی تھی۔ اس نے عشق میں ایسی ناکامی دیکھی تھی جو شاید بہت کم کے حصے میں آئی ہو۔

پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "میں مرنے والی کی خواہش کا احترام کروں گا۔ اب میں صرف اور صرف موسیقی کا ہوں۔ میرے لیے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اس کی روح کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد اس کی ویسی حالت ہو گئی جیسی آپ نے شاید فلم بیجو باورا میں دیکھی ہو۔ وہ باورا ہی ہو گیا تھا۔ اس کی تانیں پورے محلے میں گونجا کرتیں۔

شام ہوتے ہی لوگ اسے گھیر لیتے۔ وہ غزلوں سے لے کر ٹھمری دادرا سب کچھ سنایا کرتا۔ احسان نام کا ایک طبلہ نواز بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ جب ان دونوں کی سنگت ہوتی تو لطف ہی آ جاتا۔

یہ سب تو تھا لیکن اب تک وہ مرحلہ نہیں آیا تھا جس کو ترقی کرنا کہتے ہیں۔ اس کا یہ مقام نہیں تھا کہ وہ شہر کے گلی کوچوں میں اپنی آواز کا جادو جگاتا پھرے۔

اسے تو بہت آگے جانا تھا۔ بہت آگے لیکن کوئی چانس نہیں مل رہا تھا۔ پھر اسے ایک چانس مل ہی گیا۔

ریڈیو پاکستان کراچی سے اس کے نام دعوت نامہ آیا تھا کہ وہ آ کر آڈیشن دے دے۔ نہ جانے کس طرح اس کی آواز کے چرچے ریڈیو تک پہنچ چکے تھے۔

اس دن صرف وہی نہیں بلکہ ہم سب بہت خوش تھے۔ اس نے آڈیشن کے لیے استاد امانت علی کی گائی ہوئی ایک ٹھمری کا انتخاب کیا تھا۔

اسے تیاری کیا کرنی تھی وہ تو ویسے ہی پرفیکٹ تھا پھر بھی اس نے احسان کے ساتھ اس کے طبلے کی سنگت میں کئی دنوں تک ریاض کیا تھا۔

اس دن جب اسے جانا تھا وہ بہت خوش تھا۔ ویسے بھی وہ خوبصورت آدمی تھا۔ اس نے کرتہ شلوار اور ایک واسکوٹ پہن رکھی تھی۔ وہ مکمل فنکار دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ہم سبھوں کی دعائیں لے کر رخصت ہوا۔ لیکن وہ آڈیشن کے لیے کبھی نہیں پہنچ سکا۔ راستے ہی میں نہ جانے کس طرح اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

ہمیں یہ خبر ملی تو ہم دنگ رہ گئے۔ پتا چلا کہ جناح اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ ہم نے اسپتال پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ آپریشن تھیٹر میں تھا۔ بہت دیر تک اس کا آپریشن ہوتا رہا تھا۔ پھر جب اسے تھیٹر سے باہر لایا گیا تو بے ہوشی کی حالت میں تھا۔

ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کی جان تو بچ گئی ہے لیکن اس حادثے کے نتیجے میں اس کے ووکل کورڈ کو ایسا دھچکا پہنچا ہے کہ یہ کبھی بول نہیں سکے گا۔

ہم یہ سن کر سناٹے میں رہ گئے۔ موسیقی کا وہ پجاری گانا تو درکنار اب بولنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا۔ ایک بے رحم حادثے نے اس کی آواز تک اس سے چھین لی تھی۔ نہ جانے اس میں خدا کی کیا مصلحت تھی۔ ایسا عاشق اور عشق میں ایسی ناکامیاں ہم نے صرف سنی ہوں گی لیکن ماجد کی صورت میں ایک دردناک کہانی ہمارے سامنے تھی۔

میں نہیں جانتا کہ ماجد اب کہاں ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب تک اس کی آواز میرے ذہن میں گونج رہی ہے وہ زندہ ہے۔

دلبر

مدیر محترم
سلامِ تہنیت!
عرض یہ ہے کہ آج کے دور میں جب مفاد اور دولت اہم ہو چکی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں انسان کی قدروقیمت کیا رہ گئی ہے؟ دولت مندوں کے لیے تو صرف اور صرف چند ٹکے، ان کی نظر میں انسان کتّے سے بھی بدتر ہے۔ میری اس روداد کو آئینہ سمجھیں۔ یہ میری اپنی سرگزشت ہے اس لیے التجا ہے کہ میرا اصل نام شائع نہ کریں۔

احمد حسین
(کراچی)

خواجہ سگ پرست، میں نے یہ داستان کئی بار پڑھی ہے۔ جس میں ایک شخص اپنے کتّے کو بہت ناز و نعمت کے ساتھ رکھتا ہے۔ اس کے گلے میں ہیروں کے ہار ہیں اور اسے جن برتنوں میں کھانے کو دیا جاتا ہے وہ سونے کے بنے ہوئے ہیں۔

اس کے برعکس اس نے اپنے بھائیوں کو پنجروں میں قید رکھا ہوا ہے۔ ان کے جسموں پر چیتھڑے جھول رہے ہیں اور وہ ان کے ساتھ انتہائی نفرت اور حقارت کا سلوک کرتا ہے۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے خواجہ سگ پرست کی کہانی یاد آ گئی تھی۔ وہ لڑکی

جتنی خوبصورت تھی اُسی کا کُتّا بھی ویسا ہی تھا۔ نازک سا، کسی ریشمی نسل کا۔ بڑے بڑے سفید بالوں والا، جس کی آنکھیں گہرے سبز رنگ کی تھیں۔ اس کے گلے میں ایک پٹا بھی تھا جس پر یقیناً قیمتی پتھر تھے۔

وہ خوبصورت کُتّا جب اپنی خوبصورت آواز میں ہلکے ہلکے بھوں بھوں کرتا تو اس وقت وہ اور بھی پیارا دکھائی دیتا۔ ایسی ہی خوبصورت آواز اس لڑکی کی تھی جو اس کی مالک تھی۔

وہ لڑکی مجھے روزانہ ایک پارک میں ملا کرتی۔ یہ سمجھیں کہ میں اسے دیکھا کرتا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی ایک نگاہِ غلط انداز سے میری طرف دیکھ لیا کرتی۔

ایک شام ہم دونوں کے درمیان پہلی دفعہ کچھ باتیں بھی ہوگئیں۔ یہ سمجھیں کہ پہلی گفتگو تو اس کُتّے ہی سے ہوئی تھی جو نہ جانے کیوں میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور اپنی دم ہلانے لگا تھا۔

میں نے اسے چمکارا تو محبت کے اظہار کے طور پر وہ دم زور زور سے ہلانے لگا۔ اس طرح اس کُتّے سے میرا تعارف ہوا اور اسی کے حوالے سے وہ لڑکی بھی میری دوست ہوگئی۔

وہ اس کُتّے کو پکارتی ہوئی میرے پاس آگئی تھی۔

”معاف کیجیے گا، اس کُتّے نے آپ کو تنگ تو نہیں کیا۔“

”بالکل نہیں، یہ تو بہت پیارا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ریشمی نسل کے کُتّے شریف ہی ہوتے ہیں۔“

”لیکن یہ ریشمی نہیں۔ ڈچ نسل کا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے اس کا نام ویسے رکھا ہے، دلبر۔“

”دلبر۔“ میں ہنس پڑا۔ ”اچھا نام ہے دلبر۔“

”کیا آپ کو بھی کُتّے پسند ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”صرف وہ جو ڈچ نسل کے ہوں اور جن کی مالک آپ جیسی خوبصورت لڑکیاں ہوں۔“

اس بار وہ بھی ہنس پڑی تھی۔ بہت دیر تک ہنستی رہی تھی۔

تو یہ اس خوبصورت لڑکی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد بھی ہم ملتے رہے۔ ہماری ملاقاتیں اسی پارک میں ہوا کرتیں۔ وہ روزانہ ہی پارک میں آیا کرتی۔

چونکہ وہ آیا کرتی تھی۔ اس لیے میں بھی پارک جانے لگا۔ ہم کُتّے کو آزاد چھوڑ دیتے اور کسی ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے۔

اس کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوگئی تھیں۔ نسرین نام تھا اس کا۔ اس کے ڈیڈ بہت بڑے بزنس مین تھے۔ اس لڑکی نے اپنی ابتدائی اور سیکنڈری تعلیم لندن میں حاصل کی تھی۔

اس کی کوٹھی بہت شاندار تھی۔ اس کے پاس اپنی ایک شاندار گاڑی تھی۔ یعنی وہ ہر طرح سے معاشی طور پر مجھ سے بہت بہتر تھی۔

جبکہ میرا حال یہ تھا کہ میں صرف ایک سفید پوش تھا۔ بہت مشکلوں سے کرائے کا ایک فلیٹ افورڈ کر رہا تھا۔ ایک فرم میں عام سی ملازمت کرتا تھا اور میرے پاس ایک عام سی بائیک تھی۔ جس نے میرے لیے آنے جانے کی سہولت فراہم کر رکھی تھی۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا میرے پاس۔

ان سب کے باوجود نسرین نے مجھ سے دوستی کر لی تھی۔ وہ پہروں مجھ سے باتیں کیا کرتی۔ اپنی پسند ناپسند اپنی عادتیں، اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ ”نسرین، میں تو ایک عام سا غریب انسان ہوں۔ تم نے مجھ سے کیوں دوستی کی ہے۔“

”بے وقوفی کی باتیں نہ کریں۔“ وہ ناراض ہونے لگی۔ ”یہ امیری غریبی وغیرہ فلموں اور ڈراموں کی باتیں ہیں۔ جس سے محبت کی جائے، اس کے لیے یہ سب نہیں دیکھا جاتا۔“

”کیا مطلب۔“ میری سانسیں رکنے لگی تھیں۔ ”محبت!“

”جی جناب۔“ وہ مسکرادی۔ ”یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ایک لڑکی کیوں روزانہ ملتی ہے، کیوں یاد کرتی ہے۔ اگر ایک دن نہ ملے تو بے چینی ہو جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی نا۔ اور یہ بات سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔“

”نسرین پھر تو میں دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہوا نا۔“

”اب میں ایسی بھی نہیں ہوں کہ آپ مجھے کوئی اسپیشل مخلوق قرار دے دیں۔ بس ایک عام سی ایسی لڑکی ہوں جو آپ سے متاثر ہوکر آپ سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔“

میرے شب و روز اب بہت خوبصورت ہوتے جارہے تھے۔ ہم رات کے وقت ایک دوسرے کو فون کیا کرتے۔ ہمارے درمیان طویل باتیں ہوا کرتیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا ادبی اور شاعرانہ ذوق بہت بلند تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو رومانوی اشعار سنایا کرتے۔ گرچہ اس کی تعلیم انگریزی میں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اس کی اردو بہت اچھی تھی۔

اس نے بتایا تھا کہ اس کے دادا ایک اچھے ادیب بھی تھے۔ شاید یہی خاندانی اثر تھا جو وراثت کے طور پر نسرین کو ملا تھا۔

اس نے ایک بار مجھ سے ایک عجیب بات کی۔ ”حسین، کیا تمہارا کوئی دوست نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں، کئی ایک ہیں۔“ میں نے بتایا۔ پھر پوچھا۔ ”کیوں تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”تم نے اپنے دوستوں کو میرے بارے میں تو ضرور بتایا ہوگا۔“ وہ اچانک ہی آپ سے تم پر آگئی۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اپنے دوستوں کو کیوں بتانے لگا۔“

”اس لیے کہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کسی نوجوان کی دوستی کسی لڑکی سے ہوجاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ہیرو ظاہر کرنے کے لیے دوستوں کے سامنے ڈینگیں مارا کرتا ہے۔“

”یہ تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں ایسی گھٹیا ذہنیت کا آدمی نہیں ہوں۔ یہ محبت تو بالکل ذاتی چیز ہوا کرتی ہے۔ یہ ہر انسان کا پرسنل معاملہ ہوا کرتا ہے۔ اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا۔“

”گڈ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”یعنی تمہیں دوست بنانے میں میرا سلیکشن بالکل درست تھا۔“

میں خوش ہوگیا تھا۔

میری تو ویسے بھی یہی کوشش ہوتی تھی کہ میں خود کو اس کے معیار کے مطابق کرسکوں۔ میں نے اپنا لائف اسٹائل بدل لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں وہ سب تو افورڈ نہیں کرسکتا تھا جو اس کے طبقے کے لوگ کیا کرتے ہوں گے۔ پھر بھی میں نے لباس کے معاملے میں خاصی خوش لباسی کا مظاہرہ شروع کردیا تھا۔ اس سے ملاقات سے پہلے تو لاپروائی کی کیفیت ہوا کرتی۔ جو مل گیا وہ پہن لیا۔ اب میں اپنی ڈریسنگ اور اپنے جوتوں پر خاص دھیان رکھنے لگا تھا۔

حالانکہ اس تکلف میں میرے بہت پیسے بھی خرچ ہوگئے تھے لیکن نسرین کے قرب کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔

ایک شام میں نے اسے اپنے ساتھ ڈنر کی دعوت دی۔ میری دعوت کا سن کر وہ چپ ہوگئی تھی۔

”کیا بات ہے، کیا سوچنے لگی ہو۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں برا لگا ہے؟“

”کیسی بات کر رہے ہو۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”کیسی ناراضی، میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ ڈنر کہاں کیا جائے۔“

”جہاں تم کہو۔“

”میرا خیال ہے کہ شیرٹن مناسب رہے گا۔“ اس نے کہا۔ ”وہاں کے جھینگے بہت لذیذ ہوتے ہیں۔“

”چلو، وہیں صحیح۔“ میں دھیرے سے بولا۔

اس نے شہر کے مہنگے ترین ہوٹل کا نام بتا دیا تھا۔ جہاں ڈنر کا مطلب کم از کم ساتھ آٹھ ہزار روپے تھا۔ لیکن میں چونکہ آفر کرچکا تھا۔ اس لیے کہیں نہ کہیں سے پیسوں کا بندوبست تو کرنا ہی تھا۔

”اب میری بھی ایک شرط سن لو۔“ اس نے کہا۔

”چلو، بتا دو۔“

”بل میں ادا کروں گی۔“

”تم!“ میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا بات ہوئی۔ آفر تو میں نے دی ہے، تم بل کیوں دوگی؟“

”تو اس میں ایسی کون سی بات ہوگئی۔ کیا اب میں اور تم الگ الگ ہیں۔“ وہ ایک خاص انداز سے بولی۔

سچ یہ ہے کہ اس وقت جیسے میرا خون بڑھ گیا تھا۔ نسرین جیسی لڑکی جب کسی سے یہ کہہ رہی ہو تو سوچ لیں کہ اس کے دل کی کیا کیفیت ہوسکتی ہے۔

ہم دوسری رات کھانے پر گئے تھے۔ اس بار وہ اپنی دوسری گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔ یہ ایک قیمتی شاندار پجارو تھی۔

اس گاڑی میں اس کا چہیتا کُتّا دلبر بھی اس کے ساتھ تھا۔ جس کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ ہوٹل کے اندر نہیں جائے گا بلکہ گاڑی میں ہی رہے گا۔

بہرحال اس رات پورے چھ ہزار کا ڈنر ہوا تھا جو اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ جبکہ میں بھی کسی سے بندوبست کرکے اتنی رقم اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

میرا تو دل یہی چاہتا تھا کہ میں اس کے بارے میں پوری دنیا کو بتا دوں۔ ایک ایک کو پکڑ کر کہوں کہ دیکھو، نسرین مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ میں اس کا محبوب ہوں۔ وہ میرے لیے پاگل ہورہی ہے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

لیکن اس بات کو نہ تو نسرین پسند کرتی اور نہ میں اس مزاج کا تھا۔ اس لیے اپنے آپ سے اس کے بارے میں باتیں کرکے خوش ہوتا رہتا۔

ایک دن خود اس نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کبھی میرے گھر تو آئیں۔“

”تم نے خود ابھی تک نہیں بلایا ہے تو میں کیسے آسکتا ہوں۔“

”اب تو بلا رہی ہوں نا، آپ آجائیں۔“ پھر اس نے مجھے اپنا پورا ایڈریس سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ ایسا کریں کل ہی شام کو آجائیں۔ ورنہ پرسوں ڈیڈ کی فلائٹ ہے۔ وہ یورپ جا رہے ہیں۔“

ظاہر ہے وہ لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے لیے باہر آنا جانا ایک عام سی بات تھی۔

”اب یہ بتائیں، میں ڈرائیور بھیج دوں یا آپ خود سے آجائیں گے۔“ اس نے پوچھا۔

”کیوں، ڈرائیور کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود سے بھی آسکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر کل شام کو میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

دوسری شام میں نے اپنے طور پر بہت شاندار ڈریسنگ کی تھی۔ ایک دفعہ پھر میرے اچھے خاصے پیسے خرچ ہوگئے تھے۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔

اس نے جس انداز سے اپنا ایڈریس سمجھایا تھا۔ اس سے میں بہت آسانی کے ساتھ اس کے مکان تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ کم از کم پانچ ہزار گز پر بنی ہوئی تھی۔ جس کی دیواریں بلند تھیں اور بہت بڑا گیٹ تھا۔ اس گیٹ پر دو عدد گارڈز بھی کھڑے ہوئے تھے۔

میں نے جب اپنا نام بتایا تو میرے لیے فوراً گیٹ کھول دیا گیا۔ شاید نسرین نے میرے بارے میں انہیں بتادیا ہوگا اور میرے استقبال کے لیے نسرین سامنے ہی کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میری اس پذیرائی پر اس کے ملازمین بھی حیران رہ گئے ہوں گے۔

”واہ! آج تو آپ بہت زبردست لگ رہے ہیں۔“ اس نے میری تعریف کی۔

”اور تم...!“ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ”اب تمہاری کیا تعریف کروں۔“

وہ میرا ہاتھ تھام کر اپنے شاندار سے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ کیا سجاوٹ تھی اس کمرے کی۔ لاکھوں کا تو فرنیچر ہی ہوگا۔

ایک صوفے پر ایک بہت ہی باوقار اور صحت مند و توانا مونچھوں والا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہی اس کے ڈیڈ تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اپنے باپ سے میرا تعارف کرواتے وقت بھی اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جبکہ اس کے ڈیڈ نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

یعنی اس کے ڈیڈ کو اس بات کی پروا ہی نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے کہ خود نسرین نے میرا تعارف اس انداز سے کروایا ہو کہ میرا نسرین کا دوست ہونا ایک عام سی بات ہو۔

اس کے ڈیڈ نے جب مجھ سے مصافحہ کیا اس وقت نسرین نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے ڈیڈ مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میرے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ میرے بیک گراؤنڈ کے بارے میں پوچھتے رہے۔

ان کے انداز سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ میں انہیں پسند آگیا ہوں۔ شاید میرا وہاں آنا ایک طرح کا انٹرویو تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس کے ڈیڈ کھڑے ہوگئے۔ ”معاف کرنا، مجھے ذرا تیاری کرنی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو کمپنی دو۔“

نسرین نے اپنی ممی کے بارے میں بتایا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ملک سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ اس نے کہا۔ ”ان کے آنے کے بعد آپ سے ان کی بھی ملاقات کروادوں گی۔“

”کیا تمہاری ممی مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر برا نہیں مانیں گی۔“ میں نے پوچھا۔

”ارے، برا کیوں ماننے لگیں۔ میری ممی بھی بہت براڈ مائنڈڈ ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”بلکہ انہیں تو اس بات کی خوشی ہوگی کہ ان کی بیٹی کو اچھی کمپنی مل رہی ہے۔“

میں نے اب یہ مان لیا تھا کہ میرے لیے سارے مرحلے آسان ہوگئے ہیں۔ دو ہی رشتے ہوتے ہیں۔ جن کی بات ماننی پڑتی ہے اور جن کے حکم پر سر جھکا دیا جاتا ہے۔ ماں اور باپ۔ اور اتفاق سے دونوں میرے حق میں تھے۔

اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ یعنی میں کسی نہ کسی کو یہ سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح ڈھنڈورا پیٹنا کوئی مناسب بات نہیں ہوتی۔ لیکن انسان کے اندر ایک احساس تفاخر تو ہوتا ہے نا۔ بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے بھی تو یہی سب کیا ہے۔

وہ تو وہ ہیں تمہیں ہوجائے گی الفت مجھ سے
اِک نظر تم میرا محبوبِ نظر تو دیکھو

تو میں بھی اگر اپنے محبوب نظر کو کسی کو دکھانا چاہتا تھا تو اس میں کیا برائی تھی۔ ہاں، میرے انداز میں کوئی عامیانہ بات نہیں ہونی چاہیے تھی۔

میں نے یہ سب سوچ کر اپنے اکلوتے دوست خاور سے اس لڑکی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا۔ ”یار، بس یہ سمجھ لو کہ قدرت نے اتنے عرصے کی محرومیوں کا صلہ دے دیا ہے۔“

اس وقت ہم پارک میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ یہ پارک وہ نہیں تھا جہاں میں اور نسرین ملا کرتے تھے۔

”بھائی، مجھے یقین نہیں آرہا۔“ اس نے اپنی گردن ہلادی۔

”کیا یقین نہیں آرہا؟“

”سوال یہ ہے کہ منطقی جواز کیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم دونوں کے ملاپ میں کیا لاجک ہے۔ تم یہ کہتے ہو کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔“

”تمہارا یہ کہنا ہے کہ وہ پڑھی لکھی بھی ہے۔“

”بے شک۔ اس نے یہاں کی تعلیم کے علاوہ باہر بھی تعلیم حاصل کی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بقول تمہارے وہ کروڑ پتی باپ کی بیٹی بھی ہے۔“

”کروڑ پتی سے بھی کچھ زیادہ۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر وہ تم میں کیوں دلچسپی لے رہی ہے۔ معاف کرنا، تم میں کون سے ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ تم تو ایک عام سے انسان ہو، بلکہ عام سے بھی کم۔ اگر وہ جسمانی یا ذہنی طور پر معذور بھی ہوتی تو یہ سمجھ لیتے کہ اس کے والدین اس سے چھڑانے کے لیے تمہیں قربانی کا بکرا بنا رہے ہیں۔ لیکن جب وہ ہر طرح سے ٹھیک ہے تو پھر پوری دنیا میں اس کے لیے کیا تم ہی رہ گئے ہو۔“

خاور کی باتوں نے میرا خون کھولا دیا تھا۔ یہ اس کا حسد بول رہا تھا۔ بے چارہ خود ایک بے ڈھنگی سی بیوی پر گزارہ کر رہا تھا۔ اسی لیے اسے میری یہ شاندار اُڑان پسند نہیں آئی تھی۔

”تو پھر تم ہی بتاؤ یہ سب کیا ہے؟“ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”میری سمجھ میں ایک بات آرہی ہے۔“ وہ ایک سنسنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”کیا تم اس لڑکی اور اس کے باپ کے کہنے پر کچھ بھی کرسکتے ہو۔“

”کیوں نہیں۔“

”تو پھر لکھ لو کے اس کا باپ کوئی بہت بڑا اسمگلر ہے۔“ اس نے کہا۔ ”چونکہ تم پوری طرح اس کی بیٹی کے چنگل میں پھنس چکے ہو۔ اسی لیے وہ اس بات کا فائدہ اٹھا کر تم سے اسمگلنگ کا کام لینا چاہتا ہے۔“

”کیا بے کار سی فلمی سچویشن بتا دی ہے تم نے؟“ میں ہنس پڑا۔ ”وہ ایک بے انتہا دولت مند انسان ہے۔ اور بقول تمہارے وہ اسمگلر بھی ہوسکتا ہے۔ تو اس کے پاس کیا کام کرنے والوں کی کمی ہوگی کہ مجھے پھانسنے کے لیے اپنی بیٹی کو استعمال کرے گا۔“

”تم یہی تو نہیں جانتے۔ اس کے سارے ہرکارے قانون کی نگاہوں میں ہوں گے۔ اس کے علاوہ تم صورت سے بے وقوف اور پڑھے لکھے انسان نظر آتے ہو۔ اسی لیے کسی کا دھیان [illegible]ری طرف نہیں جائے گا اور اس کا کام بن جائے گا۔“

یہ ایک نیا پہلو تھا۔

میں بھی غور کرنے لگا تھا۔ آخر کیوں۔ کیا خاص بات تھی مجھ میں۔ نسرین کو تو اسی کے طبقے کے لوگ مل سکتے تھے پھر میں ہی کیوں۔ یہ ایک اہم نکتہ تو تھا لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

میں نے نسرین سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بھڑک کر دور ہوجائے۔ لیکن ایک شام خاور کی باتیں کچھ کچھ ٹھیک ہی معلوم ہونے لگیں۔

میں اس شام بھی نسرین کے گھر پر تھا۔ اس نے مجھے شام کی چائے پر مدعو کیا تھا۔ اس دن اس کی ممی بھی موجود تھیں۔ اس نے اپنی ممی سے بھی میرا تعارف کروادیا اور انہوں نے بھی بیٹی کی دوستی کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

بلکہ ان کے ہونٹوں پر بڑی مہربان سی مسکراہٹ تھی۔ یعنی میں ان کو بھی پسند آگیا تھا۔ خاور ایک بار پھر اپنے مشکوک سوالات کے ساتھ میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تھا۔

آخر کیوں؟ سوال یہ ہے کہ تم میں ایسے کون سے ہیرے لگے ہوئے ہیں کہ پورے گھر نے تمہیں پسند کرلیا ہے۔ ان کی باتیں اپنی جگہ لیکن ان کے خلوص پر میں کیسے شک کرلیتا۔

اسی دوران ایک ایسی بات ہوئی جس نے خاور کی باتوں کو کچھ کچھ سچ کرنا شروع کردیا۔

نسرین کے ڈیڈی نسرین سے مخاطب تھے۔ ”دیکھو تو سہی، اس پاگل آدمی نے ایک بار پھر سنگاپور جانے سے منع

کردیا ہے۔ آخر اسے کس بات کا خوف ہے۔“

اب میں نے اپنے دل میں کھٹکا محسوس کرنا شروع کردیا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی۔

”کہہ کہہ کر تھک گیا کہ سیدھا سادا کام ہے، چلے جاؤ۔ لیکن وہ ہے کہ نہیں نہیں کی رٹ لگا رکھی ہے۔“

”ڈیڈ کیوں نہ کسی اور کو بھیج دیا جائے۔“ نسرین نے مشورہ دیا۔

اب میں سمجھ گیا تھا کہ اس کے بعد کیا بات ہوسکتی تھی۔ نسرین اپنے ڈیڈ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ دونوں کچھ دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ پھر اس کے ڈیڈ ایکسکیوز کر کے کمرے سے باہر چلے گئے۔

نسرین کی ممی تو پہلے ہی کمرے سے جا چکی تھیں۔ اب میں اس بات کا منتظر تھا کہ نسرین مجھے کیا کہتی ہے۔ وہ یقیناً یہی کہنے والی ہوگی۔ ”دیکھو۔ ڈیڈ اس وقت کسی الجھن میں ہیں۔ انہیں کچھ چیزیں سنگاپور بھیجنی تھیں۔ لیکن جانے والے نے عین وقت پر انکار کردیا ہے۔ اس لیے پلیز آپ چلے جائیں۔ آپ کا پاسپورٹ، ویزا اور ٹکٹ وغیرہ صرف ایک دن میں تیار ہوسکتا ہے۔“ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اتنی جلدی یہ سب نہیں کہنا چاہتی ہو۔

میں اس کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا تھا۔ ایک طرح کا اندیشہ تو لاحق ہونے لگا تھا۔ کوئی نہ کوئی چکر تو ضرور تھا۔ ورنہ میرے سامنے یہ سب کہنے کی ضرورت کیا تھی۔

ایک دن نسرین نے مجھے فون کیا۔ ”آج شام کو آپ ضرور آجائیں۔“

”خیریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ہاں، بالکل خیریت ہے۔ کچھ مہمان آرہے ہیں۔ خاندان کے لوگ ہیں۔ ان سے آپ کو ملوانا ہے۔“

”اوہ...!“ میں دل ہی دل میں جھوم اٹھا۔ یعنی یہ بردکھوا ٹائپ کی کوئی چیز ہوسکتی تھی۔ اس کے ماں باپ تو دیکھ ہی چکے تھے۔ اب اس کی فیملی والے بھی مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔

میں اس شام اس کے یہاں جانے کے لیے بہت سلیقے سے تیار ہوا تھا۔ بہترین لباس کا انتخاب کیا تھا۔ بہترین خوشبو جو میرے پاس تھی وہ استعمال کی اور اپنی قسمت پر ناز کرتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس کے یہاں واقعی بہت سے مہمان تھے۔

ایک سے ایک طرحدار قسم کے لوگ۔ خوبصورت اور اسمارٹ لڑکیاں۔ سب کے انداز یہ بتا رہے تھے کہ سب ہی پیسے والے ہیں۔ مفلسی اور امیری دیکھنے سے پتا چل جاتی ہے۔ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ اٹھنا بیٹھنا، باتوں کا انداز، لہجہ، اس لیے کہا جاتا ہے کہ پیسا بولتا ہے۔ تو وہاں پیسا بول رہا تھا۔

اس وقت وہ خوبصورت سا کتا دلبر نسرین کی گود ہی میں تھا۔ اب وہ مجھ سے بھی مانوس ہوگیا تھا۔

نسرین ایک خوبصورت اسمارٹ سے نوجوان کو میرے پاس لے آئی۔ اس نے اس نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ ”یہ ریاض ہیں۔ امریکا میں ان کا بزنس ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ میرے فرسٹ کزن ہیں۔“

میں نے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا تھا۔

”دوسری بڑی بات بھی تو بتا دو۔“ ریاض نے نسرین سے کہا۔

”ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ یہ میرے منگیتر بھی ہیں... اور شاید اگلے ہی مہینے ہم دونوں کی شادی ہوجائے۔“

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے اوپر سے پھینک دیا ہو۔ اگر یہ شخص اس کا منگیتر تھا تو پھر میرے ساتھ کیسا مذاق ہو رہا تھا۔ یہ میرے ساتھ کیسا کھیل کھیلا تھا ان لوگوں نے۔ میرے وجود میں جیسے تلخی سی بھر دی تھی۔

اس کا منگیتر ریاض مجھ سے ایکسکیوز کر کے دوسرے مہمانوں کی طرف چلا گیا تھا جبکہ نسرین وہیں کھڑی رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ ہو کر پوچھا۔ ”نسرین، اگر یہ تمہارا منگیتر ہے۔ تو پھر میں کیا ہوں۔“

”ارے بھئی، آپ تو میرے دلبر ہیں، دلبر۔“ وہ کتے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

اور میری سمجھ میں آگیا کہ اس کی نگاہ میں میری کیا حیثیت تھی! میں اس کا دلبر تھا، اس کے دو دلبر تھے۔ ایک تو وہ جس کو وہ اٹھائے پھرتی تھی۔ اور دوسرا میں۔ میری حیثیت بھی اس کے لیے بس اتنی ہی تھی۔ وقت گزاری کے لیے دو پیروں سے چلنے والا کتا جس سے دل بہلایا جاسکتا ہے دولت مندوں کے لیے ہم جیسے لوگ دلبر ہی تو ہوتے ہیں۔ سب سمجھ میں آگیا تھا۔

میں موقع پا کر اس کمرے، اس گھر اور اس کے بنگلے سے دور نکل آیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس لیے آج تک مجھے خواجہ سگ پرست کی کہانی بہت اچھی طرح یاد ہے۔

● ●

ایجنٹ

محترم مدیر سرگزشت ڈائجسٹ

مودبانہ آداب!

میں کوئی دودھ کا دھلا ہوا بندہ نہیں ہوں۔ اب تک پولیس کی پکڑ سے محفوظ ہوں اس لیے شیر ہوں۔ لوگ مجھے انسانی اسمگلر کہتے ہیں۔ میرا بڑا نام ہے۔ افغانستان، پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، نیپال اور سری لنکا سے لوگوں کو لاتا لے جاتا ہوں اس کام کی ابتدا میں نے کیسے کی تھی وہ بتا رہا ہوں لیکن میں نے اپنا اصل نام چھپالیا ہے۔

زاہد خان

(العین، یو اے ای)

اس لانچ میں چالیس آدمی تھے اور روانہ ہونے سے پہلے ہمیں طرح طرح کی ہدایات دے دی گئی تھیں کہ خطرہ ہو تو کیا کرنا ہے، اپنے آپ کو کس طرح بچانا ہے۔ ہماری نگرانی پر چار آدمی معمور تھے جو صورت ہی سے خونخوار اور وحشی قسم کے لگتے تھے۔ ان چاروں کے پاس جدید اسلحے تھے وہ ہر وقت ہماری نگرانی کرتے رہتے۔

ہمیں کھانے کے لیے بہت کم خوراک دی جاتی جو ڈبل روٹی کے چند ٹکڑوں اور بدمزہ چائے پر مشتمل ہوتی۔ ہمیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ جب خطرہ ہو اور ہم پکڑے جائیں تو ہمیں اپنے آپ کو کیا ظاہر کرنا ہے۔

ثوبیہ رضی اللہ عنہا

صحابیہ، ابولہب کی لونڈی تھیں۔ بعد میں اسلام قبول کیا۔ آنحضورؐ نے اپنی والدہ کے دودھ کے بعد پہلا دودھ جو پیا، وہ انہی کا تھا۔ حضرت ثوبیہؓ نے حمزہ بن عبدالمطلب، جعفر بن ابی طالب اور ابوسلمہ بن عبدالاسد المخزومی کو بھی دودھ پلایا تھا۔

مرسلہ: نصیرالدین، لاہور

"مچھلیاں پکڑنے والے۔"

ہمیں اصل خطرہ کوسٹ گارڈ کی جانب سے تھا لیکن ہمیں اس سے بھی زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ یہ چرمرائی ہوئی لانچ کہیں جواب ہی نہ دے جائے۔

کھلے سمندر میں ایسی خستہ حال لانچ پر سفر کرنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے برابر تھا لیکن ہم مجبور تھے کیونکہ ہم غیر قانونی طور پر ملک سے باہر جارہے تھے اور ہمارے پاس ویزے اور پاسپورٹ جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔

ہمیں اسمگل کرنے والوں نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ یہ سفر سات سے دس دن تک کا ہوسکتا ہے یعنی ہمیں اتنے دنوں تک کھلے سمندر میں زندگی اور موت کے درمیان معلق رہنا تھا۔

مجھے کچھ مسافروں سے باتیں کرنے کا موقع ملا تو جانا کہ ان سب لوگوں .... کی کہانیاں تقریباً ایک ہی جیسی تھیں۔ ایک جیسی مجبوریاں، ایک جیسی زندگی اور ایک جیسے حالات۔

وہ سب کے سب سنہرے دنوں اور خوبصورت خوابوں کی تعبیر کے لیے اس طرح غیر قانونی طور پر جارہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے ایجنٹ کو اچھی خاصی رقم دے رکھی تھی۔

میرے قریب جو نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کا باپ لوہار تھا اور اس نوجوان کو اپنے باپ کا کام پسند نہیں تھا۔ دوسرے نوجوان نے جو شروع ہی سے کچھ خوفزدہ سا تھا۔ اس کا نام اکبر تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے گھر والوں نے اس بے چارے کا ایسا نام رکھ دیا تھا۔

اس کا باپ ایک معمولی سا درزی تھا۔ جس کی اپنی دکان بھی نہیں تھی۔ وہ کسی کی دکان پر کام کیا کرتا تھا۔ اس نے اکبر کو بھی اپنا کام سکھانے کی بہت کوشش کی لیکن اکبر پر باہر جانے کا جنون سوار ہوگیا..... انگریزی فلموں کے مناظر نے اس کے شوق کو اور ہوا دے دی۔ ان فلموں میں دکھائے جانے والے گلیمر نے اسے مجبور کردیا کہ وہ کسی طرح بھی ملک سے باہر چلا جائے۔

اس نے اپنی بہن کے جہیز کے زیورات چرا کر فروخت کردیے..... اور وہی پیسے ایجنٹ کو دے دیے تھے اور اب اس طرح خطرناک طریقے سے کھلے سمندر میں ایک مخدوش لانچ پر سفر کررہا تھا۔

سفر شروع ہوتے ہی اسے اپنے گھر کی یاد آنے لگی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے واپس ساحل پر اتار دیا جائے۔ نگرانی کرنے والے نے اسے بے تحاشا گالیاں دیتے ہوئے سمندر میں پھینک دینے کی دھمکی دی تو خاموش ہوگیا۔ البتہ اس کی سسکیاں ہمیں پریشان کررہی تھیں۔

نہ جانے یہ کیسے لوگ تھے۔ ارے جب قسمت میں کچھ اچھا ہونا لکھا ہی نہیں ہے تو پھر محنت کرنے اور خود کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس جو ہے اور جیسا ہے پر گزارا کرتے رہو۔

لیکن یہاں کون سنتا ہے۔ خیر میں بھی تو انہی میں سے ایک ہوں۔

میں بھی تو اسی لانچ پر ہوں اور کسی انجانی منزل کی طرف جارہا ہوں۔ لیکن میں اپنے بارے میں فی الحال بتانا نہیں چاہتا۔

مظلوم چہرے... لانچ میں ایک ایسا لڑکا بھی تھا جس کی عمر مشکل سے پندرہ یا سولہ برس ہوگی۔ نہ جانے اس نے کہاں سے پیسے حاصل کیے ہوں گے اور اس کے گھر کے کیا حالات ہوں گے؟

یہ عمر تو اپنے شہر، اپنے محلے، اپنے ملک اپنے گھر میں رہ کر اسکول جانے اور تعلیم حاصل کرنے کی ہوتی ہے مگر یہ کس طرف جارہا تھا اور اس نے کیا سوچا ہوگا۔

دو راتیں ہم نے اس لانچ میں گزار لی تھیں۔ دور دور تک سوائے سمندر کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اس کے سینے پر ڈولتی ہوئی ہماری یہ لانچ۔ بہت ہی خوف ناک صورت حال تھی.... اور تیسری صبح ہمیں گھیر لیا گیا۔

گھیرنے والے کوسٹ گارڈ تھے جو ہمارے اپنے ہی ملک کے تھے۔ وہ لوگ دو چھوٹے جنگی جہازوں میں مسلح چاق و چوبند موجود تھے۔

ہمارے نگرانوں نے بڑی پھرتی سے اپنے اسلحے سمندر

میں پھینک دیے تھے۔ جہازوں سے اعلانات کیے جا رہے تھے کہ ہم اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیں۔ ورنہ گولیاں چلا دی جائیں گی۔ لانچ پکڑی گئی اور ہم سب کو واپس لے آیا گیا۔

واپسی کا سفر اور بھی الم ناک تھا۔ لوگوں کے خواب بکھر چکے تھے اور وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔ انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی محنتیں رائگاں چلی گئی ہیں کیونکہ ان کے سارے پیسے ڈوب چکے ہیں۔ اب ان کے پاس کچھ گنوانے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ سب مایوسیوں اور مفلسی کی دنیا میں تنہا رہ گئے..... پھر ہم کو بیرکوں میں بند کر دیا گیا۔

کوسٹ گارڈ کچھ مہربان قسم کے لوگ تھے کیونکہ انہیں یہ معلوم تھا کہ اس طرح ایجنٹوں کے چکر میں آ کر باہر جانے والے خود مظلوم قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔

ان چاروں نگرانی کرنے والوں کو کسی علیحدہ جگہ پر بند کر دیا گیا تھا پھر ہمیں باری باری بلایا جاتا رہا اور مختلف قسم کے سوالات ہوتے رہے۔ "کیا نام ہے، پتا کیا ہے، کیا کرتے تھے، ایجنٹ کو کتنے پیسے دیے۔ کہاں سے رقم لائے تھے وغیرہ وغیرہ۔" بالآخر میری بھی باری آ گئی۔

جس کمرے میں سوالات کیے جا رہے تھے۔ اس میں ایک آفیسر کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ شاید ان میں کوئی اخباری نمائندہ بھی تھا۔

"ہاں، کیا نام ہے تمہارا؟"

"جناب، میں اپنا نام تو بتا دوں گا لیکن بالکل تنہائی میں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" آفیسر حیران رہ گیا۔

"جی جناب، بالکل تنہائی میں کیونکہ مجھے جو کہنا ہے صرف آپ سے ہی کہنا ہے۔" آفیسر کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئی تھیں کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اشارہ کیا اور کمرے میں موجود لوگ باہر چلے گئے۔

"ہاں، اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

میں نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ دیکھ لیں جناب۔" اس کارڈ پر میرا نام اور اس کے ساتھ ہی ایک اخبار کا جرنلسٹ رپورٹر بھی لکھا ہوا تھا۔

"کیا ہے یہ سب اور کون ہو تم۔"

"جناب، میں ایک صحافی ہوں۔ میں بہت دنوں سے انسانی اسمگلروں کے راز جاننے کے لیے بے چین تھا کہ کس طرح یہ لوگ ایجنٹ مقرر کرتے ہیں کس طرح بھاؤ تاؤ ہوتا ہے، ان کی شاخیں کہاں کہاں ہیں۔ ان کے روٹس کیا ہیں۔ مقامی اور غیر مقامی ایجنٹس کون کون ہیں۔ یہ لوگ مسافروں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ سب معلوم کرنا تھا تاکہ ان کے خلاف مکمل رپورٹ کر سکوں اس لیے میں عام کسٹمر بن کر ان کے پاس چلا گیا۔ میں نے باقاعدہ پیسے دیے اور سب کچھ دیکھتا رہا۔ ویسے مجھے اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئیں ہیں ان کے بارے میں پھر آپ لوگ آ گئے اور ہمیں یہاں لے آئے۔"

"اوہ، تو یہ بات ہے۔" آفیسر مسکرا دیا۔ "تم نے بہت بڑا رسک لیا ہے۔"

"یہ رسک لینا ضروری تھا کیونکہ ان سے دور رہ کر میں ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ویسے میں نے ممکنہ خطرے سے بچنے کے لیے اپنے دو ساتھی بھی ساتھ لے لیے تھے۔"

"کہاں ہیں تمہارے ساتھی؟"

"وہ بھی پکڑے گئے ہیں۔ بابر اور اجمل نام ہیں ان کے۔"

"پھر اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"آپ بتائیں کیونکہ میں نے تو یہ سوچ لیا ہے کہ میں ان کے پورے ریکٹ کا پتا چلا کر رہوں گا۔"

"اس ملک کو تم ہی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔" آفیسر نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ "میں تمہیں اور تمہارے دونوں ساتھیوں کو چھوڑ رہا ہوں۔"

"بہتر جناب۔"

"لیکن اچھا یہی ہو گا کہ آئندہ جب کسی ایجنٹ کے ساتھ جانے لگو۔ تو مجھے اطلاع دے دو تاکہ اس لانچ کو گزرنے دیا جائے... اور یہ سب تم اپنے رسک پر کرو گے۔"

"جانتا ہوں جناب، جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کام کر رہا ہوں۔"

ایک گھنٹے کے بعد میں، بابر اور اجمل ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "دیکھا دوستو، کیسا جان بچا کر نکال لایا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ہے۔" دونوں نے تائید کی۔

"اب اگلے ٹرپ میں ہم سب یہاں سے بہ آسانی نکل جائیں گے اور کوئی روکنے والا بھی نہیں ہو گا۔ اب ایسا کرو دس یا بارہ بندے پکڑ لو لیکن اب میں تین تین لاکھ سے کم نہیں لوں گا۔"

وہ سب ہنس پڑے اور ہم آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ کر بہت خوش تھے۔

✤

"ماہ نور!" میری ساس نے آواز دی۔ "تیار ہو جا، پیر جی کی طرف جانا ہے۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے بستر پر لیٹے ہوئے جواب دیا۔ "آپ چلی جائیں، میں پھر بعد میں جاؤں گی۔"

"بعد میں کہاں جاؤ گی۔" انہوں نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "تمہارا تو ارادہ ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے رہو.. بدنصیب میرا کیا جاتا ہے۔"

پیر جی

جناب مدیر اعلیٰ

سلام مسنون!

اسلام دینِ فطرت ہے، ہر طرح سے مکمل دین۔ کہیں کوئی کمی نہیں پھر بھی معصوم فطرت لوگ کس طرح چالاک لوگوں کے جال میں پھنس کر اپنے دین وایمان کو داؤ پر لگا دیتے ہیں اور دین ودنیا خراب کر لیتے ہیں اسی کا مختصر سا بیان۔ یہ واقعات میں نے اپنی اہمیت جتانے کے لیے نہیں لکھے بلکہ لوگوں کو آئینہ دکھانا چاہا ہے کہ ایک عورت ہو کر بھی میں... سسرال والوں کو سیدھے راستے پر لے آئی، میری طرح دوسرے لوگ ایسا کر سکتے ہیں۔

ماہ نور

(کراچی)

میں خاموشی سے لیٹی سنتی رہی، جب ان کی بڑبڑ زیادہ ہوئی تو میں نے تکیہ کانوں پر لپیٹ لیا میری سسرال بہ ظاہر بڑی روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھی۔ کوئی بھی گریجویشن سے کم نہیں تھا۔ میرے ساس اور سسر تک کالج سے پڑھے ہوئے تھے۔ میرے ایک جیٹھ اور میرے شوہر سے چھوٹا بھائی ماسٹرز تھے۔ خود میرے شوہر اویس احمد ایم فارمیسی کی ڈگری رکھتے تھے۔ میری دو شادی شدہ نندیں بھی گریجویٹ تھیں۔ گھرانا اوپری متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک اچھے علاقے میں اپنا مکان تھا جس میں اوپر تلے تین پورشن تھے۔ سب سے اوپری پورشن میں میرے جیٹھ نفیس احمد اپنی بیوی روبینہ اور چار بچوں کے ہمراہ رہتے تھے۔ اس سے نیچے والے فلور پر میں اپنے ساس سسر کے ہمراہ تھی اور سب سے نچلا فلور کرائے پر دیا ہوا تھا۔ میرے سسر ریٹائرڈ اسکول ہیڈ ماسٹر تھے۔ ساس بھی کسی زمانے میں سرکاری جاب کر چکی تھیں لیکن پھر انہوں نے جاب چھوڑ دی اور گولڈن شیک ہینڈ لے لیا تھا۔ نفیس بھائی ایم کام تھے اور ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ میرا دیور رامس ایم بی اے کے بعد ملازمت کر رہا تھا اور ساتھ ہی ملک سے باہر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

گھر میں تین کمانے والے تھے۔ اویس ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں ملازم تھے اور ساتھ ہی دواؤں کی ڈسٹری بیوشن کا کام بھی کرتے تھے۔ سسر کی اچھی خاصی پنشن تھی، پھر اپنی بچت انویسٹ کر رکھی تھی اور ساتھ میں مکان کا کرایہ بھی آتا تھا۔ رامس کی بھی ٹھیک تنخواہ تھی۔ یعنی مالی لحاظ سے میری سسرال ٹھیک تھی۔ طرزِ زندگی بھی مناسب تھا۔ سب روزے نماز کے پابند تھے لیکن کسی تفریح پر قدغن بھی نہیں تھی۔ گھر کی عورتیں باہر جاتے ہوئے چادر لے لیتی تھیں مگر پردے کی پابندی نہیں تھی۔ البتہ میں عبایا لیتی تھی کیونکہ اویس کی خواہش تھی کہ میں صرف چادر یا دوپٹے میں باہر نہ جاؤں اور میں ان کی خواہش پر عبایا لینے لگی تھی۔ گھر میں ٹی وی تھا۔ بلکہ سب کے پاس الگ الگ ٹی وی تھا۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال سب کرتے تھے۔ رامس ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر استعمال کرتا تھا جب کہ اویس کے پاس لیپ ٹاپ تھا۔ جب وہ دفتر میں ہوتے تھے تو یہ میرے پاس ہوتا۔ میں فیس بک استعمال کرتی تھی۔

بہ ظاہر میری سسرال کو دیکھ کر کوئی نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ پیر فقیر کے چکر میں پڑنے والے لوگ ہو سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا ہی تھا۔ مجھے بھی شادی کے بعد پتا چلا۔ شادی کے موقع پر اویس کے گھر والے نکاح پڑھوانے کے لیے ایک شخص کو لائے تھے۔ کیونکہ رجسٹرڈ قاضی تو میرے ابو نے بلوایا تھا اور ساری کاغذی کارروائی اسی نے کی تھی لیکن زبانی نکاح اسی آدمی نے پڑھایا تھا۔ میری چھوٹی بہن شاہ نور یہ کارروائی دیکھ رہی تھی اور مجھے لمحے لمحے کی رپورٹ دے رہی تھی۔ جب نکاح کا خطبہ ہونے لگا تو وہ دوڑی آئی اور میرے کان میں گھس کر بولی۔ ”ماہ نور تیرا نکاح تو دوسرا ایک شخص پڑھا رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”نکاح خواں تو ابو لائے تھے؟“

”ہاں لیکن یہ شخص دولھا والوں کے ساتھ آیا ہے۔“

کچھ دیر بعد جب نکاح پڑھا دیا گیا اور میں اویس کی ہو گئی تو مجھے ہال کے ڈریسنگ روم سے باہر اسٹیج پر لایا گیا اور کچھ دیر بعد اویس بھی وہیں آ گئے۔ میرے ابو اور بھائی ذرا قدامت پسند ہیں اس لیے شادی ہال میں مردوں اور عورتوں کا حصہ الگ الگ رکھا گیا تھا۔ جب اویس آئے تو ان کے بھائی اور دوسرے قریبی مرد رشتے دار بھی وہیں اسٹیج کی طرف آ گئے تھے۔ البتہ عام مرد حضرات مردوں والے حصے میں رہے تھے۔ پھر ایک شخص خاص طور سے آیا۔ میری ساس جو وہیں تھیں انہوں نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔ ”ماہ نور سلام کرو، شاہ جی آئے ہیں۔“

تب میں نے اس گورے چٹے اور خوبرو شخص کو دیکھا۔ وہ کسی قدر لمبے قد کا آدمی تھا۔ اس نے گاؤن نما لباس پہن رکھا تھا اور سر پر کلاہ تھا۔ اس سے گھنے سیاہ بال نکل کر اس کے شانوں پر آ رہے تھے۔ داڑھی کے بال بھی سیاہ تھے اور سیاہ آنکھیں جن میں عجیب سی کشش تھی اور رنگ بہت دمکتا ہوا گورا تھا۔ مجموعی طور پر وہ بہت خوب صورت آدمی تھا۔ عمر شاید پچاس کے آس پاس تھی۔ شاید دوسروں کو وہ کم عمر بھی لگتا ہوگا لیکن مجھے وہ اتنا ہی بڑا لگا تھا اور بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میں نے سلام کر کے سر نیچے کر لیا تو اس نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دھیمی لیکن گونجتی آواز میں بولا۔ ”خدا خوش رکھے، آباد رکھے، گود اور گھر بھر دے۔“

مجھے شرم آئی، ابھی میرا نکاح ہوا تھا اور وہ ایسی دعائیں دے رہا تھا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور یہ اتنا اچانک ہوا کہ میں مزاحمت بھی نہ کر سکی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس روز کوئی اجنبی یوں میرا ہاتھ تھام لے گا جسے تھامنے کا حق صرف اویس کا تھا۔ اس نے میری ہتھیلی پر ایک چھوٹا سا لفافہ رکھا اور ہتھیلی بند کر کے اسے دبا دیا دوسرے لمحے میں اپنا ہاتھ چھڑا چکی تھی۔ پھر اس نے اویس کے ساتھ ایسا ہی کیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اویس اس کے ساتھ اسٹیج سے نیچے گیا۔ میں نے سنا وہ اس سے بہت لجاجت سے کہہ رہا تھا۔ ”شاہ جی کچھ دیر تو رکیں۔“

”تم جانتے ہو ہم کسی دعوت میں نہیں جاتے ہیں اور نہ کچھ کھاتے ہیں۔“ اس نے بارعب لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ بس تم لوگوں کی محبت تھی جو یہاں تک چلے آئے اب اجازت دو۔“

میری پوری سسرال شبیر شاہ کو ہال کے باہر تک چھوڑنے گئی تھی۔ میرے گھر والے پُرتجسس تھے کہ یہ کون شخص تھا جو شادی کے دن دولھا دلہن سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ بعد میں ان سے پوچھا تو سب ٹال گئے تھے۔ اس کے کچھ دیر بعد کھانا لگ گیا اور پھر دوسری رسومات شروع ہو گئیں تو سب بھول گئے اور آخر میں رخصتی کا مرحلہ آیا۔ آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان میں نے اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کیا۔ ہر لڑکی کی طرح مجھے بھی اس دن کا انتظار تھا جب میں کسی کی ہو جاؤں اور کوئی میرا ہو جائے۔ ان سب باتوں میں مجھے شبیر شاہ یا کسی اور شخص کا دھیان کہاں رہتا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شبیر شاہ اصل میں میری سسرال کا پیر تھا اور اب میرا اس سے واسطہ رہے گا۔ ایک بہت خوب صورت اور حسین رات کے بعد صبح ناشتے کی میز پر میری ساس نے کہا۔ ”ماہ نور تیار ہو جاؤ۔“

”کس لیے امی؟“ میں نے سعادت مندی سے پوچھا۔

”پیر جی کو سلام کرنے جانا ہے۔“

”کون پیر جی؟“

میرے اس سوال پر ساس نے کڑی نظروں سے اویس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے بتایا نہیں۔“

اویس گڑبڑائے۔ ”وہ امی ذہن میں نہیں رہا تھا۔“

”ہاں بیٹا اس وقت ذہن میں کچھ اور ہوتا بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے طنز کیا تو میں اور اویس دونوں کھسیا گئے تھے۔ میری ساس کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ میرے سسر، جیٹھ اور دیور بھی ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ ساس نے میری طرف دیکھا۔ ”پیر شبیر شاہ ہمارے خاندانی پیر ہیں۔ کل تمہارا اور اویس کا نکاح انہوں نے ہی پڑھایا تھا۔“

تب مجھے پتا چلا کہ وہی گورا شخص اصل میں پیر جی تھا۔ اس شخص سے مجھے پہلی نظر اور اس کے ہاتھ کے لمس کے ساتھ ہی چڑ ہو گئی تھی۔ اسے نفرت تو نہیں کہہ سکتے تھے لیکن یہ نفرت کے آس پاس ہی تھی۔ میں ناشتے کے بعد کمرے میں آئی تو میں نے ٹھنک کر کہا۔ ”میں کسی پیر جی کے پاس نہیں جاؤں گی۔“

میرا خیال تھا کہ اویس مان جائیں گے لیکن یہ سنتے ہی ان کے چہرے پر ناگواری آ گئی۔ ”ماہ نور، آئندہ ایسا مت کہنا، تم نہیں جانتیں پیر جی کے لیے ہمارے دلوں میں کیا عزت ہے۔ آج ہم جو کچھ ہیں ان کے طفیل ہیں۔“

میں اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہ ظاہر اپ ٹو ڈیٹ شوہر کے منہ سے یہ بات سن کر حیران ہوئی تھی۔ اگر کوئی جاہل یا کم پڑھا لکھا شخص ایسی بات کرتا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن ایک پڑھا لکھا اور سب جاننے والا شخص ایسی بات کرے تو عجیب تو لگتا ہے۔ اس وقت میں نے جراٴت کی اور بول دیا۔ ”انسان کو دینے والا صرف اللہ ہے اور کوئی انسان کسی انسان کو کچھ نہیں دے سکتا اگر اللہ کی مرضی نہ ہو۔“

”میں کب اس سے انکار کر رہا ہوں۔“ اس بار اویس خلافِ توقع نرم پڑ گئے۔ ”میرا مطلب ہے کہ ہم پیر جی کی بہت عزت کرتے ہیں اور پھر یہ ہماری روایت ہے کہ نئی آنے والی دلہن لازمی ان کو سلام کرنے جاتی ہے۔ روبینہ بھابی بھی گئی تھیں۔ راحیلہ اور نبیلہ بھی شادی کے دوسرے دن ان کو سلام کرنے اور ان سے دعائیں لینے گئی تھیں۔“

راحیلہ اور نبیلہ میری نندیں تھیں۔ دونوں جڑواں تھیں اور اویس سے دو سال چھوٹی تھیں اور ان کی شادی بھی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ ”ٹھیک ہے آپ لوگ پیروں فقیروں کو مانتے ہیں لیکن اویس ہمارے گھر میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔“

”اب تمہارا تعلق اس گھر سے ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن مجھے عادی ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا۔“

اویس یہ بات سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے سر ہلایا۔ ”او کے، لیکن ابھی تو چلو ورنہ امی ہنگامہ برپا کر دیں گی۔“

”ایک شرط پر، صرف آپ کی خاطر جاؤں گی۔“ میں نے ادا سے کہا تو اویس پگھل گئے تھے۔ وہ مسکرائے۔

”میری خاطر بھی اور شرط بھی؟“

”ہاں صرف آپ کی خاطر ورنہ اللہ کی قسم کوئی مجھ سے

یہ بات نہیں منوا سکتا ہے۔ میں پہلی اور آخری بار جاؤں گی۔ دوبارہ کوئی مجھ سے پیر جی کے پاس جانے کے لیے نہ کہے۔"

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" اویس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"نہیں آپ مجھ سے وعدہ کریں۔" میں اڑ گئی۔ "میں اسی شرط پر جاؤں گی۔"

اویس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "پلیز ایسا وعدہ مت لو، ہمارے ہاں بہت سے مواقعوں پر پیر جی کے ہاں جاتے ہیں اور سب گھر والے جاتے ہیں۔ کسی کے نہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔"

میرا منہ سوج گیا تھا۔ مگر میں اویس سے ناراض نہیں تھی۔ ایک اجنبی شخص ایک تعلق کے بندھن میں جکڑ کر کتنا عزیز ہو جاتا ہے یہ میں نے شادی کے بعد ایک ہی دن میں جان لیا تھا۔ اویس نے بھی محسوس کر لیا کہ میری ناراضی اندازِ محبوبی ہے اس لیے انہوں نے مجھے پیار سے منا لیا۔ کچھ دیر بعد .... ہم پیر جی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ میرا سسرال کراچی کے ایک اچھے علاقے میں ہے۔ میرا خیال تھا کہ پیر جی یہیں رہتے ہوں گے لیکن کچھ دیر بعد ہم کراچی کے ایک عام سے علاقے پہنچے۔ یہاں گندی گلیاں تھیں اور جا بہ جا کچرا بکھرا ہوا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اتنا صاف ستھرا اور نفیس نظر آنے والا شخص ایسے علاقے میں رہتا ہے۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ ایسے لوگ ایسی جگہوں پر ٹھکانے بناتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہم ایک بڑے احاطے کے سامنے رکے۔ اندر ایک چھوٹے سے گنبد پر رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ کار باہر چھوڑ کر ہم پیدل اندر آئے۔ کچے احاطے میں کئی درجن افراد زمین پر بچھی چٹائیوں پر بیٹھے تھے۔ گنبد ایک پختہ عمارت کے اوپر تھا اور عمارت اچھی حالت میں تھی۔ برآمدے میں عورتوں کے لیے الگ جگہ تھی۔ میں اور میری ساس وہاں بیٹھ گئے جب کہ اویس چٹائی پر دوسرے مردوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ احاطے میں چند مرید نما لوگ بڑی مستعدی سے انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔ ایک مردوں اور عورتوں کو باری باری اندر لے جا رہا تھا۔ میری ساس نے اس سے آہستہ سے کہا۔ "میری نئی بہو سلام کرنے آئی ہے۔"

مرید نے سر ہلایا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ چند منٹ بعد وہ براہِ راست میری طرف آیا۔ "چلو بی بی سرکار سائیں نے تمہیں بلایا ہے۔"

"امی آپ بھی چلیں۔" میں نے ساس کی طرف دیکھا۔

"نہیں یہ یہاں کا قاعدہ ہے پیر جی سے ہر فرداً کیلے ہی ملتا ہے۔" میری ساس نے جواب دیا۔ "میری باری بعد میں آئے گی تم خوش قسمت ہو جو پیر جی نے تمہیں پہلے بلا لیا۔"

"چلو بی بی سرکار سائیں سے ملنے کے لیے اور بھی لوگ بیٹھے ہیں وہ کسی کو انتظار کرانا پسند نہیں کرتے ہیں۔"

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اور اکیلے جاتے ہوئے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ مجبوراً میں دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ اس مرید کے ہمراہ چل پڑی۔ اندر داخل ہوتے ہی تیز چبھتی خوشبوؤں اور عجیب سے چکراتے دھوئیں نے میرا استقبال ... کیا تھا۔ اس میں چند سانسیں لینے کے بعد میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میں بڑی مشکل سے خود کو سنبھال رہی تھی۔ مرید مجھے مختلف کمروں سے گزارتا ہوا شبیر شاہ کے سامنے پہنچا۔ وہ ایک نیم تاریک کمرے میں خود پر سیاہ چادر ڈالے ایک چوکی پر بیٹھا تھا۔ وہاں خوشبو اور دھواں مزید گہرا تھا۔ مرید نے مجھے چوکی کے سامنے نیچے قالین پر بیٹھنے کو کہا اور خود واپس چلا گیا۔ میری گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ سیاہ چادر کے نیچے سے مجھے آنکھوں سے ٹٹول رہا ہو۔ یہ احساس اتنا واضح تھا کہ میں نے اپنے جسم پر محسوس کیا اور میں جلدی سے دوپٹا لپیٹ کر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہاں بہت زیادہ خاموشی تھی کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے جب اس نے اچانک کہا تو میں اچھل پڑی تھی۔ "لگتا ہے تمہیں یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔"

خود پر قابو پانے میں کچھ دیر لگی تھی پھر میں نے جواب دیا۔ "نہیں پیر صاحب۔"

"تم سلام کرنے آئی تھیں سلام تک نہیں کیا۔"

واقعی میں بھول گئی تھی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر ماتھے تک لے جا کر سلام کیا تو اس نے کہا۔ "یہاں سلام ایسے نہیں ہوتا ہے۔"

"پھر کیسے ہوتا ہے؟"

اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔ اس کی بھری بھری انگلیوں میں کئی پتھروں والی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ "یہاں سلام کے لیے آنے والی نئی دلہن اپنے ہونٹوں سے ہمارے ہاتھ پر نذرانۂ عقیدت ثبت کرتی ہے۔ سلام کا یہی طریقہ ہے۔"

میں بدحواس ہو گئی۔ "پر آپ تو نامحرم ہیں۔"

"ہم پیر ہیں اور پیر نامحرم نہیں ہوتے۔" اس کے لہجے میں اچانک درشتی اور سختی آ گئی تھی۔ میں سہم گئی۔ "تو نے ہمیں ناخوش کیا ہے۔ بہرحال ہم پھر بھی تیرے لیے دعا کریں گے۔ اب سلام کر اور یہاں سے جا۔"

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کیسے اس کے ہاتھ کو ہونٹ لگائے۔ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ میرا تعلق کسی پسماندہ گھرانے سے نہیں تھا۔ ہمارے ہاں لڑکیوں اور عورتوں کو مناسب آزادی حاصل تھی۔ ابو اور امی ہم بہن بھائیوں پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی مگر ساتھ ہی غیر محسوس انداز میں ہمارے لیے حدود بھی متعین کر دی تھیں۔ ہم نے کبھی ان سے تجاوز نہیں کیا۔ غیر مردوں سے ہمارا ایک مخصوص طرزِ عمل ہوتا تھا۔ یعنی ان سے میل جول یا بے تکلفی کا تصور بھی نہیں تھا۔ ہم تین بہنیں ہیں لیکن کبھی ہم تینوں بھی ایک ساتھ امی یا کسی بھائی کے بغیر کہیں نہیں گئیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول کیسا تھا۔ کسی اجنبی مرد کو ہاتھ لگانا یا اسے ہاتھ لگانے کی اجازت دینا ممکن نہیں تھا۔ مگر شادی کے دوران اور اب مجھے دوبار... کراہیت آمیز تجربہ ہوا تھا۔ میں باہر آئی تو مجھے اپنے ہونٹ گندے لگ رہے تھے۔ میں نے رومال سے کئی بار صاف کیے لیکن اس گندگی کا احساس نہیں گیا تھا جو پیر جی کے ہاتھ سے میرے ہونٹوں پر منتقل ہوا تھا۔ میرے بعد میری ساس گئیں اور پھر اویس کی باری آئی۔ ہم وہاں ایک گھنٹا رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ میرا سانس رک رہا ہے۔ جب ہم وہاں سے نکلے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میری ساس بہت خوش تھیں اور بار بار پوچھ رہی تھیں کہ پیر جی نے مجھ سے کیا کہا۔

"کچھ نہیں کہا، بس میں نے سلام کیا اور باہر آ گئی۔" میں نے تنگ آ کر کہا۔ اویس سمجھ گئے کہ میرا موڈ خراب ہے۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا لیکن ساس سارے راستے بڑبڑاتی رہی تھیں۔ جب میں نے گھر آ کر اویس کو بتایا کہ مجھے پیر جی کا ہاتھ چومنا پڑا تو اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

"پیر جی کو ایسے ہی سلام کرتے ہیں۔"

"یہ کیسے پیر ہیں؟ انہیں معلوم نہیں ہے کہ ہمارے مذہب میں محرم، نامحرم کا کتنا فرق ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اویس دیکھیں آپ لوگ انہیں پیر مانتے ہوں گے لیکن میں ایسی کوئی بات نہیں مانتی اس لیے آپ آئندہ مجھے وہاں جانے کو یا کچھ کرنے کو نہیں کہیں گے۔"

"ایسا ممکن نہیں ہے۔"

"ممکن ہے اگر دوبارہ مجھ سے وہاں جانے کو کہا گیا تو میں اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں گی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور واش روم میں آ کر رگڑ رگڑ کر اپنے ہونٹ دھونے لگی۔ منہ دھونے کے دوران روتی رہی تھی۔ جب دل ہلکا ہوا اور باہر آئی تو اویس متفکر سے بیٹھے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میری دھمکی نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں بھی ایک بات انہیں کہہ چکی تھی اس لیے دوبارہ کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ بلکہ انہیں پریشان دیکھ کر میرا دل دکھنے لگا تھا کہ میں نے اتنی سخت بات کیوں کہی اور وہ بھی شادی کے دوسرے دن۔ مگر میں نے اس کی تلافی کی کوشش نہیں کی۔ میں چاہتی تھی کہ یہ بات ان کے ذہن میں بیٹھ جائے کہ میں اس معاملے میں کتنی سخت ہوں۔ مگر یہ رشتہ ایسا ہے کہ کتنی ہی ناراضی کیوں نہ ہو ذرا سی بات ہوتی ہے اور ساری خفگی دور ہو جاتی ہے۔ رات تک ہمارے درمیان کشیدگی باقی نہیں رہی تھی۔

شادی کو کچھ عرصہ گزرا تھا کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری سسرال والے اس جہالت کی دلدل میں کتنے گہرے اتر چکے تھے۔ اس کا آغاز میرے سسر سے ہوا تھا۔ جس زمانے میں وہ اسکول میں پڑھاتے تھے اور ایک عام ٹیچر تھے۔ تب وہ کسی معاملے میں پکڑے گئے۔ یہ بات میری جیٹھانی روبینہ بھابی نے بتائی تھی، پوری بات ان کو بھی نہیں معلوم تھی۔ بہرحال میرے سسر سخت محکمہ جاتی گرفت میں آ گئے تھے۔ ان کے خلاف انکوائری ہو رہی تھی اور امکان تھا کہ وہ نہ صرف ملازمت سے جائیں گے بلکہ شاید انہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس وقت ان کے سارے بچے چھوٹے تھے۔ سب سے بڑے ... نفیس بارہ سال کے تھے اور رامس تو ساس کی گود میں تھا۔ چھوٹے بال بچوں کا ساتھ تھا اور کوئی مالی سہارا نہیں تھا۔ میرے ساس سسر کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ نوکری اور جیل سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ افسروں کی خوشامد اور تعلقات استعمال کرنے سے لے کر تعویذ گنڈے سب کر رہے تھے۔ جہاں کوئی کسی کا بتاتا وہ دونوں دوڑ کر جاتے تھے۔ بہ قول میری ساس کے ان دنوں انہوں نے جتنی

جدوجہد اور دعائیں اس ایک نوکری کے لیے کی تھیں اگر جنت کے لیے کرتے تو جنت مل جاتی۔

مگر تمام کوششیں ناکام جارہی تھیں اور لگ رہا تھا کہ نہ صرف نوکری جائے گی بلکہ میرے سسر کو سزا بھی ہوگی اور کچھ نہیں تو کچھ عرصے جیل اور حوالات میں بھی خوار ہونا پڑے گا۔ ان ہی دنوں کسی نے پیر جی کا بتایا۔ ان دنوں شبیر شاہ نے اپنا نیا نیا ڈیرا جمایا تھا اور اس وقت تو نوجوان ہی تھا۔ میرے ساس سسر اس سے ملے اور اس نے ان کو ایک عمل بتایا اور تعویذ دیا۔ اب اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اس سے ملاقات کے تیسرے دن اچانک ہی انکوائری رک گئی اور پھر جس افسر نے میرے سسر کے خلاف تحقیقات شروع کی تھیں اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ کیس رک گیا اور کچھ عرصے بعد داخلِ دفتر کر دیا گیا۔ یوں نہ صرف سسر کی نوکری بچ گئی بلکہ کچھ عرصے بعد انہیں اسی اسکول میں نائب ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔

وہ پہلے ہی پیروں فقیروں کے چکر میں رہنے والے لوگ تھے جب شبیر شاہ کی یہ "کرامت" دیکھی تو دل و جان سے اس کے مرید بن گئے۔ اس کے بعد وہ ہر معاملے میں پیر جی سے مشورہ ضرور کرتے تھے اور جب میرے سسر ہیڈ ماسٹر بنے تو سانس بھی پیر جی سے پوچھ کر لینے لگے تھے۔ پھر جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے وہ بھی ان کے رنگ میں رنگتے گئے۔ بلکہ میرے جیٹھ اور دونوں نندیں تو ماں باپ سے بھی آگے نکل گئی تھیں۔ وہ ہر ہفتے پیر جی کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ البتہ اویس اور رامس اس معاملے میں کسی قدر پیچھے تھے۔ عقیدت وہ بھی رکھتے تھے لیکن حاضری میں تساہل سے کام لیتے تھے اور اس پر انہیں میرے ساس سسر کی طرف سے ڈانٹ پھٹکار پڑتی تھی اس لیے وہ بھی مہینے میں ایک چکر لگا لیتے تھے۔ جب آستانے پر نیاز دی جاتی تھی اور لنگر ہوتا تھا اس رات کا کھانا وہیں کھاتے تھے۔

جب میرے گھر والوں کو پتا چلا کہ میری سسرال کتنا پیر پرست ہے تو وہ حیران ہوئے تھے۔ کیونکہ میرے گھر میں عمومی تاثر یہی تھا کہ میرے سسرال والے اتنے پڑھے لکھے ہیں اور وہ اس قسم کے چکروں میں کہاں پڑتے ہوں گے۔ میرے گھر والے اولیا اللہ کے قائل تھے۔ ان بزرگانِ دین کی خدمات سے تو کافر بھی انکار نہیں کر سکتے جنہوں نے دنیا کے کونے کونے میں اسلام پھیلایا اور اپنی زندگیاں اسی میں گزار دیں۔ روکھی سوکھی کھا کر اور دشمنانِ اسلام کا ظلم و جبر صبر اور حوصلے سے برداشت کر کے بالآخر ان کو اپنے کردار سے اسلام کی طرف مائل کر لیا۔ مگر آج کل جو لوگ پیر بنے بیٹھے ہیں اور خود کو ان اللہ والوں سے ملاتے ہیں اور بزعمِ خود ان کے گدی نشین بنتے ہیں وہ ان سے اور ان کے کردار سے کوئی مماثلت ہی نہیں رکھتے ہیں۔ انہوں نے کافروں اور مشرکوں کو اسلام کی طرف مائل کیا اور یہ اچھے بھلے مسلمان کو ایسے چکروں میں پھنساتے ہیں جن سے اس کا ایمان بھی چلا جاتا ہے۔ ایسے نام نہاد پیروں کے اپنے ایمان کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ آج کے دور میں بھی اولیا اللہ ہیں مگر ان کا کردار وہی ہے جو ہمیشہ سے اولیا اللہ کا رہا ہے۔ بھی تو یہ دنیا باقی ہے مگر یہ نام نہاد پیر شیطان کے چیلے ہیں اور ان کے اعمال اس کی گواہی دیتے ہیں۔ جب انسان پر کوئی افتاد آتی ہے یا جب وہ کوئی خواہش پوری نہیں کر پاتا ہے تب اس کے اندر کا شیطان اسے بہکاتا ہے کہ وہ اپنی منشا حاصل کرنے کے لیے ان راستوں پر چلے جو اصل میں شیطان کا راستہ ہے اور وہی انسان کی کسی ایسے شخص تک رہنمائی کرتا ہے جو اس زمین پر شیطان کا فرستادہ ہوتا ہے۔ اپنے نفس پر چلنا اور کسی کو نقصان پہنچانے کی خواہش رکھنا یا پھر ایسی خواہشات رکھنا جو اصل میں اللہ کے اختیار میں ہیں اور کسی انسان سے ان کی چاہ کرنا ہی گمراہی ہے۔ میں اور میرے گھر والے اس گمراہی سے محفوظ تھے لیکن بدقسمتی سے مجھے سسرال ایسی ملی جو اس گمراہی میں مبتلا تھی۔

جب میں نے پیر جی کے آستانے سے آنے کے بعد اویس سے کہہ دیا کہ اب میں وہاں دوبارہ نہیں جاؤں گی تو پھر ہمارے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں یہ بتا دوں کہ سوائے اس ایک معاملے کے میرا سسرال ایک نارمل سسرال ہے۔ یہاں بہوؤں کو عزت دی جاتی ہے اور انہیں ان کا مقام دیا جاتا ہے۔ تھوڑی بہت اونچ نیچ تو ہر جگہ ہوتی ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ روک ٹوک یا بے وجہ کا تنگ کرنا نہیں تھا۔ میں جب چاہتی میکے جا سکتی تھی اور اویس کے ساتھ باہر آنے جانے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ مالی لحاظ سے خوشحال تھے اور کھلا کھانا پینا تھا۔ سب مل جل کر خرچ کرتے تھے اور کوئی کنجوس نہیں تھا۔ صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی۔ البتہ کھانا میں اور ساس مل کر بناتے تھے۔ وہ صبح کا ناشتا بناتیں اور میں رات کا کھانا۔ دوپہر میں ہم دو ہی ہوتے تھے تو گزارا کر لیتے تھے مرد رات کو آتے تھے اس لیے ہانڈی رات کو ہی بنتی تھی۔ البتہ روبینہ بھابی

کے چار بچے تھے اس لیے انہیں تین وقت پکانا پڑتا تھا۔

شادی کے بعد جب پہلی بار آستانے جانے کا وقت آیا تو اویس نے ایک دن پہلے مجھ سے کہا۔ "تیار رہنا آج شام تمہاری طرف چلیں گے۔"

میں خوش ہو گئی۔ حالانکہ تین دن پہلے بھی ہم ہو کر آئے تھے لیکن اپنے ماں باپ کے گھر جانا کسے برا لگتا ہے۔ میں شام کو اویس کے ساتھ نکلنے لگی تو میری ساس نے کہا۔ "جلدی آ جانا کل پیر جی کے پاس جانا ہے۔"

یہ سن کر میرا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ باہر آتے ہی میں نے اویس سے کہا۔ "میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں دوبارہ وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"اسی لیے تو تمہیں تمہاری امی کے گھر لے جا رہا ہوں۔" اویس نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم تھا کل تم انکار کر دو گی اور گھر میں بدمزگی ہو گی اس لیے آج رات تم وہاں رک جانا میں کل دفتر سے آتے ہوئے تمہیں لیتا آؤں گا۔"

میں خوش ہو گئی۔ اویس مجھے امی کے گھر چھوڑ کر چلے گئے اور انہوں نے اپنے گھر والوں سے بہانہ کیا کہ میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں وہیں رک گئی۔ ظاہر ہے میری ساس اور سسر نے اچھا محسوس نہیں کیا تھا کیونکہ اگلے دن میں واپس آئی تو ان کے منہ پھولے ہوئے تھے۔ لیکن میں انجان بن کر ان سے ہنستی بولتی رہی تو کچھ دیر بعد وہ بھی ٹھیک ہو گئے۔ میں نے سکون کا سانس لیا تھا مگر فوراً ہی مجھے آنے والے مہینے کی فکر لاحق ہو گئی تھی کیونکہ ساس نے وارننگ دے دی تھی کہ میں بہر صورت اگلے مہینے پیر جی کے آستانے جاؤں گی۔ میں نے رات اویس سے کہا تو وہ بولے۔ "اس میں ابھی ایک مہینا پڑا ہے ابھی سے کیوں فکر کر رہی ہو؟"

"آج کل وقت کا پتا نہیں چلتا ہے۔"

اویس مطمئن تھے لیکن میں فکر مند تھی۔ ہر بار گھر جانے اور وہاں رک جانے کا بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے اور اویس کو اس مسئلے کا کوئی مستقل حل نکالنا تھا اور واحد حل یہی تھا کہ وہ گھر والوں کو دو ٹوک منع کر دیتے کہ میں پیر جی کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ وقت گزرتا رہا اور دوسرے مہینے جانے کا وقت آ گیا۔ مگر اتفاق سے میں بیمار پڑ گئی اور ساس کی بھرپور کوشش کے باوجود میں بیماری کو لے کر پڑی رہی اور یہ ظاہر کیا کہ مجھ میں اٹھنے کی سکت بھی نہیں ہے۔ بخار تیز تھا مگر میں اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی جتنا ظاہر کر رہی تھی۔ بلکہ بخار تو چند گھنٹوں میں اتر گیا اور شکر ہے اس وقت تک میرے سسرال والے جا چکے تھے۔ اویس بھی گئے تھے۔ وہ رات کو واپس آئے تب بھی میں ظاہر کر رہی تھی کہ میری طبیعت بدستور خراب ہے۔ البتہ رات کو میں نے اویس کے سامنے اقرار کر لیا کہ میری طبیعت اتنی خراب نہیں تھی، میں جان بوجھ کر زیادہ بیمار بنی رہی۔

"ماہ نور ایسا کب تک چلے گا۔" اویس نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں جانا تو پڑے گا۔ بلکہ تمہیں اعتراض کیا ہے۔"

"اویس مجھے اعتراض یہ ہے کہ میں کسی شخص کو اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ مجھے ہاتھ لگائے اور نہ ہی مجھے کسی غیر شخص کو چھونا پسند ہے۔ آپ کے پیر جی کے پاس جانے کی صورت میں مجھے دونوں مراحل سے گزرنا پڑے گا اور یہ مجھے کسی صورت گوارا نہیں ہے۔"

"اس میں حرج کیا ہے؟" اویس دبے لفظوں میں بولے۔ "پیر جی ایک قابلِ احترام ہستی ہیں اور ہمارے خاندان کی عورتیں بلا جھجک ان کے پاس جاتی ہیں کبھی کسی کو ان سے شکایت نہیں ہوئی۔"

میں نے اویس کو اپنے احساسات کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ جب میں پہلی بار شبیر شاہ کے سامنے اکیلے میں گئی تو میں نے کیا محسوس کیا تھا۔ اگرچہ بہ ظاہر کچھ نہیں ہوا تھا لیکن ہر عورت کے اندر ایک حس ہوتی ہے جو اسے بتاتی ہے کہ اس کے سامنے موجود مرد اس کے بارے میں کس طرح سے سوچ رہا ہے۔ میری حس نے مجھے بتایا تھا کہ شبیر شاہ میرے بارے میں اچھا نہیں سوچ رہا ہے، اس کی سوچ اور نظریں آلودہ ہیں۔ میں اویس کو یہ سب بتا نہیں سکتی تھی مجھے ایک ڈر یہ تھا کہ وہ غصے میں آ جائیں گے اور اگر انہوں نے گھر میں کسی سے کہہ دیا تو ایک جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔ دوسرا خوف مجھے یہ تھا کہ اویس کو پیر جی کا بہتان برا لگے گا اور میرے اور ان کے تعلقات میں دراڑ آ جائے گی اور میں ایسا کسی صورت نہیں چاہتی تھی اس لیے میں نے یہ بہانہ تراشا۔ "اویس ہمارے خاندان میں اس کا رواج نہیں ہے اول تو ہم پیروں کے اس طرح سے قائل نہیں ہیں۔ پھر غیر مرد سے تعلق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ میری کیا حالت ہوئی تھی جب میں نے دل پر بہت جبر کر کے پیر جی کو سلام کیا تھا۔ یہ کام کر کے مجھے خود سے گھن آ رہی تھی۔"

اویس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں اور یہی بات ہے کہ تمہارے حوالے سے یہ بات مجھے بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ مگر تم جانتی ہو یہ بات دوسروں سے کہنا کتنا مشکل کام ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“

”گھر میں ایک فساد کھڑا ہو جائے گا۔ امی، ابو اور نفیس بھائی سب مجھ پر چڑھ دوڑیں گے۔“

”میں اور رامس آپ کی حمایت کریں گے۔“

”رامس کے بارے میں، میں جانتا ہوں وہ بھی اس معاملے میں میرا ساتھ دے گا لیکن وہ چھوٹا ہے اس کی کوئی سنے گا نہیں اور سب بڑے ہمارے خلاف ہو جائیں گے۔“

اویس کی اس بات سے مجھے خیال آیا کہ میں نے کبھی روبینہ بھابی کو اس حوالے سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کبھی ہر ہفتے اور کبھی دو ہفتے بعد جاتی تھیں کیونکہ نفیس بھائی باقاعدگی سے جاتے تھے۔ حالانکہ ان کے چار بچے تھے اس کے باوجود انہیں گھنٹوں کے حساب سے جانا پڑتا تھا۔ میں نے اکیلے میں اس بارے میں ان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ موقع مجھے جلد مل گیا اس ہفتے نفیس بھائی، میری ساس اور سسر تینوں گئے تھے۔ اویس اور رامس جاب پر تھے۔ رامس کو ایک ٹی وی چینل پر جاب مل گئی تھی اور اسے جوائن کیے ہوئے دوسرا ہفتہ تھا۔ گھر میں، میں اور اوپر روبینہ بھابی تھیں۔ میں اپنے کام نمٹا کر اوپر چلی آئی۔ وہ بچوں کے کپڑے دھو کر سوکھنے کے لیے ڈال رہی تھیں اور میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ ”آپ نہیں گئیں۔“

”میں کہاں جاتی، دیکھ رہی ہو کتنے کپڑے جمع ہو گئے ہیں۔ ماسی بس اتنے دھوتی ہے جتنے طے کیے ہوتے ہیں اس سے اوپر کپڑے میرے سر مار جاتی ہے۔“

”یہ تو زیادتی ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”ویسے آستانے جانا اور وہاں گھنٹوں بیٹھے رہنا بھی آسان کام نہیں ہے۔“

”ہاں بھئی، کمر دکھ جاتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو کون سمجھائے۔“ انہوں نے بیزاری سے کہا تو میرا حوصلہ بڑھا۔

”مجھے بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ خاص طور سے پیر جی کو سلام کرنے کا انداز۔“

روبینہ بھابی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر آہستہ سے بولیں۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مجھے بھی ناگوار گزرا تھا لیکن یہ بات کسی اور سے مت کہہ دینا ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

”کیوں نہیں بھابی، جب سے میں یہاں آئی ہوں اسی مشکل میں ہوں۔“ اس بار میں نے کھل کر کہا۔ ”میرا دل ایک فیصد بھی وہاں جانے کو نہیں مانتا ہے۔“

”تم نے اویس سے یہ بات کہی ہے؟“

”جی وہ متفق ہیں لیکن دوسروں سے ڈرتے ہیں۔“

”میں نے ایک بار ہی نفیس سے یہ بات کہی تھی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نے دوبارہ یہ بات کہی تو وہ مجھے چھوڑ دیں گے لیکن پیر جی کو نہیں چھوڑیں گے۔ تب سے زبان بند رکھی ہے۔ ٹالتی رہتی ہوں لیکن جب دیکھتی ہوں کہ ان کا موڈ زیادہ خراب ہو گیا ہے تو چلی جاتی ہوں۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔“

”میں نے اویس سے کہہ دیا ہے کہ میں دوبارہ وہاں نہیں جاؤں گی۔“

”نہیں۔“ وہ خوفزدہ ہو گئیں۔ ”اگر یہ بات بڑوں تک پہنچ گئی تو......“

”بڑوں تک تو جائے گی بھابی، لیکن میں اب اس شخص کے پاس نہیں جاؤں گی۔ اس نے جس طرح پہلی بار مجھے دیکھا تھا اس طرح کوئی معمولی اخلاق والا شخص بھی کسی غیر عورت کو نہیں دیکھتا ہے اور یہ پیر بن کر بیٹھا ہوا ہے۔“

روبینہ بھابی کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ ”ماہ نور خدا کے واسطے کسی اور کے سامنے اس طرح کھل کر بات مت کرنا۔ تم ان لوگوں کو ابھی صحیح سے نہیں جانتی ہو۔ یہ خدا کے خلاف بھی سن سکتے ہیں لیکن پیر جی کے بارے میں ایک لفظ نہیں سن سکتے۔“

”تب انہوں نے اس پیر کو خدا بنا لیا ہے۔“ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ”اتنے پڑھے لکھے لوگوں سے یہ توقع نہیں تھی۔“

”توقع تو مجھے بھی نہیں تھی لیکن ماہ نور اب یہ ہمارا گھر ہے اور ہمیں یہیں رہنا ہے اور ان لوگوں کی مرضی کے مطابق رہنا ہے۔“

”بھابی یہ مجھے جو کہیں میں ماننے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ بات نہیں مانوں گی۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”تبھی تم دوبارہ سے وہاں نہیں گئی ہو۔“

”ہاں اور نہ آئندہ جاؤں گی۔“ میں نے کہا اور پھر انہیں بتایا کہ جب میں پیر جی کو سلام کرنے گئی تو میں نے کیا محسوس کیا تھا۔ روبینہ بھابی کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ روبینہ

بھابی چار بچوں کی ماں بن کر بھی بہت خوب صورت تھیں۔ میں نے ان کی شادی سے پہلے اور بعد کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ شادی کے وقت وہ کہیں زیادہ حسین تھیں۔ ان کو بتاتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا۔ ”بھابی کیا یہی چیز آپ نے بھی محسوس کی تھی جب آپ شروع میں وہاں گئی تھیں۔“

میری بات سن کر وہ گھبرا گئی تھیں، انہوں نے آس پاس دیکھا کہ کوئی موجود تو نہیں ہے پھر وہ آہستہ سے بولیں۔ ”ماہ نور کسی کے سامنے اس بارے میں مت کہنا، میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا وہ شخص ہوس کا مارا ہے۔ میں جب اس کے سامنے جاتی ہوں تو ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔ اس کی نظریں مجھے جسم میں اترتی محسوس ہوتی ہیں۔ اگر نفیس کا دباؤ نہ ہو تو میں ساری دنیا کی دولت کے بدلے بھی وہاں جانا پسند نہ کروں۔“

”تب یہ بات راحیلہ اور نبیلہ کیوں محسوس نہیں کرتی ہیں؟“

روبینہ بھابی نے بے ساختہ کہا۔ ”وہ اس قابل ہیں کہ انہیں غور سے دیکھا جائے؟ پیر جی کو ان سے کیا دل چسپی ہو سکتی ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ میری دونوں نندیں عام شکل صورت کی تھیں اور پیر جی جیسے مردوں کو ان میں دل چسپی کی کوئی چیز نظر نہیں آتی ہو گی اس لیے وہ انہیں اس طرح دیکھتے نہیں ہوں گے جیسے مجھے اور روبینہ بھابی کو دیکھتے تھے۔ میں روبینہ بھابی جیسی حسین تو نہیں تھی لیکن نوجوانی کی ایک بہار اور دلکشی ہوتی ہے تو وہ مجھ میں بھی تھی۔ پھر خود کو سجا سنوار کر رکھنا بھی آتا ہے اس لیے خوب صورت لگتی تھی۔ لیکن میرا سجنا سنورنا اور خوب صورتی صرف میرے شوہر کے لیے تھی اس میں کسی اور مرد کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں تھی۔ روبینہ بھابی نے تصدیق کر دی تھی کہ شبیر شاہ غلط آدمی تھا۔ روبینہ بھابی کی شادی کوئی دس سال پہلے ہوئی تھی اور اب تک وہ بے شمار بار اس کے پاس جا چکی تھیں۔ اس نے نہایت چالاکی سے یہ اصول بنایا ہوا تھا کہ اس سے ملنے کے لیے آنے والا ہر شخص چاہے وہ مرد ہو یا عورت اس سے تنہائی میں ملتا تھا۔ میں نے اگلا سوال جھجکتے ہوئے کیا۔ ”بھابی آپ بہت بار اس کے پاس جا چکی ہیں، کبھی اس نے تنہائی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔“

ان کے چہرے پر جو تاثرات آئے تھے اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ ہوا ضرور تھا مگر زبان سے انہوں نے فوراً

فدائیان اسلام

ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی دہشت پسند جماعت، جس کی سرگرمیوں کا مرکز تہران تھا اور جس پر بارہ سالہ تحریک 1943-1955ء کے دوران میں متعدد سیاست دانوں کے قتل کی ذمہ داری آئی۔ فدائیان کی تنظیم اگرچہ خفیہ تھی لیکن ان کے اجتماع سرعام ہوتے تھے اور وہ اپنے اغراض ومقاصد کا کھلے بندوں اعلان کرتے تھے۔ ان کا نصب العین شریعت کامل کا نفاذ اور بے دینی کا استیصال تھا۔ فدائیوں کی بدنامی کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کی جماعت کے بانی سید مجتبیٰ میرلوحی نے، جو آگے چل کر نواب صفوی کے نام سے مشہور ہوا۔ مارچ 1945ء میں مشہور عالم احمد کسروی پر ناکام قاتلانہ حملہ کیا اور پھر اگلے سال مقدمے کی کارروائی کے دوران فدائیوں نے کسروی کو قتل کر دیا۔ شہادت نہ ہونے کے باعث وہ بری کر دیے گئے۔ فدائیوں کے لیے آیت اللہ کاشانی کی حمایت کی، ان کے اثر ورسوخ اور روز افزوں انتقامی کارروائیوں کے خوف نے فدائیوں کی بریت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اکتوبر 1949ء میں فدائیوں نے وزیر دربار عبدالحسین کو ہلاک کر دیا۔ مارچ 1951ء میں نئے وزیراعظم جنرل رزم آرا کو قتل کیا گیا۔ اس کے بعد حسین علا وزیراعظم مقرر ہوا لیکن فدائیوں کی دھمکی کے پیش نظر اسے مستعفی ہونا پڑا۔ اور ڈاکٹر محمد مصدق نے وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالا۔ ڈاکٹر مصدق کی معزولی کے بعد فدائیوں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور وہ کچھ عرصے تک نئی حکومت کے خلاف تیز وتند بیانات شائع کرتے رہے۔ اکتوبر 1955 میں وزیراعظم حسین علا پر قاتلانہ حملہ ہوا، جو ناکام رہا۔ اس طرح سے حکومت کو فدائیوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا موقع ہاتھ آیا۔ فدائیان، نواب صفوی، واحدی اور طہماسپی، ان کے رہنما گرفتار ہو کر تختہ دار پر لٹکا دیے گئے اور ان کی جماعت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

مرسلہ: راحیلہ نیاز، لاہور

تردید کر دی۔ ”نہیں ایسا آج تک نہیں ہوا۔ وہ صرف نظربازی کرتا ہے۔“

”سچی بات ہے اس نے پہلی بار میں مجھے جس طرح دیکھا اب مجھے اس کے پاس جانے کے نام سے ہی خوف آتا ہے۔“

روبینہ بھابی نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ”لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں ہم مجبور عورتیں ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ اویس کم سے کم تمہاری بات سنتا ہے۔ نفیس میری بات بھی نہیں سنتے۔ طلاق کی دھمکی کے بعد میں نے پھر ان سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔“

اویس کے رویّے سے مجھے حوصلہ ہوا تھا اگر وہ نفیس بھائی کی طرح عقیدت سے اندھے ہوتے تو شاید میں بھی مجبور ہو جاتی۔ مگر اندر سے اویس ان لوگوں کی طرح نہیں تھے البتہ وہ ایک ہی گھر میں رہ کر وہی کرنے پر مجبور ہو گئے تھے جو باقی سب کرتے تھے اسی طرح رامس بھی شبیر شاہ سے عقیدت نہیں رکھتا تھا۔ بس گھر والوں کے دباؤ پر وہاں جاتا تھا۔ جب میں نے دوسری بار ماہانہ حاضری سے انکار کیا تو اس کے بعد میری ساس کا رویّہ مجھ سے ذرا سرد ہو گیا تھا۔ وہ بات کم کرتی تھیں اور ذرا سی غلطی پر بھی سنا جاتی تھیں۔ میں ماحول خراب ہونے سے بچانے کے لیے سنی ان سنی کر دیتی یا معافی مانگ لیتی لیکن ان کے درشت رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ایک دن وہ ناشتا تیار کر رہی تھیں اور میں رات کے برتن دھو رہی تھی کہ ایک پلیٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گری اور ٹوٹ گئی۔ ساس نے غصے سے مجھے دیکھا اور بولیں۔

”ہاں بی بی تمہارے جہیز کا مال تھوڑی ہے جو تم احتیاط کرو گی۔“

”سوری امی غلطی ہو گئی۔“ میں نے ندامت سے کہا۔ یہ قیمتی ماربل سیٹ کی پلیٹ تھی اور صابن سے چکنی ہونے کی وجہ سے میرے ہاتھ سے نکل گئی کیونکہ غلطی سے میں نے اسے زیادہ اوپر اٹھا لیا تھا کہ وہ سنک سے باہر جا گری۔ ساس تنک کر بولیں۔

”سوری کرنے سے یہ واپس نہیں مل جائے گی۔“

اسی دوران میں رامس آ گیا اس نے کہا۔ ”امی کیا ہوا ہے، غلطی تو سب سے ہو جاتی ہے پرسوں آپ نے اسی سیٹ کی ایک پیالی گرا دی تھی۔“

”ماں کی سائیڈ نہ لینا کبھی۔“ ساس نے کھسیا کر کہا پھر بات بدل کر بولیں۔ ”تو اس بار پیر جی کی حاضری میں کیوں نہیں گیا۔“ انہوں نے کہتے ہوئے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کہیں تجھ پر بھی تو کسی کا اثر نہیں ہو گیا ہے۔“

”مجھ پر کسی انسان کا اثر نہیں ہوتا۔“ رامس نے جواب دیا۔ ”اب باتیں چھوڑیں اور جلدی سے ناشتا دیں مجھے دفتر کی دیر ہو رہی ہے۔“

”دیکھو ابھی تمہاری نوکری کا آغاز ہے، پیر جی کی دعائیں لو گے تو آگے جاؤ گے۔ نفیس کو نہیں دیکھا اس کے سر پر پیر جی کا سایہ ہے، کیسے ترقی ہوتی ہے اور ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔“

”مشکلیں دینے اور آسان کرنے والا اللہ ہے۔“ رامس نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں اسی سے مانگتا ہوں۔“

”بے شک اصل تو وہی ہے لیکن پیر جی اس کے نیک بندے ہیں اور نیک بندوں سے بھی آدمی کو فیض ملتا ہے۔“

”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی اللہ کو بھول کر بندوں کے پیچھے لگا رہے۔“ رامس بھی سنجیدہ ہو گیا حالانکہ وہ ہنسنے بولنے والا شوخ انسان تھا۔ میری ساس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”کیا مطلب؟“

”آپ لوگ اکثر نماز قضا کر دیتے ہو، بیمار ہو تو روزہ چھوڑ دیتے ہو لیکن پیر جی کے پاس حاضری نہیں چھوڑتے، چاہے کتنے ہی بیمار کیوں نہ ہو آستانے ضرور جاتے ہو۔“ رامس کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور جانے لگا۔

”ارے رک ناشتا تو کرتا جا۔“

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے مڑے بغیر کہا اور اس کے جاتے ہی ساس نے یوں مجھے گھورا جیسے اس کے بھوکے جانے کی ذمّے دار میں ہوں۔ تیسرا مہینا قریب آ رہا تھا جب سب سسرال والے شبیر شاہ کے آستانے جاتے اور مجھے ہول اٹھ رہے تھے کہ اس بار میں کیسے انکار کروں۔ جس دن جانا تھا اس روز میری ساس نے صبح سے کہہ دیا۔

”بی بی آج کوئی بہانہ مت کرنا تیار ہو جانا۔“

شام کو جانا تھا۔ میں دوپہر میں لیٹی تو اٹھی نہیں، ساس نے کئی بار آ کر پکارا اور آخر میں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ ابھی وہ اور سسر روبینہ بھابی کو لے کر جا رہے تھے۔ نفیس بھائی، اویس اور رامس ڈیوٹی سے وہیں جاتے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں اٹھ گئی لیکن میرا دل گھبرا رہا تھا۔ ان لوگوں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ واپسی پر کوئی فساد ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ وہ تقریباً دس بجے واپس آئے تھے۔ آتے ہی مجھے ساس اور سسر کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں اور اویس دبے لہجے میں ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے ساس کو بولتے سنا۔ ”اس سے کہہ دو یہاں رہنا ہے تو ہمارے طریقے سے رہنا ہوگا۔“

”امی وہ آپ .... کی اور ابو کی ہر بات مانتی ہے۔“ اویس کی آواز بھی بلند ہو گئی۔ ”لیکن یہ دین کا معاملہ ہے، اس میں کسی پر کوئی زور نہیں ہے۔ وہ نہیں جانا چاہتی ہے تو آپ کیوں زور دے رہی ہیں۔“

”اسے جانا ہو گا۔“ سسر تیز لہجے میں بولے۔ ”تمہیں پتا ہے آج پیر جی نے کیا کہا ہے۔“

”ابو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ پیر جی نے کیا کہا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بھی دین کے معاملے میں جبر سے منع کیا ہے۔“

”ہم کچھ نہیں جانتے۔“ سسر فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ ”اگر تم لوگوں کو یہاں رہنا ہے تو پیر جی کے پاس جانا ہوگا۔“

اویس نے بے یقینی سے کہا۔ ”ابو آپ ہمیں گھر سے نکالنے کا کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں۔“ وہ چلّا کر بولے۔ ”اگر تم لوگوں کو یہاں رہنا ہے تو ہماری مرضی سے رہنا ہوگا ورنہ جہاں دل چاہے جا کر رہو۔“

اویس کمرے میں آئے تو ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے بات نہیں کی تو میں روہانسی ہو گئی۔ ”اویس یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔“

”نہیں یہ ان لوگوں کی بلاوجہ کی ضد اور انا ہے۔“ وہ بولے۔ ”ٹھیک ہے ہم کہیں اور رہ لیں گے۔ میں کل سے مکان دیکھتا ہوں۔ اسی مہینے ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”پلیز آپ اس وقت غصے میں ہیں اور امی ابو بھی غصے میں ہیں اس لیے ابھی کوئی فیصلہ مت کریں۔ جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے تب....“

”تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولے۔ ”بات وہیں سے شروع ہو گی اور مسئلہ وہیں رہے گا۔ بار بار سننے سے بہتر ہے آدمی ایک بار سن کر اپنا راستہ لے۔“

اس رات تو میں باہر نہیں نکلی لیکن اگلی صبح جب ناشتے کے وقت باہر آئی تو ساس سسر کے منہ بنے ہوئے تھے۔ سسر تو مجھے دیکھتے ہی ناشتے کی میز سے اٹھ گئے۔ ساس نے بہت طنزیہ انداز میں کہا۔ ”چین پڑ گیا فساد کرا کے۔“

”امی میں نے کبھی آپ لوگوں کی کوئی بات نہیں ٹالی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور یہ بھی سچ ہے کہ آپ لوگوں نے کبھی کسی معاملے میں اپنی رائے مسلط نہیں کی تو صرف ایک اس معاملے میں کیوں زور دے رہے ہیں۔“

”کیونکہ یہ پیر جی کا معاملہ ہے اور اس میں سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔“

”امی اویس غصے میں ہیں۔ میں نے ان کو منع کیا ہے لیکن شادی کے بعد پہلی بار انہوں نے میری کوئی بات ماننے سے انکار کیا ہے۔ وہ آپ کے بیٹے ہیں۔ پلیز انہیں روک لیں۔“

”وہ نہیں مانے گا اور تمہارے سسر بھی نہیں مانیں گے۔“ ساس کا لہجہ ذرا نرم پڑ گیا۔ ”یہ بات ہی ایسی ہے۔“

”امی پلیز وہ آپ کے بیٹے ہیں آپ کو غصہ مجھ پر ہے ان سے تو کوئی ناراضی نہیں ہے۔“

”تب تم مان جاؤ۔“

”امی میرا دل نہیں مانتا۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”دیکھیں سب تو جاتے ہیں ایک میرے نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا۔“

”پیر جی نے کہا ہے ہمارے گھر پر ایک آفت آنے والی ہے اور اسے روکنے کے لیے سب کا ان کے آستانے پر جانا ضروری ہے۔ اس گھر میں رہنے والے ہر فرد کا۔“

”معذرت کے ساتھ میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔ غیب کا علم صرف اللہ کے پاس ہے اور وہی فیصلہ کرتا ہے۔ اگر اس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو ہمیں صرف اسی سے دعا کرنے سے فائدہ ہوگا۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا تو ساس کا موڈ پھر خراب ہو گیا۔

شام کو اویس آئے تو سسر نے ان کو بلا کر ایک بار پھر کہا کہ یا تو میں پیر جی کے پاس حاضری دوں یا پھر ہم اس گھر سے چلے جائیں۔ اویس نے ان سے کہا کہ وہ پہلے ہی مکان کی تلاش شروع کر چکے ہیں۔ اس لیے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سن کر میری ساس اور سسر دونوں

پریشان ہو گئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس دھمکی سے اویس ڈر جائیں گے اور مجھ پر دباؤ ڈالیں گے۔ لیکن اس کے بجائے اویس نے میری حمایت میں کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس پر میری ساس نے کہا۔ ”تو بیوی کی خاطر ماں باپ کو چھوڑ کر جا رہا ہے؟“

”میں چھوڑ کر نہیں جا رہا، ابو نے مجھے اور ماہ نور کو یہاں سے جانے کو کہا ہے۔“

”تو بیٹا اپنے باپ کی بات کیوں نہیں مان لیتا؟“

”اگر یہ ہمارے متعلق کوئی حکم دیں تو مجھے ماننے میں کبھی تامل نہیں ہوگا لیکن یہ جو منوانا چاہ رہے ہیں وہ تو دل کا معاملہ ہے۔ اس میں زبردستی کہاں چلتی ہے۔“

”پر بیٹا یہ تیری بہتری کے لیے کہہ رہے ہیں۔“

”میری بہتری چاہتے ہیں تو پھر اس معاملے میں ماہ نور کو مجبور نہ کیا جائے۔ میں پیر جی کے پاس جاتا ہوں کیا یہ کافی نہیں ہے؟ ضروری ہے ماہ نور بھی جائے۔“

”بالکل ضروری ہے۔“ سسر نے کہا۔ ”میں پیر جی کا حکم نہیں ٹال سکتا۔“

”تب میں آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔“ اویس نے تلخی سے کہا اور ان کے پاس سے اٹھ آئے۔ اس رات پھر ایک میٹنگ ہوئی جس میں مجھ سمیت گھر کا ہر فرد شریک ہوا تھا۔ روبینہ بھابی نے مجھ سے کہا۔

”ماہ نور تم مان جاؤ۔“

”ٹھیک ہے بھابی میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میری شرط یہ ہے کہ میں اکیلے میں پیر جی کے پاس نہیں جاؤں گی میرے ساتھ اویس ہوں گے۔“

”یہ کیسی شرط ہے۔“ ساس نے اعتراض کیا۔ ”پیر جی کا اصول ہے ایک وقت میں ایک آدمی کو باریابی بخشتے ہیں۔“

”تم پیر جی پر شک کر رہی ہو۔“ سسر نے بھی بگڑ کر کہا۔

”نہیں، میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ایک نامحرم سے اکیلے میں ملنا ہمارے مذہب کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے میں اپنے شوہر کے ساتھ ہی پیر جی کے سامنے جاؤں گی۔ میرا خیال ہے ان کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”ان کو نہ ہو مجھے اعتراض ہے۔“ سسر بولے۔ ”یہ ان کی شان میں گستاخی ہوگی۔ ہم ان پر شک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔“

اویس نے پھر میرا ساتھ دیا۔ ”ماہ نور نے اچھی شرط رکھی ہے آپ پیر جی سے بات کر کے دیکھ لیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ سسر غصے میں کھڑے ہو گئے۔ ”بس فیصلہ ہو گیا ہے، اس گھر میں تمہاری اور تمہاری بیوی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔“

اویس نے مجھے اگلے دن میکے چھوڑا۔ ”جب تک میں مکان تلاش نہیں کر لیتا تم یہیں رہو۔“

گھر والے پریشان ہو گئے تھے، ابو کو غصہ آیا تھا۔ ”اتنے جاہل لوگ ہیں، مجھے پتا ہوتا تو میں رشتہ ہی نہ دیتا۔“

”ابو اویس بہت اچھے ہیں۔“ میں نے اویس کی حمایت کی۔ ”دیکھیے وہ میرا پورا ساتھ دے رہے ہیں۔“

”ہاں اویس اچھا آدمی ہے۔“ ابو نے کہا۔ ”اچھا ہوگا اگر تم ان جاہلوں سے الگ ہو جاؤ۔“

”نہیں ابو وہ برے لوگ نہیں ہیں۔ بس اس چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ میری دعا ہے اللہ انہیں سیدھا راستہ دکھائے۔ اویس اپنے ماں باپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے وہ ان سے الگ رہ کر خوش نہیں ہوں گے۔“

”تب ماں باپ کو اس کا احساس ہونا چاہیے۔“

”میں نے کہا نا کہ وہ اس پیر کے چکر میں آئے ہوئے ہیں۔“

اویس نے ایک ہفتے میں اپنے دفتر کے پاس نارتھ ناظم آباد میں ایک چھوٹا فلیٹ لے لیا۔ یہ صاف ستھرا اور اچھے علاقے میں تھا۔ لیکن جب ہم یہاں منتقل ہوئے تو ہم دونوں ہی افسردہ تھے۔ اویس تو پہلی رات بار بار رونے لگتے تھے۔ ان کو چپ کراتے کراتے میں بھی رو دیتی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے سسرال والے اس معاملے میں اس حد تک چلے جائیں گے۔ لیکن اب مجھے اطمینان تھا کہ وہ مجھ پر دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے۔ اویس شروع میں بہت افسردہ تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ نارمل ہونے لگے۔ ہاں میں یہ بتانا بھول گئی کہ جب اویس گھر سے سامان لے جانے گئے تو میرے سسر نے ان سے کہہ دیا کہ اب ان کا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ دوبارہ وہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نفیس بھائی اور میری نندوں نے بھی ہمارا بائیکاٹ کر دیا تھا لیکن رامس ملنے آتا تھا۔ وہ دفتر سے ہمارے ہاں آجاتا مگر اس نے یہ بات گھر میں نہیں بتائی تھی

ورنہ اس کی بھی شامت آجاتی۔ ایک بار روبینہ بھابی بھی چھپ کر آئی تھیں۔ وہ شاپنگ کے بہانے رامس کے ساتھ نکلی تھیں اور کچھ دیر کے لیے میرے گھر بھی آئیں۔

”ماہ نور گڑبڑ بڑھتی جا رہی ہے۔“ انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

میں سمجھی وہ گھر کے حوالے سے کہہ رہی ہیں۔ ”بھابی اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ وہ ہم سے ہر قسم کا تعلق ختم کر چکے ہیں۔“

”میں گھر کی نہیں پیر جی کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ بولیں۔ ”اس کے انداز سے اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔“

میں چونکی۔ ”خیریت بھابی....؟“

”ابھی موقع نہیں ہے بعد میں بتاؤں گی۔“ انہوں نے رامس کی طرف دیکھا جو لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ مجھے تجسس ہو رہا تھا میں نے کہا۔

”آپ مجھے کال کر سکتی ہیں۔“

”نہیں نفیس نے کال کرنے پر پابندی لگا رکھی ہے اور وہ باقاعدگی سے میرا موبائل چیک کرتے ہیں۔ مجھے اس کا زیادہ پتا نہیں ہے اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں مجھ سے غلطی ہوگی اور انہوں پکڑ لیا تو میرے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔“

جیسا کہ خواتین کی عادت ہوتی ہے کہ ان کو ایک ادھوری بات پتا چل جائے تو جب تک وہ پوری بات نہیں جان لیتی ہیں انہیں چین نہیں آتا ہے۔ اب مجھے بھی سخت تجسس لاحق ہو گیا تھا۔ میرے پاس روبینہ بھابی کا موبائل نمبر تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”میں آپ کو کال کروں گی۔ اگر نفیس بھائی نے دیکھ بھی لیا تو آپ کہہ دیجیے گا کہ میں نے کال کی تھی۔ آپ نے ریسیو کر کے مجھے دوبارہ کال کرنے سے منع کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن خیال رکھنا ایسے وقت کال کرنا جب نفیس گھر پر نہ ہوں اور ہاں آج کل امی ناشتے کے بعد اوپر آجاتی ہیں اگر وہ موجود ہوئیں تب بھی میں کال ریسیو نہیں کروں گی۔“

میں نے اگلے دن بارہ بجے کال کی۔ میرے ذہن میں تھا کہ اس وقت نفیس بھائی اور بچے تو ہوں گے نہیں اور امی بھی لازمی نیچے جا چکی ہوں گی۔ اتفاق سے ایسا ہی تھا۔ روبینہ بھابی نے کال ریسیو کی۔ ”میں انتظار کر رہی تھی کہ تم کال کرو گی۔ اب میں اکیلے اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی ہو جس سے میں شیئر کروں۔ لیکن ماہ نور یہ بات اپنے تک رکھنا۔ اگر اویس کو بتانا تو اسے بھی خود تک رکھنے کو کہنا اگر یہ بات نفیس یا امی ابو تک پہنچ گئی تو میرے ساتھ بہت برا ہوگا۔“

”آپ بے فکر رہیں، یہ بات میرے دل میں رہے گی اور اگر اس میں آپ کے حوالے سے کوئی پہلو ہے تو میں اویس سے بھی نہیں کروں گی۔“

اس روز روبینہ بھابی سے میری کوئی آدھے گھنٹے بات ہوئی اور اس دوران میں انہوں نے جو انکشافات کیے میں سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ شبیر شاہ مجھے ہوس پرست آدمی لگا تھا لیکن وہ اندر سے اس قدر شیطان صفت ہوگا میں نے سوچا نہیں تھا۔ وہ شروع دن سے روبینہ بھابی کے چکر میں تھا۔ آغاز میں تو وہ اشاروں کنائیوں میں بات کرتا رہا لیکن ایک سال پہلے وہ کھل کر سامنے آگیا۔ اس نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس سے اکیلے میں ملیں تو وہ ان پر ایک ایسا عمل کرے گا کہ نفیس بھائی ان کے غلام بن جائیں گے اور وہ جو چاہیں گی نفیس بھائی ویسا ہی کریں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انہیں اس کی چند خواہشات پوری کرنا ہوں گی۔ روبینہ بھابی اس کی بات سن کر ڈر گئی تھیں اور انہوں نے انکار کر دیا کہ انہیں اپنے شوہر کو غلام بنانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اس پر شبیر شاہ نے پینترا بدلا اور روبینہ بھابی کے حسن کی تعریف کرنے لگا۔ وہ باتوں کا ماہر تھا بغیر کھل کر کہے ایسی باتیں کہہ جاتا کہ روبینہ بھابی شرم سے پانی پانی ہو جاتی تھیں لیکن وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں اور اس سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اپنے شوہر یا سسرال والوں سے بھی نہیں کہہ سکتی تھیں۔ اس لیے اندر ہی اندر گھٹتی رہیں۔

گزشتہ چند مہینوں سے شبیر شاہ مسلسل میرے سسرال والوں کو ڈرا رہا تھا کہ ان پر کوئی آفت آنے والی ہے اور اس سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام گھر والے ماہانہ حاضری دیں۔ کوئی ایک فرد بھی نہیں آیا تو اس آفت کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی لیے میرے سسرال والے مجھ پر آستانے چلنے کے لیے زور دے رہے تھے۔ جب میں نے انکار کیا تو ہمیں گھر سے نکال دیا گیا۔ اب گھر کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو ماہانہ حاضری میں نہ جاتا ہو۔ شبیر شاہ اصل میں میری حاضری چاہتا تھا اور اس کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ میرے ساس سسر نے اسے بتایا کہ حاضر نہ ہونے کی پاداش میں انہوں نے بہو بیٹے کو گھر سے نکال دیا ہے۔ گویا میں اس کی دسترس سے دور نکل گئی تھی۔ اس لیے اس نے اب روبینہ

بھابی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس نے کہا کہ آفت اس طرح سے نہیں ٹلے گی۔ جب تک ان کے گھر کی کوئی بہو ایک خاص عمل سے نہ گزرے۔ یہ عمل چاند کی پہلی رات کو کیا جاتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ پوری رات شبیر شاہ کے حجرے میں رہے۔ صرف اسی صورت میں آنے والی آفت ٹل سکتی تھی۔ یہ بات شبیر شاہ نے صرف میری ساس سے کہی تھی اور انہیں پابند کر دیا تھا کہ وہ یہ بات صرف اپنی بہو کو بتائیں جسے اس عمل سے گزرنا تھا۔ میری ساس نے بتایا کہ ماہ نور تو آنے پر راضی نہیں تھی وہ اس عمل کے لیے کہاں سے راضی ہوتی اب صرف روبینہ ہے۔ شبیر شاہ نے کہا کہ وہ اس سے بات کرے اور انہیں اس کے پاس بھیج دے۔ جب ساس نے روبینہ بھابی سے بات کی تو انہوں نے سنتے ہی انکار کر دیا۔

"امی پندرہ بیس منٹ کی بات الگ ہوتی ہے لیکن میں پوری رات کسی صورت وہاں نہیں رہ سکتی۔ میری طرف سے انکار ہے۔"

"دیکھو ماہ نور تو کم نصیب نکلی تم تو پیر جی کو ناراض مت کرو۔"

"امی میں یہ بات کسی صورت نہیں مان سکتی چاہے نفیس اس کے بدلے مجھے چھوڑ دیں۔"

مجبوراً میری ساس یہ کہہ کر چپ ہو گئیں۔ "ٹھیک ہے خود ہی بھگتنا۔"

اتفاق سے اس کے چند دن بعد روبینہ بھابی کا بڑا بیٹا بیمار ہو گیا اس کی عمر نو سال تھی۔ اچانک بخار ہوا اور اتنا تیز ہوا کہ وہ جلنے لگا تھا۔ پہلے گھر میں دوا اور پٹی کرتے رہے لیکن جب بخار کی شدت کم نہیں ہوئی تو اسے لے کر اسپتال بھاگے جہاں بڑی مشکل سے ڈاکٹروں نے اس کا بخار کم کیا اور وہ دو دن اسپتال میں داخل رہا۔ ابھی وہ پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوا تھا کہ اس سے چھوٹی بیٹی کو خسرہ نکل آئی۔ اس کی طبیعت بہت خراب رہی تھی اور ڈاکٹروں نے اڑتالیس گھنٹے کا وقت دے دیا تھا لیکن اللہ نے کرم کیا اور وہ ٹھیک ہو گئی۔ ان دو واقعات سے روبینہ بھابی بہت خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ ساس نے بھی ان سے کہا۔ "دیکھا پیر جی کی بات نہ ماننے کا انجام۔"

"میں کیا کروں۔" وہ پریشان ہو گئیں۔ "اللہ نے کرم کیا میرے بچوں کو کچھ ہو جاتا تو میں جیتے جی مر جاتی۔"

"بس اس بار چل کر پیر جی سے معافی مانگ لے اور جیسا وہ کہیں ویسا ہی کر۔" ساس نے ترغیب دی۔ روبینہ بھابی کبھی نہ مانتیں لیکن ان کے اندر کی ماں مان گئی۔ اپنے بچوں کی خاطر وہ کوئی بھی قربانی دے سکتی تھیں۔ وہ ماہانہ حاضری کے لیے سب گھر والوں کے ہمراہ گئیں۔ ساس پہلے اندر گئیں اور انہوں نے شبیر شاہ سے کہہ دیا کہ ان کی بہو معافی مانگنے اور ان کے حکم پر عمل کرنے کے لیے آئی ہے۔ یہ سن کر یقیناً شبیر شاہ کی باچھیں کھل گئی ہوں گی...... روبینہ بھابی اپنی باری پر گئیں۔ مخصوص سلام کے بعد وہ اس کے سامنے بیٹھیں تو شبیر شاہ نے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے بچوں پر کیا گزری۔ یقین کرو بڑا سخت حملہ تھا اگر ہم بروقت توجہ نہ کرتے تو کسی بچے کی جان بھی جا سکتی تھی۔"

یہ سن کر روبینہ بھابی کے ہوش اُڑ گئے تھے انہوں نے عاجزی سے کہا۔ "پیر جی، کچھ کریں اس آنے والی آفت کو ٹال دیں۔"

حالانکہ خود روبینہ بھابی شبیر شاہ کو فراڈ اور دھوکے باز سمجھ رہی تھیں لیکن جب بچوں کا معاملہ آیا تو وہ دماغ کے بجائے دل سے سوچنے لگی تھیں۔ اب وہ اس شخص کے سامنے گڑگڑا رہی تھیں۔ "ہم نے پہلے ہی حل بتا دیا تھا لیکن تم نہیں مانیں۔ خیر دیر سے سہی لیکن تم مان گئیں۔"

جب روبینہ بھابی کو اس کی شرط یاد آئی تو وہ پھر خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ "پیر جی مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"جو ہم کہیں ویسا ہی کرنا ہو گا۔ یاد رکھنا کسی بھی حکم سے ذرا بھی انکار کیا تو سارا عمل الٹ جائے گا اور اس بار صرف بچوں کی ہی نہیں بڑوں کی بھی جان جا سکتی ہے۔" شبیر شاہ انہیں پکا کر رہا تھا۔

وہ ڈر گئیں۔ "میں ویسا ہی کروں گی جیسا آپ کہیں گے۔"

"شاباش اور کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا۔"

"پر میں رات بھر یہاں رہوں گی تو میرے شوہر اور گھر والوں کو پتا تو چلے گا۔"

"وہ تو جب پتا چلے گا اس وقت کی بات ہے لیکن یہاں سے باہر نکل کر بات کرنے کی صورت میں شیاطین اس عمل کے بارے میں جان جائیں گے اور وہ پہلے نقصان پہنچا سکتے ہیں اس لیے رازداری اہم ہے۔"

"اچھا میں کسی سے نہیں کہوں گی۔"

"ایک بات کا خیال اور رکھنا۔" شبیر شاہ نے

کہا۔ "اس عمل کے دوران عورت کا پاک صاف ہونا ضروری ہے۔ وہ خاص ایام سے نہ ہو اور نہ شوہر اس کے پاس آیا ہو۔ ہماری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

روبینہ بھابی کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ انہوں نے صرف سر ہلایا منہ سے کچھ نہیں کہا۔ شبیر شاہ نے مزید ہدایات دیں۔ "گھر سے کوئی زیور اور کوئی آرائشی چیز مت پہن کر آنا۔ آخری کھانا دوپہر بارہ بجے سے پہلے کھا لینا۔ اس کے بعد اس حجرے میں آنے تک کچھ مت کھانا۔ ہاں مائع چیز لی سکتی ہو۔ یہاں آنے کے بعد تمہیں گھر کے کپڑے اتار کر ایک لباس پہننا ہو گا۔ مطلب یہ کہ دورانِ عمل گھر کی کوئی چیز تمہارے بدن پر نہ ہو۔"

روبینہ بھابی خاموشی سے سن رہی تھیں۔ جیسے جیسے گفتگو آگے بڑھ رہی تھی شبیر شاہ کے اندر کا شیطان باہر آتا جا رہا تھا، ساتھ ہی اس کا مقصد اور عزائم بھی واضح ہو رہے تھے۔ روبینہ بھابی کشمکش میں پڑ گئی تھیں انہیں لگا کہ اگر انہوں نے اس کی بات مان لی تو اس حجرے سے اپنی عزت سلامت نہیں لے جا سکیں گی۔ اگر انکار کرتی ہیں تو ان کے بچوں اور گھر والوں پر کوئی آفت نہ آ جائے۔ وہ باہر آئیں تو ان کی حالت اتنی خراب ہو رہی تھی کہ نفیس بھائی نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں گھر لے جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے موقع ملتے ہی ساس کو سب بتایا کہ شبیر شاہ نے کیا کہا ہے اور بولیں۔ "امی میں کسی صورت یہ سب نہیں کر سکتی۔"

میری ساس بھی ذرا چپ ہوئی تھیں۔ شاید انہیں بھی عجیب لگا ہو گا مگر پیر جی کی عقیدت اتنی آسانی سے ختم کھانے والی نہیں تھی۔ "دیکھو ان کی نیت پر شک نہ کرو وہ ہمارے بھلے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں۔ تم سفیر اور مشل کی حالت دیکھ چکی ہو۔ پیر جی کی بات درست نکلی تھی۔ اگر تم نہ گئیں اور خدانخواستہ کچھ ہوا تو پھر پچھتانے کا موقع بھی نہیں رہے گا۔"

"اللہ نہ کرے۔" روبینہ بھابی نے کہا اور پھر رونے لگیں۔ "میں کیا کروں میرا دل ایک فیصد بھی نہیں مان رہا ہے۔"

اب ہوا یہ کہ جب چاند کی پہلی آئی اور میری ساس نے پیر جی کی ہدایت کے مطابق نفیس بھائی سے بات کی تو وہ اندھی عقیدت کے مارے تیار ہو گئے۔ میرے سسر بھی راضی تھے لیکن اس سے پہلے شبیر شاہ کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جاتا روبینہ بھابی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ان کا بلڈ پریشر اتنا گر گیا کہ انہیں لے کر اسپتال جانا پڑا تھا اور ڈاکٹروں کے مطابق اگر انہیں لانے میں کچھ تاخیر ہو جاتی تو ان کا انتقال بھی ہو سکتا تھا۔ سب دہل گئے تھے اور نتیجہ یہ نکلا کہ شبیر شاہ کی بات پر یقین مزید پختہ ہو گیا۔ نفیس بھائی نے کال کر کے اسے اطلاع دی تو اس نے فوراً کہا۔

"یہ سب ان ہی شیطانی قوتوں کی کارستانی ہے جو نہیں چاہتیں کہ تم لوگ کسی طرح بچ سکو وہ پورے گھر کو برباد کرنا چاہتی ہیں۔"

"تب ہم کیا کریں؟"

"اگلے چاند کی پہلی کا انتظار کیونکہ آج کا موقع تو ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اب پتا نہیں کیا ہو۔ روبینہ کا دماغ بھی الٹ سکتا ہے اور وہ تم سے الٹی سیدھی باتیں بھی کر سکتی ہے۔ ہمارے بارے میں بھی بات کر سکتی ہے۔ اس کی باتوں پر دھیان مت دینا۔ ابھی اس کے علاج پر توجہ دو اور باقی سب ہم پر چھوڑ دو۔" وہ مکار شخص پوری ہوشیاری سے اپنا جال پھیلا رہا تھا اور اپنے بچاؤ کا بندوبست بھی کرتا جا رہا تھا۔

"پیر جی بس آپ ہی کا آسرا ہے۔" نفیس بھائی نے عاجزی سے کہا۔ رامس ان کے ساتھ تھا اور اس گفتگو پر پیچ و تاب کھا رہا تھا اس نے بات ختم ہوتے ہی بھائی سے کہا۔

"بھابی وہاں نہیں جائیں گی۔"

"بکواس مت کرو۔" نفیس بھائی اس پر چڑھ دوڑے۔ "یہ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ پیر جی کی ناراضی اللہ کی ناراضی ہے۔"

رامس لاحول پڑھ کر رہ گیا۔ پھر اس نے دھمکی دی۔ "اگر یہ کام ہوا تو میں بھی گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"چلے جاؤ تم جیسے لوگوں کی وجہ سے ہم پر عذاب آ رہے ہیں، تم جاؤ گے تو کوئی بدعقیدہ نہیں رہے گا۔ تب ہی مسئلہ ٹھیک ہو گا۔"

روبینہ بھابی ایک دن اسپتال میں رہ کر گھر واپس آ گئیں۔ اس بار جان بچ گئی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا اگلی بار وہ نہیں بچ سکیں گی اور انہیں شبیر شاہ کے حجرے میں جانا ہی پڑے گا۔ بھابی نے جب بات ختم کی تو وہ رو رہی تھیں۔ "ماہ نور بتاؤ میں کیا کروں، میرا تو دل چاہ رہا ہے خودکشی کر لوں اس روز روز کی ٹینشن سے تو نجات ملے۔"

"پلیز بھابی۔" میں دہل گئی تھی۔ "ایسا سوچیں بھی مت، آپ کے چار بچے ہیں۔ ان کو آپ کی ضرورت ہے۔"

"تب میں کیا کروں۔ میں اتنا سوچتی ہوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ کبھی کبھی لگتا ہے میرے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔"

کیونکہ روبینہ بھابی کا معاملہ رامس سمیت سب کے علم میں آ گیا تھا اس لیے اب اویس کو بتانے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا میں نے ان کو تسلی دی۔ "آپ پریشان نہ ہوں میں اویس سے مشورہ کرتی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔"

شام کو اویس آئے تو میں نے سب سے پہلے انہیں ساری بات بتائی، پہلے تو وہ حیران رہ گئے۔ اتنے عرصے سے وہ بھی شبیر شاہ کے پاس جا رہے تھے اور اتنی آسانی سے اسے برا آدمی نہیں مان سکتے تھے۔ میں نے ہمت کر کے اپنے احساسات کے بارے میں بھی بتایا اور یہ بھی کہ میں کیوں اس کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے اویس کو قائل کر لیا۔ وہ اب غصے میں تھے۔ "یہ شخص اس کردار کا نکلے گا۔ پتا نہیں امی، ابو اور بھائی کی آنکھوں پر کیسی پٹی بندھی ہے جو انہیں اس کا اصل چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا ہے۔"

"اویس ہمیں صرف بھابی کو ہی نہیں بلکہ باقی گھر والوں کو بھی اس شخص سے بچانا ہے۔ راحیلہ اور نبیلہ بھی اس کے پاس جاتی ہیں وہ اس پر اندھا اعتماد کرتی ہیں۔ خدانہ خواستہ کوئی اونچ نیچ ہوئی تو ان کی زندگی پر اثر پڑے گا۔"

اویس بھی ہر بھائی کی طرح اپنی بہنوں کے لیے حساس تھے۔ ان کا ذکر آیا تو وہ پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اسی وقت رامس کو کال کی۔ "تم آ جاؤ بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

رامس سمجھ گیا تھا کہ کیا ضروری بات کرنی ہے اور وہ خود بھی اس موضوع پر کسی سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ گھر میں صرف روبینہ بھابی تھیں اور وہ اس موضوع پر ان سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی بہت پریشان تھا اس نے آتے ہی کہا۔ "اویس بھائی میرا خون کھول رہا ہے، اگر نفیس بھائی نے بھابی کو اس خبیث کے پاس بھیجا تو خدا کی قسم میں کچھ کر بیٹھوں گا۔"

غصہ اویس کو بھی تھا لیکن وہ ٹھنڈے مزاج کے تجربے کار آدمی تھے۔ رامس نوجوان تھا اس لیے بھڑک رہا تھا۔ اویس نے اسے بھی ٹھنڈا کیا۔ "یہ بہت پیچیدہ معاملہ ہے کیونکہ اس میں ہمارے سامنے ہمارے ہی گھر والے اور ہمارے ماں باپ اور بھائی ہیں۔ اس لیے اسے سکون سے حل کرنا ہوگا۔"

"کیسے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"سب مل کر غور کرتے ہیں کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔" اویس نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ امی ابو اور بھائی کا ردِعمل کیا ہے؟"

"اندھے عقیدت مندوں والا۔" رامس نے تلخی سے کہا۔ "وہ اس شخص کے خلاف ایک لفظ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مجھے تو نفیس بھائی پر حیرت ہے وہ اپنی بیوی کی بات نہیں سن رہے اور اس شخص پر آنکھ بند کر کے یقین کیا ہوا ہے۔"

"تمہاری بات ہوئی کسی سے؟"

رامس نے بتایا کہ اس کی نفیس بھائی سے کیا بات ہوئی تھی اور انہوں نے کیا کہا۔ "مجھے تو لگ رہا ہے کچھ عرصے بعد میں بھی اس گھر سے باہر ہوں گا۔ سارے گھر پر نفیس بھائی کا قبضہ ہو جائے گا۔"

"وہ ایسے نہیں ہیں میں انہیں جانتا ہوں۔" اویس نے تردید کی۔ "ساری خرابی کی جڑ شبیر شاہ ہے۔"

"اویس ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے تائید کی۔ "امی، ابو اور نفیس بھائی سب بہت اچھے ہیں، مسئلہ صرف یہی ہے اگر کسی طرح سے وہ اس جعلی پیر کے چنگل سے نکل آئیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مسئلہ تو اس کے چنگل سے نکالنے کا ہے۔" رامس بولا۔

اچانک مجھے خیال آیا۔ "سنو کیا ہم کسی طرح سے اس کا اصل چہرہ سامنے نہیں لا سکتے؟"

"وہ کیسے؟" رامس نے پوچھا۔

"بھئی جیسے ٹی وی پر دکھاتے ہیں آج کل ایسے کتنے پروگرام آ رہے ہیں جن میں معاشرے کے مکروہ کرداروں کی جاسوسی کر کے ان کے چہروں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔"

رامس چونکا اور پھر پُرجوش ہو گیا۔ "میں سمجھ گیا، خفیہ کیمروں اور مائک کی مدد سے ریکارڈنگ کی جاتی ہے۔ میرے چینل سے بھی ایک ایسا ہی پروگرام آتا ہے۔"

اویس بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ "بالکل اگر کوئی شخص کیمرے اور مائک لگا کر چلا جائے اور اس کی اصلیت سامنے لے آئے تو....."

"شخص نہیں عورت۔" میں نے ان کی بات کاٹی۔ "کوئی عورت ہو گی تب ہی یہ شخص اپنے اصل روپ میں سامنے آئے گا۔"

"ایسا ہو سکتا ہے بالکل ہو سکتا ہے۔" رامس کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ "اتفاق سے اس پروگرام کا پروڈیوسر میرا بہت اچھا دوست بن گیا ہے، میں اس سے کل ہی بات کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ مان جائے گا بلکہ وہ تو ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس کے پاس کام لینے کے لیے ہر طرح کے لوگ ہیں۔ ان میں لڑکیاں اور عورتیں بھی شامل ہیں۔"

"تب وہ یہ کام کر سکتا ہے۔" اویس خوش ہو گئے۔ "رامس کسی بھی طریقے سے کوشش کرو اگر اس معاملے میں رقم کی ضرورت پڑے تو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"رقم کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" رامس نے کہا۔

پھر اس نے اگلے دن کے بجائے اسی وقت اپنے دوست کو کال کی۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ "یار تیرے لیے ایک چانس ہے..... ایک جعلی پیر ہے..... وہی سب جو جعلی پیر کرتے ہیں....." رامس نے شاید میری وجہ سے مبہم انداز میں کہا تو میں وہاں سے اٹھ گئی تاکہ وہ کھل کر بات کر لے۔

کچھ دیر بعد جب وہ جا رہا تھا تو اس نے یقین سے کہا۔ "اب دیکھیے گا اس شیطان کے ساتھ کیا ہوتا ہے، وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے صدقِ دل سے کہا۔

دوسرے دن رامس نے کال کر کے خوشخبری سنائی کہ اس کا دوست تیار ہو گیا ہے اور اسی ہفتے یہ پروگرام شوٹ ہو جائے گا اور شاید دوسرے ہفتے آن ایئر بھی ہو جائے۔ میں اور اویس خوش تھے۔ میں نے سب سے پہلے روبینہ بھابی کو کال کر کے یہ خوشخبری سنائی۔ "بس بھابی کچھ دن کی بات ہے اس منحوس سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے گی۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟" انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔" میں نے کہا اور پھر انہیں تفصیل سے بتایا کہ رامس کا دوست کیا کرے گا اس شخص کو بے نقاب کرنے کے لیے۔ رامس نے اویس کو بتایا تھا اور اویس نے مجھے بتایا کہ اس پروگرام کے لیے کام کرنے والی ایک لڑکی خود کو شادی شدہ ظاہر کر کے اولاد کی خواہش کے ساتھ شبیر شاہ کے پاس جائے گی اور اشاروں کنائیوں میں کہے گی کہ وہ اولاد کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے کیونکہ

1907ء میں برطانیہ کے ایک ماہر اثریات سر آرل اسٹائن نے ایران اور وسط ایشیا میں کھدائیاں کروائیں تو پیکنگ کے قریب بدھوں کے قبرستان سے ایک کتاب ملی جو مطبوعہ ہے اور اس کا تعلق نویں صدی عیسوی سے ہے۔ یہ طباعت کا اولین نمونہ ہے جو ابھی تک دستیاب ہو سکا ہے اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ طباعت کا کام مغربی دنیا سے بہت پہلے چین میں رائج تھا۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ چین سے بھی دو تین سو سال پہلے طباعت رائج ہو چکی تھی چونکہ 770ء کی مطبوعہ کچھ پرچیاں بھی دستیاب ہو چکی ہیں لیکن نقادوں کا کہنا ہے کہ یہ صرف پرچیاں ہیں انہیں کتابوں کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

ماخذ سائنس میگزین
زیرِ ادارت سید قاسم محمود
مرسلہ: شہناز ندیم جونیجو، لاڑکانہ

اب وہ سسرال والوں کے طعنے مزید نہیں سہہ سکتی..... لڑکی بہت خوب صورت تھی اور اسے اداکاری بھی آتی تھی۔ رامس کے دوست پروڈیوسر نے بتایا تھا کہ اس نے پہلے بھی ایسے ہی کئی افراد کو کامیابی سے اُلو بنایا تھا۔ امید تھی کہ شبیر شاہ اس کے جال میں پھنس جائے گا۔ لڑکی کے لباس میں بٹن نما کیمرہ اور مائک ہو گا جو گفتگو اور منظر ریکارڈ کر لے گا۔ رامس اور اس کے دوست کو امید تھی لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ شبیر شاہ جس قسم کا ہوس کار تھا وہ ضرور اس جال میں پھنسے گا اور جب اس کی اصلیت سامنے آئے گی تو وہ سوائے تلملانے کے اور کچھ نہیں کر سکے گا۔

ایک ہفتے کی تیاری کے بعد رامس کے دوست کی ٹیم شبیر شاہ کے آستانے پہنچی۔ لڑکی کو اندر اکیلے جانا تھا لیکن اگر وہ مشکل میں پڑ جاتی یا اس کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی جاتی تو ٹیم کے ساتھ دو مسلح گارڈز بھی تھے وہ فوراً اندر پہنچ کر لڑکی کی مدد کرتے۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ لڑکی اندر گئی تو اس کی خوب صورتی دیکھ کر شبیر شاہ کے خاص مرید نے اسے فوری باریابی کا مستحق سمجھا۔ چند منٹ بعد وہ حجرے میں تھی جہاں مخصوص دھواں دھار ماحول میں شبیر شاہ موجود تھا۔ اس کے لباس میں لگا کیمرا اور مائک منظر اور گفتگو باہر موجود وین کے آلات تک نشر کر رہے تھے اور وہ سب دیکھ اور سن رہے تھے۔ لڑکی تقریباً نصف گھنٹے وہاں رہی اور اس

نے اپنی مخصوص اداؤں اور باتوں سے شبیر شاہ کو ایسا دیوانہ کیا کہ وہ فوراً ہی کھل کر سامنے آ گیا۔ اس نے پہلے ڈھکے چھپے انداز میں اور پھر کھل کر لڑکی کو پیشکش کی کہ اگر وہ اس سے تنہائی میں ملے تو وہ اسے صاحب اولاد کر سکتا ہے۔

لڑکی نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے اور پھر ترغیب دیتے ہوئے کھل کر اس سے پوچھا کہ وہ اسے کیسے صاحب اولاد کر سکتا ہے تو شبیر شاہ نے بے حیائی سے بتایا کہ اس کے شوہر میں کمی ہے لیکن اس میں کمی نہیں ہے وہ اس سے پہلے بھی بیشمار عورتوں کو جو اولاد سے محروم تھیں اولاد دے چکا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اس سے اکیلے میں ملیں۔ لڑکی نے پورا پروگرام پوچھا کہ وہ کیسے آئے گی اور وہ کہاں اس سے ملے گا۔ اس پر شبیر شاہ نے حجرے کے عقب میں بنا ہوا پُرتعیش کمرا اسے دکھایا جو کسی ہوس کے مارے شخص کی عیش گاہ لگ رہا تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا کہ وہ یہاں اس کے ساتھ چند گھنٹے گزارے گی تو پوری امید ہے کہ اس کی مراد بر آئے گی۔ جب اس نے دیکھا کہ لڑکی خود ہی راضی ہے تو اس نے کھل کر ایسی باتیں کیں جو صرف کوئی شیطان کا چیلا ہی کر سکتا ہے۔ ہم نے جو سوچا تھا یہ اس سے کچھ زیادہ ہی تھا۔

کامیاب ریکارڈنگ کے بعد رامس کے دوست نے سب سے پہلے اس کی فرمائش پر ایک ڈی وی ڈی اس کے سپرد کی۔ اس شرط کے ساتھ کہ یہ کہیں اور ظاہر نہیں ہو گی۔ پروگرام کچھ عرصے بعد نشر ہونا تھا اور رامس اس سے پہلے گھر والوں کو شبیر شاہ کا اصل چہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک کاپی اویس کو دی جو ہم نے دیکھی۔ یہ ایسا پروگرام تھا جسے صرف میاں بیوی ہی دیکھ سکتے تھے۔ رامس کے دوست نے بتایا کہ نشر کرنے سے پہلے اس میں سے بہت کچھ سنسر کر دیا جائے گا۔ لیکن اس ڈی وی ڈی میں سب کچھ اصل تھا اور کوئی حصہ کٹ نہیں ہوا تھا البتہ روانی رکھنے کے لیے اس کی معمولی سی ایڈیٹنگ کر دی گئی تھی۔

اسی دن رامس اویس کے ساتھ گھر پہنچا تو پہلے میرے سسر اور نفیس بھائی نے انہیں برا بھلا کہا کہ وہ اب کیا کرنے آئے ہیں۔ بڑی مشکل سے رامس نے انہیں ٹھنڈا کیا اور بتایا کہ وہ انہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں۔ رامس نے اپنے لیپ ٹاپ میں ڈی وی ڈی لگائی اور صرف سسر، نفیس بھائی اور اویس بھائی کے سامنے اسے پلے کیا تھا۔ میری ساس بھی وہاں نہیں تھیں کیونکہ اس میں ایسی گفتگو تھی جو ماں بیٹے ایک ساتھ نہیں سن سکتے تھے۔ اویس نے بعد میں بتایا کہ انہیں تو ابو کے سامنے بھی شرم آ رہی تھی لیکن مجبوری تھی۔ وہ ایک مقصد کے تحت یہ سب کر رہے تھے۔ جب آدھے گھنٹے کی یہ ریکارڈنگ ختم ہوئی تو میرے سسر اور جیٹھ کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ جس شخص کو (نعوذ باللہ) تقریباً خدائی کے درجے پر فائز کر رہے تھے۔ وہ اس قدر گرا ہوا نکلے گا۔ اس کی پُرتعیش عیش گاہ میں شراب کی بوتلیں بھی سجی ہوئی تھیں۔ نفیس بھائی تو اتنے مشتعل ہوئے کہ اسی وقت شبیر شاہ کے ڈیرے پر جانے لگے تھے۔ سب نے مل کر بہ مشکل انہیں روکا۔ رامس نے انہیں سمجھایا۔

”آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے چند دن بعد اس کا یوم حساب خود آ جائے گا۔“

میرے سسر کا صدمے سے برا حال تھا۔ ”اللہ مجھے معاف کرے، اس ذلیل شخص کی باتوں میں آ کر میں نے اپنے بچوں کو گھر سے نکال دیا۔“

میری ساس کو پتا چلا تو وہ اسی وقت سر ہو گئیں کہ میں اور اویس واپس آ جائیں۔ اویس خوش ہو گئے تھے۔ ایک تو ان کے گھر والے پیر جی کے چنگل سے نکل آئے تھے دوسرے اب ہم دوبارہ اپنے گھر واپس آ جاتے۔ انہوں نے اس کا کریڈٹ مجھے دیا تھا اگر میں جرأت نہ کرتی تو شاید یہ گھرانا اسی طرح پیر جی کے چنگل میں پھنسا رہتا۔ دو ہفتے بعد جب یہ پروگرام ٹی وی پر چلا تو شبیر شاہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ڈیرے سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ مشتعل لوگوں نے ڈیرے پر حملہ کر کے وہاں توڑ پھوڑ کی اور آگ لگا دی۔ پولیس نے شبیر شاہ کے خلاف مقدمہ درج کر لیا اور اس کی تلاش کا ڈراما کرنے لگی کیونکہ لوگوں کا کہنا تھا کہ پولیس اس سے ملی ہوئی تھی اور کئی پولیس والے باقاعدگی سے اس کے ڈیرے پر آتے جاتے تھے۔ وہ اس کی آمدنی اور کالے کرتوتوں میں برابر کے شریک تھے۔ یہ جگہ بھی قبضے کی تھی۔ اس نے کسی کی زمین پر قبضہ کر کے ڈیرا بنایا تھا اور وہ بے چارہ کمزور ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ چھڑا نہیں سکا تھا۔ سب سے زیادہ خوش روبینہ بھابی تھیں۔ وہ صرف شبیر شاہ سے ہی نہیں بچی تھیں نفیس بھائی نے بھی ان سے معافی مانگی تھی۔ ان کا رویّہ بھابی سے بالکل بدل گیا تھا۔ ہم ایک ہفتے بعد ہی واپس گھر آ گئے تھے۔ اب شکر ہے میرا سسرال اس جہالت سے نکل آیا ہے۔

✱

میں نے کروٹ بدلی۔۔ اور احساس ہو گیا کہ فیاض میرے برابر میں نہیں ہے۔

اپنے شاندار بستر پر میں اکیلی تھی۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی ایک بجا رہی تھی اور فیاض کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ بستر پر سویا ہی نہیں تھا۔

ایسا بہت دنوں سے ہو رہا تھا۔

میں اپنے شوہر فیاض کا انتظار کرتے کرتے سو جاتی۔ ملازمین بھی اپنے کوارٹر میں چلے جاتے اور رات زہریلی ناگن کی طرح ڈسنے لگتی۔

فیاض دیر گئے گھر آتا۔ کوئی ملازم اس کے لیے گیٹ

آنکھیں

محترمہ عذرا رسول

تسلیم!

اگر آپ نے میری سرگزشت شائع کردی تو بہت سے لوگ مجھے ظالم کہیں گے، ایسے لوگوں سے التجا ہے کہ خدارا پہلے میرے حالات پر غور کرلیں۔ میں نے ایسا ظالمانہ فیصلہ کیوں کیا، میری مجبوری پر غور ضرور کرلیں تب رائے دیں۔

سارہ

(لاہور)

اور اندر کے دروازے کھول دیتا۔ وہ بہت اطمینان کے ساتھ کپڑے تبدیل کر کے میرے برابر لیٹ جاتا۔

میں نے کئی بار اس سے جھگڑا بھی کیا تھا۔ ”آخر یہ کیسا بزنس ہے کہ تم کو فرصت ہی نہیں ملتی۔ جبکہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں ملازموں کے رحم وکرم پر ہوتی ہوں۔“

”میری جان، یہ سارے ملازم اعتماد کے ہیں۔“ وہ کہا کرتا۔ ”تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تمہاری فکر نہیں ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے۔“

میں خاموش ہو کر رہ جاتی۔ میں جانتی تھی کہ فیاض باتیں بنا رہا ہے۔ کہانی کچھ اور ہے۔ پہلے بھی تو بزنس تھا۔ اس کی مصروفیات تھیں۔ اس کے باوجود وہ مجھ پر بھی پورا دھیان دیا کرتا۔

وہ شام ہی کو گھر واپس آجاتا اور ہم دونوں آؤٹنگ پر چلے جایا کرتے۔ زندگی ان دنوں بہت خوبصورت ہوا کرتی تھی۔

ہم دونوں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ بچے چار پانچ سال کے بعد ہونے چاہئیں۔ تاکہ اس دوران لائف کو انجوائے کر سکیں۔

لیکن ان چار پانچ برسوں سے بہت پہلے ہی بہت کچھ ہو گیا۔ فیاض کی عادتیں بدلنے لگی تھیں۔ اس نے گھر اور مجھ پر توجہ بہت کم کر دی تھی۔

حالانکہ میں ابھی تک وہی تھی۔ میری وہی توجہ تھی۔ وہی محبت تھی۔ نہ جانے کیوں ہمیشہ سے میری خواہش رہی تھی کہ میں جس سے محبت کروں ٹوٹ کر کروں۔ جس طرح ماں اپنے بچے سے پیار کرتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ بچپن میں بھی میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتی۔ کبھی اس کا سر دبا رہی ہوں، کبھی اس کے بالوں میں تیل ڈال رہی ہوں۔

میری دوست کہا کرتی۔ ”قدرت نے تم میں ممتا کا فارمولہ کچھ زیادہ ہی شامل کر دیا ہے۔ اسی لیے تم اپنی وین کے ڈرائیور کو بھی ممتا بھری نگاہوں سے دیکھتی ہو۔ اگر تمہارا بس چلے تو اس کا بھی سر دبانے بیٹھ جاؤ۔“ میں ہنس کر رہ جاتی۔

شادی کے بعد میری خواہش تھی کہ میرے گھر ننھا مہمان آجائے۔ لیکن فیاض کی یہ خواہش نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اولاد چار پانچ برس کے بعد ہونی چاہیے۔

مجبوراً میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔

شادی کے کچھ دنوں کے بعد ایک رات میں نے جب فیاض کے سر میں تیل ڈالنا چاہا تو اس نے منع کر دیا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو۔ ہم پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ یہ تو گاؤں دیہات کی عورتیں کیا کرتی ہیں۔“

میں خاموش رہ گئی تھی۔

جب فیاض جلدی گھر واپس آتا تو اس وقت میں کسی نہ کسی بہانے جلدی جلدی اس کے کام خود کرنے بیٹھ جاتی۔ چائے بنا کر پلا رہی ہوں۔ اس کے کپڑے اور موزے وغیرہ سلیقے سے رکھ رہی ہوں۔

اس وقت فیاض ہنس کر کہا کرتا۔ ”لگتا ہے تم میں کسی خاندانی نوکرانی کی روح حلول کر گئی ہے۔ تم صرف خدمت ہی کر کے خوش ہوتی ہو۔“

”تمہیں تو ناز کرنا چاہیے کہ تمہاری بیوی تمہارا اتنا خیال رکھتی ہے۔“

”ماڈرن عورت بنو یار۔ میرا اور تمہارا رشتہ برابری کا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ پاؤں دبانے کے لیے شادی نہیں کی ہے۔“

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب فیاض کو واپسی کی جلدی ہوا کرتی تھی۔ اب تو اس سے باتیں کرنے کو بھی ترس گئی ہوں۔

ناشتے کی میز پر بھی جب ملاقات ہوتی تو اس وقت بھی فیاض کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا۔

میں نے ایک دن جب اپنی ایک راز دار سہیلی کو یہ بات بتائی تو اس نے فوری طور پر رائے دے دی۔ ”میری جان مرد کا رویہ ایسا ہو جائے تو اس کا صرف ایک مطلب ہوتا ہے کہ وہ کسی اور عورت کے چکر میں پڑ گیا ہے۔“

”لیکن فیاض ایسا نہیں ہے۔“

”اس خوش فہمی میں مت رہنا۔“ میری دوست نے کہا۔ ”تم ذرا کرید و یا اپنے طور پر معلوم کراؤ۔۔ تو سچائی سامنے آجائے گی۔“

اور سچائی سامنے آ ہی گئی۔ نہ تو کریدنے کی ضرورت پیش آئی اور نہ ہی میں نے کسی سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔

فیاض نے خود ہی اس بات کا اعتراف کر لیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد وہ جلدی گھر واپس آیا تھا۔ وہ اس شام بہت سیریس اور خاموش تھا۔ مجھے کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے

وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن کچھ سوچ کر رک جاتا ہے۔ بالآخر میں نے ہی پہل کی۔ ”کیا بات ہے، آج تم کچھ الجھے الجھے سے دکھائی دے رہے ہو۔“

”ہاں۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ فیاض کا لہجہ بہت بوجھل سا تھا۔

میری دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ شاید وہ دن آ گیا تھا جس کا خدشہ تھا۔ شاید میرے لیے کوئی ایسی بات ہو جو میں برداشت نہ کر سکوں۔

”سارہ۔۔ میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ بالآخر فیاض نے وہ بات کہہ ہی دی مجھ کو جس بات کا خدشہ تھا۔ لیکن وہ اتنی بڑی بات بھی ہو سکتی ہے یہ میرے تصور میں بھی نہیں تھا۔

”دوسری شادی؟“ میں نے حیران ہو کر فیاض کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں احساس ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”ہاں۔“ فیاض نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”احساس ہے اسی لیے مجھ میں تم سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کئی بار سوچا بھی لیکن خاموش رہا۔ لیکن اب ایک ایسی مجبوری آ گئی ہے کہ تمہیں بتانا ہی پڑ رہا ہے۔ سارہ، تم خود اندازہ لگاؤ، میرے پاس سب کچھ ہے۔ اپنا بزنس ہے، اپنی مصروفیات ہیں، اپنی زندگی ہے۔ میں اگر چاہتا تو تمہارے علم میں لائے بغیر یہ شادی کر سکتا تھا۔ تم کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ لیکن میں نے سوچا کہ تم کو بتا ہی دیا جائے۔“

”بہت احسان کیا ہے تم نے۔“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ”کون ہے وہ لڑکی۔“

”نزہت نام ہے اس کا۔“ فیاض نے بتایا۔ ”میری فرم میں جاب کے لیے آئی تھی۔“

”اور اس کا تعلق بہت ہی شریف گھرانے سے ہوگا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر بولنا شروع کر دیا۔ ”وہ بہت غریب ہوگی۔ اس کے بھائی بہن ہوں گے جن کا کوئی آسرا نہیں ہوگا اور تم نے ازراہِ ہمدردی یہ فیصلہ کر لیا ہوگا کہ اس مجبور سے شادی کر لی جائے تاکہ اس کو ایک سہارا مل سکے۔ کیوں ایسا ہی ہے نا؟“

”اب سب کچھ تو تم نے کہہ ہی دیا ہے۔“ فیاض کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”اب کیا بتاؤں تم کو۔“

”اب تمہارے پاس بتانے کے لیے رہ کیا گیا ہے۔“

فاطمی خاندان

ایک حکمران خاندان، جس نے شمالی افریقا اور بعدازاں مصر میں 909ء سے 1171ء تک حکومت کی۔ اس خاندان کا نام حضرت فاطمہؓ کے اسم گرامی سے منسوب ہے، کیونکہ خلفائے بنو فاطمہ اپنا نسب حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ تک پہنچاتے تھے۔ بنو فاطمہ اپنا سلسلۂ نسب اسماعیل بن جعفر الصادقؒ سے ملاتے ہیں، لیکن انہوں نے کچھ عرصے تک اعلانیہ اور باضابطہ طور پر اپنے نسب نامے کے بارے میں اعلان نہیں کیا اور چونکہ غائب اماموں کے زمانے کے دوران محمد بن اسماعیل اور عبید اللہ المہدی کے درمیان آنے والے تمام اماموں کے نام دانستہ طور پر اخفا میں رکھے گئے تھے اس لیے مختلف انساب رائج ہو گئے۔ اسماعیلی ماخذ میں عبید اللہ سے قبل کے آئمہ کا سلسلہ ہر جگہ یکساں نہیں ملتا اور نہ ان کے ناموں کے بارے میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ بہرصورت بنو عباس نے قدرتی طور پر بنو فاطمہ کے اس سلسلہ نسب کی شد و مد سے مخالفت کی، کیونکہ اس کی بدولت فاطمیوں کے اثر اور وقار میں بے حد اضافہ ہوا تھا۔ فاطمی خاندان نے طاہری، صفاری اور طولونی وغیرہ حکومتوں کے برعکس اپنے آپ کو خلافتِ بغداد کی سیادت سے بالکل آزاد کر کے دولت عباسیہ کی مدِمقابل بن گئی۔ اہلِ بیت میں مختلف اماموں کے پیروکاروں میں سے ایک فرقہ باطنیہ اسماعیلی تھا، جو امام جعفر صادق کے بعد ان کے صاحبزادے اسماعیل کی امامت کو تسلیم کرتا تھا۔ اسی سے عبیدی فرقہ ظہور میں آیا، جو عبید اللہ المہدی بن محمد بن جعفر مصدق بن محمد مکتوم بن جعفر صادق کو امام مانتا تھا۔ اس فرقے کے مبلغین نے یمن، حجاز، بحرین وغیرہ میں اپنی دعوت کی اشاعت کی، لیکن مغرب میں محمد الحبیب کے زمانے میں اس کا آغاز اور عبید اللہ کے زمانے میں تکمیل ہوئی، عبید اللہ مہدی نے فاطمی حکومت کے قیام کے بعد سسلی سے مصر تک دولتِ فاطمیہ کا پرچم لہرانے کی کوشش کی چنانچہ 913ء میں ان کے بیٹے ابوالقاسم نے مصر پر فوج کشی کر کے برقہ، فیوم اور سکندریہ کو زیرنگیں کیا لیکن عباسی امیر مونس نے انہیں واپس لے لیا۔

مرسلہ مظفر عادل، حیدرآباد

"میں نے کہا۔ "سب کچھ تو بتا دیا ہے تم نے۔ اور پھر میری اجازت کی بھی کیا ضرورت ہے۔ جاؤ شادی کر لو۔ لیکن کم از کم ایک بات تو مجھے ضرور سمجھا دو۔"

"کیا سمجھنا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ مجھ میں ایسی کون سی کمی تھی کہ تم نے دوسری طرف رخ کر لیا۔" میں نے کہا۔ "کیا مرد کی یہی نیچر ہوتی ہے۔"

"سارہ بات یہ ہے کہ تم میں کوئی کمی نہیں ہے۔ تم بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی ہو۔"

"تو پھر اور کیا چاہیے تمہیں؟"

"محبوب۔ مرد کو ہمیشہ محبوب کی تلاش رہتی ہے اور عورت شادی کے بعد صرف بیوی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس میں وہ پہلے والی باتیں نہیں رہتیں۔ وہ صرف گھر اور گھر کی ہو کر رہ جاتی ہے۔"

"اپنی بے وفائی کو کوئی اور رنگ نہ دو فیاض۔ اگر مرد کی یہی نیچر ہے تو پھر یہ اس لڑکی سے شادی کے بعد بھی قائم رہے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے بعد تم پھر کسی اور کو تلاش کرنے نکل جاؤ گے۔"

"شاید ایسا نہ ہو۔" فیاض نے ایک گہری سانس لی۔ "اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ شادی کے بعد بھی محبوب ہی بن کر رہے گی۔"

"فیاض... اصل بات یہ ہے کہ تم نے اس سے شادی کا مکمل فیصلہ کر لیا ہے۔ اسی لیے اس قسم کی تاویلات پیش کر رہے ہو۔"

"تم جو بھی کہو۔ میں تمہاری ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں۔" فیاض نے کہا۔ "لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک بار، صرف ایک بار اس سے مل لو۔"

"وہ کیوں؟ مجھے کیا ضرورت ہے اس سے ملنے کی۔" میں نے کہا۔

"تاکہ تم کو اس کی نیچر کا پتا چل جائے۔ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ اس کے حالات سن لو۔ پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ میں اپنے فیصلے میں حق بہ جانب ہوں یا نہیں۔"

"نہیں... میں اس سے نہیں ملوں گی۔" میں نے کہا۔ "اور تمہیں جو کرنا ہے وہ کرو۔ میں تمہارے راستے کی دیوار نہیں بننا چاہتی۔ تمہیں محبوبہ کی ضرورت ہے نا۔ جاؤ، پکڑ لو اپنی محبوبہ کا ہاتھ۔"

لیکن ایسا ہو نہیں سکا بلکہ جو کچھ بھی ہوا وہ بالکل خلافِ توقع اور بھیانک تھا۔

اس شام میں ٹی وی دیکھ رہی تھی جب فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔

"کیا آپ مسز فیاض بول رہی ہیں۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ آواز میرے لیے اجنبی تھی۔

"ہاں، میں مسز فیاض ہی بول رہی ہوں۔" میں نے بتایا۔

"آپ فوری طور پر ہاسپٹل پہنچ جائیں۔ آپ کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" فون کرنے والے نے ہاسپٹل کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے، فیاض میرا شوہر تھا۔ اس کے حادثے کی اطلاع میرے لیے قیامت سے کم نہیں تھی۔ میں نے اپنے ایک کزن کو فون کیا اور ہم دونوں ہاسپٹل پہنچ گئے۔

فیاض کو آپریشن کے لیے آئی سی یو میں لے جایا گیا تھا۔

اس دوران میرے گھر والے بھی پہنچ چکے تھے۔ فیاض کے دفتر کے لوگ بھی آ گئے تھے۔ دو گھنٹے کے صبر آزما مراحل کے بعد ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ جان بچ گئی ہے لیکن اس کی دونوں آنکھیں Damage ہو چکی ہیں۔ وہ نابینا ہو گیا ہے۔ یہ کیسی خبر تھی۔ کتنی بھیانک، کتنی مکروہ، کتنی الم ناک۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

اس کے بعد کے بے شمار مراحل تھے۔ فیاض کا نابینا ہو کر گھر واپس آجانا۔ میری پریشانی، میرا دکھ۔ فیاض کے بزنس کی طرف سے کوئی پریشانی نہ تھی۔ اس کا منیجر ایک محنتی اور مخلص شخص تھا۔ اس نے بزنس کے معاملات خوش اسلوبی سے سنبھال لیے تھے۔

لیکن فیاض کی اس بے بسی اور محرومی کو کیا کہا جائے۔ اس کی دنیا تو اندھیروں کی دنیا ہو کر رہ گئی تھی۔ اس دوران ایک بات یہ ہوئی کہ اس نے جس لڑکی نزہت کے لیے میرا دل توڑا تھا۔ جس سے دوسری شادی کا منصوبہ بنا رہا تھا وہ اس کے نابینا ہونے کے بعد اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

فیاض احساس تو نہیں ہونے دے رہا تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اب اس گھر میں میں اور فیاض کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

اب تو وہ میرے اشاروں پر چلا کرتا۔ میں نے اس دوران اپنی تمام خواہشات پوری کر لیں۔ میں اس کی لاٹھی بن گئی تھی۔ اس کے سر میں تیل ڈالنا۔ اس کا لباس تبدیل کروانا۔ اس کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانا۔

غرضیکہ وہ سب کچھ جو میری فطرت میں شامل تھا۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ "کیوں فیاض، اب بتاؤ میرا لو کرانی ہونا کام آ رہا ہے یا نہیں۔"

"ہاں یار۔" اس نے فرطِ جذبات سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی بے جان آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ "سارہ۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے ساتھ زیادتی کرتا رہا ہوں۔"

"بھول جاؤ، پچھلی باتوں کو۔" میں نے کہا۔ "اب ہم ساتھ ہیں۔ تمہاری آنکھیں چلی گئیں تو کیا ہوا میں تمہاری آنکھیں ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ تم تو میری آنکھیں بن چکی ہو۔" اس نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "تم جس طرح میرا ساتھ دے رہی ہو، بہت مشکل ہے کوئی اور ساتھ دے۔"

میں اس کا ساتھ تو دے رہی تھی لیکن اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھنا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ میں نے تو اس کو اپنا محتاج ہی بنا کر رکھ دیا تھا۔

وہ بہت سے چھوٹے موٹے اپنے کام خود بھی کر سکتا تھا۔ لیکن میں کرنے ہی نہیں دیتی تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ اسے آرام پہنچانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ اور اس طرح مجھے جس قسم کی آسودگی حاصل ہوتی تھی، اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔

ایک دن اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "سارہ، جی چاہتا ہے کہ میں کہیں اور چلا جاؤں۔"

"کیسی بات کر رہے ہو کہاں جاؤ گے؟"

"کہیں بھی۔ ایسا لگتا ہے کہ میں تمہیں بہت دکھ دے رہا ہوں۔ میری وجہ سے تم صرف گھر کی ہو کر رہ گئی ہو۔ تمہاری اپنی سوشل لائف ختم ہی ہو گئی ہے۔"

"یہ بتاؤ کہ پہلے کون سی سوشل لائف تھی۔" میں نے کہا۔ "اور تم یہ کیوں نہیں سمجھ رہے کہ میرے لیے تم سے زیادہ کسی کی اہمیت نہیں ہے۔"

فیاض خاموش ہو جاتا۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیسے کیسے خیالات ہوتے ہوں گے۔ کیسے کیسے احساسات ہوں گے۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت کچھ حاصل بھی کر لیا تھا۔ پھر اچانک سب کچھ اس سے کہیں گم ہو گیا۔

ایک بار میری ایک دوست نے مجھے بتایا۔ "سارہ، تم نے فیاض کے لیے ڈاکٹر متراں سے رجوع کیا ہے۔"

"کون ڈاکٹر متراں؟"

"فرانس کا مشہور آئی سرجن، اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ معجزے دکھا دیتا ہے۔ آج کل ایک ہفتے کے لیے اسپنسر آئی ہاسپٹل میں آیا ہوا ہے۔ تم چاہو تو جا کر اس سے وقت لے سکتی ہو۔"

یہ تو بہت بڑی خوش خبری تھی۔ میرے لیے بھی اور فیاض کے لیے بھی لیکن میں نے فی الحال فیاض کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

ہو سکتا تھا کہ اس ڈاکٹر سے اس کی امیدیں وابستہ ہو جاتیں۔ وہ یہ سمجھ لیتا کہ اب اس کی بینائی واپس آنے والی ہے لیکن اگر ناکامی ہو جاتی تو پھر کیا ہوتا۔

اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے اس کی ساری رپورٹس ڈاکٹر متراں کو دکھا دی جائیں۔ بڑی مشکلوں اور کوششوں کے بعد اس سے وقت مل سکا تھا۔

وہ بہت معقول آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے رپورٹس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "میڈم، امید تو ہے لیکن میں ابھی سو فیصد نہیں کہہ سکتا۔ ان کے کئی ٹیسٹ مجھے اپنے طور پر کرنے ہوں گے اس کے بعد میں کوئی رائے دے سکوں گا۔"

میں نے جب فیاض کو بتایا تو وہ حد سے زیادہ خوش ہو گیا... "سارہ، تم تو میرے لیے بہت کچھ کر رہی ہو۔"

"میں صرف اپنا فرض پورا کر رہی ہوں فیاض۔ خدا نے چاہا تو... تم دوبارہ اس دنیا کو دیکھنے لگو گے۔"

"دنیا کو بھاڑ میں ڈالو۔ مجھے تو تمہیں دیکھنا ہے۔ اس بار اپنی آنکھوں میں جذب کر لینا ہے تمہیں۔"

پھر ڈاکٹر متراں کی ہدایت پر فیاض کے ٹیسٹ شروع ہو گئے۔

نہ جانے کتنے قسم کے ٹیسٹ تھے۔ جن کی رپورٹس متراں کے سامنے رکھ دی جاتیں۔ ہر مرحلے کے بعد ہم دونوں کی امیدیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

ہم نے کئی طرح کے پروگرام بنا لیے تھے۔ مری

سے لے کر بیرونِ ملک تک۔ ”سارہ، میں تمام مناظر، قدرت کی بے پناہ خوبصورتی کو خوب جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاروباری مصروفیات میں میں نے قدرت کے اس حسن کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ بس گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر۔“

”تم ہفتے میں ایک دو بار کلب بھی تو جایا کرتے تھے۔“

”تو کیا ہوا۔ وہی سیمنٹ کی دیواریں، وہی شیشوں سے بنی ہوئی عمارتیں اور جدید طرز کے فرنیچرز۔ ان کے علاوہ دیکھنے کے لیے اور ہے کیا۔“

”چلو۔ کم سے کم تمہیں قدرت کی خوبصورتی اور دل کشی کا احساس تو ہوا۔“

”ہاں سارہ، کہتے ہیں نا کہ جب باہر کی آنکھیں بند ہو جائیں تو اندر کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔“ فیاض نے ایک گہری سانس لی۔ ”شاید میرے اندر کی آنکھیں بھی کھل گئی ہیں۔“

ڈاکٹر متراں کے ٹیسٹ لگاتار نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں کئی کئی دنوں کے وقفے ہوتے۔ اس دوران فیاض کو مختلف دوائیں استعمال کرنی پڑتی تھیں جن کا ریزلٹ دیکھنے کے بعد دوسرا ٹیسٹ کیا جاتا تھا۔

اس دوران شام کے وقت ہم ساحل کی طرف نکل جاتے۔

فیاض مجھ سے طرح طرح کے سوالات کیا کرتا۔ ”سارہ بتاؤ کیا سمندر کی موجیں اسی طرح پُرشور ہیں جس طرح پہلے ہوا کرتی تھیں۔“

”ہاں، بالکل اسی طرح ہیں۔“

”اور ساحل پر اڑتے ہوئے پرندے۔“

”وہ بھی اسی طرح ہیں۔ بس پلیز، اب تم خاموش ہو جاؤ ورنہ میں رونے لگوں گی۔“

ڈاکٹر متراں نے مجھے تین دنوں کے بعد بلایا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس جاتے وقت فیاض نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”خدا کرے تم ڈاکٹر کے پاس سے اچھی خبر لے کر آؤ۔“

ڈاکٹر متراں فیاض کی ساری رپورٹس سامنے لیے بیٹھا تھا۔ میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مبارک ہو مسز فیاض! آپ کے شوہر کی آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ بس انہیں سرجری کے ایک عمل سے گزرنا ہوگا۔“

خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ڈاکٹر نے یہ بہت بڑی خبر سنادی تھی۔ اسی خبر پر تو ہم دونوں کی خوشیوں کا انحصار تھا۔

”ڈاکٹر تو پھر آپ آپریٹ کب کر رہے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”آپ کاؤنٹر پر جا کر وقت لے لیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

میں کاؤنٹر پر آئی تو کاؤنٹر والا شخص کسی سے موبائل پر باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ ”اوہو، تم کیا سمجھتی ہو کہ میں کلینک سے نکل کر کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ کسی اور کے پاس جاتا ہوں۔ نہیں بھائی، میں تو سیدھا گھر آتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل کلینک میں کام زیادہ ہے اس لیے مجھے دیر ہو جاتی ہے۔“

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ یہی سب تو میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ فیاض کا دیر سے گھر آنا۔ پھر کوئی نہ کوئی بہانہ۔ اس کے بعد ایک بھیانک خبر۔

تو کیا آنکھیں ٹھیک ہو جانے کے بعد یہ سلسلہ پھر سے شروع ہو جائے گا؟ شادی کے بعد پہلی بار تو فیاض کو میرے پاس رہنے کا موقع ملا تھا۔

ان دنوں وہ میرا تھا صرف میرا۔ نہیں، میں اسے دوبارہ گم نہیں کر سکتی تھی۔

میں اپنے آپ سے لڑتی رہی۔ بالآخر کاؤنٹر کلرک سے ٹائم لیے بغیر واپس آ گئی۔ فیاض میرے ہی آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

میری آہٹ سن کر اس نے میری طرف اپنا چہرہ اٹھایا۔ ”کیا ہوا سارہ، کیا کہا ڈاکٹر نے؟“

”فیاض، سوری! ڈاکٹر متراں نے آخری رپورٹ دیکھنے کے بعد یہ کہا ہے کہ اب تمہاری آنکھیں ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔“

فیاض کی بے نور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے لیکن میں نے اس کی طرف سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

تین برس ہو چکے ہیں۔ فیاض اب مکمل طور پر میرا ہے۔ میں اس کے بالوں میں کنگھی کرتی ہوں، اس کا سر دباتی ہوں اور اس کی آنکھیں بن کر اس کے ساتھ رہتی ہوں۔

● ●

مجبور

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
انسان کو معاشرے نے کس حد تک مجبور بنادیا ہے یہ آپ متذکرہ واقعہ سے سمجھ جائیں گے۔ میں کئی ماہ سے مسلسل کڑھ رہا ہوں۔ عجیب سے کرب میں مبتلا ہوں اسی کرب کو کاغذ پر منتقل کیا ہے۔ اسے شائع کریں یا نہ کریں یہ آپ کی مرضی۔

مرتضیٰ علی
(کراچی)

یہ ایک عبرت انگیز لیکن عجیب کہانی ہے۔ میرے پڑوس میں ایک صاحب رہتے تھے۔ اکرم علی، بہت شریف اور معقول انسان تھے۔ وہ کسی اسکول میں پڑھایا کرتے تھے اسی لیے ان کی معاشی حالت بہت خراب رہتی تھی۔

اس کا اندازہ ان کے رہن سہن سے ہوتا تھا لیکن چونکہ وہ شریف اور خوددار انسان تھے اسی لیے کسی کے سامنے بھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔

میں نے ان کے بارے میں آہستہ آہستہ بہت کچھ جان لیا تھا اور ان سے ہمدردی بھی محسوس ہونے لگی تھی اسی لیے میں اکثر انہیں راستے میں روک کر سلام دعا کر لیا کرتا اور ان کی خیریت دریافت کر لیتا جس پر وہ بے انتہا خوش ہوا کرتے۔

میری ان میں دلچسپی کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں خود ایک لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں اور میں نے یہ سنا تھا کہ اکرم صاحب بھی پڑھنے لکھنے کے شوقین ہیں اور ان کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔

ایک دن میں نے دریافت کیا تو وہ مسکرا دیے۔

''ہاں بھئی، زندگی میں کتابوں کے علاوہ اور کیا جمع کیا ہے۔ اگر آپ کو بھی شوق ہے تو کسی دن آ کر دیکھ لیں۔''

اس طرح اکرم صاحب کے یہاں میرا آنا جانا شروع ہو گیا۔ ان کے پاس واقعی بہت اچھی کتابیں تھیں۔ جن سے ان کے اعلیٰ ذوق ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔

اور بھی بہت کچھ پتا چلا تھا۔ مثال کے طور پر کہ ان کی دو لڑکیاں ہیں لیکن ان کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں۔ ان کی بیوی دائمی مریض قسم کی عورت ہیں لیکن بہت شریف ہیں.... اپنے شوہر کی طرح اور ان کی دونوں لڑکیاں بھی بہت شریف تھیں۔ محلے میں گردنیں جھکا کر چلا کرتیں۔ کسی نے انہیں بھی اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا ہو گا۔

ایک دن باتوں کے دوران اکرم علی صاحب نے بڑی رازداری اور شرمندگی کے احساس کے ساتھ کہا۔

''بھائی! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے؟''

''جی جناب فرمائیں۔''

''بات دراصل یہ ہے میری دونوں بیٹیاں ماشاء اللہ جوان ہو چکی ہیں۔'' انہوں نے کہا ''اور کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا ہے۔ اگر آپ کی نگاہ میں کوئی رشتہ ہو تو مجھے بتائیے گا۔''

''ضرور جناب، جیسے ہی مجھے کوئی مناسب رشتہ لگا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔''

''میری دونوں لڑکیاں تعلیم یافتہ ہیں لیکن مسئلہ وہی ہے یعنی معاشی بدحالی کا۔ ایک دو رشتے آئے بھی تو جہیز کے مطالبے کی وجہ سے بات ختم کرنی پڑی۔''

''یہ تو واقعی ہمارے معاشرے کی ایک بہت بڑی لعنت ہے جناب۔''

میں نے تبصرہ کیا۔

''بس اسی لیے آپ سے بھی کہہ دیا ہے کہ معقول لوگ ہوں اور لالچی بالکل نہ ہوں کیونکہ میں ان کی فرمائش پوری نہیں کر سکوں گا۔''

اکرم علی صاحب نے میرے کانوں میں یہ بات ڈال دی تھی۔ اس لیے میں بھی تلاش میں لگ گیا۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑا تا رہا پھر دفتر کے ایک لڑکے منیر پر نظر پڑی۔

وہ ایک شریف اور سیدھا سا لڑکا تھا اور کچھ دن پہلے ہی ملازم ہوا تھا۔ اس کا خاندانی پس منظر بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ آگے ترقی کے بھی امکانات تھے۔ شادی کے لیے اور کیا چاہیے ہوتا ہے۔

میں نے ایک دن موقع پا کر اس سے بات چھیڑ دی۔

وہ جیسے پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ ''جی جناب، خود میرے گھر والے بھی اس سلسلے میں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''چلو یہ تو اچھی بات ہے۔ اب تم بھی اپنے گھر والوں سے تذکرہ کر دینا۔''

اس نے دوسرے ہی دن آ کر یہ بتایا کہ اس کے گھر والے یہ سن کر بہت خوش ہوئے ہیں اور وہ لڑکی کے گھر جانا چاہتے ہیں تاکہ لڑکی کو دیکھ لیں۔

میں نے اکرم علی صاحب کو آ کر بتایا تو وہ بھی بہت خوش ہو گئے۔

''بھائی، خدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ نے تو بہت جلدی ایکشن لے لیا۔''

''اتفاق سے میرے دفتر میں ایک ایسا لڑکا موجود ہے اسی لیے میں نے اس سے بات کر لی۔''

''ٹھیک ہے، آپ جب چاہیں ان لوگوں کو بلا لیں۔''

میں نے دفتر جا کر منیر سے ذکر کر دیا۔ اس نے میرا پتا لیا اور تیسری ہی شام وہ اپنے گھر والوں کو لے کر پہنچ گیا۔ اس کی والدہ اور دو بہنیں اس کے ساتھ آئی تھیں۔ میں نے انہیں اکرم علی صاحب کے گھر بھیج دیا۔

میں خود وہاں نہیں گیا تھا لیکن اگلی صبح جب دفتر میں منیر سے ملاقات ہوئی تو میں نے دریافت کیا۔

''ہاں بھئی کیا رہا؟''

''اچھے لوگ ہیں جناب۔'' اس نے بتایا ''میرے گھر والوں کو بہت پسند آئے اور لڑکیاں بھی بہت اچھی ہیں۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

''بس ایک مسئلہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ان بے چاروں کی معاشی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے تو ہم لوگ بھی جہیز وغیرہ کے لالچی نہیں ہیں لیکن امی کا خیال ہے کہ لڑکی جب میکے سے خالی ہاتھ آئے تو اس کا تاثر اچھا نہیں ہوتا۔''

''خیر وہ بالکل ہی خالی ہاتھ تو نہیں آئے گی۔''

''ایسا ہی سلسلہ ہے جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''ان

کے والد صاحب نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ان کے پاس سوائے دعاؤں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ خود سوچیں آج کے دور میں دعاؤں سے کہاں کام چلتا ہے۔'' اس کی باتیں سن کر مجھے افسوس ہوا تھا۔

افسوس کے ساتھ ساتھ اکرم علی صاحب کی طرف سے شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ وہ جب دریافت کریں گے تو میں انہیں کیا جواب دوں گا۔ پتا نہیں کیسی ذہنیت ہو گئی ہے لوگوں کی کہ جو صرف جہیز کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ دوسری قدریں تو ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔

اکرم صاحب نے دریافت کیا تو میں نے انہیں اصل بات نہیں بتائی کچھ اور بتا دیا لیکن وہ بھی تجربہ کار اور جہاندیدہ انسان تھے فوراً سمجھ گئے ہوں گے کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے تھے۔

میں یہ بتانا تو بھول گیا کہ میں خود شادی شدہ ہوں۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ میں خود ہی شادی کر لیتا۔

بہرحال اس کے بعد بھی میرا آنا جانا لگا رہا تھا۔ ان کی دونوں بیٹیاں میرے سامنے آنے لگی تھیں۔ دونوں ہی صورت شکل کی اچھی خاصی معقول تھیں لیکن دونوں کے سروں پر غریبی کے آسیب منڈلا رہے تھے۔

ایک دن میں نے ان کی ایک بیٹی جمیلہ کو ایک ہوٹل میں ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا...... اتفاق سے میں اس لڑکے کو بھی جانتا تھا۔ کبھی وہ ہمارے محلے میں رہا کرتا تھا اور اس کی ساکھ بہت خراب تھی۔ جمیلہ کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔

لیکن میں کون ہوتا تھا ان کے معاملات میں مداخلت کرنے والا۔ اگر میں کچھ کہتا تو وہ پلٹ کر جواب دے دیتی لیکن میرے دل میں وسوسے جاگتے رہے۔

اس کے بعد بھی جمیلہ کئی بار اس لڑکے کے ساتھ دکھائی دیتی رہی اور ان کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں۔

دل چاہا کہ اکرم علی صاحب کو بتا دوں پھر وہی خیال آیا یہ کسی کے معاملے میں مداخلت والی بات ہو گی۔ ویسے یہ کیسی عجیب بات تھی کہ سچ بولتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہونے لگی تھی۔ ورنہ سنتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ والدین سے زیادہ محلے کے لوگ لڑکوں اور لڑکیوں پر نہ صرف نگاہ رکھتے تھے بلکہ انہیں سرزنش بھی کر دیا کرتے۔

ایک بار وہ دونوں ساحل پر بھی دکھائی دیے۔ انتہائی بے تکلفی سے ہاتھوں میں ہاتھ دیے ہوئے۔ نہ جانے اس

جمیلہ کو کیا ہو گیا تھا وہ تو اچھی خاصی معقول لڑکی تھی۔

میں سوچتا رہا کہ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس معاملے میں میری خاموشی ایک جرم کی طرح ہے۔ اسی لیے مناسب یہی سمجھا کہ اکرم علی صاحب کو اس بارے میں بتا دیا جائے۔

ایک شام موقع نکال کر میں نے اکرم صاحب کو ہلکا سا اشارہ دے دیا۔

''اکرم صاحب، آپ کو میں اس کے علاوہ اور کیا کہوں کہ آپ ذرا اپنی صاحبزادی پر نگاہ رکھیے گا۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ چونک اٹھے۔

''بس یونہی، میرا مطلب ہے کہ......''

''بہتر ہے کہ آپ مجھے واضح طور پر کھل کر بتائیں۔''

''وہ بات یہ ہے کہ آپ کی صاحبزادی ان دنوں ایک صاحبزادے کے ساتھ دیکھی جا رہی ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''تو پھر......؟'' اکرم علی صاحب نے پوچھا۔

''جی......!'' میں بھونچکا رہ گیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ یہ کوئی مناسب بات تو نہیں ہے۔ آپ ایک شریف آدمی ہیں اور آپ کی صاحبزادی بھی شریف ہے اور وہ آدمی کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔''

اکرم صاحب خاموش ہو گئے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے ہوں۔ ان کے چہرے سے ان کی کشمکش کا اندازہ ہو رہا تھا پھر انہوں نے جو کہا وہ میرے لیے حیران کن تھا۔

''بھائی، میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ آج کل کس کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے۔ آپ جمیلہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں نا؟''

''جی ہاں، میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔''

''اس نے میری اجازت سے یہ قدم اٹھایا ہے۔''

''آپ کی اجازت سے؟''

''ہاں بھائی۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ سے تو اس گھر کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے پاس ہے کیا۔ یہاں جو بھی آتا ہے وہ جہیز کا مطالبہ کرتا ہے لیکن اس لڑکے نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے کیونکہ وہ جمیلہ سے واقعی محبت کرنے لگا ہے۔ اب آپ اسے چاہے میری مجبوری سمجھ لیں یا میری بے غیرتی۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔''

اکرم علی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے... اور اپنی گردن جھکا لی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ گردن ان کی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی جھکی تھی۔ ✖

مکرمی عذرا رسول صاحبہ

آداب!

یہ میری نہیں میری ایک دوست کی سرگزشت ہے لیکن ان تمام واقعات کی میں ناظر رہی ہوں۔ اس لیے میں نے ان تمام واقعات کو یکجا کر کے لکھ دیا ہے۔ اگر سرگزشت کے معیار پر پورا اترے تو اسے شائع کر دیں۔ لوگوں کو سبق ملے گا۔

شہناز نظام
(لاہور)

میں نے اسے دور ہی سے دیکھ لیا۔ وہ بس اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی تھی اور پشت کی جانب دونوں ہاتھ اٹھائے شاید اپنے جوڑے کا کلپ کو درست کر رہی تھی۔ اس کی دونوں کہنیاں اس انداز میں اٹھی ہوئی تھیں کہ جسم کمان کی طرح کھنچ کر رہ گیا تھا۔ اب ایسے میں اسے نہ دیکھنے والے بھی پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

اس کی اسی عادت پر مجھے غصہ آتا تھا۔ کمبخت گھر سے باہر نکلنے کے بعد بھی سو سو جتن سے اپنی سجاوٹ کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس کے اندر کوئی کمی رہ گئی ہے۔ کون سی کمی رہ گئی ہے؟ یہ

اب تک سمجھ نہیں سکی تھی۔ شاید جوڑا ذرا ڈھیلا پڑ گیا ہے یا چہرے کا پلستر اکھڑ گیا ہے یا پھر لباس کا رنگ اس کے جسم کے رنگ سے بہت زیادہ کنٹراسٹ ہوگیا ہے۔ نہ جانے اتنی آرائشوں کے بیچ اس میں کون سا زنگ لگ گیا تھا کہ چھٹائے نہیں چھوٹ رہا تھا۔

وہ میری عزیز ترین سہیلی تھی۔ پھر بھی میں نے اس سے کترا کر نکل جانے کی کوشش کی۔ وہیں بس اسٹینڈ کے پیچھے الطاف مارکیٹ میں میرے خاوند کی کپڑوں کی ایک دکان ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ثمینہ کے قریب سے گزرنا ضروری تھا یا پھر بسوں کے اطراف سے ایک لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑتا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ بسوں کے پیچھے سے چھپ چھپا کر نکل جاؤں۔ ایسا کرتے وقت مجھے ندامت سی ہو رہی تھی۔ وہ میرے بچپن کی سہیلی تھی۔ ہمارے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ میرے خاوند اچھے الفاظ میں اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ شریف عورتوں کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے مزاج کو سمجھ لیں۔ میں نے بھی کسی حد تک ان کے مزاج کو سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ ثمینہ سے ملوں اور انہیں شکایت کا موقع دوں۔

''شہناز......!'' اس کی آواز تیز خنجر کی طرح سنسناتی ہوئی آئی اور میرے دل میں اتر گئی۔ ایک ساعت کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میں چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہوں۔

میرے قدم رک گئے۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور جبراً مسکرانے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو؟ اپنے میاں کے پاس......؟'' وہ بیک وقت سوال بھی کرتی تھی اور خود ہی جواب بھی دے دیتی تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اٹھلا کر بولی۔ ''چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔''

میں گھبرا سی گئی۔ میں اور اس کے ساتھ اپنے خاوند کے سامنے جاؤں؟ نہیں...... میں اسے ایک سہیلی کی محبت دے سکتی تھی لیکن سہیلی بنا کر فخر نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے جلدی سے بات بنائی۔ ''نہیں... نہیں، وہاں ابھی جانا مناسب نہیں ہے۔ دکانداری کا وقت ہے۔ ہم کہیں دوسری جگہ چلتے ہیں۔''

''یہ لو... میں نظام صاحب سے ملنے آئی ہوں اور تم مجھے دوسری جگہ لے جا رہی ہو۔''

وہ میرے خاوند کو نظام صاحب کہتی تھی حالانکہ نظام بھائی بھی کہہ سکتی تھی۔ بھائی کے رشتے سے صاحب تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے عورت اپنی ساری کمزوریوں کا اظہار کر جاتی ہے۔ یہ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ اس کے باوجود میں نظام کے مزاج کو بھی سمجھتی ہوں۔ مجھے ان پر مکمل اعتماد ہے۔ اس لیے میں ثمینہ کی بے تکلفی کا برا نہیں مانتی۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''چلو نا'' پہلے میں بھی یہی سوچتی تھی کہ دکانداری کے وقت غیر ضروری ملاقات اچھی نہیں ہوتی۔ مگر نظام صاحب خود ہی شکایتیں کرتے ہیں کہ میں مہینوں بعد کیوں آتی ہوں۔''

میں سلگ اٹھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ ثمینہ سے ایسی شکایتیں کریں گے پھر بھی میرے اندر کی عورت نے اپنے خاوند سے روٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں ثمینہ کے ساتھ دکان جاؤں گی۔ اگر بعد میں انہوں نے شکایت کی کہ میں ثمینہ سے کیوں ملتی ہوں تو میں بھی پوچھوں گی کہ وہ آپ کو نظام صاحب کیوں کہتی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے پر خواہ کتنا ہی اعتماد کرتے ہوں۔ پھر بھی کبھی کبھی زبردستی جھگڑا کرنے سے خاوند کو ہمیشہ یہ یاد رہتا ہے کہ بیوی محتاط ہے اور اس کے تمام معاملات سے باخبر ہے۔

میں اس کے ساتھ دکان کی طرف جانے لگی۔ بس اسٹینڈ کے کھلے میدان میں چار بسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ثمینہ نے کہا۔

''نہ جانے لوگوں کو مجھ میں کیا خوبی نظر آ جاتی ہے کہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے۔ میں صدر سے آ رہی تھی، پپو بھی میرے ساتھ تھا۔ ہائے کیا بتاؤں شہناز! بس میں بیٹھی ہوئی ایک بڑھیا مجھے ایسی پیاری پیاری نظروں سے تکنے لگی کہ میں اس کی دلچسپی دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ چورنگی پر میرے پاس والی سیٹ خالی ہوگئی تو وہ جلدی سے آ کر پپو کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھ سے کہنے لگی۔ ''بیٹی! یہ تمہارا بھائی ہے نا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی نہیں، یہ میرا بیٹا ہے۔''

میری بات پر یقین نہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''کیوں جھوٹ بولتی ہو۔ کوئی آنکھ کا اندھا بھی تمہیں چھو کر یہی کہے گا کہ تم کنواری ہو اور تم ہو کہ اس بچے کو اپنا بیٹا کہہ رہی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات ہے......''

اب میں اس بڑھیا سے کیا کہتی؟ وہ تو کسی رٹے ہوئے سبق کی طرح میری کم سنی اور میری خوبصورتی کی تعریفیں کیے جا رہی تھی۔ اب تم ہی بتاؤ شہناز کہ میں اسے کیسے یقین دلاتی؟''

ثمینہ کس خوبصورتی سے خود کو سدا بہار ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس کی باتوں کا سلسلہ ذرا دیر کے لیے ٹوٹ گیا۔ دکان میں میرا بھتیجا اقبال بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں نظام کے متعلق کچھ پوچھتی۔ ثمینہ نے ہی پوچھ لیا۔ ''نظام صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ بینک گئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔'' اقبال جواب دے کر گاہکوں میں الجھ گیا۔

مجھے ثمینہ پر بڑا غصہ آیا۔ کمبخت سوسائٹی کے آداب کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتی۔ وہ میرے خاوند ہیں۔ میں ان سے ملنے آئی تھی۔ ان کے بارے میں سوال کرنے کا پہلا حق میرا تھا مگر اس نے میرے ہی سامنے میرا حق چھین لیا تھا۔ بظاہر اس کے لیے یہ بات معمولی سی تھی لیکن میرے لیے بہت اہم تھی۔ میں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ وہ دکان سے ایک کرسی کھینچ کر میری جانب سرکاتے ہوئے بولی۔ ''نظام صاحب آتے ہی ہوں گے۔ آؤ تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کریں۔ بہت دنوں کے بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔''

اس وقت وہ ہماری دکان پر آئی تھی۔ میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہاں نہ بیٹھو۔ بعض اوقات اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی مرضی کے خلاف دوسروں کی خواہشوں کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ میں دکان سے ذرا دور میدان کے سرے پر آ گئی۔ وہ بھی میرے ساتھ آتے ہوئے بولی۔

''ہاں تو میں اس بڑھیا کی بات کر رہی تھی۔'' وہ پھر شروع ہوگئی۔ ''دراصل وہ ایک خوبصورت بہو کی تلاش میں تھی۔ بڑے فخر سے کہنے لگی کہ میرا بیٹا بینک کا منیجر ہے......''

ثمینہ یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔ حالانکہ اس میں ہنسی کی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ ظاہر کر رہی تھی کہ ایسے ایسے بینک منیجروں کو وہ ہنسی میں اڑا دیا کرتی ہے۔

اچانک مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ یک بیک مجھے احساس ہوگیا کہ وہ ایک بھٹکی ہوئی عورت ہے جو رات کو خوابوں سے اور دن کو من گھڑت کہانیوں کے شہزادوں سے ملتی ہے۔ کبھی کسی بینک منیجر کی ماں اپنا آنچل پسار کر اپنے بیٹے کے لیے اس کے حسن کی بھیک مانگتی ہے۔ کبھی کوئی ڈاکٹر اسے دیکھ کر مریض بن جاتا ہے اور کبھی کوئی آرمی آفیسر اس کے جوڑے میں اس طرح پھول لگاتا ہے جیسے فتح کا پرچم نصب کر رہا ہو۔

لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے صرف ایک ہی شہزادے کو دیکھا تھا، جو چھ سال پہلے اس کی زندگی میں آیا تھا۔

میں نے چھ سال پیچھے مڑ کر دیکھا تو یادوں کے البم سے ورق ورق تصویریں ابھرنے لگیں۔

☆☆☆

پہلی تصویر شہزادا انور کی تھی۔

ثمینہ کے ہاتھ میں وہ تصویر دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ''کس کی تصویر اٹھائے پھر رہی ہو۔'' اس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ پیشانی سے پسینا پھوٹ رہا تھا پھر وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

''ان کا نام شہزادا انور ہے۔ ان سے میری منگنی ہو چکی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟''

''کیوں تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آں، ہاں۔ پسند ہے مگر میرے وہ خطوط شہزاد صاحب کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔''

''کون سے خطوط......؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہی...... جو میں قیصر کو لکھا کرتی تھی!''

میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ایک پل میں بات واضح ہوگئی تھی کہ وہ کس بری طرح بدنام ہونے والی ہے۔ میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی۔ لیکن بظاہر میں نے غصے سے کہا۔ ''میں اسی دن کے لیے سمجھایا کرتی تھی کہ اندھا عشق ہمیشہ کنویں میں گراتا ہے۔ نہ جانے وہ آوارہ لفنگا قیصر تمہیں کیسے پسند آ گیا تھا جو اپنا مستقبل نہیں بنا سکتا...... وہ بھلا تمہاری زندگی کیسے سنوار سکتا ہے؟''

وہ رونی صورت بنا کر بولی۔ ''اسی لیے تو میں نے اس کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ کون ایسی لڑکی ہے جو ایک اچھے شریکِ حیات اور اچھے مستقبل کی تمنا نہیں کرتی۔ شہزاد صاحب بہت اچھے ہیں۔ ٹی اینڈ ٹی میں کسی بڑے عہدے پر ہیں۔ میری زندگی سنور جائے گی۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے شہناز۔ اگر انہوں نے شادی سے انکار کر دیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے پریشان ہو کر

پوچھا۔ ”لیکن وہ خطوط شہزاد صاحب کے ہاتھ کیسے لگ گئے؟“

”میں کیا بتاؤں؟ قیصر نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ مجھے آوارہ اور بدچلن ثابت کرنے کے لیے خود ہی وہ خطوط ان کے پاس پہنچا دیے ہیں۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔

”چہرہ چھپانے سے بدنامی نہیں چھپتی اور نہ ہی آنسو بہانے سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ تم ذرا جرأت سے کام لو اور کسی طرح شہزاد صاحب سے مل کر اپنی غلطی کی معافی مانگ لو۔ غلطی اور گناہ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تمہاری غلطی خط و کتابت تک محدود رہی ہے۔ تم نے کوئی ایسا گناہ نہیں کیا ہے کہ تمہارا سر ندامت سے جھک جائے۔“

میری باتوں سے اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”وہ خود ہی آج شام کو ہمارے ہاں آنے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ منگنی کی انگوٹھی واپس کرنے آرہے ہیں۔ امی کا رو رو کر برا حال ہو رہا ہے۔ ابا جان صاف کہہ رہے تھے کہ نظام بھائی ان کے گہرے دوست ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو انہیں سمجھا بجھا کر یہ رشتہ توڑنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔“

”اگر ایسی بات ہے تو تم اطمینان رکھو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم میری عزیز سہیلی ہو اور نظام تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ تمہاری زندگی برباد نہیں ہونے دیں گے۔ وہ ابھی آئیں گے تو میں ان سے کہوں گی کہ وہ فوراً ہی شہزاد صاحب کے پاس جائیں اور انہیں غلط فیصلہ کرنے سے باز رکھیں......“

میں بڑی دیر تک اسے تسلیاں دیتی رہی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مطمئن ہو کر گھر واپس چلی جائے لیکن اس کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ کوئی آخری فیصلہ سنے بغیر میرے پاس سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ دوپہر کو نظام کھانے کے لیے آئے تو بہت تھکے ہوئے تھے لیکن ثمینہ کو دیکھتے ہی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس وقت مجھے ان کی مسکراہٹ بڑی طنزیہ اور بڑی معنی خیز لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری سہیلی کے کردار پر مضحکہ اڑانے کے انداز میں مسکرا رہے ہوں۔ ثمینہ جھینپ کر دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔

میں نے گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”بیچاری جب سے یہاں آئی ہے، روئے جا رہی ہے۔“

انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”لڑکیاں سسرال جانے کے خیال سے دل ہی دل میں مسکراتی ہیں مگر دکھاوے کے آنسو بہاتی ہیں۔ پھر بھی بیچاری کہلاتی ہیں... اور وہ ہماری برادری کا شہزاد انور کانٹوں پر لوٹ رہا ہے۔ اس بیچارے کو کوئی بیچارہ نہیں سمجھتا......“

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا شہزاد صاحب نے آپ سے کچھ کہا ہے؟“

”روزانہ کچھ نہ کچھ کہتا ہے، بھئی اللہ میاں نے اس لیے زبان نہیں دی کہ خاموش رہا جائے۔“

”اوہو آپ مذاق میں نہ ٹالیں۔ ثمینہ کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ آپ کے دوست اس رشتے سے انکار کرنے والے ہیں۔“

انہوں نے لباس تبدیل کرنے کے لیے الماری کھولی اور میری جانب دیکھے بغیر پوچھا۔ ”تمہارا کیا مشورہ ہے شہناز! ان حالات میں ایک مرد کو کیا فیصلہ کرنا چاہیے؟“

میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ ایک عورت کی غلطی سے تمام عورتوں کی زبان پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ میں فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ اس وقت ملازمہ کھانے کی ٹرے لا کر میز پر رکھ رہی تھی۔ جب وہ کمرے سے چلی گئی تو میں نے کہا۔ ”مرد ہو یا عورت، غلطی ہر ایک سے ہوتی ہے۔ میں یہ مانتی ہوں کہ عورت کی غلطی مشکل ہی سے معاف کی جا سکتی ہے۔ آپ اپنے دوست کو سمجھائیے کہ معافی کی ذرا بھی گنجائش ہو تو وہ ثمینہ کو معاف کر دیں۔“

وہ میرے قریب پلنگ کے سرے پر آ کر بیٹھ گئے اور سنجیدگی سے کہنے لگے۔ ”میں نے اسے سمجھایا ہے۔ اگر وہ تمہاری سہیلی نہ ہوتی تب بھی میں شہزاد کو سمجھاتا کیونکہ ایک لڑکی کی ذرا سی غلطی سے اس کی ساری زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ اس کے والدین کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ شہزاد جاہل اور جذباتی نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے بعد ثمینہ کا جہاں بھی رشتہ ہوگا قیصر اسے بدنام کرنے کے لیے ایسے ہی حربے استعمال کرے گا۔“

”یہی میں بھی کہنا چاہتی تھی کہ وہ جہاں بھی بیاہ کر جائے گی، بدنامی اس کے ساتھ جائے گی۔ اگر شہزاد صاحب اسے معاف کر دیں تو یہ بدنامی یہیں ختم ہو جائے گی۔“

”شہزاد کے معاف کرنے سے کیا ہوتا ہے شہناز! سب سے پہلے تو اسے اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ تمہاری سہیلی سچ مچ اپنی غلطی پر دل سے پچھتا رہی ہے۔ وہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ شاید آج بھی قیصر کے متعلق سوچ رہی ہے اور

اس کے والدین جبراً اسے شہزاد سے منسوب کر رہے ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے......!“ اچانک ثمینہ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ہم نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ دروازے کے پردے کے پیچھے ہماری نظروں سے چھپی ہوئی رو رہی تھی اور ہچکیوں کی تال پر کہہ رہی تھی۔ ”میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے قیصر سے شدید نفرت ہے۔ وہ مجھے بدنام کر رہا ہے۔ میں اس کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ خطوط میری بدنامی کا اشتہار بن جائیں گے۔ میں دنیا والوں کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں خطاوار ہوں مگر گناہگار نہیں ہوں......“

اسے ہچکیاں لے لے کر روتے اور ہذیانی انداز میں چیختے دیکھ کر میں کمرے سے باہر آئی اور اسے اپنی بانہوں میں چھپا کر تسلیاں دینے لگی۔ نظام تھوڑی دیر تک کمرے میں سر جھکائے سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے دروازے کے قریب آکر کہا۔ ”تمہارے خطوط پڑھنے کے بعد شہزاد نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہاری غلطیاں خط لکھنے تک ہی محدود رہی ہیں۔ وہ آج شام کو تمہارے ہاں جائے گا اور تم سے تنہائی میں دو باتیں کرے گا۔ وہ تنہائی میں تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ تم گھر والوں کے دباؤ میں آکر شادی کر رہی ہو یا حقیقتاً تمہاری رضامندی شامل ہے۔ ثمینہ! خوش قسمتی سے آج تمہیں بہترین موقع مل رہا ہے۔ تم اسے اپنی پارسائی اور دیانت داری کا یقین دلا سکتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری قدر کرے گا......“

یہ کہہ کر وہ باہر جانے لگے تو میں نے کہا۔ ”کہاں جا رہے ہیں؟ کھانا تو کھا لیجیے۔“

انہوں نے پلٹ کر ثمینہ کی جانب سنجیدگی سے دیکھا اور کہا۔ ”میں شہزاد کے پاس جا رہا ہوں۔ تم ثمینہ کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں شام کو تمہیں وہاں سے لے آؤں گا۔“

وہ دوبارہ پلٹ کر کمرے کے باہر چلے گئے۔ ثمینہ پر ایسا برا وقت آیا تھا کہ ہماری بھوک پیاس مر گئی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں بھی ثمینہ کے ساتھ اس کے ہاں چلی آئی۔ وہ تمام دن بڑی پریشانی اور اضطراب میں گزرا کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ ثمینہ کو چپ سی لگ گئی تھی۔ مگر میں جانتی تھی کہ وہ اندر سے چپ نہیں ہے۔ آج تقدیر اس کے مستقبل کا ایک اہم فیصلہ سنانے والی تھی۔

شام کو نظام اور شہزاد آئے۔ ثمینہ کے والدین ان کے سامنے خوشامدانہ انداز میں بچھے جا رہے تھے۔ اس وقت خدا کے بعد ایک شہزاد ہی تھا جو اُن کی بیٹی کی زندگی کو بنا سکتا تھا یا بگاڑ سکتا تھا۔ انہوں نے اس کی خاطر مدارات کے لیے پُرتکلف چائے اور ناشتے کا اہتمام کیا تھا لیکن شہزاد نے کھانے پینے کی کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”جب تک اس گھر سے میرے کسی رشتہ کا مجھے یقین نہیں ہو جائے گا اُس وقت تک میں یہاں کا پانی بھی نہیں پیوں گا۔“

نظام اس کے والدین کو ایک طرف لے جا کر آہستہ آہستہ کچھ سمجھانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ثمینہ کی والدہ نے مجھ سے آکر کہا کہ میں ثمینہ کو ساتھ والے کمرے میں بٹھا کر آجاؤں۔ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ پاس والا کمرا خالی تھا۔ میں وہاں ثمینہ کو چھوڑ کر آگئی۔ دوسرے دروازے سے شہزاد صاحب بھی اسی کمرے میں آگئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں نظام اور ثمینہ کے والدین سر جھکائے بیٹھے تھے اور بند کمرے کے کھلنے اور واضح فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں دوسرے کمرے میں دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ دروازے کے پیچھے سے بڑی دھیمی دھیمی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان آوازوں میں ثمینہ کی سسکیاں بھی شامل تھیں۔ لیکن باتیں صاف طور سے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں یا تتلی کا آنچل پھڑ پھڑا رہا ہے اور بھونرے کی گن گن کرتی سرگوشیاں منڈلا رہی ہیں۔

بڑی دیر ہوگئی۔ بہت سارا وقت گزرتا گیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا امیدیں مستحکم ہوتی گئیں۔ کچے دھاگے کا رشتہ ایک مضبوط بندھن کا یقین دلاتا گیا۔ نتیجہ کسی حد تک ظاہر ہو چکا تھا پھر بھی ایک بے چینی سی تھی کہ شہزاد صاحب اپنی زبان سے خوشخبری سنائیں لیکن وہ دونوں خالی کمرے میں ایسے ڈوب گئے تھے کہ باہر والوں کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے تھے۔

اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں ڈرائنگ روم میں گئی اور وہاں سے ناشتے کی ٹرے اٹھا لائی۔ اس کمرے میں آکر میں نے دروازے پر دستک دی۔ ”ثمینہ......!“

پہلی بار کوئی جواب نہیں ملا۔ چند سیکنڈ تک انتظار کرنے کے بعد میں نے دوسری بار آہستگی سے پکارا۔ ”ثمینہ!“

اندر سے چٹخنی گرنے کی آواز آئی۔ پھر ایک ذرا سا دروازہ کھلا۔ ثمینہ نے جھانک کر مجھے دیکھا۔ میں نے اسے دیکھا وہ آنسوؤں کی بجائے پسینے میں بھیگ رہی تھی۔ اس کی

آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک تھی۔ جوڑا کھل گیا تھا اور زلفیں مکڑی کے جال کی طرح شانوں پر پھیل گئی تھیں۔

بس میں نے اتنا ہی دیکھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتی، سمجھتی اور اس سے کچھ پوچھتی۔ اس نے میرے ہاتھوں سے ناشتے کی ٹرے جھپٹ لی اور ایک جھٹکے سے دروازے کو بند کر دیا۔

دوسری تصویر ثمینہ شہزاد کی تھی۔

وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے تھے اور نہایت ہی خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محبت اور آپس کا اعتماد مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں میرے اور نظام کے احسان مند تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ ہماری کوششوں سے وہ ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں بھی یہ دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی تھی کہ ایک خاندان بدنامی سے بچ گیا تھا اور زمانے بھر میں رسوا ہونے والی لڑکی کی زندگی سنور گئی تھی۔

ایک سال کے بعد دو اور خوشیاں ان کی زندگی میں آئیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے ہاں ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام قمر شہزاد رکھا گیا لیکن لاڈ سے پپو کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ دوسری خوشی یہ تھی کہ شہزاد کو ترقی مل گئی تھی اور وہ ٹیلی فون انجینئرنگ سپروائزر سے ایس ڈی او کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ثمینہ کا معیارِ زندگی بدل گیا۔ اب وہ ایک شاندار بنگلے میں رہتی تھی۔ اوپری آمدنی سے خریدی ہوئی کار میں گھومتی تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں سفر کرتی تھی۔ ہر ماہ ہزاروں روپے کی شاپنگ کرنا اور پھر بھی مطمئن نہ ہونا اس کی عادت بن گئی تھی۔ شہزاد نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا تھا لیکن اب اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے شہزاد کی زندگی بدل دی ہے اور یہ ساری خوش نصیبی اس کے دم قدم سے ہے۔ اس بات پر اکثر میاں بیوی میں نوک جھوک ہوتی تھی۔ کبھی جھگڑا زیادہ بڑھ جاتا تو وہ میرے پاس آ کر شکایتیں کرنے بیٹھ جاتی۔

شہزاد صاحب ان شکایتوں کے جواب میں شکایتیں کرتے "ثمینہ فضول خرچی کی عادی ہو گئی ہے۔ بچت کیسے کی جاتی ہے یہ جانتی ہی نہیں۔ بینک میں جا کر دیکھیے اس کے اکاؤنٹ میں بمشکل سو پچاس روپے ہوں گے۔"

"بچت کس لیے کروں؟ کیا اس لیے کہ آپ میری بچائی ہوئی رقم کو جوئے میں ہار جائیں؟" وہ بیک وقت سوال بھی کرتی تھی اور خود ہی جواب بھی دیتی تھی۔

میں نے نظام سے پوچھا۔ "کیا آپ کے دوست جُوا کھیلتے ہیں؟ یہ تو بہت بری لت ہے۔"

انہوں نے اپنے دوست کی کمزوری پر پردہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "نہیں بھئی، کبھی کبھی وقت گزارنے کے لیے تاش کھیلتا ہے۔ محض تفریح سمجھ کر......"

"آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں نظام بھائی!" ثمینہ نے کہا۔ "میں انہیں آپ سے زیادہ جانتی ہوں۔ وہ رات بھر گھر سے غائب رہتے ہیں۔ ایک دو دن کی بات ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ یہ ہر رات کی تفریح کیا معنی رکھتی ہے؟ وہ آج کل مجھ سے اپنی آمدنی چھپانے لگے ہیں۔ جو کچھ اوپری آمدنی سے ملتا ہے اسے جوئے میں ہار کر آ جاتے ہیں۔"

میں پریشان ہو کر نظام کو تکنے لگی۔ پھر میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا۔ "آپ...آپ بھی تو ہفتہ کی رات گھر نہیں آتے۔ کیا آپ بھی......؟"

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم بھی عجیب ہو شہناز! شہزاد اگر تاش کھیلتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بھی یہی غلطی کرتا ہوں۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "ایک دوست دوسرے دوست کے کردار سے پہچانا جاتا ہے اور اگر نہ بھی پہچانا جائے تو مشکوک ضرور ہو جاتا ہے۔ میں آپ کے متعلق اپنے اعتماد کو کمزور نہیں بنانا چاہتی۔ خدا کے لیے اپنے دوست کو سمجھائیے یا پھر ایسی دوستی سے باز آ جائیے۔"

"تم خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ میں کسی تفریح میں اتنا آگے نہیں بڑھ جاتا کہ میری محنت کی کمائی خطرے میں پڑ جائے۔"

میں اس وقت خاموش رہی۔ ثمینہ کی موجودگی میں ان سے مزید بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ اکثر ہفتہ کی رات وہ گھر سے باہر جانے لگتے تو میں ناراض ہو جاتی۔ ان کے دوستوں کو برا بھلا کہنے لگتی۔ کبھی وہ مجھے بہلا پھسلا کر چلے جاتے تھے اور کبھی میں انہیں مجبور کر دیتی کہ وہ باہر کا راستہ بھول جائیں۔ میں تو پھر بھی خوش نصیب ہوں کہ وہ میری بات رکھ لیتے تھے اور اگر گھر سے باہر جانا بھی ہوتا تو وہ میرے دل میں اتنا اعتماد پیدا کر دیتے تھے کہ میری ساری پریشانیاں دور ہو جاتی تھیں۔ مگر ثمینہ کے ساتھ شہزاد کا رویہ بڑا حاکمانہ تھا۔ اس نے ثمینہ کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی۔ اسے گھر کی مالکہ بنا دیا تھا لیکن اپنی آزادی کے راستے میں وہ بیوی کے اعتراضات کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کے سمجھانے منانے اور لڑنے جھگڑنے کے باوجود اپنی اکثر راتیں گھر سے باہر گزارتا تھا۔

ان کی ازدواجی زندگی بھی عجیب تھی۔ وہ آپس میں محبت بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے کی شکایتیں بھی کرتے تھے۔ شہزاد میں صرف یہی ایک عیب تھا کہ وہ جواری تھا۔ ثمینہ کی یہی ایک پریشانی تھی کہ وہ اتنے بڑے بنگلے میں راتوں کو تنہا رہتی تھی۔ ملازمہ اپنے کمرے میں سو جاتی تھی۔ بچہ اپنے جھولے میں جھولتا رہتا تھا اور وہ تنہائی کے دوزخ میں جلتی رہتی تھی۔

میں نے اسے سمجھایا کہ اس سلسلے میں خاوند سے بار بار جھگڑا کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل تاش کے پتوں سے جی اکتا جائے گا...... تمہارے خاوند نے تمہارے لیے کسی چیز کی کمی نہیں رکھی ہے۔ اچھا کھاتی ہو، اچھا پہنتی ہو، گھر کے سیاہ و سفید کی مالک ہو۔

اس نے بڑی تلخی سے مسکرا کر دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ایک پیاس نظر آئی۔ ایسی پیاس کہ اس وقت میں اپنی باتوں کی روانی میں اس پیاس کا مفہوم نہ سمجھ سکی۔

ان ہی دنوں نظام نے اچانک لاہور چھوڑ کر کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں ایک سیاسی ہنگامے میں غنڈوں نے بہت سی دکانوں کو لوٹ لیا تھا۔ ہماری دکان بھی تباہ ہو گئی تھی۔ نظام کا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ میں یہاں تنہا رہوں۔ اس عرصہ میں وہ کراچی جا کر نیا کاروبار شروع کریں گے اور رہائش کا انتظام کرنے کے بعد مجھے اپنے پاس بلا لیں گے۔

ہمارے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ دولت کی کمی نہیں ہے۔ پھر بھی کراچی جیسے صنعتی شہر میں کاروبار جمانے کے لیے چھ ماہ کا عرصہ لگ گیا۔ اتنے عرصہ تک میں بھی ثمینہ کی طرح تنہا رہی۔ لیکن میں مطمئن تھی کہ میرے خاوند تاش کے پتوں سے نہیں بلکہ کاروباری داؤں پیچ سے جُوا کھیلنے گئے ہیں۔

ثمینہ اکثر میرے پاس آیا کرتی تھی۔ ایک روز وہ میرے ہاں آئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بالکل بدل گئی ہے۔ ہر دم اداس رہنے والی مجھ سے چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی پھر اس نے باتوں ہی باتوں میں مجھ سے پوچھا۔ "جمشید سے ملو گی؟"

"کون جمشید؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"او گاڈ! تم جمشید کو نہیں جانتیں؟" اس نے ایسی حیرت سے کہا جیسے جمشید کو نہ جان کر میں اپنے کم سمجھ ہونے کا ثبوت دے رہی ہوں...... "ارے وہ شہزاد اور نظام بھائی کے گہرے دوست ہیں۔ اسلام آباد میں تھے۔ اب یہاں آ گئے ہیں۔ بڑے ہی زندہ دل آدمی ہیں۔ ایسے ایسے قصے چھیڑ دیتے ہیں کہ مجھے تنہائی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

"تم اس سے کہاں مل بیٹھیں؟"

"یہ لو، مل بیٹھنے کی بھی ایک ہی کہی۔ بھئی وہ ہمارے ہی بنگلے میں رہتے ہیں۔ شہزاد کے بہت ہی معتمد اور بے تکلف دوست ہیں۔ اس لیے ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ تم اگر ملنا چاہو تو میں انہیں یہاں لے آؤں۔ سچ کہتی ہوں اتنے سوشل آدمی ہیں کہ تم اپنی تنہائی بھول جاؤ گی۔"

”نہیں ثمینہ فی الحال مجھے معاف کرو۔ میں اتنی سوشل نہیں ہوں۔ میں نظام کے دوستوں سے ملتی ضرور ہوں۔ لیکن تنہائی دور کرنے کے لیے نہیں......“

اچانک اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اُڑ گئی۔ میری بات اس کے دل کے کسی کمزور گوشے میں جا کر چبھ گئی تھی۔ اس نے تلملا کر پوچھا۔ ”تنہائی دور کرنے سے تمہاری مراد کیا ہے؟ تمہاری گفتگو کا یہ انداز مجھے بالکل پسند نہیں۔“

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے تمہیں تکلیف پہنچے۔ بعض باتیں پہلودار ہوتی ہیں اور سننے والے اپنی سمجھ کے مطابق اس کا مفہوم نکال لیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے کچھ کہا اور تم نے کچھ اور سمجھ لیا۔“

وہ میری بات کا جواب نہ دے سکی۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اس کے قریب آ کر کہا۔ ”کیا ہو گیا؟ بیٹھو، ابھی تو آئی ہو۔ اتنی جلدی کہاں جاؤ گی؟“

”مجھے ایک ضروری کام ہے۔ میں پھر کبھی آؤں گی۔“ اس نے اتنی بے رخی سے کہا کہ میں اسے رکنے کے لیے نہ کہہ سکی۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے کمرے سے چلی گئی اور میں تنہا کھڑی سوچتی رہی۔ تنہا میں بھی تھی۔ تنہا وہ بھی تھی۔ مگر اس کی تنہائی اس کے لیے گالی بن گئی تھی۔

☆☆☆

اور یہ جمشید کی تصویر ہے۔

”ہم بمبینو سے لیٹ شو دیکھ کر باہر آ رہے تھے کہ اچانک ثمینہ سے سامنا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک ہی نوجوان تھا۔ اسے دیکھتے ہی نظام نے حیرت سے کہا۔ ”ارے جمشید! تم یہاں کب سے ہو؟“

میں نے ثمینہ سے کہا۔ ”تم کراچی آئی ہو۔ مگر مجھ سے ملاقات کرنے نہیں آئیں؟“

وہ اس اچانک ملاقات سے کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔ اس نے اس کن انکھیوں سے جمشید کو دیکھا۔ جمشید نے سنبھل کر کہا۔ ”ہم آج ہی آئے ہیں۔ ثمینہ کے ماموں سخت بیمار ہیں۔ شہزاد کو چھٹی نہیں ملی اس لیے میں ثمینہ کے ساتھ آ گیا۔“

ثمینہ نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی جمشید سے یہی کہہ رہی تھی کہ ہم کل صبح شہناز کے ہاں چلیں گے۔ دیکھو تمہاری عمر کتنی لمبی ہے...... نام لیتے ہی تم سامنے آ گئیں۔“

میں نے بھی مسکرا کر کہا۔ ”ہم پورے دو سال کے بعد مل رہے ہیں۔ تم سے مل کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے میں بیان نہیں کر سکتی۔ کل صبح ضرور آؤ گی نا؟“

”ہاں ضرور آؤں گی اور تمہاری کار میں کراچی کی سیر بھی کروں گی۔“

”اچھا اب اجازت دو!“ جمشید نے نظام سے مصافحہ کرتے ہوئے اس ملاقات کو مختصر بنا دیا۔

نظام نے بے دلی سے مصافحہ کرنے کے بعد میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ”چلو' ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

مجھے نظام کا یہ رویّہ عجیب سا لگا۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے کار کے قریب آ گئے پھر انہوں نے میرے لیے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”شہزاد کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس نے جمشید جیسے لفنگے کے ساتھ اپنی بیوی کو یہاں آنے کی اجازت کیسے دے دی......“

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا جمشید اچھا آدمی نہیں ہے؟ ثمینہ ایک بار کہہ رہی تھی کہ آپ کے گہرے دوستوں میں سے ہے؟“

”دوست اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی لیکن ان پر اندھا اعتماد کرنا حماقت ہے۔ مجھے تو ثمینہ کی اس بات پر شبہ ہے کہ اس کے ماموں بیمار ہیں۔ تم ہی سوچو وہ آج ہی بیمار ماموں کے ہاں آئی ہے اور بیمار کو چھوڑ کر جمشید کے ساتھ یہاں سیر کر رہی ہے۔ کیا اس کے ماموں نے اسے اجازت دی ہو گی کہ وہ غیر مرد کے ساتھ آدھی رات تک گھر سے باہر رہے؟“

میں سوچ میں پڑ گئی۔ واقعی اس بات کو ذہن قبول نہیں کرتا تھا کہ اس کے خاوند نے اور اس کے ماموں نے اسے جمشید کے ساتھ اس طرح آزاد چھوڑ دیا ہو گا۔ پھر اس نے اتنی آزادی کیسے حاصل کر لی؟

یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب ثمینہ ہی دے سکتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اچھی بات ہے کل وہ آئے گی تو میں اس سے ضرور جواب طلب کروں گی۔

کل آ کر گزر گئی لیکن وہ نہیں آئی۔ دوسرے تیسرے دن بھی میں نے اس کا انتظار کیا۔ نظام نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تمہاری سہیلی کا بھی جواب نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے دو چار ماموں اور بیمار پڑ گئے ہیں۔“

ایک عورت کی کمزوری سے دوسری عورتوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں۔ مجھے اس کے ماموں کا پتا معلوم ہوتا تو میں وہاں جا کر اسے ہزاروں صلواتیں سنا ڈالتی۔ کمبخت میرے اعتماد کو دھوکا دے رہی تھی۔ دوستی کے پُرخلوص رشتے پر دھبا لگا رہی تھی۔

ہفتے سے مہینوں گزر گئے مگر دوبارہ اس کی صورت نظر نہیں آئی۔

ایک صبح وہ دکان جانے کے لیے گھر سے نکل رہے تھے کہ دروازے پر شہزاد سے ملاقات ہو گئی۔ نظام نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ارے شہزاد! تم کب آئے؟“

”کل شام کو آیا ہوں اور آج دوپہر کو عوامی سے چلا جاؤں گا۔“

نظام نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اتنی جلدی جانے کون دے گا۔ چلو ناشتا کرو۔ پھر ہم دکان میں چل کر باتیں کریں گے۔“

وہ دونوں کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں ان کے لیے چائے تیار کرنے جا رہی تھی کہ شہزاد نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا۔ ”بھابی' اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے بسترِ علالت سے ہمیں خط لکھا اور میں یہاں نہ آ سکا۔“

میں نے حیرانی سے نظام کو دیکھا پھر شہزاد سے کہا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں بیمار کب ہوئی تھی کہ آپ کو خط لکھتی۔“

”آپ نے مجھے نہیں، ثمینہ کو خط لکھا تھا۔ یہ دیکھیے......“ اس نے جیب سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر مجھے دیا۔

میں نے اسے کھول کر پڑھا۔ خط کا لب لباب یہی تھا کہ میں سخت بیمار ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ ایک بار آ کر مجھ سے مل لو۔ خط لکھنے والی کے نام کی جگہ میرا نام لکھا ہوا تھا۔

”یہ خط میں نے نہیں لکھا ہے۔“ میں نے غصے سے کہا اور اسے نظام کی طرف بڑھا دیا۔ ”آپ ہی بتائیے۔ کیا یہ میری تحریر ہے؟“

نظام نے خط دیکھا اور اسے شہزاد کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں شہناز کی تحریر اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ خط اس نے نہیں لکھا ہے۔ خط کی تاریخ دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد ہی ثمینہ یہاں جمشید کے ساتھ آئی تھی۔

ہماری ملاقات بمبینو میں ہوئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ دوسرے دن ہمارے ہاں آئے گی۔ لیکن وہ پانچ منٹ کے لیے بھی نہیں آئی......“

شہزاد کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں پوچھا ”اس کا مطلب یہ ہے کہ ثمینہ کا قیام تمہارے ہاں نہیں تھا۔“

نظام نے جواب دیا۔ ”نہیں بھئی، وہ اپنے بیمار ماموں سے ملنے آئی تھی۔ ہمارے گھر میں تو وہ جھانکنے بھی نہیں آئی۔“

”بیمار کوئی بھی نہ تھا۔“ شہزاد نے تلخی سے کہا۔ ”اس نے مجھ سے کہا کہ شہناز بھابی بیمار ہیں اور تم لوگوں سے کہا کہ ماموں بیمار ہیں...... ماموں پرسوں لاہور آئے تھے۔ انہیں جب پتا چلا کہ ثمینہ کراچی گئی تھی تو انہوں نے شکایت کی کہ وہ ان سے ملنے کیوں نہیں آئی۔“

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”تو کیا ثمینہ یہاں اپنے ماموں کے پاس نہیں ٹھہری تھی۔“

”نہیں!“

شہزاد کا جواب بہت مختصر تھا۔ لیکن اتنا مکمل تھا کہ ثمینہ کی ساری لغزشیں ایک پل میں سامنے آ گئیں۔ وہ میری سہیلی تھی۔ میں نے اور نظام نے کتنی کوششوں کے بعد اسے شہزاد کی شریکِ حیات بنایا تھا۔ قیصر سے ملوث ہونے والی بدنامی کے داغ کو اس کی پیشانی سے مٹایا تھا۔ آج پھر ایسا ہی داغ وہ اپنے دامن پر لگا چکی تھی۔ اس وقت مجھے ایسی شرم محسوس ہوئی کہ میں شہزاد کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ چپ چاپ سر جھکا کر دوسرے کمرے میں چلی آئی اور دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر ان کی باتیں سننے لگی۔

نظام نے ناگواری سے پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے شہزاد؟ ثمینہ کو اتنا حوصلہ کیسے ہو گیا کہ وہ تمہیں دھوکا دے سکے؟“

اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہم سب جان بوجھ کر دھوکا کھاتے ہیں۔ قیصر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ثمینہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ لیکن تم نے اور بھابی نے سب سے پہلے دھوکا کھایا تھا۔ تم دونوں کی نیک نیتی دیکھ کر میں نے اسے عزت اور شرافت کی زندگی گزارنے کا موقع دیا اور اس کا نتیجہ ہم سب کے سامنے آ گیا ہے۔“

”نہیں شہزاد! ہم نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ تمہاری شادی کے بعد ڈیڑھ سال تک میں نے لاہور میں رہ کر یہی

دیکھا ہے کہ ثمینہ ایک وفادار بیوی تھی۔ کیا تم اس سچائی سے انکار کرسکتے ہو؟''

''نہیں۔ اس وقت تک اس نے اپنی خدمت گزاری اور وفاداری سے میرا اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ جمشید ڈھائی سال سے ہمارے ساتھ ہے۔ اس دوران میں نے ان پر کبھی شبہ نہیں کیا۔ میرے ملنے جلنے والے دبی زبان سے سمجھاتے رہے۔ کسی نے کہا کہ جمشید کو میرے ہاں نہیں رہنا چاہیے۔ لیکن میں اسے محض دوست ہی نہیں بلکہ اپنا بھائی اور اپنے گھر کا ایک معتمد فرد سمجھتا رہا۔ کسی نے مجھے نصیحت کی کہ بیوی کو تنہا چھوڑ کر راتوں کو تاش نہیں کھیلنا چاہیے۔ تاش کھیلنے سے کیا ہوتا ہے؟ دوسرے بھی کھیلتے ہیں۔ میں بھی کھیلتا ہوں۔ دوسرے بھی اپنے گھروں سے باہر رہتے ہیں۔ میں بھی اکثر گھر سے باہر رہتا ہوں اور پھر یہ کہ میں نے ثمینہ کے کردار کو کبھی کمزور نہیں پایا۔ میں کبھی اس پر شبہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک رات میری جیب خالی ہوگئی۔ میں جلد ہی گھر لوٹ آیا۔ دروزے پر دستک دینے کی بجائے میں نے سوچا کہ کھڑکی سے ثمینہ کو آواز دے کر جگاؤں۔ کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں تیز روشنی سے گزر کر آیا تھا۔ اس لیے کھڑکی سے دیکھنے پر ہر چیز سائے کی طرح مٹی مٹی سی نظر آرہی تھی۔ مجھے اس وقت یوں لگا جیسے ثمینہ کے بیڈ پر ایک نہیں بلکہ دو سائے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے اور بھی اندھیرا چھانے لگا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہاں دو سائے ہیں۔ میں نے آواز دی۔ ''ثمینہ!''

''کون؟'' جمشید نے بے اختیار پوچھ لیا۔

''میں ہوں۔ دروازہ کھولو!'' میں دروازے پر آگیا۔

میرا ایمان ہے کہ برائی کبھی نہیں چھپتی۔ ایسی صورت میں گناہگار خود ہی بوکھلا جاتے ہیں۔ لیکن وہاں میں نے ذرا سی بھی بوکھلاہٹ نہیں دیکھی۔ دروازہ کھولتے ہی جمشید مجھ پر برس پڑا۔

''تم بڑے ہی واہیات قسم کے آدمی ہو۔ یہ تمہارے گھر آنے کا وقت ہے۔ تمہیں اپنی بیوی سے ذرا بھی محبت نہیں ہے، ذرا جا کر دیکھو۔ ثمینہ کی کیا حالت ہو رہی ہے......''

''کیا ہوگیا اسے؟'' میں بوکھلا کر ثمینہ کے پاس آیا۔ وہ دو لحافوں کے نیچے دبی پڑی تھی۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ پیشانی سے پسینا پھوٹ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بخار تو نہیں ہے......''

''بخار ابھی اترا ہے۔'' جمشید نے جواب دیا۔ ''دیکھتے نہیں کیسے پسینا پھوٹ رہا ہے۔''

وہ ڈراما حقیقت سے اتنا قریب تھا کہ میری سوچ کا رخ ہی بدل گیا۔ میں اس وقت یہ نہ سمجھ سکا کہ پسینا صرف بخار اترنے سے نہیں آتا۔ پسینا گھبراہٹ سے بھی آتا ہے۔ پسینا غصے سے بھی آتا ہے۔ پسینا ندامت سے بھی آتا ہے۔ پسینا چوری کرتے ہوئے بھی آتا ہے اور پسینا سینہ زوری کرتے ہوئے بھی آتا ہے اور بہت زیادہ خوف طاری ہوجائے تو ثمینہ کی طرح ہاتھ پاؤں ٹھنڈے بھی ہوجاتے ہیں۔

بہرحال اس روز میں نے بڑی ہمدردی اور محبت سے سوچا کہ میں ثمینہ سے غفلت برت رہا ہوں۔ آیندہ مجھے اس کی دیکھ بھال کا خیال رکھنا چاہیے۔ کچھ دن تک میں اس کا خاص خیال رکھتا رہا۔ کچھ روز تک میں تاش کھیلنے نہیں گیا۔ لیکن ان دنوں میں دس ہزار کے نقصان میں تھا۔ اتنی بڑی رقم ہارنے کے بعد میں سکون سے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ ہارنے والا جواری ہر بار جیتنے کا خواب دیکھتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ صرف دس ہزار روپے واپس حاصل کرنے تک کھیلوں گا۔ اس کے بعد کھیل کی ایک حد مقرر کردوں گا۔ تاکہ ثمینہ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ رہے۔

میں جیتتا رہا اور ہارتا رہا۔ ہر جیت مجھے ایک نئی جیت کا یقین دلاتی تھی اور ہر ہار اپنے نقصان کو پورا کرنے پر اکساتی رہتی تھی۔ جو تاش کے پتوں میں الجھتے ہیں وہی اس کی بھول بھلیوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

ایک رات میں کھیلنے کے لیے نہیں گیا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں سونا چاہتا تھا لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ ثمینہ نے مجھے خواب آور گولی کھانے کے لیے دی۔ اسے کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی میں گہری نیند سوگیا۔ میں راتوں کو جاگنے کا عادی ہوں۔ اس لیے ایک گولی مجھے زیادہ دیر تک نہیں سلاسکتی تھی۔ اچانک میری آنکھ کھلی تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ میں نے کروٹ لے کر ثمینہ کی جانب دیکھا۔ اس کا بستر خالی تھا۔ میں نے اٹھ کر باتھ روم میں دیکھا۔ وہاں بھی وہ نہیں تھی۔ میں نے جمشید کے کمرے کی طرف آکر دروازے پر دستک دی۔

''جمشید......!''

مجھے فوراً ہی جواب نہیں ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد ثمینہ کی آواز سنائی دی۔

''پپو......! دیکھو تمہارے ابو آئے ہیں۔ دروازہ کھولو۔''

پھر اس کی آواز دروازے کے بالکل قریب آئی۔

''اوں ہوں! ایسے نہیں بیٹے۔ پہلے تم نے کس طرح بند کیا تھا۔ ایسے۔ اب کس طرح کھولو گے۔ ایسے......''

اور دروازہ کھل گیا۔ ثمینہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''دیکھیے، آپ کا پپو کتنا ہوشیار ہوگیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے دروازہ بند کرتا ہے اور کھول بھی دیتا ہے۔''

معصوم پپو میرے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گیا۔ معصومیت گلے لگ جائے تو ساری دنیا معصوم نظر آتی ہے۔ ایک طرف بیٹے کی معصومیت تھی، دوسری طرف صبح کی اذان کا تقدس تھا۔ ثمینہ کے پیچھے جمشید کھڑا تھا۔ ان کے درمیان اگر کوئی مکروفریب تھا تو اس کی طرف میرا دھیان نہیں گیا۔ کیونکہ دوست اور بیوی دونوں ہی پر میں اندھا اعتماد کرتا تھا۔

پھر انہوں نے مجھے سچ مچ کا اندھا سمجھ لیا۔ ثمینہ جعلی خط دکھا کر ضد کرنے لگی کہ شہناز سخت بیمار ہے۔ ہمیں کراچی جانا چاہیے۔ وہ جانتی تھی کہ میری چھٹیاں ختم ہوچکی ہیں، میں اس کے ساتھ نہیں جاسکوں گا۔ اور یہی ہوا۔ میں نے مزید چھٹی کی درخواست کی لیکن درخواست منظور نہیں ہوئی اور وہ جمشید کے ساتھ یہاں چلی آئی۔

یہاں سے واپس جا کر اس نے مجھے بتایا کہ وہ پانچ دن تمہارے ہاں اور دو دن اپنے ماموں کے یہاں رہ کر آئی ہے۔ لیکن وہاں اس کے ماموں کے آتے ہی اس کا جھوٹ کھل کر سامنے آگیا۔ اپنی ازدواجی زندگی میں پہلی بار مجھے اس پر شبہ ہوا کہ اس کے وہ دو دن جو نہ تمہارے ہاں گزرے اور نہ اس کے ماموں کے ہاں...... کہاں چوری ہوگئے؟ وہ دو دن کس نے چرا لیے؟ یہ معمولی چوری نہیں تھی۔ مجھے اس چوری کا پتا چلانا تھا اور اسی لیے میں یہاں آیا ہوں تو یہ انکشاف ہو رہا ہے کہ بھابی بیمار نہیں تھیں۔ وہ خط ایک فراڈ تھا اور وہ پانچ دن تو کیا پانچ منٹ کے لیے بھی تمہارے ہاں نہیں آئی تھی۔

اس نے میری شرافت اور میرے اندھے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کا جھوٹ اور اس کی آوارگی واضح ثبوت کے ساتھ سامنے آگئی ہے۔ اب میں اسے بیوی کی حیثیت سے برداشت نہیں کرسکتا۔ میں یہاں سے جاتے ہی اسے طلاق دے دوں گا......

فتاویٰ جہانداری

مشہور مورخ ضیا الدین برنی کی تصنیف۔ یہ کتاب فیروز شاہ تغلق کے عہد کے پہلے چھ برسوں کے دوران میں لکھی گئی۔ اس میں برنی نے غیاث الدین بلبن سے لے کر فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی عہد تک کے سیاسی و معاشرتی حالات کے بارے میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ برنی ذاتی طور پر سیاست کو مذہب سے الگ نہیں سمجھتا، بلکہ اس کی دلی خواہش تھی کہ ملکی، سیاسی و معاشی مسائل کے حل کرنے میں قدیم ضابطۂ حیات کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس لیے اس نے قرآن مجید ارشاداتِ نبویؐ اور خلفائے راشدین کے حکام کی روشنی میں بعض مسائل کو واضح کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ سلطان محمود غزنوی کو اس نے خاص طور سے مثالی رہنما بتایا ہے۔ کسی مثالی رہنما کے ذریعے اپنے نظریات کو بیان کرنے کا انداز قدیم علماء نے اختیار کیا تھا۔ برنی نے بھی یہی انداز اپنایا، چنانچہ سیاسی حالات میں اپنے ذاتی تاثرات کو بھی وہ سلطان محمود کی زبانی بیان کرتا ہے۔ ''فتاویٰ جہانداری'' کے اہم موضوعات یہ ہیں۔ بادشاہ کو خدا کی حفاظت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کا مرتبۂ دینی، مشورے کی اہمیت، مشیروں کے اوصاف، مساواتِ خاص و مساواتِ عام، عسکری نظام، حق و باطل، عفو و تعزیر۔ اس تصنیف کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

مرسلہ: احمد شاہ، کوہاٹ

شہزاد نے بڑے ہی ٹھوس اور مستحکم لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ میں دروازے کے پیچھے کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ ثمینہ کی قسمت کا فیصلہ سن کر میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''بھائی صاحب! ثمینہ نے آپ کو کیسا صدمہ پہنچایا ہے، اس کا اندازہ ہمیں بھی ہے، مگر آپ اتنی عجلت میں طلاق کا فیصلہ نہ کریں۔''

''طلاق نہ دوں تو اور کیا کروں؟'' شہزاد نے تلملا کر کہا۔ ''کیا اسے بیوی بنا کر ساری عمر فریب کھاتا رہوں۔ یا ایک چوکیدار کی طرح اس کی نگرانی کرتا رہوں۔ آپ ہی بتایئے کہ میں نے اسے کون سی تکلیف پہنچائی ہے؟ کس بات کی کمی ہے؟ کھانے کے لیے اچھی غذائیں ہیں۔ پہننے کے لیے ریشمی جوڑے ہیں۔ گھومنے کے لیے کار ہے۔ رہنے کے لیے شاندار بنگلا ہے۔ روپے پیسے زیورات سب کچھ ہے۔ میں نے اپنی حیثیت کے مطابق اپنے گھر کو اس کے لیے جنت بنا دیا ہے۔ پھر وہ اس جنت سے نکل کر کیوں بھٹک گئی؟''

نظام نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''شہزاد! عورت ہو یا مرد، وہ خدا کی بنائی ہوئی جنت میں بھی تنہا نہیں رہ سکتا۔ اسے ہمیشہ ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اپنی غلطی کو بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم نے اسے ہر طرح کا آرام دیا ہے۔ تم نے اسے سونے کے زیورات سے لاد دیا۔ اس کے آگے چاندی کا گلاس رکھ دیا۔ لیکن چاندی کا خالی گلاس پیاس نہیں بجھاتا۔ تم نے اس کے لیے جنت بنائی مگر اس میں تنہائی اور انتظار کے انگارے بھر دیے۔ ازدواجی زندگی تاش کے پتوں سے زیادہ الجھی ہوتی ہے۔ رات رات بھر جوا کھیلنے والے یہ نہیں سوچتے کہ وہ صرف رقم نہیں ہارتے ہیں، اپنے گھر کی عزت کو بھی ہار کے چلے جاتے ہیں.....''

شہزاد نے ناگواری سے کہا۔ ''تم لوگ ہمیشہ ثمینہ کی حمایت کرتے ہو اور میری ہی غلطیوں کا حساب کرنے بیٹھ جاتے ہو۔ اچھی بات ہے میں خطاوار ہوں۔ مگر ایمان سے کہو، کیا ثمینہ بھی قابل نفرت نہیں ہے؟ اگر اسے مجھ سے شکایت تھی، اگر وہ جمشید کو مجھ پر ترجیح دے رہی تھی تو اسے چاہیے تھا کہ مجھے دھوکا دینے کی بجائے مجھ سے علیحدگی اختیار کر لیتی۔ اس وقت مجھے بھی احساس ہوتا کہ واقعی میری بے توجہی کے باعث وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی ہے۔ اس میں کم از کم اتنی دیانتداری تو ہے کہ اس نے بیوی کی حیثیت سے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی ہے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ خود کو چالاک سمجھتی رہی اور مجھے بے وقوف بناتی رہی۔ میں اسے طلاق دوں گا اور ضرور دوں گا۔''

''طلاق دینا یا نہ دینا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔'' نظام نے کہا۔ ''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آئندہ کے لیے تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ رہ گئی ثمینہ۔ تو مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ میں اب اس کی حمایت نہیں کرنا چاہتا۔ تم جو چاہو کرو۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔''

نظام کا فیصلہ سن کر میں بھی ثمینہ کی حمایت میں کچھ نہ کہہ سکی۔ کہنے کے لیے اس نے چھوڑا ہی کیا تھا۔ میں کیا منہ لے کر اپنے خاوند سے کہتی کہ وہ اسے طلاق کی لعنت سے بچالیں؟

شہزاد اسی دن واپس چلا گیا، ایک ماہ بعد ہمیں اطلاع ملی کہ طلاق ہو گئی ہے۔

پھر مہینوں گزر گئے، مجھے ثمینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔ ہماری گفتگو کے دوران اب اس کا ذکر نہیں آتا تھا۔ میں نے اپنے خاوند کے سامنے اسے بھلا دیا تھا۔ لیکن اس کے متعلق اکثر سوچتی رہتی تھی کہ نہ جانے اس پر طلاق کا کیا ردِعمل ہوا ہے؟ اس نے دوسری شادی کر لی یا اپنی غلطی پر پچھتا رہی ہے؟

دو سال کے بعد اچانک اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ پپو کا ہاتھ پکڑے ایک گرلز اسکول کے احاطہ سے باہر آ رہی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر حیرانی سے پوچھا۔ ''ثمینہ تم.....؟ تم اسی شہر میں ہو؟''

''ہاں.....!'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں اس اسکول میں بچیوں کو پڑھاتی ہوں۔ تم نے اسے پہچانا۔ یہ پپو ہے۔''

میں نے پپو کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر کہا۔ ''ماشاءاللہ اب تو بہت بڑا ہو گیا ہے۔''

''پورے پانچ سال کا ہے۔''

''تم نے دوسری شادی نہیں کی؟''

اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر سرد لہجے میں بولی۔ ''نہیں..... میں اپنے بیٹے کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہوں اور بہت خوش ہوں.....''

''کیا یہ پہاڑ جیسی زندگی اکیلے گزار لوگی؟''

وہ سر جھکا کر میرے ساتھ راستے کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ اس کی خاموشی سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ اسے دوسری شادی کے لیے کوئی ساتھی نہیں مل رہا ہے۔ ہمارے ملک میں کنواری لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ پھر اس بچے والی مطلقہ عورت کو کون پوچھے گا؟ میں نے ہمدردی

سے کہا۔ ''طلاق ایک ایسی لعنت ہے کہ اس کے بعد عورت کو دوسرا سہارا نہیں ملتا۔''

وہ میری بات سن کر ہنسنے لگی۔ ''شہناز.....! یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ مجھے دوسرا سہارا نہیں مل رہا ہے۔ یہاں اتنے بڑے شہر میں کون جانتا ہے کہ میں مطلقہ عورت ہوں۔ اسکول کے رجسٹر میں، میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ اسکول کے باہر میرا مشاہدہ ہے کہ لوگ مجھے بیوہ عورت بھی نہیں سمجھتے۔ ابھی پرسوں کی بات ہے۔ پپو کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تو وہ پپو کو دیکھنے کی بجائے مجھے ہی دیکھتا رہ گیا۔ میں بری طرح جھینپ کر رہ گئی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ عقل کا اندھا مجھے ایک کنواری لڑکی سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پپو میرا بیٹا نہیں ہے۔ میں اسکول کے کسی بچے کا علاج کرانے آئی ہوں.....''

کنواری لڑکی..... میں نے اس کا جھوٹ سن کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ اپنی عمر سے بھی زیادہ عمر رسیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیوں کو لپ اسٹک کی سرخی سے چھپانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں کاجل کی سیاہی دور سے ایسی لگتی تھی جیسے آنکھوں کی جگہ دو سیاہ گڑھے پڑ گئے ہوں۔ اس کی خوش فہمی پر میرا جی چاہا کہ اسے آئینہ دکھا دوں۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ عورت خواہ کیسے ہی رنگ روپ کی ہو۔ اچھی ہو یا بری ہو۔ آئینہ بھی اسے خوش فہمی میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ وہ تمام عمر آئینہ دیکھ کر جتنا دھوکا کھاتی ہے، اتنا کسی مرد سے بھی نہیں کھاتی۔''

''دوسرے دن ڈاکٹر سے رہا نہ گیا۔ اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اب تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا الٹی سیدھی ہانکتا رہا۔ بس یوں سمجھ لو کہ علاج کرتے کرتے وہ خود ہی مرضِ محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں اس کی بکواس سے گھبرا کر وہاں سے چلی آئی۔ ایسے وقت میرا ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے۔ شادی کے لیے کسی جیون ساتھی کا انتخاب کرنا بہت مشکل ہے..... بہت مشکل ہے۔''

''ایسی بھی کیا مشکل ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا کھانے پہننے والا آدمی ہو تو زندگی آرام سے گزر جاتی ہے..... کیا اس کی پریکٹس اچھی طرح نہیں چلتی ہے؟''

''بہت اچھی طرح چلتی ہے۔ بے شمار مریض آتے ہیں۔ بے حساب آمدنی ہے۔ وہ اچھا کھلا سکتا ہے۔ اچھا پہنا سکتا ہے۔ ایک مرسیڈیز کار بھی ہے.....'' یہ کہتے کہتے اس کی آواز میں ایک عجیب سا درد پیدا ہو گیا۔ ''اس کے پاس رہنے کے لیے ایک..... ایک شاندار کوٹھی بھی ہے.....''

اس کے لہجے کا درد واضح ہونے لگا۔ اس کی چال سست پڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں خواب سمٹ آئے تھے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اور..... اور وہ اپنے گھر کو میرے لیے جنت بنا سکتا ہے.....''

اس نے یک بہ یک میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ پپو کا ہاتھ پکڑ کر ایک گلی میں مڑ گئی اور مجھ سے منہ چھپا کر اس طرح جانے لگی جیسے آنسو چھپانے جا رہی ہو۔

اس کی لڑکھڑاتی اور ڈگمگاتی ہوئی چال بتا رہی تھی کہ

فاسق

لغت میں کھجور کا پک کر چھلکے سے نکلنا فسق کہلاتا ہے، لیکن شریعت میں فسق کا مطلب ہے حدِ شرع سے نکلنا۔ کافر کو بھی اس بنا پر فاسق کہا جا سکتا ہے کہ شرع کو بھی نہیں مانتا اور عقل اور فطرت کے تقاضوں سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں مومن کو فاسق کی ضد بھی کہا گیا ہے، لیکن زیادہ قطعی طور پر فاسق کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جس نے مسلمانوں کی حیثیت سے شرع کو تسلیم تو کیا، لیکن اس سے گناہ صغیرہ یا کبیرہ سرزد ہوئے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک اگر کسی کے دل میں تصدیق موجود ہے، لیکن ضعفِ ایمان کی وجہ سے عمل میں کوتاہ ہے اور فرائض کا تارک اور کبائر کا مرتکب ہوتا ہے تو ایسے شخص کو فاسق کہتے ہیں۔ یوں منافق اصلی فاسق سے بدتر ہوتا ہے، کیونکہ وہ تصدیق قلبی بھی نہیں کرتا اور صرف ظاہرداری کرتا ہے، لیکن اگر فاسق تصدیق میں بھی کمزور ہے تو یہ بھی منافق کی صف میں شامل ہوگا۔ معتزلہ کے خیال میں مومن وہ ہے، جو دل سے ایمان کی تصدیق کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور اعضا و جوارح سے احکام شریعت بجالائے، جو مسلمان تیسری شرط کو پورا نہیں کرتا، وہ حقیقی طور پر مومن نہیں ہو سکتا اور نہ عذابِ آخرت سے بچ سکتا ہے۔

مرسلہ: نادر افروز، کوٹ سلطان

عورت اپنے پیار کی پہلی جنت کو کبھی نہیں بھولتی۔

☆☆☆

میں نے یادوں کی البم کو بند کردیا۔

میرے سامنے ثمینہ کی زندہ تصویر تھی۔ ہم دونوں دکان سے ذرا دور میدان کے سرے پر کرسیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ میرا بھتیجا اقبال دکانداری میں مصروف تھا اور نظام کسی کام سے بینک کی طرف گئے ہوئے تھے۔

ثمینہ نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو میں اس بڑھیا کی بات کر رہی تھی۔ دراصل وہ ایک خوبصورت بہو کی تلاش میں تھی۔ بڑے فخر سے کہنے لگی کہ میرا بیٹا بینک منیجر ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ حالانکہ اس میں ہنسی کی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ ظاہر کر رہی تھی کہ ایسے ایسے بینک منیجروں کو وہ ہنسی میں اڑا دیا کرتی ہے۔

یک بہ یک مجھے احساس ہوگیا کہ وہ ایک بھٹکی ہوئی عورت ہے۔ ایسی بات نہیں تھی کہ زندگی گزارنے کے لیے اسے کوئی ساتھی نہ ملتا۔ ضرور ملتا، کوئی بوڑھا یا نوجوان کلرک، کوئی اسکول ماسٹر، کوئی سیلز مین یا کوئی بھی محدود آمدنی والا، تنگی ترشی سے گزر کرنے والا شریف آدمی اسے قبول کرسکتا تھا لیکن کسی بہت بڑے افسر کو یا خاندانی رئیس کو اچھی، خوبصورت اور کنواری لڑکیوں کی کیا کمی تھی کہ وہ ایک باسی پھول کو اپنے گھر کے گلدان میں سجالیتے۔ اسی لیے وہ خود کو راتوں کو خوابوں سے اور دن کو من گھڑت کہانیوں کے شہزادوں سے بہلاتی تھی۔ کبھی کسی بینک منیجر کی ماں اس کے سامنے اپنا آنچل پسارتی تھی، کبھی کوئی ڈاکٹر اسے دیکھ کر مریض بن جاتا تھا اور کبھی کوئی آرمی آفیسر اس کے جوڑے میں اس طرح پھول لگاتا تھا جیسے فتح کا پرچم نصب کر رہا ہو۔

عورت سب کچھ بھول جاتی ہے مگر اپنی گمشدہ جنت کو کبھی نہیں بھولتی۔ شاندار کوٹھی، اوپری آمدنی سے خریدی ہوئی کار، ائر کنڈیشنڈ کوچ کا آرام دہ سفر، ہر ماہ ہزاروں روپے کی شاپنگ کرنا اور پھر بھی مطمئن نہ ہونا۔ بات بات پر خاوند سے ناراض ہونا اور پھر نئی شاپنگ کی شرط پر مان جانا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پھول اور کانٹے، شعلے اور شبنم کی یہ جنت زندگی میں ایک ہی بار ملتی ہے، دوسری بار اس جنت کی تلاش کرتے کرتے عورت کھوٹے سکے کی طرح بیکار ہو جاتی ہے۔

ثمینہ کی کھوکھلی ہنسی تھم گئی۔ ہم نے دور ہی سے نظام کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے قریب آکر پوچھا۔ "ہیلو شہناز! کیا بہت دیر سے بیٹھی ہو؟"

"جی نہیں، ابھی آئی ہوں۔"

ثمینہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "کیوں جھوٹ بولتی ہو۔ ہم آدھے گھنٹے سے یہاں بور ہو رہے ہیں۔"

میں مسکرا کر رہ گئی۔ اسے سمجھانا فضول تھا کہ خاوند کے انتظار میں بوریت نہیں ہوتی۔ انہوں نے ثمینہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے... تمہیں خوامخواہ بور ہونا پڑا۔ دراصل بینک میں اچانک ہی شہزاد سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ٹرانسفر ہوکر کراچی آگیا ہے......"

نظام نے یہ کس کا نام لے لیا؟ میں نے بے اختیار ثمینہ کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر ڈوبتی ہوئی شام کی لالی آگئی تھی۔ اسی وقت کھلے میدان سے تیز ہوا کا جھونکا ایسے آیا جیسے اچانک کوئی سپنا آتا ہے یا زندگی کے مردہ ڈاکخانہ سے کوئی بھولا ہوا نامہ آتا ہے۔

"ہائے، پھر ترے نام کی خوشبو آئی......"

اس نے ہماری طرف سے رخ پھیر کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"اے دلِ ناداں! ذرا تھم تھم کے دھڑکنا...... کوئی تیرا بھید جاننے نہ پائے۔ چہرہ چھپالے۔ آنسو چھپالے۔ کیونکہ آنسو ہمیشہ کمزور جذبوں کی چغلی کھاتے ہیں......"

وہ بغیر کچھ کہے سنے تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف جانے لگی۔

"ثمینہ......!"

میں نے آواز دی۔ نظام نے آواز دی۔ مگر وردی جو لہراسے کھینچ رہی تھی، وہ ہماری آواز پر بھاری تھی۔

پھر وہ جانی پہچانی خوشبو کے پیچھے بھٹکتی چلی گئی۔

☒